فقہ المعاملات کو سمجھنے اور اس میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے
ایک اہم، مفید اور شاہکار کتاب

تطهير الاموال فی تحقيق الحلال والحرام

المعروف به

عطرِ ہدایہ

مصنف

حضرت مولانا فتح محمد تائب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تحقیق وتخریج

مفتی عبید الرحمٰن

دار الافتاء دار العلوم الرحمانیہ مردان

مکتبہ نعیمیہ نزد دار العلوم خیر المدارس پار ہوتی مردان
موبائل نمبر: 03018762001

فقہ المعاملات کو سمجھنے اور اس میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے

ایک اہم، مفید اور شاہکار کتاب

عطرِ ہدایہ

حضرت مولانا فتح محمد تائب صاحبؒ

تحقیق و تخریج

عبید الرحمن

دار الافتاء دار العلوم الرحمانیہ، مردان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ وفتاویٰ کی باغ وبہار دنیا میں "عطرِ ہدایہ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے، علامہ فتح محمد لکھنوی صاحب رحمہ اللہ نے اس کتاب کی تیاری وتالیف میں بڑی مشقت، باریک بینی اور دورسی سے کام لیا، اسی تفقہ اور نکتہ دانی کا نتیجہ ہے کہ ابتداءِ تالیف سے ہی یہ کتاب اہلِ علم کا مرجع رہی ہے، لیکن پوری صدی بلکہ سوا صدی گزر جانے کے بعد زبان وبیان اور افادہ واستفادہ کے لحاظ سے لوگوں کے طبائع ومزاج میں بڑی تبدیلی آئی جس کی وجہ سے اس کتاب سے استفادہ کرنے میں مشکلات پیدا ہوتی گئیں، چنانچہ کتاب سے کماحقّہ استفادہ کرنے میں بڑی اور بنیادی رکاوٹیں دو تھیں:

۱۔ زبان وبیان کا قدیم ہونا، موجودہ زمانے میں کتاب کے بہت سے الفاظ ومحاورات کا بالکل متروک یا نامانوس ہوجانا۔

۲۔ کتاب میں تحقیق وتخریج کا موجود نہ ہونا، زمانے اور عرف وتعامل کی تبدیلی کی وجہ سے بہت سے مسائل کے اساس وبنیاد کا بدل جانا، نیز کتاب میں چونکہ جدید نوعیت کے مسائل کا بھی کافی ذخیرہ موجود تھا جس میں مختلف اہلِ علم کے آراء وفتاویٰ سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی آراء وتحقیقات کا دیگر اہلِ علم کی آراء کے ساتھ مقارنہ کرنے کی بھی ضرورت تھی۔

پہلی رکاوٹ کا حل تو اس طرح نکلا کہ آج سے کچھ سال پہلے مولانا محمد رفیق صاحب کی ایماء وتحریک پر مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب زید مجدہ نے اس کتاب کی از سرِ نو ترتیب وتسہیل کا بیڑہ اٹھایا، جس کی وجہ سے پہلی رکاوٹ بڑی حد تک ختم ہوگئی، اللہ دونوں حضرات کو جزائے خیر نصیب فرمائیں۔

لیکن دوسری مشکل ہنوز برقرار تھی اور فقہ وفتویٰ کے نازک میدان میں اس کی اہمیت کا احساس بھی زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اس ناکارہ نے ہمت کرکے بنامِ خدا اس کام کا آغاز کیا اور اپنی کمزور استطاعت کی حد تک اس کی تحقیق وتخریج کرنے کی کوشش کی، جس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امید ہے کہ یہ دوسری مشکل بھی کسی نہ کسی حد تک حل ہوجائیگی اور پہلے کی طرح اب نئے سرے سے اس کتاب سے استفادہ کرنے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوجائے گا انشاء اللہ۔

زیرِ نظر کام میں مندرجہ ذیل باتوں کالحاظ کیا گیا ہے:

۱۔ حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے جن مسائل کے لئے کوئی حوالہ ذکر نہیں فرمایا، متعلقہ کتابوں سے اس کا حوالہ ذکر کیا گیا۔

۲۔ جہاں مؤلف رحمہ اللہ نے کسی کتاب کا نام ذکر کیا ہے مثلاً "کذا فی الہندیہ" یا صرف "عالمگیری" کا نام لکھا ہے، یا نام کے ساتھ ساتھ کتاب کی عبارت بھی ذکر کی ہے، وہاں تخریج میں اسی کتاب کی عبارت ذکر کی گئی اور تائید میں دیگر کتابوں کی عبارتیں بھی نقل کی گئیں ہیں۔

۳۔ جہاں ضروری سمجھا گیا، وہاں مشکل اور مبہم قسم کے مسائل کی توجیہ و تعلیل ذکر کی گئی۔

۴۔ اگر کسی مسئلہ میں حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے دیگر فقہاء کرام کے خلاف کسی رائے کو ترجیح دی ہے تو حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

۵۔ کتاب میں جہاں مرجوح، غیر مفتٰی بہ یا موجودہ زمانے کے لحاظ سے غیر معمول بہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے وہاں حاشیہ میں تفصیل کے ساتھ اس کی وضاحت کی گئی ہے، اسی طرح مختلف مسائل کے بیان کرنے میں بعض اہم اور ضروری شرائط و قیودات رہ گئے تھے، ان کو ذکر کرنے کی کوشش کی گئی، نیز بعض جگہوں پر تخریج کے بجائے تعلیق ذکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، وہاں تعلیقات بھی ذکر کی گئیں۔

۶۔ حوالہ جات میں عموماً اصل مصادر و مراجع اور متون کو مقدم رکھا گیا اور ہر جگہ ضرورت کے مطابق کم و زیادہ اور مختصر یا مفصل حوالہ جات ذکر کئے گئے ہیں، بعض جگہ مسئلہ کے بدیہی ہونے کی وجہ سے کوئی حوالہ ذکر نہیں کیا گیا، بعض جگہوں پر مختصر حوالہ لکھنا کافی نہ تھا اس لئے وہاں اصل کتاب کا حوالہ دیا گیا تاکہ قاری خود اس کی طرف مراجعت فرمائے، نیز جہاں مفید محسوس ہوا وہاں حوالہ لکھنے کے بجائے مسئلہ کی تعلیل و توجیہ ذکر کی گئی۔

۷۔ تسہیل شدہ نسخہ میں کئی جگہوں پر مختلف حواشی اصل متن میں داخل کئے گئے تھے، اس کے متعلق کوشش کی گئی کہ متن میں زبان کے تسہیل کے بجائے کوئی لفظ نہ آنے پائے تاکہ مؤلف رحمہ اللہ کی جانب کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو انہوں نے کہی نہ ہو، تسہیل کی خاطر بعض عناوین میں کچھ تبدیلی کی گئی اور بعض جگہ نئے عناوین بھی لگائے گئے لیکن ایسے تمام عناوین کو بریکٹ ( ) کے اندر لکھنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ حتی الامکان متن محفوظ رہے۔

اس طرح پوری کوشش کی گئی کہ تحقیق و تخریج کے حوالہ سے کتاب میں کوئی کمزوری یا سقم باقی نہ

رہے لیکن ایک طرف فقہ و فتویٰ اور تحقیق و تخریج کے باب کی دِقت و نزاکت، دوسری طرف اپنی کم علمی اور بے سروسامانی کی وجہ سے بہر حال غالب گمان یہ ہے کہ اس میں بہت سے اغلاط رہ گئیں ہوں گیں اور بہت سی جگہوں پر ابہام واجمال رہ گیا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ بعض جگہوں پر حوالہ بے جوڑ یا نامناسب ذکر ہوگا، خصوصاً اس لئے بھی کہ یہ کام زیادہ تر تعطیلات کے موقع پر کیا گیا تھا اور پھر کماحقّہ غور وخوض کے ساتھ نظرِ ثانی کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا گو سرسری طور پر ایک آدھ بار ضرور دیکھا۔

اس لئے اہلِ علم اور قارئین کی خدمت میں درخواست ہے کہ مطالعہ کے دوران اگر کسی قسم کی کوئی غلطی یا کمزوری سامنے آئے تو برائے کرم اس ناکارہ کو مطلع فرمائیں تاکہ تخریج کی غلطی وکمزوری کی وجہ سے اصل کتاب کی قدر وقیمت پر کوئی حرف نہ آئے اور آئندہ طباعت میں اس کی تصحیح کا اہتمام ہوسکے۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ کے بے حد حمد وستائش کے ساتھ ساتھ میں ان حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کی تیاری میں کسی بھی طرح اس ناکارہ کے ساتھ تعاون کا ثبوت دیا خصوصاً عزیزم مولوی عادل رضا صاحب [1] اور عزیزم مولوی محمد فاروق صاحب [2] سلمہما اللہ، کہ ان دونوں دوستوں نے مکرّر نظرِ ثانی کرنے میں بڑی محنت، تندہی اور ہمت کا ثبوت دیا، اللہ تعالیٰ ان کے علم، عمل، قبولیت، اور زندگی میں روزافزوں ترقیاں نصیب فرمائیں اور ہم سب کو اخلاص واختصاص اور استقامت کے ساتھ اپنے دینِ حنیف کی خدمت کرتے رہنے کی اور اسی پر مر مٹنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

ناکارہ عبید الرحمن رحمانی

دار الافتاء دار العلوم الرحمانیہ، مردان

۲۵ ذی الحجہ ۳۹ھ

---

[1] رفیقِ دار الافتاء مدرسہ دار العلوم الرحمانیہ، مردان۔

[2] رفیقِ دار الافتاء مدرسہ دار الفلاح، مردان۔

مؤلف کے حالات

حضرت مولانا فتح محمد تائب لکھنوی صاحب رحمہ اللہ ہمارے قریبی دور کے ان بزرگوں میں سے ہے جنہوں نے مختلف صفات و خصوصیات اور گوناگوں دینی خدمات انجام دینے کے باوجود نہایت گمنامی کی زندگی گزاری، اور بظاہر یہ سب کچھ ان کا اختیاری تھا جس کا بنیادی اور بڑا منشا آپ کی تواضع، خمول اور کسرِ نفسی ہے، ورنہ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی صفات سے نوازا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے ایک عظیم حلقہ اثر قائم کر سکتے تھے خصوصاً جس دور میں آپ نے حیاتِ مستعار کے لمحات گزارے تھے اس دور میں ایسا کرنا کوئی خاص مشکل کام نہ تھا لیکن اس کے باوجود آپ شہرت و نمود سے اس قدر کنارہ کش رہے کہ تاریخِ ہندوستان کے صفحات پر ان کا نام ہی بمشکل مل جاتا ہے چنانچہ ہندوستان کی تاریخ پر لکھی گئی دستیاب تمام کتابوں میں کافی تتبع اور تلاش کرنے کے باوجود آپ کی زندگی اور علمی خدمات کے متعلق کوئی خاص تفصیلات نہیں ملتیں۔

علامہ عبدالحیٔ حسنی رحمہ اللہ نے "نزہۃ الخواطر" میں اختصار کے ساتھ صرف اتنا لکھا ہے کہ "آپ فقہ اور اصول فقہ میں مہارت رکھتے تھے، آپ کا والد بت پرست تھا اور والدہ مسلمان تھی، آپ والدہ کے دین پر رہے، سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے، آپ سے فقہ، اصول فقہ، علم کلام، اور علم حدیث وغیرہ علوم حاصل کئے، اس کے بعد لکھنو میں "رفاہ المسلمین" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، جمادی الاخری ۱۳۲۲ھ میں انتقال ہوا۔[1]"

آپ کے صاحبزادے علامہ سعید احمد لکھنوی رحمہ اللہ نے اپنے ایک فتویٰ کے ضمن میں آپ کو حضرت شاہ احمد اللہ شاہ کا خلیفہ مجاز بھی لکھا ہے[2] جس سے آپ کی تصوف و سلوک کے ساتھ وابستگی بھی واضح ہو جاتی ہے، شاہ احمد اللہ شاہ صاحب رحمہ اللہ ایک صوفی، مجاہد اور غیور انسان تھے اور ان کے بیشتر مریدین بھی ذوقِ جہاد سے سرشار تھے، ہندوستان میں غاصب انگریزی حکومت کے خلاف ان کی بڑی خدمات ہیں۔[3]

---

[1] دیکھئے: نزہۃ الخواطر، ج۸ ص ۱۳۲۲۔

[2] یہ فتویٰ تسہیل شدہ نسخہ کے ص ۱۳۷۷ اور اصل قدیم نسخہ کے ص ۲۱۸ ذکر ہے۔

[3] دیکھئے: نزہۃ الخواطر، الشیخ أحمد اللہ العظیم آبادي، ج۷ ص ۹۰۹۔

تالیفات

آپ نے اپنی زندگی میں مختلف اور متنوّع قسم کی کئی کتابیں یادگار کے طور پر چھوڑی ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ **زیرِ نظر کتاب:** اس کا نام علامہ عبدالحیٔ حسنی صاحب نے "**تطهیر الأموال في معاملات الفقه**" بتایا ہے، حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے مقدمہ میں اس کا نام "**تطهير الأموال في تحقيق الحلال والحرام**" لکھاہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود مؤلف کی زندگی ہی میں "عطرِ ہدایہ" کے ساتھ یہ کتاب مشہور ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کے فرزندارجمند حضرت مولانا سعید لکھنوی صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنے متعدد فتاویٰ میں اسی نام سے کتاب کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ تکملہ عمدۃ الرّعایۃ علی شرح الوقایۃ۔ "عمدۃ الرّعایۃ" کے نام سے علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ نے "شرح الوقایۃ" کا حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا، ابھی "کتاب البیوع" تک پہنچے ہی تھے کہ داعی اجل کو لبّیک کہنا پڑا اور باقی کام یوں ہی باقی رہا، متعدد حضرات نے حضرت لکھنوی صاحب کے اس حاشیہ کو مکمل کرنے کی کوشش فرمائی ہیں، چنانچہ مولانا عبدالحمید لکھنوی صاحب نے "زبدۃ النہایۃ لعمدۃ الرّعایۃ" کے نام سے تیسرے حصہ کا تکملہ لکھا اور مولانا عبدالعزیز لکھنوی نے "حسن الدرایۃ لأواخر شرح الوقایۃ" کے نام سے چھوتے حصہ کا تکملہ لکھا، کچھ عرصہ پہلے قدیمی کتب خانہ سے اصل عمدۃ الرعایۃ اور یہ دو حواشی سات جلدوں میں طبع ہوئے۔

ٹھیک انہی دونوں حصوں کا ایک حاشیہ علامہ فتح محمد تائب لکھنوی صاحب رحمہ اللہ نے بھی لکھا اور اس سے اپنے استاذ کے حاشیہ کی تکمیل کی چنانچہ اس کا نام "تکملۃ عمدۃ الرّعایۃ" رکھا، ابحاث کی ندرت، جدّت، ترتیب و تنقیح، جدید مسائل پر تسلی بخش ابحاث وغیرہ خوبیوں کی وجہ سے اس آخر الذکر حاشیہ کو اہلِ علم کے ہاں بڑی پذیرائی اور قبولیت نصیب ہوئی اور یوں اس کو حاشیہ اور حلِّ کتاب سے بڑھ کر ایک مفید فقہی تحقیقی کتاب کی حیثیت نصیب ہوئی۔

۳: خلاصۃ التّفاسیر۔ اردو میں تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں چار جلدوں پر مشتمل ہے، نزہۃ الخواطر میں یہی لکھاہے اور علامہ سعید احمد لکھنوی صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنے ایک فتویٰ میں اس کا ذکر کیا ہے جو تسہیل شدہ نسخہ کے ص ۳۷۷ اور اصل قدیم نسخہ کے ص ۲۱۸ ذکر ہے۔

۴۔ ضروریاتِ دین۔ نزہۃ الخواطر میں بھی اس کو آپ کے مؤلفات میں سے شمار کیا اور مندرجہ بالا فتویٰ

میں بھی۔

۵۔"القول السّدید فی اثبات التقلید"

٦۔ القول الثّابت۔ علم کلام کے موضوع پر آپ کا رسالہ ہے۔

۷۔ علم میراث کے متعلق ایک رسالہ۔

۸۔ حساب کے موضوع پر ایک رسالہ۔

۹۔ صوم وصلاۃ کے مسائل میں ایک رسالہ۔

۱۰۔ اصلاح الاعمال۔ یہ چھ کتابیں "نزہۃ الخواطر" میں ذکر کی گئی ہیں۔

۱۱۔ ہدایۃ المحاسبین۔ اس کا ذکر آپ کے صاحبزادے علامہ سعید احمد لکھنوی صاحب نے مندرجہ بالا فتویٰ میں کیا ہے۔

پہلی دو کتابوں کے علاوہ باقی تمام کتابوں کے بارے میں ابھی تک کچھ تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں، ہندوستان کے بعض مکتبات اور ان میں موجودہ مخطوطات کی فہارس کی طرف مراجعت کرنے سے بھی فی الحال ان کتب کے متعلق کچھ زیادہ صورت حال معلوم نہ ہو سکی، قارئین کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر کہیں ان میں سے کوئی کتاب مطبوعہ یا مخطوطہ شکل میں مل جائے تو براہِ کرم ناکارہ کو بھی مطلع فرمائیں۔

کتاب کی اہمیت وقیمت

علوم وفنون کی دنیا میں مختلف کتب، تالیفات وتصنیفات کی کوئی کمی نہیں ہے (موجودہ دور میں تو اس کی بھرمار ہے) خصوصاً علمِ فقہ جیسے مخدوم علم کے متعلق تو تقریباً ہر ہر پہلو کے متعلق کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا گیا چنانچہ اس باب میں لکھی ہوئی کتابوں کو اگر کوئی گننا چاہے تو شاید اس کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو، لیکن اس کے باوجود بعض کتابیں تو لکھتے ہی ناپید ہو جاتی ہے، بعض کتابیں اپنے لئے کچھ محدود حلقہ اثر بناتی ہیں لیکن کچھ ہی عرصہ بعد علمی میدان کی سطح سے غائب ہو جاتی ہیں، جبکہ بعض کتابیں اپنی اہمیت، ندرت اور مؤلف کی اخلاص وللّہیت وغیرہ عناصر کی وجہ سے صدیوں تک امت کے لئے رہنمائی کا ذریعہ ثابت و برقرار رہتی ہیں، علم اور علماء کی تاریخ دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ کتابی دنیا کی مجموعی تعداد میں سے اس نوع کی بہت کم کتابیں ہوتی ہیں، انہی جیسی کتابوں میں سے ایک اہم اور شاہکار کتاب **"عطرِ ہدایہ"** ہے، اس کتاب کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

اخلاص اور دردِ دین

یوں تو اخلاص وغیرہ باطنی امور ہیں جن پر کوئی انسان اصلاً مطلع نہیں ہو سکتا، البتہ جس طرح ہر چیز کے پہچاننے کے لئے کچھ قرائن وشواہد ہوتے ہیں جن کی بناء پر کسی چیز کے ہونے نہ ہونے اسی طرح کم یا زیادہ ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے، یوں ہی اخلاص بھی ہے کہ مسلمان اور خصوصاً اہلِ علم کے حق میں حسنِ ظن رکھنے سے ہٹ کر بھی مختلف قرائن سے اس کا ادراک ہو جاتا ہے، پھر مصنف حضرت علامہ فتح محمد لکھنوی رحمہ اللہ کی پوری زندگی ان کی اخلاص و دیانت داری اور ریاء و نمود سے کوسوں دور ہونے کی کامل دلیل تو ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ اس زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں بھی اخلاص اور دردِ دین کی جھلک محسوس ہوتی ہے، عموماً کتاب کے مقدمہ میں کتاب کا تعارف، وجہ تالیف، اس کی خصوصیات اور صاحب کتاب کی اس فن میں مہارت و تجربہ وغیرہ باتوں کا ذکر ہوتا ہے لیکن یہاں مقدمہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی، دینی احکام و مسائل پر عمل کرنے میں ان کی کوتاہی خصوصاً معاملات کے باب میں حد درجہ کمزوری اور اپنی بھول چوک و کمزوری کا ذکر کیا ہے، اور یہی اخلاص اور دردِ دین ہی وہ جوہر ہے جس سے اعمال کے وزن و کیفیت میں بیش بہا ترقی اور قبولیت نصیب ہوتی ہے۔

ترتیب و تنسیق

اس کتاب میں سابقہ فقہی مواد کا محض تکرار ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب و تنسیق میں حد درجہ محنت و مشقت اور دقت کا مظاہرہ کیا گیا ہے بعض جگہ مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ کی ترتیب و جامعیت کو دیکھ کر غالب اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ آپ کے برسہا برس کے غور و خوض کا نتیجہ ہے ورنہ وقتی مطالعہ سے اتنی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ بات کرنا نہایت مشکل ہے، مثلاً:

الف: ہمارے متداول فقہی ذخیرہ میں مالِ حرام کے متعلق کوئی مستقل باب قائم کیا جاتا ہے نہ ہی کسی مخصوص باب میں اس کے متعلقہ مسائل یکجا ذکر کئے جاتے ہیں جبکہ کتاب کے شروع حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے اس کے متعلق مفصّل اور منضبط بحث ذکر فرمائی ہے مختلف اعتبارات سے اس کی تقسیمات اور اس سے متعلقہ احکام کا ایک وافر ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

ب: بیع کے مختلف مراتب اور اس کی شرائط بدائع، بحر، ہندیہ وغیرہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں بظاہر "عطرِ ہدایہ" میں اس سے ضرور استفادہ بھی کیا گیا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیوع کے متعلق مختلف اور منتشر جزئیات کو سامنے رکھ کر مفید اضافہ کیا گیا ہے مثلاً یہاں انعقادِ بیع کے چار مراتب مقرر کئے گئے اور چوتھا مرتبہ لزومِ بیع کو قرار دیا گیا، پھر لزومِ بیع کو صورتاً اور حقیقتہً دو صورتوں میں تقسیم کیا گیا اور دونوں کے لئے جدا جدا شرائط ذکر کی گئیں جو اس ترتیب و تفصیل کے ساتھ عام کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

ج: التزامات اور عقود میں متنوّع قسم کی شرائط کی شرعی حیثیت۔ اس بحث میں عقد و عہد کے درمیان فرق، عہد کی مختلف صورتیں، شرائط صحیحہ اور فاسدہ کی مختلف قسمیں، ان کی تطبیقی مثالیں اور احکام، بیع اور تجارتی معاہدات کے درمیان فرق وغیرہ مسائل کو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ یکجا طور پر جمع کیا ہے جو عام متداول کتابوں میں نہیں ہے۔

حوادث پر تطبیق

اس کتاب کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ محض نظریاتی مباحث و مسائل ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تطبیقی جانب پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے جو نہایت اہمیت کی حامل ہے محض نظریاتی مباحث یا پہلے سے طے شدہ اصول و قواعد کو ذکر کر دینے کا بظاہر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہے کیونکہ ایک تو وہ مباحث پہلے سے فقہی مصادر و مراجع میں موجود ہیں اور ثانیاً اس لئے کہ عموماً غلطی کی نوبت تطبیق ہی میں پیش آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اصلاحِ حال کے لئے تطبیق کے پہلو پر توجہ مرکوز رکھنا ضروری ہے، اس لئے اس کتاب میں فقہی ضوابط اور مباحث کو عموماً بطورِ تمہید ذکر کر کے اس پر مختلف مسائل کی تفریع کی جاتی ہے اور عملی پہلو پر پوری توجہ دی جاتی ہے بلکہ یہی چیز کتاب لکھنے کی اہم اور بنیادی مقاصد میں سے ہے چنانچہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے خود مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور پھر پوری کتاب میں عملی طور پر بھی اس کا التزام کیا گیا ہے۔

جدید نوعیت کے مسائل میں معتدل رائے

ایک اہم اور بنیادی خصوصیت اس کتاب کی یہ بھی ہے کہ اس میں محض قدیم جزئیات کے ذکر کرنے یا اس کو ترتیب دینے پر ہی اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ اپنے زمانے میں جو جدید قسم کے مسائل تھے، ان پر بھی فقہی نقطہ نظر سے بحث کی گئی، پھر بحث کرنے میں جادہ اعتدال کا لحاظ رکھا گیا چنانچہ کسی نئے مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے فقہی اصول وضوابط کو ہاتھ سے جانے دیا نہ ہی اس مسئلہ کی حقیقی اور واقعی صورتِ حال سے غفلت برتی گئی، بلکہ ان امور کی رعایت کے ساتھ ساتھ عموماً مختلف فقہی آراء کے نتائج اور مقتضیات کو بھی مدّ نظر رکھا گیا جس کی وجہ سے بحث کی اہمیت واستناد میں اضافہ ہوتا ہے۔

قدیم علمی ذخیرے کی روشنی میں جدید مسائل کا استخراج کیسے کیا جائے؟ اس کے متعلق کتاب میں کے مقدمہ سات (۷) اصول ذکر کئے گئے جو بہت کار آمد اور مفید ہے بلکہ اگر ان اصول کی تحقیق و تخریج کی جائے تو اہلِ فتویٰ علماءِ کرام کے لئے جدید مسائل حل کرنے کی راہ میں اعتدال کا ایک مستند نمونہ حاصل ہوگا۔

ان جدید مسائل میں مختلف قسم کے سکّوں کی فقہی تکییف اور اس کے شرعی احکام، منی آرڈر، ہنڈی کی انواع واحکام، حقوق کی مختلف انواع واصناف اور اس کے خرید وفروخت کے متعلق شرعی احکام وغیرہ مباحث شامل ہیں۔

انہی جیسی خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ اس کتاب کو اہلِ علم کے ہاں بڑی مقبولیت نصیب ہوئی، مختلف علماء نے اس کتاب کی تعریف وتوصیف کی جس کی وجہ سے کتاب سے استفادہ کرنے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

عرضِ مؤلف

بِسم الله الرّحمن الرّحيم

الحمدُ للّه الّذي اشترى مِن المؤمنين أنفسَهم بأنّ لهم الجنّة والرّضوان، والصّلاة على منْ دلّنا على تِجارة تُنجِينا مِن العذاب والخُسران وعلى الّذين بايعوه بالصّدق واتّبعوه بالإحسان.

أمّا بعدُ: فيا أيّها الإخوان إيّاكم مِن الحرام ومشتبهات الأمور وعليكم بإصلاح الأعمال وتطهير الأموال وما الحياةُ الدّنيا إلّا متاعُ الغرور.

واضح ہو کہ جن حقوق کی باز پرس ہونے والی ہے، وہ دو قسم کے ہیں:

۱: **حقوق اللہ۔**

۲: **حقوق العباد۔**

چونکہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور کریم ہے اس لئے اپنے حقوق بندے کی ندامت وتوبہ سے معاف فرمادیتے ہیں۔

بندے محتاج ہیں اس لئے اپنا حق لئے بغیر پیچھا نہیں چھوڑتے، ہاں کسی عمل صالح یا توبہ سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اتنا کہ اللہ تعالیٰ حق دار کو اپنے فضل سے دے کر معاف کرنے پر آمادہ کردے، یا حق کی وہ مقدار جو امر الٰہی کے ترک کرنے کے متعلق ہے اس کو چھوڑ دے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں سوائے قرض کے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدیون کا جنازہ پڑھنے سے اعراض فرمایا۔ پس معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی رعایت بہت ہی ضروری ہے۔

حقوق العباد دو طرح کے ہوتے ہیں: بدنی۔ مالی۔[1] بدنی حقوق معدودے چند ہیں اور ان کے احکام معلوم ہیں۔ البتہ مالی حقوق کثیر الوقوع اور ان کے اقسام بھی بہت ہیں، زمانہ کی طرح یہ حقوق بھی بدلتے رہتے ہیں، مال قیام وبقاء کا موجب ہے ہر صالح وفاسق اس کا محتاج ہے، ہر مالدار و مفلس اس میں ملوث ہے، خصوصا ہمارے زمانے میں تو کچھ اور ہی رنگ ہو گیا ہے، نمازوں کے اوقات، رمضان المبارک کا مہینہ اور جہتِ کعبہ کا بدلنا تو ممکن نہیں، جو شریعتِ مطہرہ نے مقرر کر دیا ہے وہی ہے، لیکن پہلے زمانے کی تجارتیں، صناعتیں، ضرورتیں طرز معاشرت میں اور ہمارے زمانے کی عالمگیر تجارت اور نئی نئی ایجادات اور غیر محدود شرکت (کمپنی وغیرہ) میں صرف نام مشترک ہے اس کے علاوہ کسی اور چیز یا وصف میں مطابقت وشرکت نہیں ہے۔

یہ اسی دین محکم اور ختم رسالت کا معجزہ ہے کہ جو قواعد متعین کر دئے ہیں، کسی انقلاب سے اس میں تغیر وتبدل واقع نہیں ہوتے اور اسی کے اطراف وجوانب سے اس نئی دنیا کی پیمائش ممکن ہے، انہیں اصول وضوابط پر قیاس واستنباط سے تمام جدید مسائل کے حل نکل آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا موجود ہونا یہ ایک لازمی ویقینی بات ہے کیونکہ یہ قوانین الٰہی ایسی ذات کے تعلیم فرمودہ ہے جو علیم وخبیر ہے اور قیامت تک وقوع پذیر ہونے والے تمام حالات وانقلابات سے واقف ہے، اس لئے یہ قوانین تمام تغیرات اور ضرورت وحاجت کو مد نظر رکھ کر وضع کئے گئے ہیں ورنہ کسی تالاب کو روکنے والے پشتے (بند) سمندر جیسے قہار اور دریا کے جزر ومد کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ بے شک ہمارے اصول شریعت خواہ وہ منصوص ہوں یا مستنبط، کافی ووافی ہیں، بشرطیکہ ان میں غور وفکر سے کام لیا جائے، ان اصول کا قیامت تک کے لئے کافی ہونے کا دعویٰ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے بغیر ختم نبوت اور تکمیل دین پر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] مصطلح علم فقہ میں عموماً انہی دو قسم کے حقوق العباد سے بحث کی جاتی ہے اس لئے فاضل مؤلف نے ان کو ذکر فرمایا، البتہ علم الاخلاق اور تصوف میں ان دونوں کے ساتھ ساتھ انسان کے عزت سے بھی انسانوں کے ایک مستقل حق کی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے اس لحاظ سے حقوق العباد کی تین اقسام قرار پاتی ہیں: ا۔ جانی حقوق۔ ۲۔ مالی حقوق۔ ۳۔ معاشرتی یعنی انسان کے عزت وآبرو سے متعلق حقوق۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں حضرت تھانوی صاحب رحمہ اللہ کی افادات پر مشتمل کتاب "حقوق العباد" ترتیب: حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب۔

اب جب کہ نہ جبرئیل علیہ السلام کے اترنے کا سوال اور نہ ہی کسی نبی ﷺ کے آنے کا انتظار ہے، پھر جدید پیش آنے والے مسائل معاملات کا شرعی حل کیونکر ممکن ہے؟ تو لازماً انہی قدیم اصول پر غور وفکر کر کے ہی نئے مسائل کا حل نکالنا ہوگا، بے شک ہر حاضر وغائب کے جاننے والے اور ہر جدید وقدیم کو پیدا کرنے والے کو ازل ہی سے یہ بات معلوم تھی کہ اپنی مخلوقات میں کہاں تک توسیع منظور ہے اور زمین کے طول وعرض اور اس کے نشیب وفراز کیونکر قریب قریب ہو جانے والی ہے اور اس کے تمام طویل فاصلے کیسے کم ہو جائیں گے، اس کو طے کرنا کیسے آسان ہو جائے گا کہ مشرق کے رہنے والے آفتاب کے سایے کی طرح مغرب میں شام کر سکیں گے، شمال وجنوب کے گوشے مل جانے کے باوجود قوس عالم کا دائرہ اسی بعد وفصل پر باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے خرق عادت کا ظہور ہوگا کہ خاک کے پتلے انسان اپنی عقلی قوتوں اور اصلی خاصیتوں کے حیرت انگیز کارنامے انجام دیں گے، مختلف زبانیں اجنبی طبیعتیں، متضاد عادتیں اور جداگانہ ضرورتیں ایک ساتھ آنے والی ہیں۔

اب ایسی حالت میں اسلام کا دامن وسیع نہ ہو اور اس کے قوانین عام مذاق کے لئے کافی ووافی نہ ہوں اور اسلام اپنے ماننے والوں کی ضروریات کو پوری نہ کر سکے تو ایسی صورت میں دین اسلام قانون الٰہی میں نقص لازم آئے گا، واللہ باللہ ہمارے شرعی اصول اور یہی موجودہ علم ان تمام ضرورتوں ہی کو نہیں بلکہ قیامت تک پیش آنے والے تمام جدید مسائل کے لئے ویسے ہی کافی ہے جیسے اسلام کے ابتدائی دور میں تھے، ہاں: یہ اور بات ہے کہ ورثۃ الانبیاء علماء کرام کو اس طرف مزید توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اگرچہ نزول وحی کا دروازہ بند ہے مگر استنباط احکام تخریج مسائل کا راستہ تو کھلا ہوا ہے، نئی ایجادات کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے، دینی رہنمائی کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئی کہ عوام ان پیش آمدہ مسائل کو علماء کے سامنے پیش کر کے ان سے رہنمائی حاصل کریں اور علماء ان پر غور وخوض کر کے اصول قدیمہ سے مسائل تلاش کر کے عوام کی رہنمائی کریں۔

لیکن افسوس اس پر ہے کہ علماء اور عوام میں دوریاں بڑھ گئیں، نہ علماء کو اس بات کا فکر ہے کہ عوام سے ملاقات کر کے ان کے مسائل کو معلوم کر کے شرعی حل ان کو بتایا جائے، نہ عوام کو یہ فکر دامن گیر ہے

کہ کسی بھی کاروبار کو شروع کرنے سے قبل اپنے مسلمان ہونے کے ناطے اس کے متعلق شریعت کا حکم معلوم کریں کہ کن شرائط کے ساتھ یہ کاروبار جائز ہو گا۔

اب رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی ہے کہ تدبیر معاش میں مطلقاً آزادی ہے جو ہاتھ لگ جائے اپنا حق ہے، حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں رہی، اس کے بر خلاف علماء کے خیال میں اس شتر بے مہار کو روکنا اور حدود شرع سے بے انتہا تجاوز کو روکنا ان کو دائرہ شریعت میں محدود کرنا اب ممکن ہی نہیں رہا، غرض یہ کہ ادھر سے وحشت ادھر سے نفرت بڑھتی گئی۔

امت مسلمہ کے اس زبوں حالی کو دیکھ کر اس تائب مسکین کا دل بے چین ہوا اس راہِ پر خار میں قدم رکھا اور اس امر عظیم کا بیڑا اٹھایا{ اِنَّہٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا } [الأحزاب] کا مخاطب بن بیٹھا، چنانچہ سن ۱۳۰۲ھ میں تطہیر الاموال کے نام سے ایک مسودہ شائع کیا تاکہ کاروباری طبقے سے نئے سوالات اور معاملات سے متعلق صحیح حقائق معلوم ہوں اور علماء کرام بھول چوک پر متنبہ کر دیں، اس طرح اپنے خیال کی اصلاح اور اس رسالے کی تصحیح ہو جائے، اس درخواست کے جواب کا برسوں انتظار رہا بالآخر اللہ تعالیٰ کی توفیق پر بھروسہ کر کے اس کار خیر کے انجام دینے پر کمر ہمت باندھی ہے وہی توفیق دینے والا اور ہدایت دینے والا ہے۔

اس رسالہ میں احکام حدیث و فقہ کی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں مگر معاملات جدیدہ کی غرض اور حقیقت سمجھنے میں تجربہ اور معاملہ رہنمار ہاہے، اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی اور سرکشی کے اسباب سے بچائے اور میری خطا و قصور کو معاف فرمائے، اس کتاب کا نام **"تطهير الاموال فی تحقيق الحرام والحلال"** ہے۔

مقدمہ

پہلے وہ اصول بیان کر دینا مناسب ہے جن پر استخراجِ احکام کا مدار ہے تا کہ ناظرین کو شبہ کے وقت دلائل و شواہد کے لئے دور نہ جانا پڑے۔

اصول نمبر۱: قرآن و حدیث کے صریح نصوص اور اجماع امت حرف بحرف مسلم ہیں، ان میں قیل و قال کی گنجائش نہیں، مسئلہ کی حکمت خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ حکم آسان ہو یا دشوار جیسے سود اور بیع صرف (یعنی سونا اور چاندی کی اپنی جنس کے ساتھ بیع) وغیرہ۔

اصول نمبر۲: معاملات میں توسع سے کام لینا اولیٰ ہے بنسبت تنگی کے، اور صحت مقدم ہے فساد پر، تا کہ تجارت میں ترقی اور کمائی میں سہولت ہو کیونکہ مالی عبادات میں بدنی عبادات سے زیادہ نرمی کی گئی ہے۔

اصول نمبر۳: ضرورت (یعنی وہ حالت جو آدمی کو مضطر کر دے) ہر موقع پر اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے (یہ فقہ کا قاعدہ ہے "الضرورات تبیح المحظورات") جس طرح متقدمین نے ہر موقع پر رخصت دی اور تاویل ضعیف پر اکتفاء فرمالیا تا کہ لوگوں کو کھلی کھلی نافرمانیوں سے بچالیں، اسی اصول پر مبنی ہے ہنڈی اور اجارہ کا جواز، اسی طرح شرطوں اور نئے معاہدوں کے احکام۔

اب اس اصول پر وہی شخص اعتراض کر سکتا ہے جسے نہ زمانے کی ضرورت کی خبر ہے نہ مجتہدین سلف کے مشفقانہ چالوں پر نظر نہ خود تنگ نظری سے نکلنے کا خیال۔

شب تاریک وبیم موج گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ماسکساران ساحلہا

اصول نمبر۴: مقصدِ شارع ﷺ کو پہچاننا: یعنی نصوص واحکام کے موقع محل اور غرض وغایت کا پورا لحاظ ہو، تا کہ ظاہرِ حکم سے اصل مقصود فوت نہ ہو جائے، پس جن موقع پر شریعت نے سختی کی وہاں ہم بھی سختی

سے کام لیں گے جیسا کہ سود (ربوا) اور بیع صرف (یعنی سونا، چاندی، نقدی وغیرہ کا اپنی جنس کے ساتھ بیع) اور جن مواقع پر شریعت نے چشم پوشی اور آسانی سے کام لیا وہاں ہم بھی تاویل اور نرمی سے کام لیں گے، جیسے پاکی اور ناپاکی کے مسائل اور حدود و قصاص کے مسائل۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اندر
آنچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

وصف وعلت

یعنی جو احکام وصف وعلت پر مبنی پائے جائیں گے ان پر غور کیا جائے گا کہ اب بھی وہ وصف بعینہ پایا جاتا ہے یا کچھ تغیر کے ساتھ تاکہ اسی کے مطابق حکم دیا جائے، مثلاً پہلے زمانے میں مکان کی خریداری کے وقت مکان کو باہر سے دیکھنا کافی تھا کیونکہ مکان کی بناوٹ ایک طرح تھی لیکن اب ہر ہر منزل دیکھنا ہوگا، پہلے زمانے میں مثلی اشیاء بہت کم تھیں لیکن اب کارخانوں کے وجود میں آنے کے بعد مثلی اشیاء کی تعداد بڑھ گئی کیونکہ کارخانوں کے تیار کردہ مال ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

دیانت

چونکہ معاملات میں زیادہ حقوق کی حفاظت اور انصاف مد نظر رہا ہے اس لئے ہر حکم کے ضمن میں اس کا لحاظ کرنا شرط ہے۔

اصول نمبر ۵: (اختلاف) ہمارے لئے ہر موقع پر امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پیروی کرنا ہی صراط مستقیم ہے مگر یہ کہ ضرورت زمانہ سخت مجبور کردے۔

(یعنی پانچویں اصل یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو تو ہمیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کرنا چاہئے مگر یہ کہ ضرورت زمانہ سخت مجبور کردے تو ضروری ہوگا کہ دوسروں کے اقوال کو قبول کرلیں۔) یا علت و دیانت کی صورت بدل جائے تو اس لئے کہ اکثر منشأ اختلاف اختلافِ اسباب ہوا کرتا ہے، اور ممکن ہے کہ اب وہی صورت پیدا ہو گئی ہو جو دوسرے اختلاف پیدا کرنے والوں کے پیش نظر تھی،

بہر کیف بالکل آزاد ہونے سے ایک مجتہد کے دامن دولت میں پناہ لینا اولیٰ ہے اور حنفیوں کا باہمی اختلاف بھی انہی مذکورہ بالا اصول سے فیصل ہو جاتا ہے۔

اصول نمبر۶: اربابِ فتاویٰ اور مشائخ کے اقوال کی اتباع میں نہ اندھی تقلید کی جائے گی اور نہ ہی مراتب تقلید کو اتنی وسعت دی جائے گی کہ ہم تک برابر اترتے چلے آئیں (کہ ہم بھی مجتہد بن بیٹھیں) کیونکہ بہت سے فتاویٰ وقتی مصلحت اور ضرورت مقام پر مبنی ہوا کرتے ہیں، لہٰذا ہمیں فقہاء کے اقوال سے استدلال اور استنباط مسائل میں عجلت سے کام لینے کی بجائے پہلے ماخذ و دلیل پر غور کرنا چاہئے کیونکہ اگرچہ یہ اقوال اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن دواؤں کی خاصیت جاننے سے علاج نہیں ہو سکتا۔

اصول نمبر۷: مدار احکام تو ادلہ اربعہ پر ہے تاہم فقہاء ماہرین نے کچھ اصول و قواعد مقرر کئے ہیں جو حسنِ تدبیر کی طرح عمل کے طریق اور حکم کی غرض کے لئے معین و مددگار ثابت ہوتے ہیں، ایسے اصول و قواعد عبادات کی بنسبت معاملات میں زیادہ ہیں جیسے تیمیم وطہارت کے طریقے، قضاء وشہادت وغیرہ کے آداب، فقہ پر نظر رکھنے والے اس بحث کو کمال وسعت کے ساتھ جانتے ہیں، لیکن ایسے مسائل اولیت کے درجہ سے ترقی نہیں کر سکتے بلکہ جب اس سے کوئی عمدہ دوسرا طریقہ سامنے آجائے یا اس میں تغیر لاحق ہو جائے تو یہ ترک کرنے کے قابل ہو جایا کرتے ہیں، بس ایسی جگہوں پر ہم مقصود کی پیروی کریں گے گو بظاہر وسائل میں علیحدہ نظر آئیں، یہ ایک اہم قاعدہ ہے جس سے اس رسالہ میں بہت کام لیا گیا ہے۔

میں اس بارے میں معذرت خواہ ہوں کہ اس رسالہ میں مندرج اکثر مسائل کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان مسائل کو میں نے اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مسائل میں نے اخذ کئے ان میں سرسری نظر پر اکتفاء نہیں کیا کہ کتاب دیکھی اور عبارت نقل کر دی بلکہ ہر ہر مسئلہ کئی کئی صفحات کا خلاصہ اور لب لباب ہے، اگر ہر ہر مسئلہ کا حوالہ دیا جائے تو غالباً ایک باب کا مسئلہ دوسرے باب کے کسی ضمنی عبارت سے نکلے اور بسا اوقات ظاہری عبارت سے ملانے والے کو یقین ہو جائے کہ حوالہ غلط اور اسناد بے بنیاد ہے، اس طرح مسئلہ کے استناد و استنباط کی وجہ ہر مقام پر سمجھائی جائے تو ایک ایک مسئلہ ایک ورق بن جائے۔ اور مسئلہ کے حوالہ نہ دینے کی دوسری وجہ میری ترتیب خاص

ہے جیسے کسی ایک مقام اور ترتیب سے مطابقت دشوار ہے لہٰذا جابجا ترک حوالہ پر مجبوری ہوئی اور بقول مشہور:

جائے کہ اعتبار است مہر چہ در کار

بیع مبرور یعنی رزق حلال کی فضیلت

قال الله سبحانه وتعالى:" { يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ }[1]

ترجمہ: اے ایمان والو: اپنی پاک کمائی سے خرچ کرو۔ (تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کمائی پاک بھی ہوتی ہے اور ناپاک بھی ہوتی ہے، پاک کمائی دو طرح سے حاصل ہوتی ہے: بیع۔ اجارہ)

وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ١:[2]

ترجمہ: نکمی اور ناپاک چیز خرچ کرنے کا ارادہ بھی مت کرو حالانکہ تم خود اس کو قبول نہیں کروگے مگر یہ کہ چشم پوشی کرو۔

{ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا }[3]

ترجمہ: اے پیغمبر: تم کھاؤ پاک (حلال) مال اور نیک کام کرو۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ کسب حلال اعمال پر مقدم ہے اور صلاح و تقویٰ کا پیدا ہونا اکل حلال کا نتیجہ ہے (یعنی حلال کھانے سے آدمی کے اندر تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے۔) چنانچہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ بعض آدمی طویل سفر کرتے ہیں (یعنی طالب علم اور کار خیر میں) پراگندہ حال غبار آلودہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعاء کرتے ہیں، ان کی دعاء کیسے قبول ہو گی جبکہ ان کھانا حرام ہے اور لباس حرام کا ہے اور غذا حرام کا ہے۔ (مسلم شریف)[4]

---

[1] [البقرة : ٢٦٧]

[2] [البقرة : ٢٦٧]

[3] [المؤمنون : ٥١]

[4] كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، رقم الحديث: ١٠١٥

اورارشادفرمایا: "لا يدخل الجنة لحم نبت من السحت وكل لحم نبت من السحت كانت النار أولى به"[1]

ترجمہ: وہ گوشت جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جو حرام سے پرورش پایا ہے اور وہ گوشت جو حرام سے پرورش پایاہو، آگ ہی اس کے لئے مناسب ہے۔(مشکوۃ شریف)[2]

اور ارشاد فرمایا: حلال روزی کا تلاش کرنا فرائض کے بعد فرض ہے[3]، اور ارشاد فرمایا: جو شخص اپنی اولاد یا والدین یا اپنے نفس کے لئے (حلال) روزی کماتاہے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے۔(ترغیب[4])

اورارشادفرمایاکہ جو شخص بیواؤں اور مسکینوں کے لئے سعی کرتاہے اس کا اجر اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتاہے اور رات کو (نوافل میں) قیام کرتاہے اور دن کو روزہ رکھتاہے۔(ترمذی شریف)[5]

اور ارشاد فرمایاکہ جس نے حلال روزی کماتے ہوئے یا دست کاری کی مشقت میں شام کی، وہ مغفور ہو گیا (یعنی اللہ تعالیٰ اس کی خطا، قصور اور لغزشوں کو معاف فرمادے گا۔)(کنزالعمال)۔[6]

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایاکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوست رکھتاہے جو مؤمن ہو اور (حلال روزی) کماتاہو۔[7] اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمایا: " يا سعد أطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة"[8]

---

[1] المعجم الصغير للطبراني ، باب العين، معجم عبد الله، رقم الحديث:٦٢٥،ج١ص٣٧٤.

[2] مشكاة المصابيح، كتاب البيوع، باب الكسب وطلب الحلال، رقم الحديث: ٢٧٧٢

[3] الترغيب والترهيب للمنذري ت عمارة ، كتاب البيوع، الترغيب في طلب الحلال والأكل منه والترهيب من اكتساب الحرام وأكله ولبسه ونحو ذلك،ج٢ ص ٥٤٥

[4] الترغيب والترهيب، كتاب البيوع ،الترغيب في الاكتساب بالبيع وغيره،ج٢ص٥٢٤.

[5] سنن الترمذي،ابواب البر والصلة، باب ما جاء في السعي على الأرملة واليتيم، رقم الحديث: ١٩٦٩۔ولفظه:
عن صفوان بن سليم، يرفعه إلى النبي صلى الله عليه وسلم قال: الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله أو كالّذي يصوم النهار ويقوم الليل.

[6] كنز العمال في سنن الاقوال والافعال، كتاب البيوع، الباب الاول في الكسب، رقم الحديث: ٩٢١٥.

[7] روى الامام المنذري في الترغيب والترهيب بلفظ: "عن ابن عمر رضي الله عنهما عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: إن الله يحبُّ المؤمن المحترف" (٢كتاب البيوع، الترغيب في الاكتساب بالبيع،ج٢ص٥٢٤

[8] الترغيب والترهيب، كتاب البيوع، الترغيب في طلب الحلال والأكل منه والترهيب من اكتساب الحرام وأكله ولبسه ونحو ذلك،ج٢ ص٥٤٥)

اے سعد: حلال کھانے کی عادت بناؤ مستجاب الدعوات بن جاؤگے۔(ترغیب)(یعنی رزق حلال کی یہ برکت ہوگی کہ تم جو دعاء مانگوگے وہ قبول ہوگی اور اکل حرام کی نحوستوں میں سے ایک نحوست یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دعاء قبول نہیں ہوتی۔)

مال حلال کے مراتب اور درجات

اکلِ حلال کے بھی مختلف مرتبے اور درجے ہیں جو ایک دوسرے پر فائق ہیں۔

(پہلا درجہ) ہاتھ کی کمائی: جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

ما أكل أحد طعاما قط خيرا من أن يأكل من عمل يديه(بخاري)[1]

ترجمہ: کوئی کھانا ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں ہے (یعنی ہاتھ سے محنت ومشقت کرکے جو کمائی حاصل ہوگی، وہ سب سے زیادہ پاکیزہ کھانا ہے۔)

یہی وجہ ہے کہ ہجرت سے قبل خود جناب نبی کریم ﷺ بکریاں چرایاں کرتے تھے جیساکہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے اور اکثر انبیاء کرام علیہم السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام زرہ (جنگی لباس) بناتے تھے اور حضرت زکریا علیہ السلام نجاری (بڑھیا) کا کام کرتے تھے[2]۔

(دوسرا درجہ) تجارت: دوسرا مرتبہ تجارت کا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"التاجر الصدوق الأمين مع النبيين، والصديقين، والشهداء[3]

ترجمہ؛ سچے امانت دار تاجر کا حشر قیامت کے روز انبیاء کرام، اولیاء اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔(ترمذی)

اسی طرح ارشاد فرمایا کہ: التاجر فاجر إلا من أخذ الحق وأعطاه.[4]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب كسب الرجل وعمله بيده، رقم الحديث: ٢٠٧٢

2 تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: امام محمد رحمہ اللہ کی كتاب الكسب، ص ٣٦،٣٥

[3] رواه الترمذي بلفظ" التاجر الصدوق الأمين مع النبيين، والصديقين، والشهداء "ابواب البيوع، باب ما جاء في التجار وتسمية النبي صلى الله عليه وسلم إياهم، رقم الحديث:١٢٠٩. واما لفظ المؤلف فرواه الامام الدار قطني في كتاب البيوع من سننه برقم: ٢٨١٣.

[4] رواه صاحبُ كنز العمال موقوفا على سيدنا علي كرم الله وجهه، نعم رواه في مقام اخر عن ابي ذر انه قال كنا نتحدث، فليتامل.

ترجمہ: ہر تاجر گناہگار ہے مگر وہ تاجر (گناہ گار نہیں ہے) جس نے اپنا بھی حق لیا اور دوسرے کا بھی حق دیا (کنزالعمال)[1] مطلب یہ ہے کہ جس نے تجارت میں سچائی اور امانت داری کو اختیار کیا، اس کی کمائی حلال ہے پاکیزہ ہے، جس نے جھوٹ بولا، جھوٹی قسمیں کھا کر دھوکہ فریب سے کام لیتے ہوئے تجارت کی، اس کی کمائی مشکوک یا حرام ہے۔

اور ارشاد فرمایا: بدترین کمانے والا وہ شخص ہے جو مانگ کر کھائے اگرچہ جائز طریقے سے ہی دست دراز کیا ہو۔ اور ارشاد فرمایا: "فمن أخذه بطيب نفس بورك له فيه، ومن أخذه بإشراف نفس لم يبارك له فيه، وكان كالذي يأكل ولا يشبع"

ترجمہ: جس نے اس مال کو خوش دلی کے ساتھ حاصل کیا اسے برکت دی گئی اور جس نے مال کو ذلت نفس کے ساتھ حاصل کیا اسے برکت نہیں ملتی، وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھانا کھائے لیکن پیٹ نہ بھرے۔ (رواہ البخاری)[2]

یعنی مال ہوتے ہوئے بھی مزید کے حرص کی وجہ سے پریشان رہے گا اس کو قناعت حاصل نہیں ہو گی۔

اور ارشاد فرمایا: "اليد العليا خير من اليد السفلى"[۳]

ترجمہ: "دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے" یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے حسن معاملات کو عبادت پر مقدم رکھا ہے، حضرت امام محمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ تصوف کے موضوع پر کچھ تصنیف نہیں فرماتے؟ تو فرمایا: "**حسبك كتابُ البيع**" یعنی خرید و فروخت کے شرعی احکام جان لینا تمہیں کمال زہد و ورع و تقویٰ کے لئے کافی ہے۔

مبارک تجارت کی شرائط

مگر ایسی پاکیزہ و مبارک تجارت و صناعت کے لئے چند امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ صحت بیع کی جملہ شرائط۔ جو آئندہ مذکور ہوں گی۔ ان کا لحاظ رکھا جائے۔

---

[۱] رواه المحدث المتقي في كنز العمال عن سيدنا علي رضي الله عنه موقوفا، كتاب البيوع، باب في الكسب، محظورات متفرقة، رقم الحديث: ٩٨٩٧.

[۲] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: هذا المال خضرة حلوة، رقم الحديث: ٦٤٤١

[۳] الحوالة السابقة.

۲۔ مکروہات بیع سے بھی بچے۔

۳۔ تجارت کا سرمایہ حلال مال سے ہو۔

۴۔ایسی چیز کی تجارت نہ کرے نہ کارخانوں میں تیار کرے جن کے طلب گار (خریدار) اکثر فساق وفجار یا کفار یا امراء متکبر یا ظالم حکام ہی ہوں کیونکہ ایسے لوگوں کا قرب اللہ تعالیٰ سے دوری کا سبب بنتا ہے اور ان کا مال اکثر باعث وبال ہے (یعنی اکثر حرام ہوتا ہے یا مشکوک)۔

۵: اور ایسی چیزیں بھی نہ ہوں جن کی بیع وشراء فی نفسہ ممنوع ہے اگرچہ ضرورتاً اور تبعاً جائز ہے، جیسے افیون، زہر اور حقہ میں استعمال ہونے والا تمباکو، اور وہ تصویریں جو کسی کے ضمن میں بکتی ہے، ریشمی زری تار والے کپڑے، چاندی سونے کے زیور جو عام طور پر مردوں کے استعمال میں آتے ہوں جیسے رومال چکن، عمامہ، چاندی سونے کی گھڑی، سونے چاندی کے بٹن وغیرہ۔

مذاہبِ باطلہ کی کتب فروشی سے اجتناب کرنا

مذاہبِ باطلہ کی وہ کتابیں جن میں احکام ہیں، یا ان کے عقائد ہیں، یا لچر بوچ فاسقانہ قصے کہانیاں یا شریعت کے خلاف امور درج ہوں، ان کی تجارت سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ ایسی چیزوں کی تجارت سے من وجہ گناہ کے کام میں ان کی تائید کرنا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے گناہ کے کام میں تعاون کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: { وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ } [المائدة : ۲]

ترجمہ: یعنی گناہ کے کام میں ایک دوسرے کی مدد مت کیا کرو۔ [1]

شرط ۶: ایسے پیشے اور تجارتیں بھی اختیار نہ کرے جن میں سخت مشغولی اور بہت زیادہ انہماک کی ضرورت ہو کیونکہ جو شخص ایسی تجارت یا پیشہ اختیار کرے گا وہ نیکی کے کام۔ جمعہ وجماعت میں حاضر ہونے سے اسی طرح وعظ ونصیحت کی مجلس میں حاضر ہونے۔ سے محروم رہے گا جو بہت بڑی محرومی ہے۔

مکن عمر ضائع بتحصیل مال

---

[1] "تالیفات رشیدیہ" میں ہے: "کتب غیر مذہب اور مبتدعین وغیرہ کی تجارت وطبع واشاعت کرنا کہ اس میں ابطالِ مذہب حق اور تائید مذہب باطلہ ہوتی ہے، منع ونا جائز ہے یا نہیں؟ جواب: ایسی کتب کی تجارت حرام ہے کہ وہ خود معصیت کی اشاعت اور اسلام کی توہین ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔" (ص ۴۰۲)

کہ ہم نرخ گوہر نباشد سفال

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ } [النور : ۳۷]

یعنی مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں وہ مردانِ خدا ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے بے خبر نہیں کرتے۔

شرط نمبر۷: ایسا مال بھی نہ ہو جو عام طور پر ناقص اور خراب ہوا کرتا ہے دھوکہ فریب اور عیب پوشی کے بغیر بکنا مشکل ہو، کیونکہ انسان ایسی صورت میں نقصان کے خوف اور نفس کے تقاضے سے نیت بدل ہی دیتا ہے۔

شرط نمبر۸: خرید وفروخت میں فریق مقابل کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ نہ کرے، مثلاً یہ کہے کہ یہ چیز فلان قوم یا فلان موسم یا فلان شہر میں بہت قدر سے بکتی ہے، یا اس چیز کی یہ خوبی ہے یا اس کے خریدار بہت ہیں، کیونکہ اگر یہ بیانات صحیح نہ ہوں تو یہ کذب (جھوٹ) ہے اور کذب حرام ہے۔ ارشاد فرمایا: " اليمين الفاجرة منفقة للسلعة وممحقة للكسب[1] " یعنی جھوٹی قسم مال خرچ کر دیتی ہے (یعنی اس سے مال بک جاتا ہے) اور کمائی مٹا دیتی ہے (یعنی کمائی میں برکت نہیں پیدا کرتی)، اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "المنفق سلعته بالحلف الكاذب[2] " یعنی جھوٹی قسمیں کھا کر مال بیچنے والے پر نہ نظر رحمت ہوگی نہ مغفرت۔ وصف بیان کرنے کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ خالص سچ ہو، تو یہ جائز ہے۔

۲۔ کسی قدر مبالغہ ہو، یہ مکروہ ہے۔

۳۔ خالص جھوٹ، یہ دھوکہ ہے اور وعید میں داخل ہے۔

شرط نمبر۹: ناپ تول اور گنتی میں بہت احتیاط سے کام لینا ضروری ہے، قوم شعیب ﷺ پر ناپ تول میں کمی کرنے کی وجہ سے عذاب آیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: { وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۹ } [الرحمن : ۹]

ترجمہ: ترازو انصاف سے قائم کرو، نہ دیتے وقت کمی کرو نہ ہی لیتے وقت زیادہ لو، (یعنی کسی چیز وزن کر کے

---

[1] رواه الامام احمد في مسند ابي هريرة من مسنده برقم : ۷۲۹۳ بلفظ" اليمين الكاذبة منفقة للسلعة، ممحقة للكسب".

[2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار، والمن بالعطية، وتنفيق السلعة بالحلف، رقم الحديث: ۱۷۱

دیناہو تو پوری چیز دو،اور لیناہو تو (دھوکہ سے) زیادہ نہ لے لو۔)

شرط نمبر ۱۰: قیمت بتانے میں بھی جھوٹ اور مبالغہ نہ ہو یعنی جتنے میں دینے کاارادہ ہے وہی کہہ دے، یہ نہ ہو کہ بیچنا ہے ایک روپے میں اور قیمت بتائے آٹھ روپے۔ دوسرے کے اصرار یا کسی اور وجہ سے قیمت بدل دینا جائز ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ خریدا اور قیمت میں ہر بار اضافہ فرماتے یہاں تک کہ جابر رضی اللہ عنہ نے قبول فرمایا۔ [1]

شرط نمبر ۱۱: اگر خریدار بے وقوف یاناواقف ہو یا دوستی وغیرہ کی وجہ سے بائع پر اعتماد کرتا ہے یا ایسی صورت پیدا ہو جائے جس سے معلوم ہو جائے کہ بازار کی قیمت پر یا نفع کے بغیر یا فلان شخص کے قیمت پر معاملات طے کئے جاتے ہیں، اب بعد میں کچھ بھی تفاوت نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا دیانت اور مروت کے خلاف ہے۔ [2]

شرط نمبر ۱۲: کسی سے وعدہ کرنا ہو تو سوچ سمجھ کر کرے کہ وفاء کر سکتا ہوں یا نہیں؟ تاکہ کسی کو بے فائدہ تکلیف نہ پہنچے، اگر اتفاق سے کوئی ایسا وعدہ کر لیا جس کا ایفاء مشکل ہے تو جواں مردی اور ہمت سے کام لیتے ہوئے وعدہ پورا کرنا چاہئے، حضور اقدس ﷺ قرض خواہ کو کچھ زائد بھی عطاء فرماتے۔ [3]

شرط نمبر ۱۳: معاملات کو خوب تفصیل کے ساتھ طے کیا کرے تاکہ بعد میں جھگڑا پیش نہ آئے، خصوصاً قرض، دین اور وعدوں میں اس کا خوب خیال رکھیں۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "{ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ}" [البقرة : ٢٨٢]

ترجمہ: "جب تم دین کا معاملہ کرو تو لکھ لیا کرو" اور ارشاد نبوی ﷺ ہے "ماحقّ امرء مسلم يمرّ عليه ثلاث ليال الا وعنده وصية مكتوبة" [4] یعنی کسی مسلمان کی یہ شان نہیں ہے کہ اس پر تین راتیں گزر جائیں (اور) اس کے پاس لین دین کے معاملات کے بارے میں وصیت لکھی ہوئی نہ ہو، پس حساب

---

[1] روي البخاري هذه القصة في صحيحه، كتاب الشروط،باب إذا اشترط البائع ظهر الدابة إلى مكان مسمى جاز، رقم الحديث: ٢٧١٨

[2] روي الامام ابوداؤد في سننه عن سفيان بن اسيد الحضرمي انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول" كبرت خيانة أن تحدث أخاك حديثا هو لك به مصدق، وأنت له به كاذب". سنن ابي داؤد، كتاب الادب،باب في المعاريض، رقم الحديث: ٤٩٧١.

[3] موطأ مالك ت الأعظمي،كتاب البيوع، ما يجوز من السلف، رقم الحديث: ٢٥٠٦

[4] مسند أبي يعلى الموصلي، مسند عبد الله بن عمر،رقم الحديث: ٥٥٤٦،ج٩ص ٤٠٣.

وکتاب کو صاف رکھنا بھی لازمی امر ہے۔

شرط نمبر۱۴: بیع وشراء اور اجارات میں نمونے (سیمپل) اور وعدہ کے خلاف نہ کرے بلکہ اپنی سچائی اور دیانت داری سے اہل معاملہ کو راضی رکھے اور ہر معاملہ کو خندہ پیشانی کے ساتھ اختتام تک پہنچائے۔

شرط نمبر۱۵: اگر خریدار کو کوئی مجبوری پیش آئے اور وہ مال واپس کرنا چاہے یا کسی نقصان کی وجہ سے بیع ختم کرنا چاہے تو بائع (تاجر) کو معاملہ ختم کرنے میں عذر کرنا مناسب نہیں، اگر بیع ختم کرکے رقم واپس کردے گا تو بڑے اجر وثواب کا مستحق ہو گا۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: منْ أقال مسلما أقال الله عسرته[۱]: یعنی جس نے کسی مسلمان سے اقالہ کرلیا (یعنی فروخت کرنے کے بعد خریدار کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے مال واپس لے لیا) اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن بوجھ ہلکا کردے گا[2]۔

شرط نمبر۱۶: مزدور کی اجرت کام ختم ہوتے ہی ادا کردے کیونکہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "**أعطوا الأجيرَ أجرَه قبل أنْ يجفّ عرقه**" ترجمہ: مزدور کو اِس سے پہلے مزدوری دیدو کہ اس کا پسینہ خشک ہو (ابن ماجہ)[3] مطلب یہ ہے کہ مزدوری کی ادائیگی میں تاخیر نہ کرے تاکہ اس کو تنگی پیش نہ آئے۔

شرط نمبر۱۷: معاملات میں نرمی، عفو وسخاوت اختیار کرے، چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے "إن الله يحب سمح البيع، سمح الشراء، سمح القضاء[٤]"

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بیع وشراء اور فیصلہ کرنے میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا "من أنظر معسرا، أو وضع له، أظله الله يوم القيامة تحت ظلّ عرشه يوم لا ظلّ إلا ظلّه[٥]"

ترجمہ: جس نے کسی تنگدست کو (قرض کی ادائیگی میں) مہلت دی یا حق میں سے کچھ تخفیف کردی (یعنی

---

[۱] اصل لفظ "عثرتہ" ثاء معجمہ کے ساتھ ہے، سین مہملہ بظاہر کاتب کی غلطی ہے۔

[۲] سنن ابي داؤد، باب في فضل الإقالة، رقم الحديث: ٣٤٦٠

[۳] سنن بن ماجه، باب أجر الأجراء، رقم الحديث: ٢٤٤٣.

[٤] سنن الترمذي، ابواب البيوع، باب ما جاء في استقراض البعير أو الشيء من الحيوان أو السن، رقم الحديث: ١٣١٩.

[٥] المصدر السابق، باب ما جاء في إنظار المعسر والرفق به، رقم الحديث: ١٣٠٦.

معاف کردیا) اللہ تعالیٰ اس کو عرش کے سایے میں جگہ دے گا جس دن عرش کے سایے ے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔"

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا اس کے اعمال نامہ میں کوئی نیکی نہ ملی، مگر یہ کہ امیر تھا اور اپنے خادموں کو حکم دیتا تھا کہ تنگ دستوں سے معاملات میں در گزر کردیا کریں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ عفو و درگزری کے ہم اس سے زیادہ مستحق ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل فرمادیا[1]۔

اور ارشاد فرمایا "مطلُ الغني ظلم، وإذا أتبع أحدكم على مليء فليتّبع" [2]

ترجمہ: امیر اگر کسی کے حق دینے میں ٹال مٹول کرے تو یہ ظلم ہے اس لئے صاحب سے حق کا مطالبہ کرنے میں اس کا پیچھا کرو۔"

مطلب یہ ہے کہ مفلس کا حیلہ حوالہ مجبوری قابل رحم ہے مگر امیر پر تقاضا کرنے میں کوئی حرج نہیں، اسی بناء پر جناب نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ تم کسی کے ہاتھ پھل فروخت کرو اور وہ پھل زمینی یا آسمانی آفت سے ہلاک ہو جائے تو اس کی قیمت بقدر نقصان، اگر تمام پھل خراب ہو جائے تو کل کے کل قیمت واپس کردو۔ (صحیح مسلم) [3]

شرط نمبر ۱۸: ہمیشہ خیر کی نیت رکھے، تجارت میں یہ قصد و ارادہ نہ ہو کہ سارا نفع مجھے ہی ملے دوسروں کو کچھ نہ ملے یا دوسروں کو نقصان پہنچے، جو اپنے لئے ناپسند ہو وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی ناپسند کرے۔

شرط نمبر ۱۹: معاملات میں خوشامد اور تذلل سے پرہیز کرے اللہ تعالیٰ ہی رازق ہے۔

شرط نمبر ۲۰: کچھ صدقات بھی کیا کرے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ " ان الشیطان والاثم یحضران البیع فشوبوہ بالصدقة[1]" شیطان اور گناہ دونوں خرید و فروخت کے وقت موجود ہوتے ہیں (یعنی کچھ نہ کچھ زیادتیاں ہو ہی جاتی ہیں، پس چاہئے کہ خیرات کرکے اسے مٹادیا کرو)۔

---

[1] صحيح مسلم، كتاب المساقاة،باب فضل إنظار المعسر.رقم الحديث: ١٥٦٠.

[2] مسند احمد، (باب)مسند ابي هريرة، رقم الحديث: ٨٩٣٨

[3] صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب وضع الجوائح، رقم الحديث:١٥٥٤.

شرط نمبر ۲۱: یہ بات بہت ضروری ہے کہ جس قسم کا کام کرنا ہو یا کوئی تجارت کرنی ہو، اس کے شرعی مسائل کو سیکھ لے تاکہ حلال و حرام پہچان سکے جائز و ناجائز معلوم ہو سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں سرکلر جاری فرمایا تھا کہ " لايبيع فی سوقنا الا من تفقّه فی الدّین"[2] یعنی جو شخص دین کے احکام نہ سمجھتا ہو وہ بازار میں خرید و فروخت نہ کرے اس لئے کہ (یا) خود حرام کھائے گا (یا) دوسروں کو کھلائے گا۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: إن أطيب الكسب كسب التجار الذين إذا حدثوا لم يكذبوا وإذا ائتمنوا لم يخونوا وإذا وعدوا لم يخلفوا وإذا اشتروا لم يذموا وإذا باعوا لم يمدحوا وإذا كان عليهم لم يمطلوا وإذا كان لهم لم يعسروا.

ترجمہ: سب سے زیادہ پاک کمائی ان تاجروں کی ہے جو بات کرتے جھوٹ نہیں بولتے اور جب ان کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت نہیں کرتے جب وعدہ کرے تو خلاف نہیں کرتے، اور خریدتے وقت مال کی بے جا مذمت نہیں کرتے کہ بائع گھبرا کر سستا دے ڈالے، اور سامان فروخت کرتے وقت زائد تعریف نہیں کرتے کہ گاہک خرید ہی لے، اور جب کسی کو دینا ہو تو ادائیگی میں سستی نہ کریں، جب ان کا حق کسی پر ہو تو اس قدر سختی نہ کریں جو طاقت سے زیادہ ہو "(ترغیب)[3] بیع کے احکام میں یہ جامع ترین حدیث ہے۔

حلال و حرام پاک و ناپاک اشیاء کے بیان میں

ہر وہ چیز نجس ہے جس کی ناپاکی پر شرعی دلیل قائم ہو، جیسے خون، شراب، خنزیر، پیشاب، پاخانہ، مردار۔ ان اشیاء کو خریدنے سے ملک ثابت نہیں ہوتی اور ان کو فروخت کر کے نفع کمانا بھی جائز نہیں[4]، مگر یہ کہ ماہیت بدل جائے جیسے شراب سرکہ بن جائے، مردار نمک بن جائے، سرگین راکھ بن جائے۔[1]

---

[1] رواه الامام الترمذي في سننه بلفظ"يا معشر التجار، إن الشيطان، والإثم يحضران البيع، فشوبوا بيعكم بالصدقة" (ابواب البيوع،باب ما جاء في التجار وتسمية النبي صلى الله عليه وسلم إياهم، رقم الحديث:١٢٠٨.

[2] الترغيب والترهيب لقوام السنة، باب في فضل التاجر الأمين والترغيب في الصدق في المعاملة ،ج١ص ٤٤٨.

[3] الترغيب والترهيب للمنذري، الترغيب في الاكتساب بالبيع وغيره، رقم الحديث: ٢٧٤٧،ج٢ص ٣٦٦.

[4] مندرجہ بالا اشیاء کا یہی حکم ہے، البتہ یاد رہے کہ فقہاء فقہاءِ حنفیہ کے نزدیک کسی چیز کی بیع کے جائز یا ناجائز ہونے کا دارومدار اس کے جائز استعمال موجود ہونے اور نہ ہونے پر ہے، لہٰذا جس چیز کا جائز استعمال موجود ہو اس کی خرید و فروخت جائز ہے چنانچہ فقہاءِ کرامؒ نے اسی

ہاں ناپاک چیزیں اگر کسی پاک چیز کے تابع ہو جائے جیسے خون اور پیشاب وغیرہ جو کسی کپڑے وغیرہ میں لگا ہوا ہو تو یہ بک سکتا ہے، استعمال بھی جائز ہے البتہ اس کو زائل کرنا واجب ہے۔

مسئلہ : تیل میں کوئی ناپاک چیز مل جائے اور تیل کی مقدار ناپاکی سے زیادہ ہو تو اس کا بیچنا جائز ہے، مسجد کے علاوہ دوسری جگہ چراغ میں جلانا جائز ہے (عالمگیری)۔[2]

مسئلہ : جس نشہ والی چیز میں بذاتہ سیلان ہو جیسے شراب یا تاڑی، وہ ناپاک بھی ہے اور حرام بھی، اور اگر ذاتی سیلان نہ ہو تو وہ ناپاک نہیں ہے اگرچہ اس میں تصرف کر کے سیال بنالیں جیسے بھنگ اور افیون، یہ حرام ہے ناپاک نہیں ہے (حرمت کے ساتھ سیلان کو نجاست میں دخل ہے جیسا کہ بہتا ہوا خون ناپاک قرار پایا)۔[3]

مسئلہ : نشہ آور بہنے والی چیز کو دوسری کسی چیز میں ملا کر غیر سیّال بنالی جائے جیسے تاڑی جو بسکٹ یا نان پاؤ

کو مد نظر رکھ کر بعض ناپاک اشیاء کی خرید وفروخت کو بھی جائز قرار دیا (بشرط ان لایکون نجس العین ولم یردنص خاص علی تحریم بیعه) مثلاً بیع السرقین، بیع العذرة المخلوطة بالتراب وغیرہ، اور جس چیز کا جائز استعمال بالکل موجود نہ ہو اس کی بیع وشراء بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے مختلف درندوں کی خرید وفروخت ممنوع ہونے کے متعلق شوافع کی دلیل یہ نقل فرمائی کہ یہ نجس چیزیں ہیں اس لئے خرید وفروخت جائز نہیں، پھر حنفیہ کی طرف سے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ولأنه منتفع به حراسة واصطيادا فكان ما لا يجوز بيعه، بخلاف الهوام المؤذية؛ لأنه لا ينتفع بها، والحديث محمول على الابتداء قلعا لهم عن الاقتناء ولا نسلم نجاسة العين، ولو سلم فيحرم التناول دون البيع."كتاب البيوع، مسائل منثورة ،ج٣ص ٧٧.
وفي فتح القدير تحته:قال (ولو سلم فنجاسة عينه توجب حرمة أكله لا منع بيعه) بل منع البيع بمنع الانتفاع شرعا، ولهذا أجزنا بيع السرقين والبعر مع نجاسة عينهما لإطلاق الانتفاع بهما عندنا، بخلاف العذرة لم يطلق الانتفاع بها فمنع بيعها.(ج٧ص ١٢١).

[1] (وكذا يطهر حمار وقع في المملحة فصار ملحا) لانقلاب العين، وهو من المطهرات. مجمع الأنهر ،باب الأنجاس،ج١ص٦١. وكذا في البحر الرّائق، باب الأنجاس، ج١ص٢٣٩.

[2] والحلال إذا اختلط بالحرام كالخمر والفأرة تقع في السمن والعجين فلا بأس ببيعه إذا بين ما لم يغلب عليه أو استويا كذا في محيط السرخسي ولا بأس بالانتفاع به من غير الأكل.. وما كان الغالب عليه الحرام ولم يجز بيعه ولا هبته وكذلك الزيت إذا وقع فيه ودك الميت فإن كان الزيت غالبا جاز بيعه وإن كان الودك غالبا لم يجز. الفتاوى الهندية، الفصل الخامس في بيع المحرم الصيد وفي بيع المحرمات،ج٣ص ١١٦.

[3] والحاصل أنه لا يلزم من حرمة الكثير المسكر حرمة قليله ولا نجاسته مطلقا إلا في المائعات لمعنى خاص بها، أما الجامدات فلا يحرم منها الكثير المسكر، ولا يلزم من حرمته نجاسته كالسم القاتل فإنه حرام مع أنه طاهر. الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب الاشربة،ج٦ص ٤٥٥.

میں خمیر کی جاتی ہے ناپاک ہی رہے گی اور جس میں ملائی گئی اسے بھی ناپاک کر دے گی، پکانا نہ دلیلِ طہارت ہے نہ مفیدِ حلت (یعنی حرام چیز پکانے سے حلال نہ ہو گی اسی طرح ناپاک چیز پکانے سے پاک نہیں ہو گی)۔[1]

مسئلہ : صرف خشک گوبر (سرگین) اگر مٹی ملی ہوئی ہو تو تبعاً، ورنہ ضرورت (اور) اسلاف کے تعامل کی وجہ سے جائز ہے اور پانس (کھاد) بھی بحکم ضرورت بک سکتی ہے (جامع صغیر)۔[2]

اس پر خون وغیرہ کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ تعامل امر غیرِ معقول ہے جو قابل قیاس نہیں ہے لہٰذا خون کا بیچنا حرام ہے۔[3] پاک چیز جس کی نجاست پر کوئی دلیل شرعی قائم نہ ہو، یہ حلال بھی ہے حرام بھی۔[4]

---

[1] يمكن أنْ يُستأنس له بما في الدر:" أن لبن الإبل إذا اشتد لم يحل عند محمد خلافا لهما، والسكر منه حرام بلا خلاف۔وكذالبن الرماك: أي الفرسة إذا اشتد لم يحل، وصحح في الهداية حله. وفي الخزانة أنه يكره تحريما عند عامة المشايخ على قوله". (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الاشربة، ج٦ص٤٥٦.

البتہ اگر آپ پر رکھنے کی وجہ سے نجس چیز کی ماہیت تبدیل ہو جائے اور نجاست کے اثرات بالکل زائل ہو جائے تو اس کے بعد وہ پاک شمار ہو گا چنانچہ فقہاءِ کرام نے "مطہرات" میں سے آگ کو بھی ذکر کیا ہے۔

قال أبو حنيفة ومحمد: إذا احترقت النجاسة بالنار طهرت. وقال أبو يوسف: لا تطهر. وبه قال الشافعي. لنا أن المعنى الموجب لنجاسة الأشياء المستحيل ما فيها من الاستحالة، ولهذا قال النبي صلى الله عليه وسلم في الروثة، "إنها ركس"، ومتى احترقت زالت الاستحالة، فزالت النجاسة بزوال علتها. (التجريد للقدوري، كتاب الطهارة، ج٢ص ٧٦٣).

ولا تظن أن كل ما دخلته النار يطهر كما بلغني عن بعض الناس أنه توهم ذلك، بل المراد أن ما استحالت به النجاسة بالنار أو زال أثرها بها يطهر، ولذا قيد ذلك في المنية بقوله في مواضع. (رد المحتار، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، ج١ص ٣١٥).

[2] في الجامع الصغير: لا بأس ببيع السرقين ويكره بيع العذرة، وفي شرحه النافع الكبير تحته: قوله بيع السرقين لأنه منتفع به فيجوز بيعه كالثوب النجس لأن الناس يلقونه في الأراضي لاستكثار الريع وما كان منتفعا به كان مالا فيجوز بيعه بخلاف العذرة الخالصة لأن الناس لا ينتفعون بها ولا يحرزونها وإنما ينتفعون بالمخلوط بالتراب وذلك مال عندنا يجوز بيعه ونجاسة العين تمنع الأكل لكن لا تمنع الانتفاع (الجامع الصغير وشرحه النافع الكبير ،باب الكراهية في البيع،ص٤٨٠.

وكذا فى الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، ج٦ص٣٨٥.

[3] لو باع الخمر والخنزير والميتة والدم وجلد الميتة فإنه لا يجوز أصلا حتى لا يملك بالقبض (تحفة الفقهاء، كتاب البيوع، قبيل اقسام البيع، ج٢ص٣٤.

وكذا في الهداية شرح بداية المبتدي (كتاب البيوع،باب البيع الفاسد، ج٣ص٤٢.

[4] پاک وناپاک اور حلال وحرام دو مختلف چیزیں ہیں، کسی چیز پاک ہونے سے اس کا حلال ہونا لازم نہیں آتا، اسی طرح کسی چیز کے حرام ہونے کے ساتھ یہ کوئی لازم نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ ناپاک بھی ہو بلکہ دونوں اصطلاحات کا مفہوم الگ الگ ہے، پاک وہ چیز ہے جس کے نجاست پر کوئی شرعی دلیل قائم نہ ہو مثلاً مٹی، پتھر، درخت اور کھانے پینے کی چیزیں۔ اور حلال اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کھانا اور استعمال کرنا جائز ہو، لہٰذا مٹی اور پتھر وغیرہ پاک تو ہیں کیونکہ ناپاک ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں لیکن حلال نہیں ہیں کیونکہ "اضرار" یعنی مضر صحت ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

حرام کی چار قسمیں

(پہلی قسم) حرمت خاصہ: یعنی صرف بعض کے حق میں حرام ہو، جیسے صدقات واجبہ اغنیاء اور بنی ہاشم پر حرام ہیں یا چاندی سونے کا زیور، ریشمی لباس جو خاص مردوں کے لئے حرام ہے، باقی منافع ان کے لئے حلال ہے۔

(دوسری قسم) حرمت وصفی: بذاتہ حلال ہو مگر کسی وصف خبیث کی وجہ سے حرمت آگئی (جس وقت وہ وصف خبیث ختم ہو جائے حرمت بھی ختم ہو جائے گی) جیسے بھنگ افیون، بعلت فتور عقل لہو وطرب کے لئے پینا حرام ہے اور علاج کی ضرورت سے حلال ہے۔

مسئلہ: ایسی چیزوں کا استعمال جو موجب سکر ہوں، بیماری کی حالت میں بطور دواء جائز ہے بشرطیکہ اس کی عادت نہ بنالی جائے اور قصداً بھی نہ ہو، بلکہ صرف مجبوری کی حالت میں ہو، ورنہ ہر چیز نفع کے لئے حیلے سے دوا بن سکتی ہے [1]، اور زہر کی وہ مقدار جو مہلک ہو حرام ہے مگر ناپاک نہیں، اور جو مقدار مہلک نہ ہو اس کا استعمال جائز ہے [2]۔

حرمتِ اصلی: جیسے ہڈی اور حرام جانوروں کا گوشت جبکہ ذبح شرعی سے پاک ہو جائے، کھانے کے سوا

ثم الطهارة على قول محمد لا تستلزم جواز الأكل كالتراب ونحوه.البناية شرح الهداية،كتاب الطهارات،فصل في الأسآر وغيرها، ج١ص٤٩٠.

وفي تبيين الحقائق: لأن كثيرا من الطاهر لا يجوز شربه.(كتاب الطهارة، ج١ص٢٨.

[1] اختلف في التداوي بالمحرم وظاهر المذهب المنع كما في رضاع البحر، لكن نقل المصنف ثمة وهنا عن الحاوي: وقيل يرخص إذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوى.الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب الطهارة، باب المياه، ج١ص٢١٠.

وكذا في البحر الرائق.كتاب الطهارة، ج١ص ١٢٢.

[2] **مگر اس میں شرط یہ ہے کہ بلا فائدہ محض لہو ولعب کے لئے استعمال نہ کرے نیز ایسا استعمال ناقابل برداشت حد تک مضر صحت بھی نہ ہو۔** والحاصل أن استعمال الكثير المسكر منه حرام مطلقا كما يدل عليه كلام الغاية. وأما القليل، فإن كان للهو حرام، وإن سكر منه يقع طلاقه لأن مبدأ استعماله كان محظورا، وإن كان للتداوي وحصل منه إسكار فلا .حاشية ابن عابدين الدر المختار،كتاب الاشربة، ج٦ص٤٥٨.

أن التلهّي حرام وما يؤدي إلى الحرام فهو حرام أيضا. مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر،كتاب الاشربة،ج٢ص ٥٧٣.

دوسرے استعمال میں لانا جائز ہے۔[1]

حرمت عارضی(اوراس کی قسمیں): یہ وہ خبث ہے جو مخالفت شرعی سے قائم ہو اوراس کی دو قسمیں ہیں:

حرام مملوک: (یعنی لین دین کے جو قوانین شرعی ہیں، ان کی مخالفت سے حرمت آجاتی ہے) جیسے بیوع اور اجارات فاسدہ کے معاوضے، ان میں بخوشی قبضہ پائے جانے سے ملک حاصل ہو جاتی ہے مگر ہر ایک کے ذمہ واجب ہے کہ مبیع اور ثمن واپس کردے (ہدایہ)[2]

مسئلہ: ایسے مال جس چیز کے عوض لئے گئے تھے، اگر وہ چیز ہلاک ہوجائے یا قابل رد نہ رہے، یا مالک معلوم نہ ہو، یا اس کا نشان نہ ملے، یا اس تک پہنچنا دشوار ہو، یا وہ واپسی پر رضامند نہ ہو اور کوئی قاضی بھی نہیں جو اس کو مجبور کرے تو اس مال کو فروخت کرکے اصل قیمت لے لے اور جو نفع ملے، اس کو صدقہ کردے (ہدایہ)۔[1]

---

[1] گوشت کے پاک ہونے کے متعلق اختلاف ہے علامہ شلبی اور علامہ حصکفی رحمہما اللہ سمیت بہت سے فقہاء کرام کے نزدیک گوشت پاک نہیں ہوگا جبکہ صاحب ہدایہ، اس کے اکثر شارحین اور علامہ کاسانی رحمہم اللہ کے نزدیک چمڑہ کے ساتھ ساتھ گوشت بھی پاک ہو جائے گا۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے دونوں اقوال کو مصحح قرار دیا اور خود اپنی تحقیق یہ بیان فرمائی کہ اگر حلال جانور ہو تو ذبح کرنے سے اس کا گوشت پاک ہو جائے گا ورنہ نہیں۔

(لا) يطهر (لحمه على) قول (الأكثر إن) كان (غير مأكول) هذا أصح ما يفتى به وإن قال في الفيض الفتوى على طهارته. الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،كتاب الطّهارة، ج١ص ٢٠٥.

ثم ما يطهر جلده بالدباغ يطهر بالذكاة لأنها تعمل عمل الدباغ في إزالة الرطوبات النجسة وكذلك يطهر لحمه هو الصحيح وإن لم يكن مأكولا.الهداية في شرح بداية المبتدي، كتاب الطهارات،باب الماء الذي يجوز به الوضوء وما لا يجوز،ج١ص٢٣.

واختلفوا في طهارة اللحم والشحم، ذكر الكرخي فقال: كل حيوان يطهر بالدباغ؛ يطهر جلده بالذكاة، فهذا يدل على أنه يطهر لحمه وشحمه وسائر أجزائه؛ لأن الحيوان اسم لجملة الأجزاء. وقال بعض مشايخنا ومشايخ بلخ: إن كل حيوان يطهر جلده بالدباغ يطهر جلده بالذكاة، فأما اللحم والشحم ونحوهما فلا يطهر، والأول أقرب إلى الصواب.بدائع الصنائع.كتاب الطهارة، فصل بيان ما يقع به التطهير، ج١ص٨٦.

والحاصل أن ذكاة الحيوان مطهرة لجلده ولحمه إن كان الحيوان مأكولا، وإلا فإن كان نجس العين فلا تطهر شيئا منه، وإلا فإن كان جلده لا يحتمل الدباغة فكذلك؛ لأن جلده حينئذ يكون بمنزلة اللحم، وإلا فيطهر جلده فقط، والآدمي كالخنزير فيما ذكر تعظيما له.حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب الطهارة،باب المياه،ج١ص٢٠٥.

[2] إنما لا يثبت الملك قبل القبض كي لا يؤدي إلى تقرير الفساد المجاور إذ هو واجب الرفع بالاسترداد.الهداية في شرح بداية المبتدي ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه،ج٣ص٥١.

ان فعله معصية فعليه التوبة منها بفسخه .البحر الرائق،باب البيع الفاسد، احكام البيع الفاسد،ج٦ص٩٩.

مسئلہ : اس قسم کی حرمت متعدی نہیں ہوتی (در مختار) پس ایسے مال کو مفت یا قیمت دے کر لینا جائز ہے مگر ایک گونہ کراہت کے ساتھ (شامی)[2]

مسئلہ : وارث، بیوی، بچوں کے لئے جائز ہے کہ ایسے مال سے اپنا حق وصول کریں۔[3] (الاشباہ)

حرام غیر مملوک

یہ وہ مال ہے جس پر ناجائز قبضہ کر لیا جائے، اس پر ملک ثابت نہیں ہوتی، اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ حق اللہ: جیسے زکوۃ، نذر، عشر اور مسجد وغیرہ کا مال۔

۲۔ حق العبد: جیسے چوری، غصب، رشوت، سود، قمار (جوا) زنا کی اجرت وغیرہ۔

۳۔ حقوق مشترکہ: (یعنی وہ مال جس سے بہت سے لوگوں کا حق متعلق ہو) جیسے اوقاف، مدارس اور بیت المال کے اموال، بیوع باطلہ اور اجارہ باطلہ کا عوض، یہ قسم دوسرے حراموں اور نجسوں سے زیادہ خبیث تر ہے۔[4]

---

[1] ومن اشترى جارية بيعا فاسدا وتقابضا فباعها وربح فيها تصدق بالربح ويطيب للبائع ما ربح في الثمن. الهداية،باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه ،ج٣ص ٥٣.

وكذا في الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص ٩٧.

وكذا في البحر الرائق، باب البيع الفاسد، احكام البيع الفاسد،ج٦ ص١٠٦.

[2] بخلاف البيع الفاسد فإن رده واجب على البائع قبل البيع لا على المشتري لعدم بقاء المعنى الموجب للرد كما قدمنا فلم يتمكن الخبث فيه فلذا طاب للمشتري، وهذا لا ينافي أن نفس الشراء مكروه لحصوله للبائع بسبب حرام؛ ولأن فيه إعراضا عن الفسخ الواجب. الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،باب البيع الفاسد، قبيل مطلب الحرمة تتعدد،ج٥ص ٩٨.

وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية .كتاب البيوع،ج١ص٢٤٨.

[3] إمرأة زوجها في أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلك الطعام غصبا فهي في سعة من أكله وكذا لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناول ذلك الطعام والثياب ويكون الإثم على الزوج.غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر،كتاب الحظر والإباحة،ج٣ص ٢٣٤.

وكذافي فتاوى قاضيخان(كتاب الحظر و الإباحة و ما يكره أكله و ما لا يكره ج٣ص ٢٤٣.

[4] فالخبث لعدم الملك يعمل في النوعين كالمودع والغاصب إذا تصرف في العرض أو النقد وربح يتصدق بالربح عند أبي حنيفة ومحمد لتعلق العقد بما لغيره ظاهرا فيما يتعين فيتمكن حقيقة الخبث وفيما لا يتعين يتمكن شبهة الخبث.الدرر شرح الغرر ، باب البيع الفاسد،٢ص ١٧٦.

وكذا في تبيين الحقائق، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،،ج٤ص ٦٦.

حرام مال میں گناہ کے اسباب

حرام غیر مملوک سے کئی طرح کے گناہ لازم آتے ہیں:

۱۔مالک کی حق تلفی، جیسے سود اور چوری میں۔

۲۔ حرام پر قبضہ کرنے اور اس سے نفع کمانے کا مواخذہ۔

۳۔ اگر اس مال حرام کو کسی اور چیز کے عوض میں دیدیا تو ایسے ناجائز طریقہ سے براءت کا فائدہ حاصل کرنا۔(یعنی جب کسی سے مال خریدیں گے تو گلوخلاصی تب ہوگی کہ جب قیمت ادا کردیں گے تو یہ ناجائز روپے دے کر جان بچائی کہ قاضی کے یہاں روپیہ ادانہ کرنے کا مقدمہ دائر نہ ہو،اس طرح ناجائز طریقہ سے براءت حاصل کریں)

۴۔اگر یہ ناجائز مال کسی کو مفت دیدیا تو یہ احسان حصولِ ثواب کی ناجائز امید ہے۔[1]

۵۔اور لینے والا کوئی مسلمان ہے تو اسے بھی بلاء ومصیبت میں مبتلا کرنا ہے۔

۶۔اگر اسے معلوم نہیں تو دھوکہ دہی کا وبال ہے۔

۷۔اگر اس مال سے کوئی کام یا مال حاصل کیا تو ایسے بے جا تصرف اور نفع حاصل کرنے کا گناہ ہے۔

۸۔اور اگر کسی کارِ خیر میں لگایا جیسے مساجد یا مدارس یا فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا، تو ایسی ناپاک اور حرام چیز کا حق تعالیٰ شانہ کے دربار میں پیش کرنے کی گستاخی،اس پر وعید اوپر گذر چکی ہے اس لئے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔[2]

---

[1] ویکفر بتصدقه علی فقیر بشيء حرام یرجو الثواب وبدعاء الفقیر له عالما به وبتأمین المعطی. البحر الرائق، کتاب السیر،باب أحکام المرتدین،ج٥ص١٣٢.

وکذا في شرح التنویر ورد المحتار.کتاب الزکاة، باب زکاة الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام،ج٢ص٢٩٢.

[2] گناہ نمبر ۴ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

حرام غیر مملوک کا حکم

۱۔ان مالوں کی حرمت متعدی ہے، نہ ہاتھ کے بدلنے سے پاک ہو گی نہ ہی میراث سے حلال ہو گی، پس ایسے مال کو نہ خود کھائے نہ ہی کسی کو کھلائے۔[1]

۲۔نہ ان مالوں کا مفت لینا جائز ہے نہ کسی چیز کے عوض میں وصول کرنا مباح ہے، نہ میراث پر قبضہ و تصرف حلال ہے۔

۳۔ان مالوں پر زکوۃ بھی واجب نہیں اور صدقہ کرنا بھی جائز نہیں اور صدقہ پر ثواب بھی ثابت نہیں۔[2]

۴۔ جہاں تک ہو سکے، جن کے مال ہیں، انہی کو واپس کردئے جائیں یا منت سماجت کر کے یا کوئی معاوضہ دے کر ان سے معاف کرالئے جائیں، اور جب ایسا ممکن نہ ہو اور اس کے مالک نہ مل سکے یا پہچانے نہ جائیں تو حق دار کے حق کو ادا کرنے کی نیت سے مستحق فقراء کو دے دئے جائیں اور ہر گز ثواب اور نذر اللہ کی نیت نہ کی جائے ورنہ کمال گستاخی سے کفر کا خوف ہے[3]۔

---

[1] الحرمة تنتقل مع العلم إلا للوارث إلا إذا علم ربه. قلت: ومر في البيع الفاسد لكن في المجتبى مات وكسبه حرام فالميراث حلال ثم رمز وقال لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقا على الورثة فتنبه (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب الحظر والاباحة،فصل في البيع ،ج٦ص٣٨٥.

وكذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم.كتاب الحظر والاباحة،ص:٢٤٧.

[2] کیونکہ زکوۃ وحج وغیرہ کے لئے خاص مقدار مال کا مالک ہونا ضروری ہے اور ایسا حرام مال ملک میں داخل نہیں ہوتا اس لئے زکوۃ بھی لازم نہیں، لیکن یہ حکم تب ہے کہ جب پورا مال حرام ہو، یا کچھ مال حلال بھی ہو لیکن وہ اتنا نہ ہو کہ مال حرام کے بقدر مال کو منہا کرنے کے بعد نصاب تک پہنچے، ورنہ تو زکوۃ واجب ہو جائے گی۔

ولو بلغ المال الخبيث نصاباً لا يجب فيه الزكاة لأن الكل واجب التصدق.الفتاوى البزازية،كتاب الزكاة، الفصل الثاني في المصرف، نوع اخر،ج١ص:٤١.

عن محمد رحمه الله تعالى أن النائحة و المغنية إذا أخذت الأجرة على الشرط ترد على أربابها و لا تتصدق بها (فتاوى قاضيخان ،كتاب الوصايا،فصل في مسائل مختلفة ،٣ص:٣١٦.

والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الزكاة، قبيل مطلب في التصدق من المال الحرام،ج٢ص: ٢٩١).

[3] یعنی اپنا ذمہ فارغ کرنے کے لئے کسی فقیر کو تھمادے ورنہ یہ اصطلاحی صدقہ نہیں ہے کیونکہ صدقہ کے لئے مال مملوک کا دینا شرط ہے جبکہ حرام مال مملوک نہیں۔

۵۔ فقراء کو بحالت مجبوری لینا جائز ہے۔

۶۔ جس مال کی حرمت اصلی نہ ہو بلکہ طریق وصول میں خلاف ورزی سے حرمت کا حکم دیا گیا ہو اور وہ بعض کے حق میں ممنوع نہ سمجھا گیا ہو تو اس شخص سے مفت یا کسی چیز کے عوض میں لینا جائز ہے، جیسے صدقہ جو فقراء پر تو حلال ہے اغنیاء اور بنی ہاشم پر حرام ہے، مگر فقیر صدقہ لے کر اپنی طرف سے ہدیۃً یا کسی چیز کے عوض میں بنی ہاشم کو دیدے تو حلال ہے جیسا کہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے پاس صدقہ کا گوشت آیا، اس میں سے آپ ﷺ نے تناول فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ تمہارے حق میں تو صدقہ تھا لیکن جب تم نے مجھے دیدیا تو میرے حق میں ہدیہ ہو گیا۔[1]

لہٰذا حربی کافروں کے مال میں کرید (کرنے) کی ضرورت نہیں کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ کیونکہ دار الحرب میں نہ احکام نافذ ہیں نہ ان سے خطاب ہے، اسی بناء پر مال غنیمت بلا تکلف لے لئے جاتے ہیں اور ذمی اگر شراب یا خنزیر فروخت کرکے اس کی قیمت مسلمان کو مفت یا کسی چیز کے عوض میں دیدے تو مسلمان کے لئے اس کا لینا جائز ہے اس لئے کہ شراب اور خنزیر ذمی کے حق میں ممنوع نہیں ہے۔[2]

قالوا لو مات رجل، وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذوا منه شيئا، وهو أولى لهم، ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.(تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع،، ج٦ص٢٧.

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع،ج٦ص ٣٨٥).

ويكفر بتصدقه على فقير بشيء حرام يرجو الثواب وبدعاء الفقير له عالما به وبتأمين المعطى.البحر الرائق، كتاب السير،باب أحكام المرتدين، ج٥ص١٣٢.

[1] ومن الأصول المقررة أن تبدل الملك قائم مقام تبدل الذات أخذا لقوله عليه السلام لبريرة هي لك صدقة ولنا هدية كما مر. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، كتاب المكاتب، باب العجز والموتْ،ج٢ص: ٤٢٠).

وكذا في العناية شرح الهداية، كتاب المكاتب،باب موت المكاتب وعجزه وموت المولى،ج٩ص٢١٤.

[2](وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر) لصحة بيعه (بخلاف) دين على (المسلم) لبطلانه إلا إذا وكل ذميا ببيعه فيجوز عنده خلافا لهما وعلى هذا لو مات مسلم وترك ثمن خمر باعه مسلم لا يحل لورثته.الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، ج٦ص٣٨٥.

وكذا في الدرر شرح الغرر ،كتاب الكراهية والاستحسان،ج١ص ٣١٨.

حرام غیر مملوک پاک مال سے مخلوط ہو جائے

اموال حرام غیر مملوک میں پاک مال مل جائے، تو اس کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ حلال کو حرام سے آسانی کے ساتھ جدا کیا جا سکے جیسے سو روپے سودی قرض دے کر ایک سو دس روپے حاصل کئے، اب دس روپے کو علیحدہ کر دے تو سو حلال ہے اور روپیوں میں نہ تعین ہے نہ امتیاز، جو چاہے رکھے اور جو چاہے دے۔ [1]

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قیمت ادا کر کے حرام سے علیحدگی ہو سکتی ہے جیسے سو روپے میں ایک مکان بیع کے طور پر خریدا[2]، اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اس کو فروخت کر دے اگر کچھ نفع ملے تو اس کو صدقہ کر دے اور اصل رقم اپنے پاس رکھ لے، اگر کچھ نقصان ہو تو اس کو برداشت کر لے، اگر کسی کو سو روپے دے کر ایک گھڑی بطور رہن رکھ لی، سال پورا ہونے کے بعد وہی گھڑی اصل رقم اور سود کے عوض میں لے لے تو اب گھڑی سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ فروخت کر کے سو روپے اصل رقم لے لے اور باقی صدقہ کر دے۔ [3]

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ حلال کو حرام سے جدا کرنا مشکل ہو جیسے کسی کے گندم میں جَو مل گئے تو بہتر تو یہی ہے کہ چن چن کر علیحدہ کر دیا جائے اور اگر علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو جیسے دودھ میں چینی مل گئی، اب ملی ہوئی مال کی قیمت لازم ہو گئی وہ قیمت مالک کو دیدے اگر مالک نہ ملے تو خیرات کر دے، اگرچہ ایسے خلط کرنے سے گناہگار ہو گا، اگر سہواً ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید ہے اور احتیاط ایسے مشتبہات سے بچنے میں ہے۔ [4]

---

[1] (الخلط على أربعة أوجه) : أحدها خلط بطريق المجاورة مع تيسير التمييز كخلط الدراهم البيض مع الدراهم السود وخلط الذهب والفضة فهذا لا يقطع حق المالك بالإجماع، ولو هلك قبل التمييز هلك أمانة كما هلك قبل الخلط.(الفتاوى الهندية،كتاب الوديعة، الباب الرابع فيما يكون تضييعا للوديعة وما لا يكون، ج٤ص٣٤٨).

وكذا في البناية شرح الهداية(كتاب الوديعة، ج١٠ص١١١).

وكذا في النافع الكبير شرح الجامع الصغير(كتاب القضاء، باب الدعوى، ص٣٨٢).

[2] مطبوعہ تسہیل شدہ نسخہ میں عبارت یہی ہے، لیکن اصل نسخہ میں عبارت یوں ہے "مکان سو روپیہ بطور بیع فاسد لیا" اور یہی صحیح ہے۔

[3] رجل اشترى جارية شراء فاسدا وتقابضا فباع الجارية وربح فيها تصدق بالربح ويطيب للبائع ما ربح في الثمن. الجامع الصغير، كتاب البيوع،باب ما يجوز بيعه وما لا يجوز،ص:٣٣٣.

والتفصيل في الهداية: كتاب البيوع، أحكام البيع الفاسد، ج٣ص٥٣. ورد المحتار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص٩٦.

[4] والثاني خلط بطريق المجاورة مع تعذر التمييز كخلط الحنطة بالشعير وذلك يقطع حق المالك لأن الحنطة لا تخلو عن حبات شعير فتعذر التمييز حقيقة.النافع الكبير،ص٣٨٢.

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ اس میں مال خبیث شامل ہے یا نہیں؟ اس کی دو صورتیں ہیں:

الف: اگر حلت کا قرینہ قوی موجود نہ ہو اور بچنا ممکن بھی ہو تو حرام کو ترجیح دے۔

ب: اور اگر بچنا مشکل ہو اور ابتلاء عام ہو تو اعراض کافی ہے کیونکہ مجرد ظن سے حرمت کا ثبوت ظنی اور احتیاطی ہے قطعی اور وجوبی نہیں اور بلوائے عام سے بچنا مشکل ہے۔ اس مسئلہ کی مزید تشریح آئندہ آئے گی۔

حرام مال سے بچنا واجب ہے

حرام مال سے بچنا اور تمام امور پر مقدم ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: { یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا } [المؤمنون: ٥١]

ترجمہ: اے رسولوں کی جماعت: حلال مال کھاؤ اور نیک کام کرو۔

پہلا درجہ حرام قطعی: یعنی اس کی نجاست و حرمت کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف واخفاء نہ ہو اور نہ ہی اس کے طریق معرفت میں کوئی تردد ہو جیسے شراب، خنزیر وغیرہ، جو بالاتفاق ناپاک اور حرام ہیں، یا وہ مال جس کی نسبت قبضہ کرنے والا خود اقرار کرتا ہے یا دو عادل آدمی گواہی دیتے ہیں کہ یہ مال فلاں حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہے، یا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اس طرح کہ زید نے آنکھوں کے سامنے کسی کی بکری کو ذبح کیا یا سود کا روپیہ وصول کیا یا رشوت لی، یا کسی سے زبردستی چھین لیا، ایسے مال نہ خود استعمال کر سکتا ہے نہ کسی کو مفت یا کسی چیز کے عوض میں دے سکتا ہے، نہ کسی دوسرے شخص کو جسے اس کی حرمت کا یقین ہو گیا ہو مفت یا کسی چیز کے عوض میں لینا جائز ہے۔[1]

وكذا في الفتاوي الهندية والبناية كما مر في الحاشية المتقدمة في تخريج الصورة الاولى للخلط.

[1] قوله: الحرمة تتعدى في الأموال مع العلم بها. قال الشيخ عبد الوهاب الشعراني – رحمه الله – في كتاب المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى ذمتين سألت عنه الشهاب ابن الشبلي فقال: هذا محمول على ما إذا لم يعلم بذلك أما من رأى المكاس مثلا يأخذ من أحد شيئا من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذه من ذلك الآخر فهو حرام (غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، كتاب الحظر والاباحة، ج٣ص٢٣٤).

وكذا في رد المحتار (كتاب الحظر والاباحة،فصل في البيع، ج٦ص٣٨٥).

دوم حرام مشتبہ: جس کی دلیل یا معرفت میں تردد ہو مثلاً اس کی حرمت کے بارے میں علماء مجتہدین مختلف ہیں یا طریق معرفت قطعی نہیں، اور اس کے تین درجے ہیں:

موہوم: جب کہ صرف وہم ہی وہم ہو جیسے بازاری افواہ کہ فلان دواء یا غذا میں شراب یا کوئی اور نجس یا حرام چیز ملی ہوئی ہو۔

مشکوک: جس چیز کی حلت و حرمت میں دو طرح کی دلیلیں برابر قوت رکھتی ہوں جیسے جھینگا جس کو بعض نے مچھلی سمجھ کر حلال کہا ہے اور بعض نے کیڑا سمجھ کر حرام کہا ہے، یا ایسے لوگوں کے مال جن کی کچھ آمدنی حلال ہے اور کچھ حرام، ان کی ہر آمدنی پر دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔

مظنون: ظنِ غالب کی وجہ سے کسی چیز کو حرام یا نجس قرار دینا جیسے کسی کی ظاہری آمدنی یا زائد آمدنی حرام ہے۔

موہوم کی طرف دھیان کرنا صحیح نہیں ہے [1] اور مشکوک اپنی اصل پر محمول ہے اگر وہ چیز اصل میں پاک ہے تو شک سے ناپاک نہیں ہو سکتی جیسے گڑ، چینی یا کپڑا وغیرہ، جو اصل میں پاک تھا مگر عارضی طور پر ناپاکی کا احتمال ہے، اب محض شک سے نہ اصلی طہارت زائل ہو سکتی ہے نہ عارضی ناپاکی ثابت ہو سکتی ہے، ایسا مشکوک کپڑا اگر دھوبی دھوتا ہے جو عام طور پر کافر یا محض لاشعور ہوتا ہے، اب یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ان کا دھونا شرعاً غسل معتبر ہوا یا نہیں کہ جس کے بعد پاکی کا حکم لگایا جا سکے، اب چونکہ دھونے میں اصل پاکی کا حکم حاصل ہونا ہے اس لئے وہ کسی شک سے زائل نہیں ہو سکتی لہٰذا پاکی کا حکم لگایا جائے گا۔ [2]

ایسے ہی یہ وہم کہ ذبح کو ذبح کرنے والا قصائی شرعی حکم سے ناواقف ہوتے ہیں یا ذبح کرتے وقت بے احتیاطی کرتے ہیں، لہٰذا یہ وہم کہ جانور صحیح ذبح ہوا یا غلط، اب ذبح ہونا ظاہر ہے ذبح میں غلطی کرنا خلاف شرعی طریقہ پر کرنا موہوم اور مخفی بات ہے اس لئے اس کو حلال ہی کہا جائے گا۔

---

[1] لأنّ الوهمَ دونَ الشكّ.

[2] اليقين لا يزول بالشك. الأصل بقاء ما كان على ما كان. مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة: ٤.٥ .ص: ١٦.

إنّ ما كان ثابتاً ومعلوماً يجب التمسك به وبناء الأحكام عليه حتى يعلم خلافه، وإذا لم يعلم خلافه لا يجوز العدول عنه. وهذه القاعدة لها صلة وثيقة بسابقتها؛ لأن التمسك بالأصل المعلوم هو الاستصحاب وإبقاء ما كان على ما كان. موسوعة القواعد الفقهية للبورنو، ج٢ص ٤٦٧.

ایسے چینی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے بنانے میں بعض ناپاک اشیاء سے مدد لی جاتی ہے حالانکہ اس کے طریق اختلاط واستعمال پر نہ معتبر گواہی موجود ہے اور نہ عدم جواز کا علم کافی ہے، ایسے انگریزی دوائیں جن میں شراب یا دوسری ناپاک چیزوں کے ملائے جانے پر زور لگایا جاتا ہے، مگر اب تک یہ ثابت نہیں کیا جاسکا کہ جس جوہر قوی کو وہ عام طور پر ان اشیاء میں ملایا کرتے ہیں وہ اپنی لغت میں اس کو شراب کہتے ہیں، آیا وہ شرعاً حد شراب میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور میرے نزدیک وہ سم ہے شراب نہیں جس کی وجوہ ہماری تفسیر "خلاصۃ التفاسیر" میں موجود ہیں۔

الحاصل مشکوک ہونا بھی واجب الترک نہیں، بعض صلحاء امت کا ان کے استعمال سے احتیاط فرمانا صرف اس لئے تھا کہ مواقع حرمت سے دور دور رہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نافہمی اور غفلت سے بھی ہلاک نہ ہوں جیسا کہ ایک محتاط آدمی راستے کے درمیان چلتا ہے اور دریا کے نایاب پانی میں بھی پاؤں نہیں ڈالتا کہ کنارے پر چلنے سے مبادا کہیں پاؤں پھسل کر دوسری جانب چلا جائے تو کون بچا سکے گا؟ یہ مرتبہ کمالِ تقویٰ اور مزید احتیاط کا ہے جن کے اہل وہی لوگ ہیں۔

لیکن مظنون یعنی جبکہ حرمت کے وجوہِ معرفت قوی نہ ہوں اور غالب حالت مقتضی ہو کہ یہ مال حرام طور پر حاصل کیا گیا ہے، اس پر علماءِ سلف نے بہت زور دیا اور بلا توقف اسے صریح حرام کے ساتھ ملحق فرمایا ہے۔

کیونکہ احکام فقہی اکثر ظنی ہیں "وللا کثر حکم الکل مسلم" ہے جبکہ حلال و حرام میں تعارض ہو تو حرمت کو ترجیح دی جاتی ہے، لہٰذا ایسے مال کو حرام و ناپاک قرار دے کر ان سے اجتناب کرنا سلف صالحین کا معمول رہا ہے اور کتابیں ایسے اموال کے استعمال سے ممانعت کے ساتھ بھری ہوئی ہیں۔

مشتبہ مال کے متعلق متاخرین کی رائے

مگر اسی کے ساتھ مصلحت شناس علماء کرام اور صوفیاء عظام کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ شریعت مطہرہ میں جہاں تک گنجائش ہو احکام میں گنجائش دی جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھیں اور حرام و مشتبہات کو چھوڑنے کی فکر ہی چھوڑ دیں۔

چنانچہ احکامِ فقہی پر مرتب کتابوں پر نظر کرنے والے جانتے ہیں کہ ترکِ مشتبہات کے مسئلہ میں ہر صدی کی بعد کچھ سہولت ضرور ہوتی ہے،اس بارے میں امامِ غزالی رحمہ اللہ کی تصانیف ملاحظہ ہوں۔

عالمگیر رحمہ اللہ جو ایک حامی شریعت محی سنت عادل و متقی بادشاہ تھے، انہی کے حکم سے فتاویٰ عالمگیریہ تیار ہوا، فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین کا قول یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں مشتبہات سے احتراز کرنا مشکل ہے تو جب تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ بعینہ یہی مال حرام ہے تو اس مال کے استعمال کو ترک کرنا واجب نہیں ہے [1]، صاحب اشباہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔[2]

تو ہمارا زمانہ جو فضولیات ولغویات سے بھرا ہوا ہے جس کی فضول کاروائیوں اور آزادیوں سے نہ حکومت محفوظ ہے نہ تجارتیں بچ سکیں، نہ ملازمتیں اس سے پاک ہیں، نہ اجارہ کا معاملہ صحیح ہے نہ زراعتیں سود ورشوت سے پاک ہیں، اسی طرح بیوع فاسدہ کے علاوہ ایک دو نہیں، ہزاروں بلائیں ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ترک مشتبہات پر زور دیا جائے۔

احتیاطی تدابیر

اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی، کہ اپنے تمام معاملات کو حرام وممنوع آلائشوں سے پاک رکھے جائیں، دوم وہ اموال جن کے حرام ہونے کا یقین ہو گیا ہے اور کوئی تاویل اس کی حلت پر قائم نہیں ہو سکتی، چھوڑ دیے جائیں، سوم مشتبہ مالوں میں زیادہ بحث نہ کی جائے۔

سہولت کی چند مثالیں

ا۔ سرگین (گوبر) اور پانس (کھاد) جو قطعاً ناپاک ہے، اس کی بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے۔[3]

---

[1] قد قال بعض مشايخنا عليك بترك الحرام المحض في هذا الزمان فإنك لا تجد شيئا لا شبهة فيه كذا في جواهر الفتاوى. الفتاوى الهندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس والعشرون، ج٥ص ٣٦٤.

[2] ليس زماننا زمان اجتناب الشبهات.الأشباه والنظائر مع شرحه غمز عيون البصائر، كتاب الحظر والإباحة،ج٣ص ٢٣٣.

[3] في الجامع الصغير: لا بأس ببيع السرقين ويكره بيع العذرة، وفي شرحه النافع الكبير تحته: قوله بيع السرقين لأنه منتفع به فيجوز بيعه كالثوب النجس لأن الناس يلقونه في الأراضي لاستكثار الريع وما كان منتفعا به كان مالا فيجوز بيعه بخلاف العذرة الخالصة لأن الناس لا ينتفعون بها ولا يحرزونها وإنما ينتفعون بالمخلوط بالتراب وذلك مال عندنا يجوز بيعه ونجاسة العين تمنع الأكل لكن لا تمنع الانتفاع.الجامع الصغير وشرحه النافع الكبير ،باب الكراهية في البيع،ص: ٤٨٠.

وكذا فى الدر المختار وحاشية ابن عابدين.كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع ،ج٦ص٣٨٥.

۲۔ بارش کے دنوں میں ناپاک کیچڑ کو ضرورۃ پاک قرار دیا گیا ہے۔[1]

۳۔ ناپاک کپڑے جس کا مقام نجاست معلوم نہ ہو، ایک حصہ دھونے سے پورے کپڑے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔[2]

۴۔ جنگل اور میدان میں بنے ہوئے کنوؤں میں گوبر، لید وغیرہ کا گرنا ایک حد تک معاف ہے، اس سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا[3] لیکن گھر کے کنویں میں معاف نہیں ہے۔[4]

۵۔ ایک گھر کی لڑکیوں کے بارے میں رضاعت کا شبہ ہو تو احتیاطاً کسی سے نکاح جائز نہیں[5]، لیکن اگر شہر کے تمام عورتوں کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہو جائے تو اس شبہ پر عمل نہیں کیا جائے گا۔[1]

---

[1] وعن أبي نصر الدبوسي طين الشارع ومواطئ الكلاب فيه طاهر وكذا الطين المسرقن وردغة طريق فيه نجاسة طاهرة إلا إذا رأى عين النجاسة (البحر الرائق، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، ج۱ص: ۲٤۸).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين(كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في العفو عن طين الشارع، ج۱ص۳۲٤).

[2] ایسی صورت میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ پورے کپڑے کو دھونا ضروری قرار دیا جائے، علامہ کاسانی رحمہ اللہ رحمہ اللہ وغیرہ بعض فقہاء کرام نے اس کو اختیار بھی فرمایا لیکن دیگر فقہاء نے کپڑے کے ایک حصہ دھونے کو بھی کافی قرار دیا گیا جیسا کہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔

(وغسل طرف ثوب) أو بدن (أصابت نجاسة محلا منه ونسي) المحل (مطهر له وإن) وقع الغسل (بغير تحر) وهو المختار.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين(كتاب الطهارة، باب الأنجاس، ، ج۱ص۳۲۷).

وكذا في الدرر والغرر (كتاب الطهارة، قبيل باب الاستنجاء، ج۱ ص ٤۸).

ولاحظْ "بدائع الصنائع" (كتاب الطهارة، فصل في بيان المقدار الذي يصير به المحل نجسا، ج۱ص ۷۱).

[3] إن وقعت فيها بعرة أو بعرتان من بعر الإبل أو الغنم لم تفسد الماء " استحسانا. والقياس أن تفسده لوقوع النجاسة في الماء القليل وجه الاستحسان أن آبار الفلوات ليست لها رؤوس حاجزة والمواشي تبعر حولها فتلقيها الريح فيها فجعل القليل عفوا للضرورة.(الهداية في شرح بداية المبتدي، تاب الطهارة، فصل في البئر، ج۱ص۲٤).

وكذا في بدائع الصنائع (كتاب الطهارة، فصل في بيان المقدار الذي يصير به المحل نجسا، ج۱ص ۷٦).

[4] یہ بعض فقہاء کرام کا مسلک ہے شاید حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہی قول قوی ہو، لیکن راجح قول یہی ہے کہ شہر، دیہات اور گھر کے کنوؤں میں کوئی فرق نہیں۔

والرطب واليابس والصحيح والمنكسر سواء لعموم البلوى وآبار الأمصار كذلك، وقيل يعتبر ما ذكرنا من الضرورة. (الاختيار لتعليل المختار، كتاب الطهارة، ج۱ ص ۱۷).

وفرق كثير من المشايخ في البعر بين آبار الفلوات؛ فيعفى عن قليله للضرورة؛ لأنه ليس لها رءوس حاجزة والإبل تبعر حولها، وبين آبار الأمصار؛ لعدم الضرورة، بخلاف الكثير.

ولكن المعتمد عدم الفرق بين آبار الفلوات والأمصار، وبين الصحيح والمنكسر، وبين الرطب واليابس. (الأشباه والنظائر مع الغمز ، الفن الاول، القاعدة الخامسة الضرر يزال، ج۱ص ۲۷۷).

والاصح ان ابار البيوت والامصار والفلوات في الضرورة سواء كذا في المجتبى.(السعاية ، كتاب الطهارة، ص: ٤٥٦)

[5] یہ صرف احتیاط تک کی بات ہے ورنہ شرعی شہادت یا شوہر کے اقرار کے بغیر محض شبہات کی وجہ سے نکاح ناجائز نہیں ہوتا جیسا کہ نیچے حاشیہ میں مندرجہ عبارات سے ظاہر ہوتا ہے۔

۶۔ایک دکان کے بارے میں مال حرام کا شبہ پیدا ہو جائے تو اس دکان سے خرید و فروخت بند کی جائیگی لیکن اگر پورے بازار کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہو جائے تو اس شبہ پر عمل نہیں کیا جائے گا۔[2]

۷۔ جن تصاویر سے احتراز ممکن نہیں ہے وہ معاف سمجھی گئی ہیں جیسے نوٹوں اور مارکوں میں جو تصویریں ہیں[3]۔

۸۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مسلمان تاجر یہود ونصاریٰ سے مال خریدنے میں زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتے تھے حالانکہ ان کی حرام کاری قرآن میں منصوص ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "{لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ} [المائدة : ٦٣]"

الغرض جہاں عموم بلویٰ ہو اور احتراز حقیقۃً مشکل ہو تو اس صورت میں عفو و اعراض بہتر ہے، اور اگر کسی نے اپنے خاص معاملہ میں رعایت کرلی تو نہ مال کہیں سے مل سکے گا، نہ فروخت کر کے قیمت وصول کر پائے گا۔

---

[1] أرضعتها بعض أهل القرية ثم تزوجها رجل من تلك القرية فهو في سعة من المقام معها في الحكم والتنزه أولى، صغير وصغيرة بينهما شبهة الرضاع ولا يعلم ذلك حقيقة لا بأس بالنكاح بينهما إذا لم يخبر به واحد فإن أخبر به واحد عدل ثقة يؤخذ بقوله ولا يجوز النكاح بينهما (الفتاوى البزازية ،كتاب النكاح،الرابع في الرضاع، ج٢ص٧).

وكذ في المحيط البرهاني في الفقه النعماني (كتاب النكاح، الفصل الثالث عشر في بيان أسباب التحريم ،ج٣ص ٦٣).

وكذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم.(القاعدة الثالثة، الأصل في الأبضاع التحريم،ص ٥٧).

[2] یہ بھی احتیاط پر مبنی ہے۔

رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشتري أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام. (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة والأرباح الفاسدة، ج٣ص٢١٠).

وكذ في فتاوى قاضيخان (كتاب البيوع، فصل فيما يكون قرارا عن الربا، ج٢ص ١٤٠).

[3] الضرورات تبيح المحظورات،ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة، وإساغة اللقمة بالخمر، والتلفظ بكلمة الكفر للإكراه وكذا إتلاف المال، وأخذ مال الممتنع الأداء من الدين بغير إذنه ودفع الصائل، ولو أدى إلى قتله.(الأشباه والنظائر لابن نجيم،الفن الاول، القاعدة الخامسة" الضرر يزال"ص٧٣).

اما اتخاذ الصورة الشمسية للضرورة او الحاجة كحاجتها في جواز السفر وفي التاشيرة فينبغي ان يكون مرخصا فيه(تكملة فتح الملهم، مسئلة التصوير في الاسلام، ج٤ص١٤٢).

مسئلہ : جس ملک میں حرام خوری اس قدر عام ہو جائے کہ اس سے بچنا دشوار نظر آئے جیسے ہمارے ملکوں میں سود ورشوت وغیرہ بیوع فاسدہ عام ہے، تو ان مالوں سے احتراز واجب ہوگا جن کے بارے میں یقین ہو جائے کہ یہ مال حرام طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے۔[1]

مسئلہ : جہاں یہ حرام خور قلیل اور ذلیل حالت میں ہوں جیسے ہمارے شہر میں زناکار، بدکار اور گلوکار وغیرہ، ان سے بچنا واجب ہے بشرطیکہ قرینہ صحیحہ اور ظن غالب موجود ہو کیونکہ اس موقع پر احتراز ممکن ہے لہٰذا حرمت اصلی اپنی حالت پر برقرار ہے اور پہلے مسئلہ میں احتراز مشکل ہے اس لئے عارضی تخفیف سے کام لیا گیا ہے۔[2]

مسئلہ : جب اکثریت اس حرام کاری سے اجتناب کرے گی تو اقلیت خود بخود مجبور ہوں گی اور جب قلیل سے معاملات کو ترک کیا جائے گا تو دوسروں کے لئے بھی تنبیہ ہوگی، اسی طرح گناہوں کے کام کے لئے سد باب ہوگا، لوگ ایسے حرام خوری سے اجتناب کریں گے۔[3]

حرام مال سے قیمت ادا کرنے کا حکم

حرام مال سے جو قیمت ادا کی جاتی ہے، اس کی تین صورتیں ہیں:[4]

---

[1] قالوا ليس زماننا زمان الشبهات فعلى المسلم أن يتقي الحرام المعاين. فتاوى قاضيخان ،كتاب الحظر والاباحة، ج٣ص ٢٤٥.

قوله: ليس زماننا زمان اجتناب الشبهات إلخ. روي عن أبي بكر بن إبراهيم أنه سئل عن هذه الشبهات أي عما يكون إلى الحرام أقرب فقال: ليس هذا زمان الشبهات إن الحرام أغنانا يعني إن اجتنبت الحرام كفاك كذا في التجنيس (غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، كتاب الحظر والاباحة، ج ٣ص ٢٣٣).

[2] (قال) وكذلك لا ينبغي له أن يشتريه منه لأن بيعه حرام على المحرم، ولأن في امتناعه عن الشراء زجرا للمحرم عن اصطياده فإنه تقل رغبته في الاصطياد إذا علم أنه لا يشترى منه الصيد. المبسوط للسرخسي، كتاب الجنايات، باب جزاء الصيد، ج٤ص ٩٦.

لأنه إذا علم أنه لا يشتري منه لا يبيع على الطريق فكان هذا إعانة له على المعصية وقد قال الله تعالى:ولا تعاونوا على الاثم والعدوان.المحيط البرهاني، كتاب البيوع، الفصل الخامس والعشرون، ج٧ص ١٤٠.

[3] ایضا.

[4] یہ امام کرخی رحمہ اللہ کا قول ہے ان کے نزدیک مال حرام سے خریداری کی کل پانچ صورتیں ہیں جن میں یہی تین بنیادی صورتیں ہیں جو مولف رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے۔

۱۔ عقد مطلقاً واقع ہو مثلاً حرام آمدن والے نے کپڑے کا ایک تھان خریدا یا کسی آدمی سے مزدوری کروایا اور صراحت کے ساتھ نہیں کہا کہ مزدوری حرام مال سے دوں گا لیکن ادا کرتے وقت حرام مال سے ادا کر دیا۔

۲۔ عقد کرتے وقت صراحت کے ساتھ ذکر کیا کہ ان روپیوں یا اس گندم کے عوض خریدتا ہوں جو حرام ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہے لیکن پھر قیمت حلال مال سے ادا کر دی، ان دونوں صورتوں میں جو لیا حلال ہے اگرچہ نقدین (یعنی سونا چاندی کے علاوہ) کا بدلنا جائز ہے۔

۳۔ عقد کرتے وقت متعین کیا کہ اس کپڑے کی قیمت حرام پیسوں سے ادا کروں گا، پھر کپڑا خریدنے کے بعد حرام پیسوں ہی سے قیمت ادا کی، تو ایسی خریدی ہوئی چیز میں خبث آگیا ہے یا اس طریقہ پر کوئی کام لیا اور حرام ہی رقم سے اجرت دی تو ایسی رقم کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر کسی عقد میں نقدین (یعنی سونا چاندی یا نوٹ) کو عوض ٹھہرائیں یا مثلیات محض اوصاف بیان کر کے عوض ٹھہرائیں اور اشارہ سے متعین نہ کیا جائے تو ان کا کوئی فرد متعین نہیں ہوتا بلکہ وہ عوض ذمہ میں ثابت یا لازم ہو جاتا ہے، عقد صحیح اور جائز ہوگا اور جو مال یا کام اس کے عوض میں لیا جائے وہ جائز اور حلال ہے۔[1]

البتہ عوض کی ادائیگی کے وقت اگر حرام مال دیا گیا تو دینے والا اس ناجائز تصرف کی وجہ سے گناہ گار ہوگا اگر لینے والے کو معلوم ہو تو وہ بھی گناہ گار ہوگا لیکن خریدار ہر حال میں بری الذمہ ہوگا، قضاءً بھی اور دیانةً بھی۔[2]

رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم أخر ودفع تلك الدراهم--- وقال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب (الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب البيوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اكتسب حراما ثم اشترى فهو على خمسة أوجه ،ج٥ص ٢٣٥).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب الغصب، الفصل التاسع في تملك الغاصب المغصوب، والانتفاع به، ج٥ص٤٩٩).

[1] كذا فى الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الفصل الثالث في معرفة المبيع والثمن والتصرف فيهما قبل القبض ،ج٣ص ١٢).

وكذا في المحيط البرهاني في الفقه النعماني (كتاب البيوع، الفصل الأول: فيما يرجع إلى انعقاد البيع، مبحث معرفة المبيع والثمن ،ج٦ص ٢٧٥).

[2] مشتری تو اس لئے گناہ گار ہوگا کہ اس نے مال حرام سے انتفاع حاصل کیا کیونکہ قرض کی ادائیگی سے ذمہ فارغ کرنا منفعت ہے جبکہ مال حرام سے اس طرح نفع حاصل کرنا ناجائز ہے انتفاع کے بغیر اصل مالک یا اس کے ورثاء کو واپس کرنا ضروری ہے اور ان کے معلوم نہ ہونے کی صورت

مسئلہ : اگر مقروض نے مال حرام سے قرض ادا کیا تو قرض ادا ہو جائے گا، اس کا ذمہ بری ہو گا اور قرض وصول کرنے والے کے حق میں وہ قرض حلال ہو گا، اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) حلال غیر مملوک جیسے عاریت پر لی ہوئی چیز (۲) حلال مملوک جیسے ہبہ۔

ملک حلال حاصل ہونے کے چھ اسباب ہیں:

۱۔ عقود: جیسے خرید و فروخت اور اجارہ (کرایہ داری)

۲۔ عطایا: جیسے ہبہ، صدقہ، عاریت

۳۔ زوائد: یعنی اپنی ملک جو خود بخود بڑھے جیسے باندی کی اولاد یا درختوں کے پھل یا درخت وغیرہ۔

۴۔ اباحت: جیسے دریا کا پانی، جنگل کا گھاس، یا دعوت کا کھانا وغیرہ۔

۵۔ قہر و غلبہ: جیسے مال غنیمت وغیرہ۔

۶۔ حقوق: جیسے میراث اور حق شفعہ وغیرہ۔

حصول ملک کے حلال اور پاک اسباب انہیں چھ میں منحصر ہیں۔[1]

میں ان کی طرف سے تصدق ضروری ہے جبکہ مشتری نے ایسا نہیں کیا اس لئے گناہ گار ہو گا اور بائع اس لئے گناہ گار ہو گا کہ حقیقت حال معلوم ہونے کے باوجود قبول کرنا در حقیقت اس گناہ کے کام میں مشتری کی اعانت و تائید کرنا ہے جو کہ جائز نہیں۔

[1] ولاحظ للتفصيل "الأشباه والنظائر مع الغمز (الفن الثالث، القول في الملك، ج٣ص٤٦١).

باب اول: عقود کے بیان میں

عقد ہر وہ معاملہ ہے جس میں[1] جانبین سے ایجاب و قبول پائے جانے کے ساتھ منعقد ہوتا ہے اس کو عقد کہا جاتا ہے، کیونکہ ایجاب و قبول سے دونوں میں حکمی طور پر بندش پیدا ہو جاتی ہے، ہر قول دوسرے کے لئے معین و مددگار ہوتا ہے، پس یہ عقد اگر ملک حاصل کرنے کے لئے ہے تو اس کو بیع کہا جاتا ہے اور اگر صرف نفع حاصل کرنے کے لئے ہے تو وہ اجارہ ہے۔

بیع کی اقسام واحکام

بیع کی تعریف: بائع و مشتری کا آپس کی رضامندی سے عین شئ میں ملک ثابت کرنے کی خاطر دو مفید مالوں کا تبادلہ کرنا۔[2]

موضوع: بیع کا موضوع مال مفید ہے۔

غرض: بیع کی غرض حاجت کو دفع کرنا اور منفعت حاصل کرنے کے لئے عین شئ کا مالک بننا اور بنانا۔

بیع کے ارکان تین ہیں:

عاقدین کا موجود ہونا: یہ شرط ہے کیونکہ عاقدین سے صادر ہوئے بغیر ایجاب و قبول محال ہے۔

مالِ متقوم: (یعنی قیمتی مال ہونا) یہ بیع کا محل ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ ایجاب و قبول واقع ہو سکتا ہے نہ ملک قائم ہو سکتی ہے۔

رضامندی: چونکہ کوئی فرد بشر اپنی تمام حاجتوں کو خود پوری نہیں کر سکتا اور دوسروں کی ملک میں تصرف کی اجازت وقدرت نہ تھی، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے مبادلہ کا طریقہ تعلیم فرمایا تاکہ کبھی حاجت پوری

---

[1] "جس میں" کے بجائے "جو" کا لفظ ہونا چاہئے۔

[2] مبادلة شيء مرغوب فيه بمثله۔ على وجه) مفيد. (مخصوص) (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب البيوع، ج٤ص ٥٠٢)

کرنے کے لئے اور کبھی نفع حاصل کرنے کی لالچ میں اس کو وسعت دیدی تاکہ ہر درجہ کا آدمی اپنی حاجت پوری کرسکے، اور آپس کی رضامندی کے حکم کو مقدم کیا تاکہ دوسروں کی ملک پر مالک و متصرف ہونا جبر وظلم کے ساتھ نہ ہو، رضاء رکن ہے مگر رضامندی ایک مخفی بات ہے جو دل سے تعلق رکھتی ہے اس پر مطلع ہونا متعذر ہے اس لئے وہ شرائط عائد کی گئیں ہیں جو فطرت سلیمہ کے لئے عام طور پر رضاء کی علامت ہوسکیں، ان کے نہ ہونے کے وقت یا ناقص ہونے کے وقت ہم فیصلہ کرسکیں گے کہ بیع صحیح نہیں ہوئی۔[1]

بیع کی شرائط کے پانچ مراتب

پھر فقہاء نے ان تینوں اصلوں کے لئے پانچ مراتب متعین فرمائے ہیں، اور ہر مرتبہ کے لئے کچھ شرائط ٹھہرائیں تاکہ انہی شرائط کے موافق بیع کے جائز یا فاسد ہونے کا حکم لگایا جائے اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

پہلا مرتبہ: وہ شرائط جن پر وجود بیع کا مدار ہے۔

دوسرا مرتبہ: وہ شرائط جن پر صحت بیع موقوف ہے۔

تیسرا مرتبہ: وہ شرائط جن سے فساد بیع کا احتمال دور ہو جاتا ہے۔

چوتھا مرتبہ: وہ شرائط جن پر بالفعل حکم کا مرتب ہونا موقوف ہے۔

پانچواں مرتبہ: وہ شرائط جن پر معاملہ کا بقاء ودوام منحصر ہے۔

ہم تفصیلات بیان کرتے ہوئے ہر مقام پر یہ ظاہر کریں گے کہ یہ شرائط کس درجہ کی ہیں۔

احکام عاقدین: اس میں تین شرطیں ہیں:

ا۔ تعدد: یعنی ایک ایجاب کرے دوسرا قبول کرے، پس ایک شخص دونوں جانب سے وکیل یا اصیل نہیں ہوسکتا، البتہ جب تعدد حقیقی شرعاً متعذر ہو جائے جیسے مجنون یا کم سن بچے جو خود ایجاب و قبول نہیں کرسکتے (یعنی شرعاً ان کا ایجاب و قبول معتبر نہیں) ان کا ولی یا وصی فریق ثانی ہو تو اس وقت ایک ہی شخص

---

[1] (ومنها) الرضا لقول الله تعالى: {إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم} عقيب قوله {يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل} وقال – عليه الصلاة والسلام لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب من نفسه» فلا يصح بيع المكره (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب البيوع، شرائط الصحة في البيوع، ج٥ص ١٧٦).

بضرورت دونوں جانب کا متولی ہو جائے گا، اس کی تفصیل بیان ولایت میں آئے گی۔ [1]

۲۔ فہم: یعنی بیع وشراء کے معاملہ کا سمجھنا، پس مجنون اور ناسمجھ بچے خود عقد نہیں کر سکتے اور سمجھدار لڑکوں کی بیع جائز ہے (عالمگیری) اگرچہ غبن فاحش بھی ہو، مگر حقوق وضمان ان پر عائد نہ ہوں گے، اور بے ہوشی کی حالت یا مذاق میں بیع کی جائے، وہ بیع منعقد نہیں ہو گی۔ [2]

۳۔ قابلیت: یعنی عاقدین میں مالک بنے اور بنانے کی صلاحیت موجود ہو، لہٰذا نابالغ بچے، پاگل اور غلام کی بیع ولی اور مولیٰ کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہو گی۔ [3]

مسئلہ: یہ معلوم نہ تھا کہ عاقد بالغ ہے یا نابالغ، غلام ہے یا آزاد، تو مشتری اس کو مولیٰ یا ولی کی اجازت سے پہلے پہلے فسخ کر سکتا ہے۔ [4]

اصیل: جو شخص اپنی ملک میں تصرف کرتا ہے وہ اصیل ہے۔

وکیل: جو شخص غیر کی ملک میں تصرف کرتا ہے شریعت کے حکم سے، وہ وکیل ہے۔

فضولی: جو ولی اور مولیٰ کی اجازت کے بغیر ان کے نام پر معاملہ کرے، اگر ان کے نام پر ان کی اجازت سے معاملہ کرے تو وہ قاصد ورسول ہے۔

غاصب، خائن، سارق: جو غیر کے نام سے اپنے لئے جعلی تصرف کرے۔

---

[1] وأن يكون متعددا فلا يصلح الواحد عاقدا من الجانبين كذا في البدائع إلا الأب ووصيه والقاضي إذا باعوا أموالهم من الصغير أو اشتروا منه (الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب الاول، ج٣ص ٢).

وكذا المحيط البرهاني في الفقه النعماني(كتاب البيع، الفصل الثامن عشر في بيع الأب والوصي والقاضي مال الصبي وشرائهم له، ج٧ص ٣٤).

[2] أما شرائط الانعقاد فأنواع منها في العاقد وهو أن يكون عاقلا مميزا كذا في الكافي والنهاية فيصح بيع الصبي والمعتوه اللذين يعقلان البيع وأثره. الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب الاول، ج٣ص ٢.

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، ج٥ص ٢٧٨).

[3] انظر الحاشية المذكورة.

[4] کیونکہ اس صورت میں اصل عاقد یہ نابالغ یا غلام نہیں ہے بلکہ وہ ولی یا مولیٰ ہے جس کی اجازت پر بیع موقوف ہے تو گویا عاقد کی طرف سے صرف ایجاب عمل میں آیا اور قبول کرنا ابھی باقی ہے اور قبول کرنے سے پہلے پہلے عاقد کو اختیار ہے کہ اپنے ایجاب سے رجوع کرے۔

إذا أوجب أحد المتعاقدين البيع فالآخر بالخيار: إن شاء قبل في المجلس وإن شاء رده (مختصر القدوري، كتاب البيوع، ص٧٨).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، ج١ص ١٨٤).

مکرَہ: جو اپنی یا غیر کی ملک میں تصرف کو جبراً قبول کرے۔

مال کی تعریف واحکام

مال ہر وہ مفید چیز ہے جو محفوظ اور مملوک ہو سکے، لیناد یینااس میں معتبر ہو اور طبیعت اس کی طرف مائل ہو، پس نکمّی چیز فائدہ نہیں دیتی اور آزاد مملوک نہیں ہو سکتا اور منافع اور حق مجرد قبضہ کرنے اور محبوس رکھنے کے قابل نہیں، جیسے حق شفعہ اور منفعت سکونت، لہٰذا یہ چیزیں مال نہیں ہیں۔[1]

مال غیر متقوم: یعنی وہ مال جو دوسرے ادیان میں مباح ہو اور دین اسلام میں مباح نہ ہو، وہ مال غیر متقوم ہے جیسے شراب اور خنزیر جو کفار کے نزدیک مال ہے ہمارے نزدیک حرام ہے، لہٰذا مال نہیں۔[2]

مال متقوم: مال ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری شریعت میں مباح بھی ہو، یہی مال صحتِ بیع میں معتبر ہے۔[3]

فائدہ: بہت سی چیزیں جو کسی زمانے میں بے کار سمجھ کر مال کی تعریف سے خارج کی گئیں تھیں، اب کار آمد ہو کر مال ہو گئیں ہیں، مثال کے طور پر خون اور مردار کار آمد ہونے کی وجہ سے عرفاً مال ہے لیکن یہ نہ کسی دین سابق میں مباح ہے نہ ہی دین اسلام نے اس کو حلال قرار دیا، لہٰذا خون اور مردار مال تو ہے لیکن مال غیر متقوم ہے۔[4]

مسئلہ: جو چیز کار آمد ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری شریعت میں مباح ہو وہ مال متقوم ہو جائے گا جیسے ہڈیاں وغیرہ۔

مسئلہ: جو چیزیں خاص موقع پر مال ہیں، لیکن عام نظروں میں اس کو مال نہیں سمجھا جاتا، وہ انہی خاص جگہوں میں مال سمجھی جائیں گی، جیسے چھلکے، سڑے ہوئے پھل وغیرہ۔[1]

---

[1] وفي الكشف الكبير المال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة(البحر الرائق، كتاب البيوع، ج٥ص ٢٧٧).
وكذا رد المحتار، كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم، ج٤ص٥٠١).

[2] والتقوم إنما يثبت بإباحة الانتفاع به شرعا، وقد ثبت صفة التقوم بلا صفة المالية فإن حبة من الحنطة ليست بمال حتى لا يصلح بيعها، وإن أبيح الانتفاع بها لعدم تمول الناس إياها،(درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب البيوع، ج٢ص١٦٨).
وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، ج٥ص ٢٧٧).

[3] إن محل البيع هو المال المتقوم (العناية شرح الهداية، كتاب البيوع، فصل في بيع الفضولي، ج٧ص ٥١).
وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب البيوع، ج٢ص ٣).

[4] انظر الحاشية المتقدمة.

مال کے اقسام

پھر مال کی تین قسمیں ہیں:

(پہلی قسم) ثمن: ثمن کی دو قسمیں ہیں۔(۱) ثمن خلقی جیسے سونا، چاندی۔(۲) ثمن عرفی، ہر سکہ رائج الوقت جیسے فلوس اور کاغذی نوٹ وغیرہ جو فلوس کی طرح رائج ہو گیا۔

پس ثمن ہمیشہ غیر متعین ہوتا ہے، تعین اثر نہیں کر سکتی، ہاں البتہ بعض صورتوں میں متعین ہوتا ہے جیسے امانت، ہبہ، صدقہ، شراکت، مضاربت، غصب، ثمن مبیع بیع فاسد اصلی، ثمن بیعِ فاسد جو قبضہ سے پہلے دیا جائے، وہ روپیہ جو قاضی مدعی کو دلادے پھر مدعی کے اقرار سے قضاء کے حکم کو توڑ کر رقم واپس کرنے کا حکم دے (شامی)[2]

زیور طلائی برتن و نقرہ، وہ درہم و دینار جو کسی چیز کے عوض میں رہن رکھوایا جائے، جیسے وہ درہم و دینار جو اس صندوق یا تھیلی میں بند ہیں، اس کے عوض میں بیچا مگر زید نے بکر کو روپیہ یا اشرفی دکھلا کر کہا کہ یہ فلان مال کی قیمت یا فلاں کام کی اجرت ہے، اور معقود علیہ پر قبضہ کے بعد دوسرے روپے دے دئے تو ایسی صورت میں نہ بکر کو انکار کا حق ہے اور نہ ہی زید پر کوئی الزام ہے[3]۔

---

[1] کیونکہ کسی چیز کے مال ہونے کے لئے ہر حال میں نص شرعی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ لوگوں کے تمول اور تعامل پر اس کا دار و مدار ہے جس چیز کو لوگ مال سمجھتے ہیں وہ مال قرار پائے گا۔

والمالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم، (رد المحتار، كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم، ج٤ص٥٠١).

وكذا فى البحر الرائق(كتاب البيوع، ج٥ص ٢٧٧).

[2] لا يتعين في المعاوضات۔۔ ويتعين في الأمانات والهبة والصدقة والشركة والمضاربة والغصب،(الأشباه والنظائر لابن نجيم ،أحكام النقد وما يتعين فيه وما لا يتعين،ص٢٧١).

وكذا في الشامية، كتاب البيوع،فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض،مطلب فيما تتعين فيه النقود وما لا تتعين، ج٥ص ١٥٣).

[3] کیونکہ اشارہ اور متعین کر دینے سے یہ چیزیں متعین نہیں ہوئی اس لئے بکر کا حق خاص اس معین زیور وغیرہ میں ثابت نہیں ہوا، واضح رہے کہ رہن اگرچہ معاوضات نہیں بلکہ امانات کے قبیل سے ہے جس میں ذکر کردہ قاعدہ کے مطابق نقود متعین ہو جانے چاہئے لیکن چونکہ رہن کی حیثیت ایجاب و قبول کے بعد بھی عقد غیر لازم کی ہوتی ہے اس لئے نقود کو متعین کرنے کی صورت میں راہن کو اختیار رہتا ہے کہ متعین نقود مرتہن کے پاس رکھے یا اس جیسے اور نقود، یا بالکل ہی نہ رکھے۔

مسئلہ : کسی ایسی رقم سے جو متعین ہے، مالک کی اجازت کے بغیر نفع اٹھانا شرعاً حلال نہیں ہے جیسے وکیل یا امین امانت کی رقم سے کچھ خرید کر نفع حاصل کرے۔[1]

مسئلہ : جو مال تعین سے متعین نہ ہو، وہ بعینہ واجب الاداء نہیں ہوتے بلکہ مالک کا حق قابض کے ذمے رہتا ہے۔[2]

مثلی کی تعریف: سونا چاندی اور اصطلاحی سکہ کے علاوہ ہر وہ چیز جو ناپ تول یا شمار سے برابر قیمت کی ہو یا ان کی باہمی مماثلت کسی خاص اعتبار سے عادۃً معروف ہو جیسے کپڑے، چاقو، یا کسی خاص کارخانے کے بنے ہوئے ایک نمبر کی چیزیں جن کی قیمت برابر ہیں۔[3]

تنبیہ: بہت سی چیزیں گذشتہ زمانے میں خلقی تفاوت یا دستی صناعت میں اختلاف کی وجہ سے مثلی نہیں تھیں لیکن موجودہ زمانہ میں کارخانوں اور کلوں اور نمبروں کی وجہ سے مثلی ہو گئی ہیں۔

مسئلہ : مثلی چیز خود متعین نہیں ہوتی مگر متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہے، مثلاً اشارہ کر کے کہا کہ گندم کی یہ بوری، جَو کا یہ ڈھیر، چاقوؤں کا یہ درجن، اب متعین ہو گئی اس میں تبدیلی کرنا جائز نہیں، بخلاف درہم و دینار کے (کہ) متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے۔[4]

ذوات القیم کی تعریف: سونے اور چاندی کے علاوہ ہر وہ چیز جس کا ہر فرد دوسرے فرد سے اپنے تشخص اور

---

[1] غير المالك لا يكون له التصرف في ملكه من غير إذنه ورضاه إلا لضرورة (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ، كتاب الدعوى، قبيل كتاب الشهادة، ج٦ص ٢٦٤)

[2] "مالِ حرام سے قیمت ادا کرنے کا حکم" کے عنوان کے تحت حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[3] (المادة ١٤٥) المثلي: ما يوجد مثله في السوق بدون تفاوت يعتد به (مجلة الأحكام العدلية،كتاب البيوع،المقدمة:في بيان الاصطلاحات الفقهية المتعلقة بالبيوع ،٣٢).

والتفصيل في جامع الفصولين،الفصل الثالث والثلاثون في أنواع الضمانات الواجبة،ما هو مثلي وما ليس بمثلي، ج٢ص ٧٢).

[4] كذا فى الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الفصل الثالث في معرفة المبيع والثمن والتصرف فيهما قبل القبض ،ج٣ص ١٢).

وكذا في المحيط البرهاني في الفقه النعماني (كتاب البيوع، الفصل الأول: فيما يرجع إلى انعقاد البيع، مبحث معرفة المبيع والثمن ،ج٦ص ٢٧٥).

خاصیت کے اعتبار سے ممتاز ہو۔[1]

مسئلہ : الماس اور تمام جواہر اور عطر وغیرہ، اگرچہ وزناً بکتی ہیں، تاہم قیمی ہیں ان کے آپس میں مماثلت نکلے بھی تو ایسے مخفی طریقوں سے (کہ) اس کا امتیاز کرنا نہ عوام کے لئے ممکن ہے نہ ہی اختلاف کے دعویٰ میں تصفیہ مسلم ہے۔

مسئلہ : قیمی اشیاء ہمیشہ متعین رہتی ہیں۔[2]

مسئلہ : قیمی چیزیں ذمہ میں واجب نہیں ہوتیں اس طرح ان کو قرض دینا بھی جائز نہیں۔[3]

مسئلہ : اگر اثمان (دراہم ودینار) ذمہ میں واجب الادا ہوں تو وہ متعین نہیں ہوں گے، اگر مثلی چیزیں واجب الادا ہو تو عین چیز ادا کی جائے گی، اگر نہ ہو تو ان کا مثل خرید کر ادا کریں اگر نہ مل سکیں تو قیمت ادا کریں، اگر قیمی چیز واجب الادا ہوں تو بعینہ وہی چیز ادا کرے، ورنہ اس کی جو بازاری قیمت ہو وہ ادا کرے۔

بیع کے بعض اصطلاحات

بیع میں مال کے دو نام ہیں: **۱۔ ثمن:** جو مال حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

۲: مبیع: جو مقصود ہے، بیع کا زیادہ تعلق اور قیام اسی کے ساتھ ہے، درہم ودینار کے عوض کوئی چیز خریدی جائے تو یہ دونوں ثمن قرار پائیں گے کیونکہ یہ ہمیشہ کے لئے ثمن ہیں، قیمی اشیاء ہمیشہ مبیع قرار پائیں گے،

---

[1] القيمي: ما لا يوجد له مثل في السوق أو يوجد لكن مع التفاوت المعتد به في القيمة. (مجلة الأحكام العدلية،كتاب البيوع، المقدمة:في بيان الاصطلاحات الفقهية المتعلقة بالبيوع ،٣٢).

والتفصيل في جامع الفصولين(الفصل الثالث والثلاثون في أنواع الضمانات الواجبة وكيفياتها،ما هو مثلي وما ليس بمثلي، ج٢ص ٧٢).

[2] وأما ما هو مبيع أبدا فهي الأعيان التي ليست من ذوات الأمثال والعدديات المتفاوتة.(كتاب البيوع، الفصل الثالث في معرفة المبيع والثمن والتصرف فيهما قبل القبض، ج٣ص ١٢).

وكذا في المحيط البرهاني(كما في الحاشية المتقدمة).

[3] ولا يجوز القرض في الأموال الغير المثلية أي يكون فاسدا كالحيوان والثياب والعقار والعدديات المتفاوتة والأموال التي تقرض بقرض فاسد على هذا الوجه يجب ردها للمقرض إذا كانت لم تزل موجودة في يد المستقرض.(درر الحكام في شرح مجلة الأحكام،الكتاب العاشر، الفصل الثالث،المبحث الرابع في حق الأموال التي يصح إقراضها أو لا يصح، ج٣ص٨٥).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، فصل في القرض، ج٥ص١٦١).

مثلی اشیاء اگر قیمی اشیاء کے مقابلہ میں ہوں تو ثمن ہوں گے اور درہم و دینار کے مقابلے میں ہوں تو مبیع قرار پائیں گے، اگر مثلی اشیاء کو آپس میں مبادلہ کریں تو ہر ایک مبیع ہیں۔[1]

مثلی چیزوں کو ثمن بنانے کی شرطیں:

مثلی چیزوں کو ثمن بنانے کی تین شرطیں ہیں:

ا۔ مقدار: اگر اشارے سے ثمن متعین نہ کرے تو مقدار کو بیان کرنا ضروری ہے ورنہ صرف یوں اشارہ کر دینا کافی ہے کہ اس صندوق میں یا اس تھیلی میں جو روپیہ یا اشرفی ہیں، اس کے عوض خریدتا ہوں۔

مسئلہ : اگر ثمن کی مقدار کو معلوم کرنا مشکل ہو تو بائع کو اختیار ہو گا کہ اگر کم سمجھے تو عقد کو فسخ کر دے (شامی)[2]

۲۔ توصیف: یعنی ثمن کے وصف کو بیان کرنا، یہ اس وقت ضروری ہے کہ کئی قسم کے مختلف قیمتوں کے سکے برابر رائج ہوں اور کسی متعین سکے کی طرف اشارہ بھی نہ کیا ہو، اگر ایک ہی قسم کا سکہ رائج ہے یا کئی قسم کے سکے تو ہیں لیکن سب کی قیمت برابر ہے یا اشارہ سے متعین کر دیا کہ یہ روپیہ دیں گے تو ان صورتوں میں وصف کو بیان کرنا ضروری نہیں۔[3]

واضح ہو کہ اگر ثمن اور مبیع دونوں اموال ربویہ میں سے ہوں جیسے سونا، چاندی، گندم اور جو وغیرہ، یا بیع سلم ہو تو اشارہ کافی نہیں ہے بلکہ مقدار اور وصف دونوں کو بیان کیا جائے گا۔

۳۔ تاجیل: یعنی ادھار معاملہ میں مدت ادا کا بیان کرنا شرط ہے تا کہ جلدی مطالبہ کرنے اور روکنے کے بارے میں نزاع پیدا نہ ہو۔[4]

---

[1] قد مرّ تخريجه.

[2] قد مرّ تخريجه قبلُ.

[3] "ومن أطلق الثمن في البيع كان على غالب نقد البلد"؛ لأنه المتعارف، وفيه التحري للجواز فيصرف إليه "فإن كانت النقود مختلفة فالبيع فاسد إلا أن يبين أحدهما"(الهداية في شرح بداية المبتدي، كتاب البيوع، ج٣ص ٢٤).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، ج١ص١٨٥).

[4] صح بثمن حال وبأجل معلوم) أي البيع..قيد بعلم الأجل؛ لأن جهالته تفضي إلى النزاع فالبائع يطالبه في مدة قريبة والمشتري يأباها فيفسد (البحر الرائق، كتاب البيوع، ج ٥ص٣٠١).

وكذا في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (كتاب البيوع،رقم المادة: ٢٤٦، ج١ص٢٢٨).

نقد وادھار کا ضابطہ

ا۔ ہر وہ عقد نقد ہے جس میں ایجاب و قبول کرتے وقت نقد کا لفظ بولا جائے جیسے یہ گھوڑا نقد سو روپے میں لے لیا۔[1]

۲۔ یا لیتے وقت قیمت پیش کر دی جائے کہ یہ ہزار روپے اور تھان کپڑے کا دیدو۔

۳۔ یا مال کسی کے ہاتھ بھیجا جائے کہ قیمت لے کر واپس آنا۔

۴۔ کچھ تصریح نہ کرے مثلاً یوں کہے کہ یہ گھوڑا سو کا خریدا۔

۵۔ جو مال ریلوے، ٹرک، ڈاک یا بائع کے نمائندہ کے ہاتھ منگوایا جائے۔

۶۔ مطلقاً عقد کر کے مال لے لیا مثلاً ایک تھان پانچ سو روپے میں طے کر کے مال اٹھالیا اور چلا گیا، بائع نے کچھ مزاحمت نہیں کی، پہلی تین صورتیں یقینی طور پر نقد ہیں اور آخری تین نقدیت پر محمول ہیں، پس اگر اسی مجلس میں قیمت کا ذکر ہوا بائع نے پوچھا قیمت کب دیں گے؟ یا خریدار نے خود ہی کہا کہ مہینہ کے آخر میں دوں گا، تو ادھار ہو جائے ورنہ نقد ہی رہے گا، لہٰذا ایسی صورت میں مدت کے مذکور نہ ہونے میں کوئی نقصان نہیں اور بائع کو ہر وقت مطالبہ کا حق ہو گا۔

مسئلہ ۸ : زید نے مال خریدا اور کہا کہ جب تم آدمی بھیجو گے یا حساب کر کے دو گے، رقم بھیج دی جائے گی، تو یہ نقد ہے۔

---

[1] مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نقد وادھار کا ضابطہ بیان فرمایا ہے اور وضاحت کے لئے نقد معاملہ کی سات مثالیں جبکہ ادھار معاملہ کی تین صورتیں ذکر فرمائی، اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عقد معاوضہ میں اصل یہ ہے کہ نقد ہو، مبیع وصول کرنے کے فوراً بعد فروخت کنندہ کو قیمت بھی مل جائے تاکہ معاوضہ کا اصل مفہوم انصاف وتوازن کے ساتھ برقرار رہے اس لئے ہر عقد معاوضہ نقد متصور ہو گا جب تک کہ اس میں ادھار کی شرط نہ لگائی جائے، اگر ادھار کی شرط لگائی گئی تو معاملہ نقد نہیں رہے گا بلکہ ادھار بن جائے گا، پھر شرط لگانے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ صراحتاً الفاظ میں شرط لگائے کہ مثلاً یہ چیز اتنے کی خریدی اور قیمت ایک ہفتہ بعد دوں گا اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایسی صراحت تو نہ کرے لیکن کسی معاملہ میں ادھار ہی کا رواج ہو۔

في السراج الوهاج إن الحلول مقتضى العقد وموجبه والأجل لا يثبت إلا بالشرط اهـ. البحر الرائق ، كتاب البيوع، ج٥ص ٣٠١.

وكذا في الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب البيوع، مطلب في الفرق بين الأثمان والمبيعات، ج٤ص ٥٣١.

ادھار: ا۔ ہر وہ عقد (ہے) جس کے ایجاب و قبول میں ادھار کا ذکر آجائے۔

۲۔ یا طریقہ لین دین میں ادھار ہونا معلوم ہو جائے، یا مذکورہ صورت نمبر ۴۔۵۔۶ میں دین کی بات مجلس عقد ہی میں ہو گئی، البتہ مدت ادا کو ذکر کرنا ضروری ہے ورنہ بیع فاسد ہو جائے گی۔

مسئلہ: صورت ۴،۵،۶ میں مجلس عقد ختم ہونے کے بعد ادا کی بات ہوئی یا ایجاب و قبول کے بعد قیمت ادا نہیں کی لیکن وعدہ ہوا، اب مدت فاسدہ کا فساد اصل عقد کے ساتھ ملحق نہ ہو گا اس لئے کہ عقد تمام ہو گیا۔[1]

مسئلہ: نقد معاملہ ہو مگر قیمت مجلس عقد میں ادا نہیں کی یا قیمت کی ادائیگی کے لئے جو وعدہ کیا تھا، وہ وعدہ پورا نہیں کیا، تو وعدہ خلافی کا تو گناہ ہو گا لیکن عقد میں اس کا اثر نہیں ہو گا۔

تعیین مدت کی (مختلف) صورتیں

پھر تعیین مدت کی چار صورتیں ہیں:

ا۔ صریحی: یعنی اتنے دنوں میں قیمت ادا کر دی جائے گی۔

۲۔ ضمنی: فلاں کام یا حساب کے ساتھ ادائیگی ہو گی جبکہ اس کام یا حساب کا وقت متعین ہے۔

۳۔ یعنی عادۃً جانتے ہیں کہ فلاں وقت میں ہی ادائیگی ہو گی، جیسے بعض سرکاروں، کارخانوں اور محکموں وغیرہ میں حساب وغیرہ کے اوقات مقرر ہیں۔

۴۔ عملی: یعنی جو عمل درآمد ہو، مثلاً زید بکر سے کچھ خریدتا ہے اور ماہانہ ہفتہ وار حساب چکا دیتا ہے، یہ تمام بیانات کافی ہیں، المعروف کالمشروط۔[2]

مسئلہ: اگر یہ کہا گیا کہ ایک ماہ کے بعد اور ایک سال کے اندر اندر ادا کر دوں گا تو اصل مدت ایک سال کی

---

[1] یعنی جبکہ مجلس عقد ختم ہونے کے بعد کوئی مجہول مدت مقرر کر دیں۔

بخلاف ما إذا باع مطلقا ثم أجل الثمن إلى هذه الأوقات حيث جاز؛ لأن هذا تأجيل في الدين وهذه الجهالة فيه متحملة بمنزلة الكفالة (الهداية في شرح بداية المبتدي ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ص ٥٠)

وكذا في فتح القدير (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج ٦ص٤٥٤)

[2] حضرات فقہاء کرام نے ادھار معاملہ کی صورت میں مدت متعین کرنے کو ضروری قرار دیا ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ ادائیگی کی مدت میں ایسی کوئی جہالت باقی نہ رہے جو باہمی جدال و نزاع کا باعث بن سکے، لہذا تعیین کی یہ چاروں صورتیں درست اور معتبر ہیں کیونکہ اس سے تعیین کا اصل مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

ہو گی لیکن ایک مہینہ کے بعد بھی مطالبہ کرنا جائز ہوگا۔

مسئلہ: اگر کل قیمت کو قسطوں میں ادا کرے تب بھی جائز ہے مثلاً ہزار روپیہ کل قیمت ہے، ماہانہ سو روپے ادا کرے اس طرح دس ماہ میں مکمل ہو جائے۔

مدتِ مجہولہ فساد بیع کا موجب ہے

ہر ایسی مدت غیر معتبر ہے جس کے وجود یا اس کے وقوع کے وقت میں تردد ہو اور ایسی مدت کا ذکر کرنا فساد عقد کا موجب ہے، مثلاً یوں کہے جب چاہو دیدینا، یا جب چاہیں گے دیدیں گے، یا جب نوکری ہو جائے یا جب مال مل جائے یا جب ہوا چلے یا جب بارش ہو جائے، جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ [1]

اس طرح مطلق عقد ہوا، قیمت کی ادائیگی کے بارے میں کوئی متعین بات نہیں ہوئی کہ جلدی دوں گا یا دیر سے دوں گا۔ [2]

یا وہ مدت عرفاً اور شرعاً معروف نہ ہوں جیسے کافروں کے تہوار، ہاں اگر وہ مدت بائع اور مشتری دونوں کو معلوم ہو اور جہل کا دعویٰ نہ کرے تو بیع صحیح ہے ورنہ فاسد ہے۔ [3]

مسئلہ: مدتِ فاسدہ میں نزاع واقع ہونے سے پہلے یا مدت ختم ہونے سے پہلے اس کی اصلاح جائز ہے (ہدایہ) مثلاً نوروز پر قیمت ادا کرنے کے وعدہ پر کوئی چیز خریدی (اب مدتِ فاسدہ کی وجہ سے بیع فاسد ہوئی) لیکن نوروز کے آنے سے پہلے ہی یا کوئی جھگڑا پیش آنے سے قبل ہی قیمت ادا کردی یا کوئی دوسری صحیح مدت

---

[1] صح بثمن حال وبأجل معلوم) أي البيع..قيد بعلم الأجل؛ لأن جهالته تفضي إلى النزاع فالبائع يطالبه في مدة قريبة والمشتري يأباها فيفسد (البحر الرائق، كتاب البيوع، ج ٥ص٣٠١).

وكذا في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (كتاب البيوع،رقم المادة: ٢٤٦، ج١ص٢٢٨).

[2] اس صورت میں بیع فاسد ہونے کی بظاہر کوئی بنیاد موجود نہیں، اگر ثمن کی نقد یا ادھار ادائیگی کے متعلق کچھ طے نہیں کیا گیا تو اس سے معاملہ فاسد نہیں ہوگا بلکہ معاملہ نقد قرار پائے گا، اور فروخت کنندہ کو کسی بھی وقت ثمن کے مطالبہ کرنے اور وصول کرنے کا اختیار حاصل ہوگا جیسا کہ نقد و ادھار کی صورتوں میں خود مؤلف رحمہ اللہ نے ذکر بھی فرمایا ہے، البتہ اگر ایجاب و قبول کے دوران ثمن کا صرف ادھار ہونا طے ہو جائے لیکن اجل متعین نہ کی جائے تو البتہ بیع فاسد ہو جائے گی، حضرت مؤلف رحمہ اللہ کا کلام اسی پر محمول کرنا انسب ہے۔

[3] لا يجوز تأجيل ثمن دين إلى النيروز والمهرجان وصوم النصارى وفطرهم والحصاد والدياس وقدوم الحاج لجهالة الأجل حتى لو كان كلاهما معلوما عندهم أي العاقدين صح البيع والأجل (منحة الخالق على البحر الرائق، ج٥ص ٣٠١).

وكذا في اللباب في شرح الكتاب (كتاب البيوع، ج٢ص٢٨).

متعین کر دی تو بیع صحیح ہو جائے گی۔[1]

مثلی اور قیمی اشیاء میں جواز بیع کی بارہ شرطیں

۱۔ مال مفید ہو، لہٰذا بے کار اور سڑی ہوئی گلی ہوئی چیزوں کا بیچنا جائز نہیں۔(ہدایہ)[2]

۲۔ قابل ملک ہو، لہٰذا آزاد آدمی کی بیع جائز نہیں۔[3]

۳۔ مال متقوم ہو، لہٰذا شراب اور خنزیر کی بیع درست نہیں۔[4]

۴۔ جائز الاستعمال ہو، لہٰذا مردار کی کھال کی بیع دباغت سے پہلے، بتوں کی بیع نا قابل پرستش بنانے سے پہلے، اور حشرات الارض کی بیع جبکہ اس سے کوئی نفع متعلق نہ ہو، جائز نہیں ہے۔[5]

۵۔ جائز البیع ہو، انسانی اجزاء اور حرم شریف کی زمین اور مساجد، کمال احترام کی وجہ سے ان چیزوں کو بیچنا جائز نہیں۔[6]

---

[1] ولو باع إلى هذه الآجال ثم تراضيا بإسقاط الأجل قبل أن يأخذ الناس في الحصاد والدياس وقبل قدوم الحاج جاز البيع أيضا . الهداية في شرح بداية المبتدي ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ص ٥٠). وكذا في البحر الرائق،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٦ص٩٧.

[2] البيع بالميتة والدم باطل، وكذا بالحر لانعدام ركن البيع وهو مبادلة المال بالمال، فإن هذه الأشياء لا تعد مالا عند أحد والبيع بالخمر والخنزير فاسد.الهداية،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٣ص ٤٢.

[3] ايضا.

[4] ايضا.

[5] وجلد الميتة قبل الدّبغ وبعده يباع وينتفع به(كنز الدقائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ص٤٢١).
وكذا في الدرر والغرر كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ص ١٧٢.

[6] *ان اشیاء کے بیع ناجائز ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ فروخت کنندہ کی ملکیت میں نہیں ہیں، مساجد اور حرم شریف کی زمین تو وقف ہے اور وقف تام ہو جانے کے بعد واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اس لئے وہ اس کا ملک ہی نہیں رہا، اسی طرح انسان اپنے اعضاء کا اس حد تک مالک نہیں کہ اس کو فروخت کر سکے۔*
"ولا يجوز بيع شعور الإنسان ولا الانتفاع بها" لأن الآدمي مكرم لا مبتذل فلا يجوز أن يكون شيء من أجزائه مهانا ومبتذلا. الهداية ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٣ص ٤٦.
وفي الشرنبلالية صرح رحمه الله تعالى ببطلان بيع الوقف، وأحسن بذلك إذ جعله في قسم البيع الباطل إذ (لا) خلاف في بطلان بيع الوقف لأنه لا يقبل التمليك والتملك، وغلط من جعله فاسدا. منحة الخالق، كتاب البيوع،قبيل أحكام البيع الفاسد ،ج٦ص ٩٨.

٦۔ تعین، تعین کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مبیع تبدیلی اور کمی وزیادتی سے محفوظ ہو جائے اور اشارہ سے بھی یہ تعین ہوتی ہے یعنی یوں کہے کہ گندم کی یہ بوری میں نے خریدی ہے، اور تعین کبھی قبضہ سے ہوتی ہے جیسے گھوڑا بیچنے کے بعد قبضہ میں دیدیا، اور تعین کبھی حصر سے بھی ہوتی ہے جیسے اس صندوق میں جو کچھ ہے، کبھی وصف بیان کرنے سے تعین ہو جاتی ہے جیسے فلاں نمبر کی پلیٹ۔

لیکن مثلیات میں مطلق وصف (استعمالی چاول، شاہجہاں پوری شکر درجہ اول) کافی ہے، اور قیمی اشیاء میں ایسا وصف بیان کرنا ضروری ہے جو اسے ممتاز اور جدا کردے، مثلاً وہ گھوڑا جو تم میرے گھر پر فلاں تاریخ کو دیکھا تھا وہ تمہارے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، یا وہ الماری جو میرے دفتر میں رکھی ہوئی ہے، وہ قلمی گلستان جس پر طلائی نقشہ ہے، غرض یہ ہے کہ وصف کے بیان میں اس حد تک مبالغہ ضروری ہے کہ جہالت بالکل دور ہو جائے۔ [1]

مسئلہ: جب وصف یا مقدار یا دونوں اشارے یا حصر کے ساتھ جمع ہوں تو اس کی چار صورتیں ہیں:

ا۔ ثمن میں تو وصف اور مقدار مذکور لازم ہو گی، اشارہ اور حصر باطل ہوں گے جیسے یہ سکہ چہرہ دار یا تھیلی والے، تو اشارہ لغو ہو جائے گا اور چہرہ دار لازم ہے یعنی جن کی طرف اشارہ کیا تھا، اگر چہرہ دار نہ تھا تو بھی چہرہ دار دینے ہوں گے۔ [2]

وكذا في الهداية . كتاب الوقف، ج٣ص ١٨.

[1] والذي يظهر من كلامهم تفريعا وتعليلا أن المراد بمعرفة القدر، والوصف ما ينفي الجهالة الفاحشة وذلك بما يخصص المبيع عن أنظاره، وذلك بالإشارة إليه لو حاضرا في مجلس العقد، وإلا فبيان مقداره مع بيان وصفه لو من المقدرات، كبعتك كر حنطة بلدية مثلا بشرط كونه في ملكه، أو ببيان مكانه الخاص كبعتك ما في هذا البيت، أو ما في كمي أو بإضافته إلى البائع كبعتك عبدي، ولا عبد له غيره، أو بيان حدود أرض ففي كل ذلك تنتفي الجهالة الفاحشة عن المبيع، وتبقى الجهالة اليسيرة التي لا تنافي صحة البيع لارتفاعها بثبوت خيار الرؤية، (حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب البيوع، ج٤ص ٥٣٠).

وكذا في البحر الرائق ،كتاب البيوع، ج٥ص ٢٩٤).

[2] کیونکہ ثمن اس معنی میں تو متعین نہیں ہوتا کہ خریدار کو اسی متعین سکہ کا استحقاق پیدا ہو جائے تاہم اوصاف اور مقدار کے اعتبار سے متعین ہو جاتا ہے یعنی جو کچھ اوصاف اور مقدار بیان کی جائے خریدار اس کا مستحق قرار پائے گا، لہٰذا مذکورہ صورت میں اشارہ باطل ہے کیونکہ وہ خاص سکہ متعین نہیں ہوا اور چہرہ دار وغیرہ جو صفت بیان کی ہے اس کی پابندی ضروری ہے۔

وإنما لا يتعينان في عقود المعاوضات في حق الاستحقاق وإن عينت وتتعين في حق بيان القدر والجنس والصفة وهذا عندنا. تحفة الفقهاء، كتاب البيوع، حكم البيع ،ج٢ص٣٨.

۲۔ مثلی اور قیمی میں اگرچہ وہ چیز سامنے موجود ہے، لیکن اس کی مقدار اور خوبی کو ہر شخص بادی النظر میں نہ سمجھ سکے۔

۳۔ یا وہ نظر سے مخفی ہو تو ایسی صورت میں بیان وصف معتبر ہے، لہٰذا اگر ظاہر کے خلاف ہو یا بیع کی ذات بدلی ہوئی ہو جیسے کہا گھوڑا، نکلا بیل، یا چکن کا تھان کہا گیا تھا (اور) نکلا کوئی دوسرا کپڑا، تو بیع منعقد نہیں ہو گی (ہدایہ) اور اگر وصف بدلا ہوا ہو مثلاً کہا تنزیب قسم اول (ایک قسم کا کپڑا) اور نکلے قسم دوم، تو مشتری کو اختیار ہو گا چاہے لے چاہے واپس کر دے۔ (ہدایہ)[1]

۴۔ مبیع نظر کے سامنے ہے اور مقدار مذکور بلا تکلف دکھائی دے رہی ہے تو اب اشارہ معتبر ہو گا اور بیان لغو ہے۔[2]

مسئلہ: بائع نے کہا کہ یہ چکن[3] کے دو تھان ہیں اور نکلا تنزیب، اور کہا کہ یہ چار تھان مارکین کے اور نکلا نین سکھ[4]، بیع تمام ہو گئی۔

مسئلہ: جب بیان میں ابہام ہو یا کئی احتمال ہوں تو بیع مکمل نہ ہو گی، جیسے کہا ان دونوں تھانوں میں سے کوئی ایک تھان۔ یا یہ تھان روپیوں سے خریدے ہیں، یا جو قیمت بازار میں ہو یا جو اشتہار میں درج ہو، کھاتے یا

وكذا في بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم البيع ، ج٥ص٢٣٣).

[1] ومن باع جارية فإذا هو غلام" فلا بيع بينهما، بخلاف ما إذا باع كبشا فإذا هو نعجة حيث ينعقد البيع ويتخير. والفرق ينبني على الأصل الذي ذكرناه في النكاح لمحمد رحمه الله وهو أن الإشارة مع التسمية إذا اجتمعتا ففي مختلفي الجنس يتعلق العقد بالمسمى ويبطل لانعدامه، وفي متحدي الجنس يتعلق بالمشار إليه وينعقد لوجوده ويتخير لفوات الوصف كمن اشترى عبدا على أنه خباز فإذا هو كاتب، (الهداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٣ص ٤٧).

وكذا في فتح القدير (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ص ٤٣١) . وكذا في غمز عيون البصائر و الأشباه والنظائر (الفن الثالث، أحكام الإشارة، ج٣ص٤٥٧).

[2] (المادة ٦٥) الوصف في الحاضر لغو وفي الغائب معتبر. مثلا: لو أراد البائع بيع فرس أشهب حاضر في المجلس وقال في إيجابه: بعت هذا الفرس الأدهم وأشار إليه , وقبل البائع صح البيع ولغا وصف الأدهم, أما لو باع فرسا غائبا وذكر أنه أشهب والحال أنه أدهم , فلا ينعقد البيع. (مجلة الأحكام العدلية ،المقالة الثانية في القواعد الكلية، رقم المادة: ٦٥، ص ٢٣).

وكذا في الهداية، (كتاب الايمان، باب اليمين في الدخول والسكنى، ج٢ص٣٢١)

[3] چکن: بیل بوٹے کا کام۔ کشیدہ کاری یا سوزن کاری۔ بیل بوٹوں والا کام۔ (فیروز اللغات، ص۵۳۱)

[4] نین سکھ: ایک قسم کا عمدہ باریک کپڑا۔ خاصہ (فیروز اللغات، ص۱۳۹۷)

سر ٹیفکیٹ میں جو لکھی ہوئی ہو، یا فلاں جو قیمت بتائے، یا جتنے میں تم لیتے ہو، یا جس قیمت پر بک جائے، ان تمام صورتوں میں اگر دونوں کو اسی مجلس میں علم صریح یعنی متعین اور واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ اتنے میں بیع ہوئی ہے تو بیع منعقد ہو گی ورنہ فاسد۔[1]

مسئلہ: گندم کا ایک ڈھیر ہے، کہا کہ فی من ایک روپیہ کے حساب سے یہ تمام گندم بیچا ہے، تو صرف ایک من میں بیع لازم ہو گی کیونکہ کل کی مقدار معلوم نہیں ہے، البتہ کسی ذریعے سے مجلس عقد میں کل مقدار معلوم ہو جائے تو بیع صحیح ہو جائے گی، لہٰذا اگر زید نے کہا کہ یہ گندم میں نے ایک من سو روپے کے حساب سے فروخت کیا اور بکر نے کہا کہ میں نے خریدا تو دونوں میں سے کوئی بھی خریدنے اور فروخت کرنے پر مجبور نہ ہو گا کیونکہ یہ بیع صِرف ایک من میں لازم ہوئی ہے۔[2]

فائدہ: کبھی قیمت صراحت عرفی (کے ساتھ معلوم) ہوتی ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شہر میں ایک چیز متعین قیمت پر بکتی ہے جس میں کسی کو تردد نہیں تو قیمت کے ذکر کے بغیر ہی وہ قیمت خود لازم ہو جائے گی۔[3]

---

[1] کیونکہ مبیع اور ثمن کو اس حد تک متعین کرنا ضروری ہے کہ باہمی نزاع واختلاف کا باعث نہ بن جائے جیسا کہ پہلے باحوالہ ذکر کیا جا چکا ہے اور اس طرح مبہم چھوڑنے کی صورت میں تعیین نہیں ہوتی اس لئے اگر مجلس کے آخر تک بھی یہی ابہام برقرار رہا تو بیع فاسد ہو جائے گی۔

[2] ومن باع صبرة طعام كل قفيز بدرهم جاز البيع في قفيز واحد عند أبي حنيفة إلا أن يسمي جملة قفزانها وقالا يجوز في الوجهين" له أنه تعذر الصرف إلى الكل لجهالة المبيع والثمن فيصرف إلى الأقل وهو معلوم، وإلا أن تزول الجهالة بتسمية جميع القفزان أو بالكيل في المجلس. (الهداية ،كتاب البيوع، ج٣ص ٢٤)

" وكذا في مجمع الأنهر (كتاب البيوع، ج٣ص ١٠).

فائدہ: یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف ہے صاحبین کے نزدیک پورے ڈھیر میں بیع درست ہو جائے گی، علامہ میدانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قوت دلیل کے لحاظ سے یہی قول درست ہے لیکن یسر وسہولت کے اعتبار سے صاحبین کا موقف راجح ہے اس لئے دونوں قول مصحح اور مفتی بہ ہیں۔(ملاحظہ فرمائیں: اللباب فی شرح الکتاب، کتاب البیوع، ج۲ص۷)

[3] وفي شرح الشافي لو باع بمثل ما باع فلان إن كان شيئا لا يتفاوت كالخبز واللحم يجوز. (الفتاوى الهندية، كتاب البيوع،الفصل الثامن في جهالة المبيع أو الثمن، ج٣ص ١٢٧).

وفي فتاوى قاضيخان: رجل اشترى شيئا بقيمته أو بحكمه أو بما يريد أو بما يرضى لا يجوز ..أو باع بثوب أو كر حنطة أو باع برأس ماله أو بما اشتراه فلان أو بمثل ما اشترى فلان أو بمثل ما يبيع الناس لا يجوز البيع إلا أن يكون شيئا لا يتفاوت ثمنه كالخبز واللحم. كتاب البيوع،الفصل الأول في فساد البيع بجهالة أحد البدلين ،ج٢ص ٦٩.

تعیین کی تین صورتیں:

ا۔اشارے سے متعین کرے مثلا یہ چیز۔

۲۔اوصاف بیان کر کے مثلاً فلان قسم کا کپڑا۔

۳۔تقدیر یعنی مقدار بتادے کہ اتنی مقدار،ایک کلو دو کلو۔

پس ثمن اور مثلی چیزوں میں پہلی بات (یعنی اشارہ) کی ضرورت نہیں جبکہ باقی دونوں کی ضرورت ہے اور قیمی چیزوں میں تینوں باتوں کی ضرورت ہے۔[1]

مسئلہ : اگر مبیع یا اس کا نمونہ سامنے موجود نہ ہو ویسے ہی بغیر دیکھے خرید لیا تو خیارِ رؤیت باقی رہے گا۔[2]

۷۔ تعجیل: مطلب یہ ہے کہ مبیع مشتری کے حوالہ کرنے کے لئے کوئی مدت لازم نہ کرے، تو ایسی صورت میں یہ دیکھا جائے گا اگر مبیع جنس ثمن سے ہے (مثلاً روپیہ دے کر ریزگاری ادھار خریدے) یا بیع سلم۔ یا مستصنع (یعنی آرڈر پر خریدنا) تو وعدہ کرنا صحیح ورنہ مبیع کو بعد میں کسی وقت ادا کرنے کے وعدہ سے بیع فاسد ہو جائے گی، کیونکہ مبیع کو فی الحال حوالہ نہ کرنا یا تو اس وجہ سے ہو گا کہ بائع مبیع سے کچھ اور فائدہ اٹھائے یا پھر مبیع موجود نہیں کہیں سے خریدنا اور تیار کرانا ہے تو ایسی بیع کے فساد میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔

ہاں البتہ اگر مبیع کے حوالہ کرنے میں تاخیر کی وجہ یہ ہو کہ ابھی تک قیمت پوری وصول نہیں ہوئی یا چابی موجود نہیں، یا شرائط طے کرنا باقی ہے یا مقام حوالگی تک لے جانے کے لئے مہلت درکار ہے تو چونکہ یہ عذر ہے وعدہ نہیں ہے، لہٰذا مشتری کا حق قبضہ ثابت ہے اور ان اعذار کی بناء پر تاخیر ہو رہی ہے تو بیع فاسد نہ ہو گی جبکہ وعدہ میں حق طلب نہیں ہوتا ہے۔[3]

---

[1] مرّ تخريجه.

[2] من اشترى شيئا لم يره فله الخيار إذا رآه إن شاء أخذه وإن شاء تركه (البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية،ج٦ص ٢٨).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية،ج ٤ص٥٩٤).

[3] (ومن باع عينا على أن لا يسلمها إلى شهر، أو إلى رأس الشهر فالبيع فاسد) ؛ لأنه لا فائدة للبائع في تأجيل المبيع، وفيه شرط نفي التسليم المستحق بالعقد (الجوهرة النيرة ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج١ص ٢٠٣).

وكذا في النهر الفائق (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ص ٤٣٧).

للبائع حق حبس المبيع حتى يقبض الثمن إذا كان الثمن حالا، (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم البيع،ج٥ص ٢٣٧)

مسئلہ : مبیع کا مجلس عقد میں موجود ہونا یا فوری قبضہ میں دیدینا ضروری نہیں، ہاں البتہ تعین مشتری کے بعد حق قبضہ فوراً دیدیا جائے چاہے قبضہ اسی وقت کرے یا بعد میں کرے۔[1]

۸۔ مال معدوم نہ ہو: جیسے بے موسم کے پھل، یا گھوڑے کا جو بچہ پیدا ہوگا وہ آپ کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، یا اس درخت میں جو پھل لگے گا، یا کتاب چھاپنے کے بعد فروخت کریں گے، یا کھالیں، ہڈیاں، یا گوڈر (یعنی پھٹا پرانا کپڑا وغیرہ) وغیرہ کو فراہمی سے پہلے ہی فروخت کردے تو یہ جائز نہیں ہے۔[2]

ہاں البتہ جو چیز تھوڑی تھوڑی کرکے پیدا ہوا کرتی ہے ایک دفعہ میں نہیں ہوتی جیسے گلاب کے پھول وغیرہ، ان میں معدوم موجود کے تابع ہیں اس لئے ایسے معدوم کی بیع موجود کے تابع ہوکر جائز ہے (ہدایہ)[3]

۹۔ غیر موجود نہ ہو: یعنی بازار میں تو ہے مگر بائع کے پاس نہ ہو، اس خیال سے بیچنا کہ بازار سے خرید کر مشتری کے حوالہ کرے گا۔

اس کی کئی صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ مال دوسرے کا ہے اور قبضہ بھی مالک کا ہے۔

---

[1] مبیع کو مجلس عقد میں قبض کرنا صرف بیع صرف میں ضروری ہے، دیگر بیوعات میں قبض کرنا کوئی ضروری نہیں حتی کہ اموال ربویہ میں بھی صرف تعیین کافی ہے تقابض لازم نہیں، قبض کرنے کی ضرورت تب پیش آتی ہے جبکہ خریدار اس چیز کو کسی پر فروخت کرنا چاہے۔

القبض ليس بشرط في البيع. درر الحكام في شرح المجلة، رقم المادة: ٢٦٢، ج١ص٢٤٩.

[2] ومنها بيع المعدوم الذي انعقد سبب وجوده أو ما هو على خطر الوجود كبيع المضامين والملاقيح ونتاج الفرس لما روي عن النبي عليه السلام أنه نهى عن بيع المضامين والملاقيح وبيع حبل الحبلة. تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ص ٤٩.

وكذا في بدائع الصنائع (كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه، ج٥ ص١٣٨).

[3] إذا اشترى ثمار بستان..وبعض الثمار قد خرج وبعضها لم يخرج بعد، هل جاز هذا البيع؟ ظاهر المذهب أنه لا يجوز، وكان شمس الأئمة الحلواني رحمه الله يفتي بجوازه في الثمار والباذنجان والبطيخ وغير ذلك، وكان يزعم عن أصحابنا رحمهم الله، وهكذا عن الإمام الجليل أبي بكر محمد بن الفضل البخاري أنه كان يفتي بجواز هذا البيع، وكان يقول: أجعل الموجود أصلاً في هذا العقد وما يحدث بعد ذلك تبعاً،(المحيط البرهاني، كتاب البيوع،الفصل السادس: فيما يجوز وما لا يجوز بيعه، ج٦ص٣٣٤).

وكذا في جامع الفصولين(الفصل الثاني والثلاثون في بيع الغصب والرهن والمستأجر وبيع الأرض المدفوعة مزارعة، ج٢ص٥٨).

۲۔ مال تو دوسرے کا ہے لیکن اپنے قبضہ میں ہے جیسے چوری کا یا غصب شدہ مال، امانت، عاریت، رہن اور کرایہ وغیرہ کسی وجہ سے دوسرے کا مال اپنے قبضہ میں ہے، ان صورتوں میں دوسرے کی ملک کو اپنے نام سے بیچنا جائز نہیں ہے۔[1]

۳۔ اپنا مملوک غیر کے قبضہ میں ہے مگر قبضہ مضمون ہے جیسے چور یا غاصب کے ہاتھ میں ہے یا وہ مال غیر کے حق کے ساتھ مشغول ہے۔ جیسے مرہون یا مستاجر کے ہاتھ میں، ان کا بیچنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک غیر کا قبضہ ختم نہ کروالے[2]، ہاں اگر اپنی مملوک پر غیر کا قبضہ نیابۃً ہے جیسے ملازم، محافظ، اہل خانہ یا عاریت پر لینے والا تو گویا کہ چیز اپنے قبضہ میں ہے لہٰذا اس کو فروخت کرنا جائز ہے۔

۱۰۔ متردد الوجود نہ ہو: جیسے مادوں جانوروں کے پیٹ کا حمل، یعنی حاملہ ہے لیکن معلوم نہیں کہ پیٹ میں ہے یا ہَوا ہے، اس لئے جننے سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے۔[3]

۱۱۔ غیر مقدور التسلیم نہ ہو: مثلاً اپنا بھاگا ہوا غلام یا ہوا میں اڑتا ہوا پرندہ، یا اپنے مملوکہ میں چھوڑی ہوئی مچھلی، ان چیزوں کو اسی حالت میں فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ ان کو پکڑنے کے لئے حیلہ کرنا ہوگا اور حیلہ کا درست ہونا کوئی ضروری نہیں جبکہ مبیع کو بائع کے حوالہ کرنا واجب ہے، ہاں البتہ قبضہ میں آجانے کے بعد بیچے تو جائز ہے۔[4]

---

[1] (من شرائط انعقاد البيع)أن يكون مملوكا في نفسه (الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الفصل الاول، ج٣ص ٢).
وكذا في النهر الفائق (كتاب البيوع، ج٣ص٣٣٦).

[2] لعدم القدرة على التسليم بدون ضرر وهو شرط كما سيأتي عن قريب.

[3] مرّ تخريجه تحت بيع المعدوم فليراجع.

[4] والفساد بالمعنى الأعم يثبت بأسباب منها .. عدم القدرة على التسليم (البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ص ٧٥).
وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص ٦٠).
(ولا) يجوز (بيع الآبق) لورود النهي ولعجزه عن التسليم (إلا ممن يزعم أنه) أي الآبق (عنده) فإنه حينئذ يجوز لأن المنهي بيع آبق في حق المتعاقدين وهو غير آبق في حق المشتري ولأنه انتفى العجز لكونه مقبوضا (مجمع الأنهر ، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص ٥٨).
وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص ٧٠).

مسئلہ: اگر ایک شخص کا پرندہ اڑ گیا یا غلام بھاگ گیا اور وہ زید کے قبضہ میں ہے تو اس کو زید ہی کے ہاتھ فروخت کر دیا تو جائز ہے اس لئے کہ زید کو پہلے سے قبضہ حاصل ہے۔

مسئلہ: زید کا کبوتر اڑ کر بکر کے کبوتر خانہ میں دوسرے کبوتروں کے ساتھ چلا گیا، اب زید اس کبوتر کو بکر کے ہاتھ فروخت کر دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مسئلہ: زید نے بکر سے کہا کہ تم اپنا کبوتر اڑا دو اور جس کے قبضہ میں جائے اس کے حق میں مباح کر دو، یا اپنے تالاب کی مچھلیاں ہر پکڑنے والے کے حق میں مباح کر دو، اس کے عوض میں تم کو دس روپے دیدوں گا، بکر نے شرط قبول کر لی تو یہ بیع صحیح ہو گی کیونکہ مبیع مقدور التسلیم ہونا صحت بیع سے مانع تھا، اب تسلیم کی شرط ہی ختم ہو گئی۔[1]

مسئلہ: پالتو کبوتر ذرا دور تک اڑا دئے جائیں، اس حالت میں بھی وہ مقبوض کے حکم میں ہے کیونکہ واپس آنے کے عادی ہیں اور جو بات عادت سے ثابت ہو متعین کی طرح ہے۔

تنبیہ: ان قواعد سے مروجہ اکثر معاملات فاسد نظر آتے ہیں، مگر سب معاملات ایسے نہیں ہیں، فصل معاہدہ بیع میں اس کی تفصیل مذکور ہو گی (انشاءاللہ)۔

مسئلہ: مبیع کے کسی جز یا کل سے بیع کی قیمت ادا کرنا جائز ہے، مگر اس کو مشروط کرنا جائز نہیں مثلاً یوں کہے یہ جو بکری خرید رہا ہوں اس کی کھال فروخت کر کے بکری کی قیمت ادا کر دوں گا، یا اس بکری کی قیمت ہزار روپے اور اس کی کھال ثمن ہے۔

۱۲۔ مباح الاصل نہ ہو: جیسے دریا کا پانی، جنگل کی گھاس، جنگلی جانور، کیونکہ یہ تینوں چیزیں قبضہ میں لانے اور محبوس کرنے سے پہلے ہر ایک لے لئے مباح ہے جو چاہے ان کو حاصل کر کے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لہٰذا ان کو

---

[1] والأصل أن الإباق إنما يمنع جواز البيع إذا كان التسليم محتاجا إليه بأن أبق من يد المالك ثم باعه المالك فأما إذا لم يكن التسليم محتاجا إليه كما في مسألتنا يجوز البيع. اهـ. (البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ص ٨٦).

وكذا في النهر الفائق (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٣ص ٤٢٧).

إن باع طيرا له يطير في الهواء إن كان ذا جناح يعود إلى بيته ويقدر على أخذه من غير تكلف جاز بيعه وإلا فلا (فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، الفصل الاول، ج٢ص ٧٥).

وكذا في فتح القدير ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ص ٤١٠).

قبضہ میں لانے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے ان کے متعلق مزید احکام مباحات کی بحث میں آئیں گے انشاءاللہ تعالیٰ۔[1]

مسئلہ: اگر مبیع منقولی چیزوں میں سے ہوں تو قبضہ سے پہلے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے لہٰذا اگر زید نے دو گھوڑے خریدے، ابھی ان پر قبضہ نہیں کیا، کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ بیع منعقد نہیں ہوئی۔[2]

مسئلہ: زید نے کوئی زمین خریدی اس پر قبضہ سے پہلے کسی اور کے ہاتھ کر دیا یا رہن رکھ دیا یا ہبہ کر دیا، تو یہ معاملات صحیح ہیں کیونکہ زمین غیر منقولی اشیاء میں سے ہے۔[3]

مسئلہ: میراث اور مہر کے مال میں قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے۔[4]

---

[1] وأن يكون مملوكاً في نفسه موجوداً ليخرج بيع الكلأ ولو في أرضه (النهر الفائق ،كتاب البيوع، ج٣ص٣٣٦).
وكذا في الفتاوى الهندية،(كتاب البيوع، الفصل الاول،ج٣ص ٢).

[2] (صح بيع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه) من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار، حتى لو كان علوا أو على شط نهر ونحوه كان كمنقول ف (لا) يصح اتفاقا ككتابة وإجارة و (بيع منقول) قبل قبضه ولو من بائعه (الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب البيوع،فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض،ج٥ص١٤٧).
وكذا في تحفة الفقهاء (كتاب البيوع، حكم البيع،ج٢ص ٤٠).

[3] انظر الحاشية المتقدمة.

[4] اصل ضابطہ یہ ہے کہ ایجاب و قبول کے بعد خریدار مبیع کا مالک بن جاتا ہے اور مالک اپنی ملکیت میں کوئی بھی جائز تصرف کر سکتا ہے لہٰذا قبض کی شرط لگانے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ قبضہ سے پہلے تصرف کرنے میں یہ خدشہ موجود تھا کہ مبیع ہی ہلاک ہو جائے اور قبض نہ پائے جانے کی وجہ سے یہ تصرف بالکل بے کار ہو جائے اس لئے اس خدشہ کے پیش نظر فقہائے کرام نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ اگر مبیع مالک کی ملکیت میں کسی ایسے عقد کے ذریعے سے آئی ہو کہ مبیع کے ہلاک ہونے سے وہ عقد بھی فسخ ہو جاتا ہو تو ایسی صورت میں قبضہ سے پہلے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں، اور اگر وہ عقد مبیع کے ہلاک ہونے سے فسخ نہیں ہوتا تو اس میں قبضہ سے پہلے بھی تصرف کرنا درست ہے، جیسے مہر و میراث، نیز ہر تصرف بھی ناجائز نہیں بلکہ بعض تصرفات جائز بھی ہیں جس کی تفصیل انشاءاللہ ذکر کر دی جائے گی۔
كل عوض ملك بعقد لا ينفسخ العقد فيه بهلاكه قبل القبض يجوز التصرف فيه كالمهر، وبدل الخلع، وبدل العتق، وبدل الصلح عن دم العمد..وكذلك الميراث يجوز التصرف فيه قبل القبض (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع،شرائط الصحة،ج٥ص ١٨١).وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع،فصل في بيان التصرف في المبيع والثمن قبل قبضه،ج٦ص١٢٦).

مال کے پانچ اقسام

۱۔مال متقوم بدون صناعت: یعنی وہ مال جو بدوں کسی کاریگری کے قیمتی ہیں، جیسے کپڑا، غلہ، لوہا،تانبا وغیرہ۔

۲۔مال متقوم بصناعت: جو مال صنعت کاری سے قیمتی بنا ہو جیسے ٹوپی، عبا، قمیص، پکا ہوا کھانا، آٹا، ستو، لوہے کے اوزار، تانبے کے برتن وغیرہ، ان کے احکام پہلے گذر چکے ہیں۔

آلات معصیت کا حکم

۳۔مال متقوم وصناعت غیر متقوم: یعنی مال فی نفسہ تو قیمتی ہے لیکن صنعت کاری گناہ کے کاموں کے لئے ہونے کی وجہ سے یہ مال غیر متقوم بن گئے، جیسے بت، باجے، کنگوے[1]، ان کی بیع مالیت کو دیکھتے ہوئے نافذ ہونی چاہئے اور صناعت ممنوعہ کو دیکھتے ہوئے عاقدین گناہگار ہوں گے، اور مالیت کے مقابلے میں قیمت واجب الادا ہیں اور اس وصف ممنوع کی وجہ سے غیر ثابت ہیں، یا ڈھول کی قیمت اس کے لکڑی وغیرہ کا اعتبار کرتے ہوئے ثابت اور باعتبار صناعت ساقط ہے اور عاقدین معصیت پر تعاون کے ارادہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوں گے۔[2]

مسئلہ: ایسے اشیاء جو صرف گناہ کے کام میں استعمال ہوتے ہیں، ان کو خریدنا، فروخت کرنا اور کرایہ پر دینا ناجائز ہے۔[3]

مسئلہ: جب یہ آلات معاصی ٹوٹ کر ختم ہو جائیں اب ان کو کسی دوسرے کام کے لئے خرید نا جائز ہے۔[4]

---

[1] کنکوا: کاغذ کا بنا ہوا پتنگ۔ گڈی۔ تکل۔ ایک بوٹی (فیروز اللغات، ص۱۰۳۶)

[2] ونظيره بيع الخشب الذي يصلح لاتخاذ المزمار فإنه لا يكره وإن كره بيع المزامير. (بدائع الصنائع،كتاب البيوع، قبيل حكم البيع، ج٥ص ٢٣٣)

وكذا في البحر الرائق (قبيل كتاب اللقيط، ج٥ص ١٥٤).

[3] لأن الانتفاع بهذه الأشياء حرام ومحليته يعتمد جواز الانتفاع بها..والحاصل:أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع (المحيط البرهاني ، كتاب البيوع، الفصل السادس، ج٦ص٣٤٧).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (باب البيع الفاسد،مطلب في بيع دودة القرمز، ج٥ص ٦٨).

[4] (وضمن بكسر معزف) بكسر الميم آلة اللهو ولو لكافر ابن كمال (قيمته) خشبا منحوتا (صالحا لغير اللهو)..(وصح بيعها) (الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الغصب، ج٦ص٢١١).

وكذا في الدر والغرر(كتاب الغصب قبيل كتاب الاكراه، ج٢ص ٢٦٨).

۴۔مال نہ ہو مگر صناعت مباح ہو: یعنی فی نفسہ مال نہیں ہے لیکن صنعت کاری کے ذریعے ان کو مباح کام کے لئے کار آمد بنایا، جیسے مٹی کے برتن، وہ کھلونے جن میں کسی جاندار کی تصویر نہ ہو، پتوں کا پیالہ، گودڑ کی بتیاں وغیرہ، ان سب کی بیع صحیح اور نافذ ہیں، مگر ناقابل استعمال ہو جانے کے بعد چونکہ ان کی حیثیت مال کی نہیں ہے اس لئے ان کی بیع حلال نہیں۔[1]

مسئلہ: مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو فروخت کرنا حلال نہیں ہے الّا یہ کہ وہ ٹوٹے ہوئے کسی خاص غرض کے لئے قابل انتفاع ہو تو بیع صحیح ہو گی۔

۵۔نہ مال ہے نہ صنعت مباح: یعنی ذات کے اعتبار سے بھی مال نہیں ہے اور جس کام کے لئے بنایا گیا ہے وہ کام بھی ناجائز حرام ہے، جیسے گنجفہ، کھیل کے گولے اور پتے، لکڑی اور ہڈی کی بنی ہوئی نردیں اور مہریں، مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بت، ردی کاغذ پر ذی روح کی تصویر، ان سب کی خرید و فروخت حرام ہے اور بیع باطل ہے۔[2]

مسئلہ: اگر کسی قسم کے نوٹ کا استعمال حکومت کی طرف سے ختم ہو جائے اب اس کے ذریعہ لین دین نہیں ہوتا تو چونکہ اس کی مالیت ختم ہو گئی اس لئے اس کی بیع باطل ہے البتہ گناہ نہیں۔[3]

ذات مبیع اور وصف مبیع کی تعریف

مبیع کی ذات اور وصف میں فرق کرنا یہ تجارت کا ایک اہم اور ضروری مسئلہ ہے، چونکہ اس کے

---

[1] فقہائے کرام نے مٹی کو مال شمار نہیں فرمایا، اس لئے اس کے فروخت کرنے کو بھی ناجائز قرار دیا، مؤلف رحمہ اللہ کا ذکر کردہ یہ مسئلہ بھی اسی پر مبنی ہے، لیکن مال نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگ اس میں زیادہ رغبت نہیں رکھتے نہ ہی اس کے بدلے مال خرچ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہر جگہ مفت مٹی دستیاب ہوتی ہے لوگوں کے اس تعامل کے علاوہ مٹی میں فی نفسہ کوئی ایسی عنصر موجود نہیں جو فساد بیع کا مقتضی ہو، لہذا اگر کہیں لوگوں کا طرز عمل اس کے خلاف ہو جائے اور وہ اس کو مال سمجھنے لگے تو وہاں اس کی بیع جائز ہو گی۔

فتاویٰ شامی میں ہے: (قوله فخرج التراب) أي القليل ما دام في محله وإلا فقد يعرض له بالنقل ما يصير به مالا معتبرا ومثله المال.(حاشية ابن عابدين على الدر المختار كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص ٥١).

[2] انظر الحاشية رقم:١٣٩.

[3] شاید گناہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہو کہ اس میں پہلی مثالوں کی طرح کسی گناہ اور ناپاک چیز کا فروغ نہیں ہوتا، البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ معاملہ بیعِ باطل ہو اور ساتھ گناہ بھی نہ ہو، اس کی کوئی تصریح نظر سے نہیں گذری، نیز حکومت کی طرف سے استعمال ختم ہونے سے ثمنیتِ عامہ تو ختم ہو جائیگی لیکن مالیت کا مکمل طور پر اس طرح ختم ہو جانا کہ بیع باطل ہو جائے، مشکل ہے، فتح القدیر میں بیع عینہ کے بحث کے ضمن میں لکھا ہے: لو باع كاغدة بألف يجوز ولا يكره.(كتاب الكفالة، ج٧ص٢١٢).

متعلق فقہاء کی عبارتیں نہایت دقیق اور باریک ہیں، اس لئے ہم آسان طریقہ پر اس کی اصلی غرض وغایت کو ظاہر کردیتے ہیں۔

مال میں دو اعتبار ہوتے ہیں:

ا۔ ذاتِ شئی: تبادلہ میں اسی ذات کا اعتبار ہوتا ہے، قیمت ذات ہی کے مقابلے میں ہوتی ہے۔

۲۔ وصفِ شئی: اوصاف کے مقابلے (میں) قیمت نہیں ہوتی، عمدہ اوصاف سے خریدار میں رغبت ہوتی ہے اور قیمت کا تعین ہوتا ہے، مثال کے طور پر موتی آبدار گول نہایت نفیس ہے، اب موتی کے خریدار کو اس طرف رغبت ہوئی، ورنہ صرف موتی ہونا باعث رغبت نہیں ہوسکتا ہے، اگر خریدار جانتا ہے کہ کوئی موتی بدون قیمت کے نہیں ملے گا مگر قیمت کا تعین واندازہ کہ ہزار کا ہو یا پانچ سو کا، یہ اس کے اوصاف وحسن کے اعتبار سے ہوگا، پس خریداری کا تصور اور قیمت کی ادائیگی باعتبار ذات مبیع کے ہے اور خریداری کی طرف رغبت اور قیمت کا اندازہ وصف مبیع کے اعتبار سے ہوگا۔

چنانچہ فقہاء کا مقولہ ہے کہ **"الأثمان للأعيان لا لِلأوصاف"** یعنی قیمت ذات کے مقابلے میں ہوتی ہے نہ کہ وصف کے مقابلے میں، ہاں قیمت کا تعین اور اس میں کمی وزیادتی وہ وصف اور حسن کے مقابلے میں ہوتی ہے، لہٰذا کپڑے کا تھان قیمت کے عوض میں ملے گا باعتبارِ ذات ہے اور اس کی قیمت کتنی ہوگی؟ یہ باعتبار وصف اور حسن کے متعین کی جائے گی۔[1]

وصف اور ذات کو پہچاننے کے قاعدے

قاعدہ نمبر ا: کپڑے میں گز وصف ہے، گز کے مقابلے میں قیمت کا کوئی حصہ نہیں، لہٰذا اگر کہا کہ یہ ایک گز کا لمبا کپڑا دو روپے میں ہے بعد میں جب ناپا تو پونے دو گز یا سوا گز نکلا تو قیمت وہی برقرار رہے گی۔[2]

---

[1] ان الأوصاف لا يقابلها شيء من الثمن ما لم تكن مقصودة. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع،مطلب في خيار التعيين، ج٤ص ٥٨٧).

وكذا في البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط، ج٦ ص٢٥).

[2] ومن اشترى ثوبا على أنه عشرة أذرع بعشرة دراهم أو أرضا على أنها مائة ذراع بمائة درهم فوجدها أقل فالمشتري بالخيار، إن شاء أخذها بجملة الثمن، وإن شاء ترك"؛ لأن الذراع وصف في الثوب؛ ألا يرى أنه عبارة عن الطول والعرض، والوصف لا يقابله شيء من الثمن كأطراف الحيوان فلهذا يأخذه بكل الثمن،(الهداية ،كتاب البيوع، ج٣ ص ٢٥).

قاعدہ نمبر ۲: وزن اور عدد ذات ہے اس سے قیمت میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے، مثلاً ایک من گندم چار سو روپے میں ہے، تو چار من کی سولہ سو روپے قیمت ہوگی، یا آم اگر ایک کلو دس روپے کا ہے تو چار کلو چالیس روپے کے ہوں گے۔ [1] اور کبھی اس کے بر عکس بھی ہوتا ہے یعنی وصف مقصود بن جاتا ہے اسی کے حساب سے قیمت بڑھتی ہے، مثلاً ایک گز کپڑا تیس روپے میں ہے تو اب گز ذات بن گیا جتنے گز بڑھیں گے تو قیمت بھی بڑھے گی، گز کم ہوں گے تو قیمت بھی کم ہوگی، یا خاصدان (ایک قسم کا برتن) وزنی آدھا کلو بارہ روپے کا ہے، اب وزن وصف ہے، قیمت وہی رہے گی وزن کم یا زیادہ ہو، اگر وصف مرغوب فوت ہو جائے تو اس کی وجہ سے قیمت میں کمی نہیں ہوگی البتہ خریدار کو لینے اور نہ لینے کا اختیار ہوگا۔ [2]

خلاصہ یہ ہے کہ اگر قیمت وزن، کیل، عدد یا گز کے مقابل رکھی جائے تو یہ سب ذات ہیں، ان کی کمی زیادتی سے قیمت میں کمی زیادتی ہوگی، اور اگر وزن، عدد یا گز بطور وصف یا بیان کے ملحوظ ہوں جس طرح قیمت دستار (عمامہ) دری، چاندنی، کمبل، چادر یا بعض تانبے وغیرہ کے برتن میں دستور ہے (جو وزنا فروخت نہیں کئے جاتے) یا مرصع زیورات جن پر نگ یا موتی جڑے ہوئے ہوں، ان میں قیمت اسی شئ کے مقابل ہے، وزن، عدد اور گز کے مقابلہ میں نہیں۔

مسئلہ: ایک تھان کپڑا ہزار روپے میں لے لیا کہ اس میں سولہ گز ہے، بعد میں پندرہ یا سترہ گز نکلا تو قیمت وہی رہے گی۔ [3]

مسئلہ: ایک پاندان [1] ایک سو روپے میں خریدا کہ اس کا وزن تین کلو ہے، بعد میں وزن کم نکلے یا زیادہ، تو قیمت وہی رہے گی، البتہ ایسی صورت میں مشتری کو خیار وصف ثابت ہوگا (یعنی وصف مرغوب فوت ہونے

ان القدر في المكيلات والموزونات أصل والذرع في المذروعات وصف (البحر الرائق ،كتاب البيوع، ج٥ص ٣١٤).

[1] "ومن ابتاع صبرة طعام على أنها مائة قفيز بمائة درهم فوجدها أقل كان المشتري بالخيار إن شاء أخذ الموجود بحصته من الثمن، وإن شاء فسخ البيع" لتفرق الصفقة عليه قبل التمام، فلم يتم رضاه بالموجود، "وإن وجدها أكثر فالزيادة للبائع"؛ لأن البيع وقع على مقدار معين والقدر ليس بوصف(الهداية ،كتاب البيوع، ج٣ ص ٢٥).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، ج٥ص ٣١٤ الى ٢١٧).

[2] أن الذراع وصف في الأصل، وإنما أخذ حكم المقدار بالشرط وهو مقيد بالذراع،(الهداية ،كتاب البيوع، ج٣ ص ٢٥).

[3] مر تخريجه في الحواشي الثلاثة السابقة.

کی وجہ سے لینے نہ لینے کا اختیار ہو گا)،[2] جیسے کپڑے کے ایک گھانٹھ جس میں بیس تھان کپڑے ہیں، ایک تھان میں سولہ گز کپڑے ہیں، ایک تھان پانچ سو روپے میں، پانچ تھان خریدے، یا چار ریم کاغذ فی ریم /۲۰ دستہ پر دستہ کا وزن /۴۰ پونڈ، ایک ریم /۴۰۰ روپے میں۔

اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ تینوں یا چاروں مذکورہ اوصاف موجود ہیں، تو قیمت بھی پوری دینی ہو گی۔

۲۔ دونوں یا تینوں وصف ناقص ہیں تو قیمت بھی کم ہو جائے گی۔

۳۔ بعض وصف کامل اور بعض ناقص ہیں، تو مشتری کو اختیار حاصل ہو گا۔

مسئلہ: دو گانٹھ میں /۴۰ تھان کپڑے، فی تھان سولہ گز کے حساب سے /۶۴۰ گز ہونا چاہئے، مگر تھان تو ۳۹ نکلے تو پیمائش /۶۴۰ گز ہی کپڑے ہیں، یا تھان تو /۴۰ ہیں لیکن پیمائش کم نکلے، اب دونوں وصف کم ہیں اس لئے دونوں صورتوں میں مشتری کو خیار وصف حاصل ہو گا۔[3]

مسئلہ: بالی اور پتے موتی جوڑے ہوئے خریدے، ان میں /۴۰ موتی کے بجائے /۳۹ نکلے، یا /۲۰ نگینوں کے ۱۸ نکلے، قیمت تو وہی رہے گی مگر مشتری کو خیار وصف حاصل ہو گا، اور اگر زیادہ نکلے تو قیمت وہی رہے گی مگر بائع کو خیار بھی حاصل نہیں ہو گا۔[4]

قاعدہ: جو تقریر ہم نے وزن، عدد اور گز کے متعلق کی ہیں، بعینہ یہی حکم ان کے کسور میں ہے یعنی نصف ربع ثمن وغیرہ، ہاں البتہ اگر یہ کسور غیر معتبر ہوں یعنی ان کی وجہ سے قیمت میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی تو یہ کسور وصف ہوں گے اور کمی کی صورت میں مشتری کو اختیار ہو گا۔[1]

---

[1] پاندان: پان رکھنے کا ڈبہ یا پٹاری۔ دھات کا برتن جس میں چونا، کتھا، ڈلی، الائچی وغیرہ پان کے لوازمات رکھے جاتے ہیں۔ (فیروز اللغات، ص۲۶۷)

[2] یہاں وزن تو بیان کی گئی لیکن چونکہ ان اشیاء میں وزن مقصود نہیں ہوتا اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا جیسا کہ قاعدہ نمبر ۲ کے تحت مؤلف رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔

[3] انظر القاعدتین اللتین ذكرتا أنفا.

[4] اس صورت میں مبیع تو بالی اور پتے ہیں، موتیوں اور نگینوں کی حیثیت مستقل مبیع کی نہیں بلکہ یہ وصف مرغوب ہے۔

قاعدہ: کسور کا اعتبار ہر چیز میں الگ الگ ہے جیسے غلہ میں تولہ کے حساب کا اعتبار نہیں لیکن مٹھائی میں اس کا اعتبار ہے، مگر اس میں ماشہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے اور عطریات میں ماشوں کا اعتبار ہے، ان کی مزید تشریحات باب ربا میں آئیں گی (ان شاءاللہ تعالیٰ)[2]۔

قاعدہ: اگر ذات مبیع بدل جائے تو مشتری کو اختیار ہوگا، جیسے ایک چھٹانک والا کٹورا فروخت کیا بعد میں کم یا زیادہ نکلا۔[3]

قاعدہ: اگر ثمن بدل جائے تو اس سے بیع اپنی جگہ قائم رہے گی، اس کو توڑنے کا اختیار نہیں ہوگا کیونکہ ثمن متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتا جیسے کہا کہ روپے کے عوض خریدا پھر پیسے دے رہا ہے، اس کے ذمہ لازم ہے کہ روپے ہی دے چاہے کوئی بھی روپے دے۔[4]

ہاں البتہ جن نوٹوں کو ثمن قرار دیا تھا وہ بازار سے معدوم ہو جائے یا غیر مروج ہو جائے تو ایسی صورت میں امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نزدیک بیع کے دن کی قیمت دینی لازم ہے۔[5]

قاعدہ: اگر کہا کہ اس صندوق میں جو روپے ہے وہی اس چیز کی قیمت ہے، بعد میں دیکھا کہ اس میں روپے

---

[1] "ولو اشترى ثوبا واحدا على أنه عشرة أذرع كل ذراع بدرهم فإذا هو عشرة ونصف أو تسعة ونصف، قال أبو حنيفة رحمه الله: في الوجه الأول يأخذه بعشرة من غير خيار، وفي الوجه الثاني يأخذه بتسعة إن شاء (الهداية ،كتاب البيوع، ج٣ص٢٦).
وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب البيوع، ج٢ص ١٤٩).

[2] وہی اس کی تفصیل عرض کر دی جائے گی۔(انشاءاللہ تعالیٰ۔)

[3] قد مرّ تخريجه.

[4] قد مرّ تخريجه.

[5] في الدر المختار: ومما يكثر وقوعه ما لو اشترى بقطع رائجة فكسدت بضرب جديدة يجب قيمتها يوم البيع من الذهب لا غير.
وفي حاشية ابن عابدين تحته: وحاصل ما مر: أنه على قول أبي يوسف المفتى به لا فرق بين الكساد والانقطاع والرخص والغلاء في أنه تجب قيمتها يوم وقع البيع أو القرض لا مثلها،(كتاب البيوع،مطلب مهم في أحكام النقود إذا كسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت، ج٤ ص٥٣٤).
وكذا في الفتاوى الهندية(كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل الثاني، ج٣ص ١٠٦).
قال العبد الفقير: وللامام التمرتاشي الغزي الحنفي(صاحب تنوير الابصار) رسالة في هذا الموضوع سمّاها "بذل المجهود في تحرير أسئلة تغير النقود" طبعت بتعليقات الشيخ الدكتور حسام الدين عفانة. وكذلك للعلامة ابن عابدين رحمه الله رسالة أيضا في هذا الموضوع باسم" تنبيه الرقود في احكام النقود".

نہیں تھے بلکہ فلوس یا اشرفی وغیرہ کوئی اور چیز تھی تو اس صورت میں خریدار پر لازم ہے کہ روپے ادا کریں[1]، ہاں اگر مقدار مقررہ سے کم یا زیادہ، یا کھرے کوٹے ہوئے تو وہی جو کچھ صندوق میں ہے ، وہی لازم ہوں گے۔[2]

بیانِ صفقہ

"ذکر في المغرب: الصفقة ضرب اليد على اليد في البيع والشراء ثم جعلت عبارة عن العقد بعينه.(حاشية هدايه، ج٣ص٣١٢)[3]

صفقہ (یکمشت) یعنی معقود علیہ کی وہ مقدار جس پر ایجاب کی بنیاد ہے۔

مسئلہ : (یہ) جائز ہے (کہ) ایجاب میں کئی صفقے مذکور ہوں[4] یا ایک، مثلاً یہ سولہ کتابیں ایک ہزار میں لیں، یا (یہ کہا کہ) یہ دس (کتابیں) سو روپے میں، اور وہ تیس دو سو پچاس میں اور یہ ساٹھ پانچ سو میں خرید لیں، پہلی صورت میں بائع کو اختیار نہیں ہو گا کہ کچھ فروخت کرے اور کچھ نہ کرے، دوسری صورت میں اختیار ہو گا کہ صرف دس کو یا صرف تیس کو یا صرف ساٹھ کو فروخت کرے۔

صفقہ متحدہ: مثال کے طور پر یہ مکان دس ہزار میں فروخت کیا یا یہ مکان لاکھ میں اور باغ پچاس ہزار میں، مجموعہ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کیا ہے، اب مشتری کو اختیار ہو گا چاہے سب کو قبول کرے یا سب کو رد کردے، لیکن اگر ایجاب کرتے وقت دو تین چیزوں کی قیمت ذکر کرکے آخر میں سب کو جمع نہیں کیا بلکہ

---

[1] کیونکہ جب اس طرح ثمن کو متعین کیا جائے تو جنس، صفت اور مقدار کے اعتبار سے وہ متعین ہو جائے گی تاہم اس خاص و معین ثمن کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، لہذا جب بیع کے دوران روپے کا کہا تو اب روپے ہی دینا لازم ہے۔

[2] کیونکہ یہاں صفت اور اشارہ دونوں جمع ہو گئے جبکہ دونوں کا جنس ایک ہے، لہٰذا اشارہ کا اعتبار ہو گا۔

والأصل في هذا أن الإشارة مع التسمية إذا اجتمعتا في باب البيع فيما يصلح محل البيع ينظر إن كان المشار إليه من خلاف جنس المسمى، فالعبرة للتسمية، ويتعلق العقد بالمسمى، وإن كان من جنسه .. وإن قل التفاوت فالعبرة للمشار إليه، ويتعلق العقد به.(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه،ج٥ص١٤٠).

أن الإشارة مع التسمية إذا اجتمعتا ففي مختلفي الجنس يتعلق العقد بالمسمى ويبطل لانعدامه، وفي متحدي الجنس يتعلق بالمشار إليه. (الهداية ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ص ٤٧).

[3] (الصفق) ضرب اليد على اليد في البيع والبيعة ثم جعلت عبارة عن العقد نفسه(المغرب في ترتيب المعرب،(ص ف ق) ص ٢٦٨)

الصفقة: في اللغة عبارة عن ضرب اليد عند العقد، وفي الشرع عبارة عن العقد.(التعريفات ،باب الصاد،ص ١٣٣)

[4] یہاں صفقہ متعدد ہونے کی جو مثالیں ذکر ہوئی ہیں اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں، حضرات فقہاء کرام جو تعدد صفقہ کی وجہ سے عقد کو غیر منعقد قرار دیتے ہیں وہ اس سے مختلف ہے جس کی تفصیل آ رہی ہے۔

یوں کہا کہ یہ تلوار سو روپے میں، بندوق پانچ ہزار میں اور زرہ (بلیٹ پروف جیکٹ) تین ہزار میں لے لیں، تو اس میں دونوں احتمال ہیں کہ ہر صفقہ علیحدہ ہو یا سب مل کر ایک ہو، اب اگر ان تینوں کو ایک ہی لفظ میں قبول کیا تو تعدد کا احتمال ختم ہو گیا، ایک ہی صفقہ ہوا اور اگر الگ الگ لفظوں میں قبول کیا مثلا تلوار سو میں اور بندوق پانچ ہزار میں اور زرہ کو تین ہزار میں خریدا، تو اب اتحاد صفقہ کا احتمال ختم ہو گیا۔

صفقہ متعدد کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ صراحت کے ساتھ کہے کہ یہ تلوار ہزار کی اور یہ بندوق پانچ ہزار کی ہے، آپ جو چاہیں لے لیں۔

۲۔ بتکرار: مثال، یہ کتاب سو روپے کی فروخت کی، وہ تھان ہزار میں فروخت کی۔

بقرائن: جیسے غلہ اور کپڑے وغیرہ میں ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ یہ تھان فی گز/ ۴۰ روپے اور گندم کا یہ ڈھیر فی من پانچ سو روپے میں، اس میں اختیار ہے جس قدر چاہے لے لیں، جتنی مقدار بھی خریدی اس میں تفریق صفقہ نہیں ہے۔

صفقہ فاسدہ کی صورتیں:

اول: دو مختلف جنس کے صفقوں کو جمع کرنا، جیسے بیع اور رہن، مثلاً یہ مکان فروخت کیا اور وہ مکان گروی رکھا، یہ گھوڑا عاریت پر لیا اور وہ گاڑی گروی رکھی، یہ زمین خریدی اور سو روپے قرض دیئے، ان کو ایک ہی صفقہ میں جمع کرنا مفسد عقد ہے کیونکہ ان کو جمع کرنے سے ایک تو شروط فاسدہ کے جواز کے لئے حیلہ متبادر ہوتا ہے اور سود کا شبہ قائم ہوتا ہے۔[1]

یا یہ جب دوسرے نے قبول کیا تو تین حال سے خالی نہیں ، یا تو سب کو ایک ساتھ اکٹھا قبول کرے گا تو اجتماع باطل و صحیح سے دونوں فاسد ہو گئے (کیونکہ صفقہ اولیٰ اعراض کے شبہ کی وجہ سے فاسد ہو گیا تھا) اور اگر پہلے اول کو قبول کیا تو دوسرے کے قبول کرنے سے اعراض پایا گیا، پہلا باطل ہوا ایجاب کرنے والے کے اعراض سے، اور دوسرا باطل ہو قبول کرنے والے کے اعراض سے، ہاں البتہ دوسرے

---

[1] (وإن شرط تركها) أي الثمرة (على الشجرة) حتى تدرك (فسد) البيع لأنه شرط لا يقتضيه العقد وهو شغل ملك الغير أو لأنه صفقة في صفقة لأنه إجارة في البيع إن كانت للمنفعة حصة من الثمن أو إعارة في بيع إن لم تكن له حصة من الثمن (مجمع الأنهر، كتاب البيوع، فصل فيما يدخل في البيع تبعا بغير تسمية وما لا لا يدخل، ج۲ص ۱۷).

وكذا فی البحر الرائق ،كتاب البيوع، فصل يدخل البناء والمفاتيح في بيع الدار ج۵ص۳۲۷).

میں پہلے قبول کرے تو یہ ثانی میں قبول صحیح ہو گا کیونکہ اس کا ایجاب ابھی باقی ہے مگر یہ بائع کی غرض کے بالکل خلاف ہے (کیونکہ وہ صرف صفقہ ثانی کو پسند نہیں کرتا)۔[1]

مثلاً زید نے کہا کہ میں نے یہ مکان رہن رکھا اور دکان فروخت کی، بکر نے کہا دکان میں نے خریدی تو یہ عقد صحیح ہو گیا (اور بائع کے منشأ کے خلاف ہونا اس لئے غیر معتبر ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ دونوں عقد ایک ساتھ ہوں گے، دوسری بات یہ ہے کہ اس کی منشأ کی رعایت کرنے میں فساد عقد لازم ہے جبکہ تصحیح فساد سے مقدم ہے)۔

دوم: صفقہ میں صفقہ داخل کرنا، یہ ہر ایسی شرط میں پایا جاتا ہے جو بائع یا مشتری کے لئے مفید ہو، مثلاً میں نے مکان فروخت کیا مگر شرط یہ ہے کہ ایک ماہ تک بطور عاریت اپنے استعمال میں رکھوں گا، یا یہ گھوڑا تم سے خریدتا ہوں اس شرط پر کہ تم مجھے سواری سکھاؤ گے۔[2]

قاعدہ: جن چیزوں کو فروخت کرنا جائز ہے اور جن چیزوں کو فروخت کرنا اصلاً حرام ہے، اگر دونوں قسم کی چیزوں کو ایک صفقہ میں جمع کیا جائے تو یہ صفقہ باطل ہو گی، جیسے غلام اور آزاد کو ملا کر فروخت کرنا، یا حلال جانور کا گوشت مردار کے گوشت کے ساتھ ملا کر فروخت کرنا۔[3]

قاعدہ نمبر: جن چیزوں کی بیع جائز ہے، ان کو ایسی چیزوں کے ساتھ ملا کر فروخت کیا جائے جن کی بیع کسی عارض کی وجہ سے ممنوع ہو تو جائز چیزوں میں بیع جائز ہو جائے گی، مثلاً اپنا باغ اور دوسرے کے باغ کو ملا کر

---

[1] لأن في تصحيح العقد في أحدهما تفريق الصفقة على البائع قبل التمام؛ لأنه أوجب البيع فيهما، فالقبول في أحدهما يكون تفريقا، وهذا لا يجوز. بدائع الصنائع، كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه، ج٥ص١٤٥.

[2] "ومن اشترى ثوبا على أن يقطعه البائع ويخيطه قميصا أو قباء فالبيع فاسد"؛ لأنه شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين؛ ولأنه يصير صفقة في صفقة على ما مر. (الهداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٣ ص٥٠). وكذا في فتح القدير (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ ص٤٥١).

[3] ولو جمع بين ما هو مال، وبين ما ليس بمال في البيع بأن جمع بين حر، وعبد أو بين عصير، وخمر أو بين ذكية، وميتة، وباعهما صفقة واحدة، فإن لم يبين حصة كل، واحد منهما من الثمن لم ينعقد العقد أصلا بالإجماع، وإن بين فكذلك عند أبي حنيفة، وعندهما يجوز في العصير والعبد.. ولو جمع بين قن، ومدبر أو أم ولد، ومكاتب أو بين عبده، وعبد غيره، وباعهما صفقة واحدة؛ جاز البيع في عبده بلا خلاف. (بدائع الصنائع ، كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه، ج٥ص١٤٥).
وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ص٢٣).

فروخت کیااور قیمت دونوں کی الگ الگ بیان کر دی تو بائع کے باغ میں عقد صحیح ہوااور دوسرے کا باغ عقد میں داخل نہیں ہوا، ہاں اس صورت میں بھی اگر دونوں کی قیمت علیحدہ بیان نہ ہو بلکہ اکھٹی بیان کی، تو جہالت ثمن کی وجہ سے بیع فاسد ہو گا۔[1]

قاعدہ: تبدیلِ صفقہ سے ایجاب فاسد ہو جاتا ہے مثلاً زید نے کہا کہ دو تھان کپڑے ہزار میں فروخت کئے، بکر نے کہا ایک تھان میں نے ہزار میں قبول کئے، تو یہ ایجاب جدید ہوا اب اگر زید دوبارہ اس ایجاب کو قبول کرے تو بیع نافذ ہو گی ورنہ نہیں۔[2]

قاعدہ: عقد تمام ہونے سے پہلے تفریق صفقہ بطلان عقد کا موجب ہے، عقد اس وقت تام ہو گا جبکہ اس میں خیار شرط ورئویت باقی نہ رہے اور قبضہ بھی مکمل ہو جائے، عقد تمام ہونے کے بعد تفریق صفقہ مضر نہیں۔[3]

لہٰذا اگر زید نے بیس گز کپڑا ہزار روپے میں خریدا، اب خیار رئویت اور خیار شرط کے ساقط ہونے سے پہلے اسی طرح قبضہ سے پہلے کسی معقول عذر کی بناء پر کچھ مقدار کم کرنا چاہے تو ۲۰/ گز میں جو ایجاب ہوا تھا وہ فاسد ہو جائے گا، لیکن اگر ان تینوں کام کے ہونے کے بعد جب صفقہ تمام ہوا اس کے بعد کپڑے میں کچھ عیب، یا بعض کپڑے میں مستحق نکل آنے یا بے کار محض ہونے کی وجہ سے کپڑے کا کچھ حصہ واپس کرنا پڑا جس کی بناء پر تفریق صفقہ لازم آیا، اس مقدار میں تفریق صفقہ عقد کے لئے مضر نہیں۔

---

[1] انظر الحاشية المقدمة.

[2] بکر نے جب زید کی بات کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا بلکہ کم مقدار خریدنے کی پیشکش کر دی تو یہ گویا سابقہ ایجاب کو قبول کرنے سے اعراض کیا اور اعراض کرنے سے سابقہ ایجاب ختم ہو جاتا ہے لہٰذا یہ بکر کی طرف سے نئے ایجاب کے مترادف ہے۔

[3] قال أصحابنا: خيار الشرط يمنع تمام الصفقة؛ لأنه يمنع ثبوت الحكم وهو الملك ويمنع اللزوم، فكان مانعاً تمام الصفقة؛ لأن تمامها بثبوت جميع أحكامها، فإذا كان الخيار للمشتري والمبيع شيء واحد أو أشياء لم يكن له أن يجيز العقد في البعض دون البعض مقبوضاً أو لم يكن؛ لأنه تفريق الصفقة قبل التمام وإنه لا يجوز بخلاف ما بعد التمام حيث يجوز التفريق. (المحيط البرهاني ،كتاب البيع، الفصل الثاني عشر ،ج٦ ص ٤٨٩).

وفي مجمع الأنهر في تفصيل هذه المسئلة: وفي رد ما بقي تفريق الصفقة قبل التمام لأن خيار الرؤية والشرط يمتنعان تمامها بخلاف خيار العيب(كتاب البيوع، فصل في خيار العيب،ج٢ ص ٤٠).

وفي بدائع الصنائع :والصفقة لا تتم بقبض بعض المعقود عليه، وإنما تتم بقبض الكل فلو لزمه العقد في المقبوض دون الآخر لتفرقت الصفقة على البائع قبل التمام، وتفريق الصفقة قبل التمام باطل.. وأما) الاستحقاق فإن استحق بعض المعقود عليه قبل القبض ولم يجز المستحق بطل العقد في القدر المستحق(كتاب البيوع، مبحث خيار الشرط،ج٥ ص ٢٨٨).

مسئلہ : خیار عیب اور استحقاق، صفقہ کے تام ہونے سے مانع نہیں ہے، ہاں کوئی قدیم عیب یا کسی کے حق کا دعویٰ ثابت ہو جائے تو عقد لازم نہ رہے گا۔[1]

قبضہ کی تعریف

قبضہ: یعنی دوسرے کی اجازت سے کسی چیز میں تصرف کرنے پر قدرت حاصل ہونا، اب اگر یہ قدرت مالک کی اجازت سے ہے یا شرعی حق کی وجہ سے، تو اس کو قبضہ جائز کہا جاتا ہے، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ ظلم ہے جیسے چور اور غاصب کا دوسرے کے مال میں قبضہ۔

جائز قبضہ کی تین صورتیں:

۱۔ قبضہ امانت: یعنی صرف مالک کے نفع کے لئے قبضہ کیا گیا ہو، جیسے امین، وکیل، کرایہ دار اور عاریت پر لینے والے کا قبضہ۔

۲۔ مضمون: یعنی وہ قبضہ جس میں قابض کا نفع ہو، جیسے مقبوض بخیار شرط، مقبوض علی سوم الشراء، یا وکیل نے مبیع کو اس لئے محبوس رکھا تاکہ موکل سے پوری قیمت وصول کرلے۔

۳۔ مختلط: جس میں دونوں کا کچھ کچھ نفع ہو، جیسے شئ مرہون قرض کی مقدار مضمون ہے اور زائد امانت ہے، یا خیار تعیین میں بقدر مبیع مضمون ہے اور زائد امانت ہے، پھر جس کا قبضہ دائمی ہو اس کو مالک اور جس کا قبضہ عارضی ہو اس کو قابض کہتے ہیں۔

مسئلہ : جو مال پہلے سے قبضہ میں ہے اس پر دوبارہ قبضہ کا حق ثابت ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ دونوں قبضے ایک جنس کے ہیں یا نہیں؟ اگر دونوں ہم جنس ہیں تو دوبارہ قبض کرنے کی ضرورت نہیں، اگر ہم جنس نہ ہوں تو دوبارہ قبض کرنا لازم ہے۔[2]

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] والأصل أنه متى تجانس القبضان ناب أحدهما عن الآخر وإذا تغاير أناب الأعلى عن الأدنى لا عكسه فناب قبض المغصوب والمبيع فاسدا عن قبض البيع الصحيح ولا ينوب قبض الأمانة عنه(البحر الرائق ،كتاب الهبة،ج٧ ص ٢٨٧).

وكذا في العناية شرح الهداية(فصل في التخارج،ج٨ص ٤٤٠).

وكذا في شرح المجلة للعلامة علي حيدر رحمه الله تحت المادة ٨٤٦، ج٢ص٤١١.

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زید نے بکر کی تلوار غصب کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد وہی تلوار بکر سے خرید لی، اب چونکہ دونوں قبضے ضمان کو مستلزم تھے اس لئے پہلا قبضہ کافی ہے اور اگر پہلے یہ تلوار زید کے پاس امانت ہوتی پھر اسے خریدتا تو ضروری ہوتا کہ تلوار مالک کو واپس دے کر پھر ان سے دوبارہ اپنے قبضہ میں لے[1]۔

مسئلہ: زید نے عمرو کو ایک کتاب بطور عاریت امانت دی، پھر وہی کتاب عمر کے ہاتھ فروخت کر دی، تو اب زید کو حق حاصل ہے کہ وہ کتاب عمرو سے واپس لے کر قیمت وصول ہونے تک اپنے قبضہ میں روک کر رکھے۔[2]

مسئلہ: مذکورہ بالا صورت میں اگر عمرو نے دوبارہ قبضہ نہیں کیا اور اسی حالت میں وہ کتاب کسی آفت ارضی یا سماوی سے ضائع ہو گئی تو بیع فسخ ہو جائے گی اور عمرو کے ذمہ قیمت کی ادائیگی لازم نہ ہو گی، کیونکہ ابھی تک عمرو کے پاس قبضہ امانت تھا۔

مسئلہ: اگر زید عمرو سے کوئی چیز چھین لے یا زید کے قبضہ میں کوئی چیز قبضہ مضمون ہو، پھر اس چیز کو بکر سے خرید لے تو وہی پہلا قبضہ کافی ہے دوبارہ قبضہ کی ضرورت نہیں ہے۔[3]

مسئلہ: زید نے بکر کے ہاتھ کوئی درخت فروخت کیا یا کوئی بکری فروخت کی، ابھی تک نہ قیمت وصول ہوئی نہ مبیع کو مشتری کے حوالہ کیا گیا (یہاں تک کہ) درخت میں پھل لگ گیا یا بکری نے بچہ دیدیا تو ان

---

[1] اس طرح مالک کو واپس کر کے قبضہ کرنا کوئی ضروری نہیں بلکہ جب بائع کی طرف سے اجازت ہے تو تمکن من التصرف بھی کافی ہے لہذا مذکورہ صورت میں اگر زید بکر سے تلوار خریدنے کے بعد گھر جائے کہ تلوار میں اپنی مرضی کا تصرف کر سکے تو بس قبضہ سمجھا جائے گا اور اس پر قبضہ کے احکام بھی جاری ہو جائیں گے اگر اس کے بعد وہ چیز ہلاک ہو جائے تو زید ہی کا نقصان ہو گا۔(ملاحظہ فرمائیں: بدائع الصنائع، کتاب البیوع، قبیل شرائط النفاذ، ج ۵ ص ۱۴۸)۔

[2] بشرطیکہ بیع کے بعد عمرو نے زید کے صراحۃً یا دلالۃً اجازت سے اس کتاب پر حقیقی یا حکمی قبضہ نہ کیا ہو، حکمی قبضہ کی مثال اوپر حاشیہ میں ذکر کی گئی ہے۔

ففي مجلة الأحكام العدلية: عدم منع البائع حينما يشاهد قبض المشتري للمبيع يكون إذنا من البائع بالقبض. ((المادة: ٢٧٦. ص ٥٦).

[3] لان كلا القبضين متجانسان فتناوبا كما مر تخريجه في حاشية المسئلة الثانية.

پھلوں اور بچوں کے لئے بھی ثمن کا حصہ ہو گا یعنی اگر قبضہ سے پہلے بکری کے بچے مر گئے یا پھل ضائع ہو گئے یا کھا لئے گئے تو خریدار ثمن کا ایک حصہ، جو ان پھلوں اور بچوں کے مقابل ہو سکے، کم کر دے گا گویا کہ وہ مبیع کے جزء تھے۔

اور اگر خریدار کے قبضہ میں داخل ہو جانے کے بعد یہ زیادتی ہلاک کی جائے یا ہو جائے، پھر کسی عذر سے بکری یا درخت بائع کو واپس کیا جائے تو ان پھلوں اور بچوں کے عوض قیمت کا کوئی حصہ واپس نہیں کرنا پڑے گی (عالمگیری)[1] اور شامی میں ہے: "جو چیز بیع میں تبعاً داخل ہو اس کے لئے ثمن میں کوئی حصہ نہیں ہے"۔[2]

قبضہ معتبر

پھر کون سا قبضہ شرعاً معتبر ہے؟ اس بارے میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں، سب کا مرجع عرف ہے اور یہ بات بھی ہے کہ قبضہ کوئی شرعی ایجاد نہیں بلکہ جسے عام طور پر لوگ قبضہ سمجھتے آئے ہیں، اسی کو شرعاً قبضہ سمجھا گیا ہے، خصوصاً اس زمانے میں قبضہ کے اعتبار کو وسعت دینے کی ضرورت ہے، مثلاً

---

[1] ہندیہ کی عبارت یہ ہے:

ومن باع أرضا دخل ما فيها من النخل والشجر في البيع وإن لم يسمه فإن كانت النخيل مثمرة وقت العقد وشرط الثمر للمشتري فله حصته من الثمن..وإن لم تكن الثمرة موجودة وقت العقد وأثمرت بعده قبل القبض فإن الثمرة للمشتري وتكون الثمرة زيادة على الأرض والنخل عندهما وقال أبو يوسف – رحمه الله تعالى – على النخل خاصة(الفتاوى الهندية ،الباب الخامس، الفصل الثاني فيما يدخل في بيع الأراضي والكروم ،ج٣ ص٣٤)

علامہ حدادی رحمہ اللہ نے جوہرہ میں اس بحث کو ذرا تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ الجوہرۃ النیرۃ، کتاب البیوع، ج۱ ص۱۸۸۔

دونوں عبارتوں میں یہ قید لگی ہوئی ہے کہ عقد کے وقت پھل یا بکری کا بچہ موجود ہو تب یہ مسئلہ ہو گا جبکہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ پھل اور بچہ عقد کے وقت موجود نہ تھے بعد میں پیدا ہوئے، حالانکہ بعد میں پیدا ہونے کی صورت میں ذکر کردہ حکم درست نہیں ہے کیونکہ عقد کے بعد درخت اور بکری خریدار کی ملکیت میں آگئی اب جو کچھ اس سے پیدا ہو گا تو وہ بھی اصل کی طرح خریدار ہی کی ملکیت شمار ہو گی کہ تولد من المملوک بھی ملک کے اسباب میں سے ایک ہے اور جب ابتداءً ملکیت ہی خریدار کی ہے تو اس کے مقابلے میں ثمن بھی نہیں ہو گا جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ اور جوہرہ کے مندرجہ عبارت میں اس کی تصریح بھی ہے۔

[2] كل ما يدخل تبعا لا يقابله شيء من الثمن لكونه كالوصف (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع،مطلب كل ما دخل تبعا ... ،ج٤ ص ٥٥٢)

وكذا في االبحر الرائق (كتاب البيوع، قبيل فصل في بيع الفضولي،ج٦ ص ١٥٩)

ٹرالر اور ٹرک وغیرہ مالوں سے بھر کر آتے ہیں، کھڑے کھڑے کئی بار فروخت ہو کر آخر میں مال اتارا جاتا ہے تو اگر ہر مرتبہ اس کو اتارا چڑھایا جائے، یا ادھر سے ادھر منتقل کیا جائے تو غالباً اس کا خرچہ ہی اصل قیمت کے برابر ہو جائے یا اصل سے بھی بڑھ جائے۔[1]

لہٰذا قبضہ کے لئے صرف اتنی بات ضروری ہے کہ قولاً قبضہ دیدیا جائے اور مال کی بلٹی پر دستخط کر کے حوالہ کردے یا مال فروخت کر کے اس کو دیدیا، یہی قبضہ ہے، کیونکہ فی زمانہ یہ تمام امور جائز قبضہ متصور ہوتے ہیں اور ان سے مشتری کو باقاعدہ تصرف کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے، اور ظرف یعنی جہاز، کشتی، چھکڑا وغیرہ اگر بائع کے ذاتی ملک میں ہے یا بائع اس کا کرایہ ادا کر چکا ہے تب بھی قبضہ درست ہے گویا کہ مشتری نے صراحۃً یا عرفاً یا ضرورۃً ان چیزوں کو ایک مدت تک کے لئے عاریت پر لیا ہے، اور اگر بائع کے پاس یہ چیزیں کرایہ پر تھیں اور کرایہ کی مدت بھی ختم ہوگئی تب بھی یہ سمجھا جائے گا کہ مشتری نے دوسرے کے کرایہ کی چیز میں اپنا مبیع رکھا ہے۔[2]

---

[1] قال الفقهاء: كل ما ورد به الشرع مطلقا، ولا ضابط له فيه، ولا في اللغة، يرجع فيه إلى العرف(الأشباه والنظائر للسيوطي ،القاعدة السادسة، المبحث الخامس، ج ١ص ٩٨).

وهذا عند الغالب من فقهاء المذاهب الاربعة المتبوعة:

(و) قبض (غيره) أي غير العقار من عروض وأنعام ودواب (بالعرف) الجاري بين الناس(الشرح الكبير للشيخ الدردير باب البيع، ج٣ص ١٤٥).

لأن القبض مطلق في الشرع، فيجب الرجوع فيه إلى العرف، كالإحراز، والتفرق.(المغني لابن قدامة ،كتاب البيوع، فصل قبض كل شيء بحسبه مكيلا أو موزونا، ج٤ ص٨٥).

ولم يثبت عن النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ في اشتراط القبض في الهبة شيء. ولو ثبت اشتراط قبض فقبض كل شيء بحسبه (البناية شرح الهداية، كتاب الهبة، ج١٠ص ١٧٠).

لان الشرع ورد بالقبض، وليس له حد في اللغة، ولا قدر في الشرع، فوجب الرجوع فيه إلى عرف الناس وعادتهم، كما قلنا في الحرز والإحياء(البيان في مذهب الإمام الشافعي ،كتاب البيوع، فرع كيفية القرض ،ج٥ ص ٧٤).

[2] الأصل في جنس هذه المسائل أن قبض المعقود عليه يكون من المشتري، تارة بالتمكن منه بعد تخلية البائع بينه وبينها، وتارة يكون بمباشرة التسليم إليه. ففي التخلية يعتبر التمكن من إثبات اليد عليه ليصير قابضا، وفي مباشرة التسليم إليه لا يعتبر التمكن من تقرير اليد فيه، لأن هذا تسليم حقيقة، وحقيقة الشيء تثبت بوجوده.(شرح السير الكبير ، باب ما يجوز لصاحب المقاسم للغنائم وما لا يجوز، ج١ص ١٠٩٤)

تسليم المبيع يحصل بالتخلية وهو أن يأذن البائع للمشتري بقبض المبيع مع عدم وجود مانع من تسليم المشتري إياه (مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة ٢٦٣،ص ٥٤).

قبضہ کا حکم

۱۔ قبضہ سے بیع تام ہو جاتی ہے۔

۲۔ بائع کا حق مبیع سے منقطع ہو جاتا ہے۔

۳۔ مشتری کو مبیع پر تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

۴۔ منقولی چیزوں پر قبضہ سے پہلے مشتری کا تصرف حرام ہے، البتہ غیر منقولی میں جائز ہے۔ [1]

مسئلہ: اگر کوئی زمین خریدی اور قبضہ سے پہلے ہی اس کو فروخت کر دیا، یا رہن رکھوادیا تو جائز ہے، لیکن گھوڑا یا اس جیسی چیزوں میں قبضہ سے پہلے ایسا کرنا جائز نہیں۔ [2]

مسئلہ: ثمن، مہر اور میراث میں قبضہ سے پہلے بھی تصرف صحیح ہے۔ [3]

بیان رضاء

اس کے لئے دو شرطیں ہیں:

۱۔ فی الحال رضاء پائی جائے: پس اگر زید ایک مکان خریدنے پر راضی تھا مگر عین عقد کے وقت رضاء ظاہر نہ کی یا ایجاب وقبول کے وقت راضی نہ تھا پھر بعد میں راضی ہو گیا تو یہ رضاء معتبر نہیں۔ [4]

---

[1] منقولی اور غیر منقولی اشیاء کے درمیان فرق حضرات شیخین کا مسلک ہے، امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں کو قبض کرنے سے پہلے بیچنا یا اس کے علاوہ کوئی اور تصرف کرنا ناجائز ہے، اکثر فقہاء کرام نے حضرات شیخین کے قول پر فتویٰ دیا ہیں اور خلافت عثمانیہ کے منتخب کمیٹی نے بھی مجلہ میں شیخین کا قول ہی اختیار فرمایا ہے:

(صح بيع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه) من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض، ج ٥ص ١٤٧).

(المادة ٣٥٣) للمشتري أن يبيع المبيع لآخر قبل قبضه إن كان عقارا وإلا فلا(مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة: ٣٥٣،ص٥٢)

[2] انظر الحاشية المقدمة.

[3] قد مر تخريجه في بحث البيع.

[4] ومنها) الرضا لقول الله تعالى: {إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم}عقيب قوله {يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل}وقال عليه الصلاة والسلام لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب من نفسه فلا يصح بيع المكره إذا باع مكرها وسلم مكرها؛ لعدم الرضا، (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط الصحة،ج٥ ص١٧٦).

وكذا في الهداية ،كتاب الاكراه،ج٣ ص ٢٧٢).

۲۔زبان سے رضاء کا اظہار کرے: جیسے کہے میں نے خریدا یا میں نے فروخت کیا، یا رضاء پر دلالت کرنے والا کوئی فعل اس سے صادر ہو جیسے بیع تعاطی (یعنی ہاتھ درہاتھ بیع) میں یہ فعل ہی رضاء طرفین کی دلیل ہے،اس کے علاوہ میں صرف دلی رضاء کافی نہیں ہے۔

رضاء کے دو رکن

پھر رضاء کے دو رکن ہیں:

۱۔ایجاب: یعنی پہلے درخواست بائع کی طرف سے ہو یا مشتری کی جانب سے۔

۲۔قبول: یعنی اس درخواست کی منظوری۔ایجاب و قبول کے باہم رابطہ قائم ہونے کو انعقاد کہتے ہیں،ان کے بغیر بیع منعقد نہیں ہوتی۔[1]

ایجاب و قبول کی شرائط

پھر ایجاب و قبول کی کچھ شرائط ہیں:

۱۔ماضی، مستقبل امر کے اور خبر کے صیغے استعمال نہ کرے اسی طرح وعدہ کے الفاظ استعمال نہ کرے،یعنی یوں نہ کہئے کہ میں نے فروخت کیا تھا یا فروخت کروں گا، یا خریدنے کا اقرار کرتا ہوں، تو فروخت کردے تو میں خرید لوں گا۔[2]

۲ عاقدین میں اہلیت ہو اور تعدد ہو، یعنی صرف ایک ہی آدمی ایجاب و قبول نہ کرے بلکہ دو آدمی ہوں اور عقد کرنے والے نا سمجھ بچے، مجنون اور مجبور (یا جس پر پابندی ہے) نہ ہو۔[3]

۳۔عوض صحیح اور مفصل مذکور ہوں جیسا کہ اموال کی بحث میں گزر چکا ہے۔

۴۔عقد کو شروط فاسدہ کے ساتھ متعلق نہ کیا ہو۔[1]

---

[1] (فالإيجاب) هو: (ما يذكر أولا من كلام) أحد (المتعاقدين) والقبول ما يذكر ثانيا من الآخر سواء كإن بعت أو اشتريت الدال على التراضي) (الدر المختار ،كتاب البيوع،ج٤ ص ٥٠٦).

[2] البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إذا كانا بلفظي الماضي" مثل أن يقول أحدهما بعت والآخر اشتريت؛ لأن البيع إنشاء تصرف، والإنشاء يعرف بالشرع والموضوع للإخبار قد استعمل فيه فينعقد به (الهداية ،كتاب البيوع، ج٣ ص ٢٣).

وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب البيوع،ج٢ ص ٤).

[3] مرّ تخريجه اول البيوع.

۵۔ عقد بیع موقت نہ ہو، مثلاً یہ مکان سو سال کے لئے خریدا، یہ کتاب دس دن کے لئے خریدی، اگر متعین کے لئے خریدیں تو مدت قلیل ہو یا کثیر، عقد فاسد ہو جائے گا۔ [2]

۶۔ قبول ایجاب کے موافق ہو یا اس میں شامل ہو۔ [3]

مسئلہ: زید نے کہا یہ مکان ایک لاکھ کا فروخت کیا اور بکر نے کہا میں نے لے لیا، تو یہ قبول ایجاب کے موافق ہے، اگر یہ کہا کہ میں نے ایک لاکھ دس ہزار کا لیا تو یہ شامل ہے، لیکن اگر بکر نے کہا کہ میں نوے (ہزار) کا لیا ہے یا ادھار خریدا ہے یا گھر کو باغ سمیت خریدا ہے تو یہ قبول ایجاب کے مخالف ہے، اب ایجاب مؤثر نہ رہا، از سرِ نو ایجاب کرنا ہو گا۔

مسئلہ: زید نے کہا کہ میں نے دو تھان کپڑے ہزار روپے میں دو ماہ بعد قیمت کی ادائیگی کے وعدہ پر فروخت کیا، بکر نے کہا کہ میں نے نقد خرید لیا تو بیع منعقد ہو گئی۔ [4]

۷۔ قبول سے پہلے ایجاب کرنے والے نے ایجاب سے انکار نہ کر دیا ہو، اگر انکار کرنے کے بعد قبول کیا تو یہ قبول مفید نہ ہو گا۔

مسئلہ: زید نے کہا یہ گھوڑا سو روپے کا فروخت کیا، بکر نے جواب نہیں دیا تھا کہ زید نے انکار کر دیا، اب قبول کی گنجائش نہ رہی۔ [5]

۸۔ ایجاب و قبول جبر و اکراہ سے نہ ہو، مجبور کرنے والا گناہگار ہو گا اور جس کو مجبور کیا گیا، تو جبر ختم ہونے کے بعد اس کو اختیار ہو گا کہ چاہے تو بیع کو قائم رکھے کہ صورۃ رضاء پائی گئی تھی، یا چاہے تو رد کر دے کیونکہ حقیقۃً رضاء نہیں پائی گئی تھی۔ [1]

---

[1] ومنها الخلو عن الشرط الفاسد.(الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب الاول،ج٣ ص ٣).

وكذا في بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (كتاب البيوع، شرائط الصحة،ج٥ ص ١٦٨)

[2] ومنها أن لا يكون مؤقتا، فإن أقته لم يصح (البحر الرائق ،كتاب البيوع،ج٥ ص ٢٨١)

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الباب الاول،ج٣ ص ٣).

[3] مر تخريجه اول الباب.

[4] گویا یہاں قبول ایجاب کو شامل ہے اور اس میں ایجاب کرنے والے کا کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہے اس لئے بیع منعقد ہو گئی۔

[5] کیونکہ قبول کرنے سے پہلے ایجاب کی حیثیت حتمی نہیں ہوتی بلکہ ایجاب کرنے والے کو اپنے ایجاب سے رجوع کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

۹۔ قبول اسی مجلس میں ہونا چاہئے جس میں ایجاب پایا گیا، مجلس قبول بدلنے کے بعد ایجاب قابل قبول نہ ہوگا۔ [2]

مجلس بدلنے سے مراد یہ ہے کہ ایجاب کے بعد کوئی ایسا کام کیا جائے جس کو معاملہ بیع سے اعراض سمجھا جائے، دونوں میں سے کوئی ایک چلنے کے لئے کھڑا ہوگیا یا ور کسی کام میں مشغول ہوگیا یا خود سو گیا تو مجلس بدل گئی، اگر دونوں ساتھ چلیں اور ابھی تک معاملہ کے متعلق گفتگو جاری ہے تو مجلس نہ بدلے گی، مثلاً زید نے کہا یہ مکان ایک لاکھ کا فروخت کیا، بکر نے کہا دیکھ لوں، یوں کہہ کر مکان کے چاروں طرف چکر لگانے لگا یا اس کے کاغذ یا نقشہ بلانے کے لئے گیا، یا بعض ضروری باتیں معلوم کرنے لگا، ان تمام کاموں سے مجلس نہ بدلے گی کیونکہ یہ بیع سے اعراض نہیں بلکہ بیع کے اندر عین مشغولی اور توجہ ہے۔ [3]

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تحریر تقریر ہی کی طرح ہے، بلکہ ہمارے زمانے کے اعتبار سے اس میں مزید وسعت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ [4]

۱۔ زید کا خط لکھنے اور پڑھنے کا ایک خاص مقرر تھا۔

۲۔ خط پڑھنے کا وقت اور ہے اور جواب لکھنے کا اور۔

---

[1] "وإذا أكره الرجل على بيع ما له أو على شراء سلعة أو على أن يقر لرجل بألف أو يؤاجر داره فأكره على ذلك بالقتل أو بالضرب الشديد أو بالحبس فباع أو اشترى فهو بالخيار إن شاء أمضى البيع وإن شاء فسخه ورجع بالمبيع" لأن من شرط صحة هذه العقود التراضي(الهداية ،كتاب الاكراه، ج٣ ص ٢٧٢).

(ولمزيد الجزئيات والعبارات لاحظ مبحث رضاء العاقدين الذي تقدم ذكره انفا).

[2] وإذا أوجب أحد المتعاقدين البيع فالآخر بالخيار: إن شاء قبل في المجلس وإن شاء رده وأيهما قام من المجلس قبل القبول بطل الإيجاب (مختصر القدوري ،كتاب البيوع،ص ٧٨).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، ج١ص ١٨٤).

[3] قال: في النهر. واختلاف المجلس باعتراض ما يدل على الإعراض من الاشتغال بعمل آخر كأكل إلا إذا كان لقمة، وشرب إلا إذا كان الإناء في يده، ونوم إلا أن يكونا جالسين (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، مطلب ما يبطل الإيجاب سبعة،ج٤ص ٥٢٧).

والأولى ما في (المجتبى) المجلس المتحد أن لا يشتغل أحد المتعاقدين بغير ما عقد له المجلس أو ما هو دليل الإعراض إذ لا شك أن القيام وإن لم يكن للإعراض لكن لم يعقد المجلس له(النهر الفائق ،كتاب البيوع،ج٣ ص ٣٤١).

[4] والكتاب كالخطاب، وكذا الإرسال حتى اعتبر مجلس بلوغ الكتاب وأداء الرسالة، (الهداية كتاب البيوع،ج ٣ ص٢٣).

وكذا في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (رقم المادة: ٦٩ ج١/٦٩).

۳۔ خط کا جواب یا مشورہ کے لئے کوئی دوسرا آدمی مقرر ہے۔
۴۔ کاغذ، قلم دوات وغیرہ موجود نہیں۔
۵۔ یا بیع کے متعلق کسی بات کا انتظار ہے۔
۶۔ کئی خطوط ہیں سب کو پڑھ کر جواب لکھنا ہے۔

ان تمام صورتوں میں مجلس وصول خط مجلس قراءت اور مجلس جواب میں معمولی فرق سے کوئی نقصان نہ ہوگا، اگر معمولی فرق کا اعتبار کیا تو کاروبار معطل ہو جائیں گے۔

البتہ اگر مکتوب الیہ نے قصداً سکوت کیا یا مکان پر موجود نہ تھا یا خط کا جواب لکھنے یا پڑھنے کی فرصت نہ ملی اس لئے فوری جواب نہ لکھ سکا بعد میں لکھا، تو ان سب صورتوں میں کاتب کو اختیار ہوگا کہ اس جواب کو قبول تصور کرے یا ابتدائی ایجاب بنائے۔

مسئلہ: زید نے جمعہ کے دن خط لکھا کہ پچاس ہزار روپے کے سو تھان کپڑے فلاں کمپنی کے بھیج دو، پھر اس کے پیچھے دوسرا خط ممانعت کا روانہ کیا، اب اگر بائع کو ممانعت والا خط پہنچنے سے پہلے وہ قبول کر چکا تھا اور مجلس بھی نہ بدلی تھی تو بیع لازم ہوگئی، چاہے مال ابھی تک روانہ کیا یا نہ کیا ہو، اور اگر بائع کے قبول کرنے سے پہلے ہی دوسرا خط موصول ہوا تو پہلے خط کا ایجاب باطل ہو جائے گا۔[1]

مسئلہ: مذکورہ بالا مسئلہ میں خط وصول کر کے ابھی تک جواب نہیں لکھا تھا جبکہ خط جواب طلب تھا تو صرف زبانی قبول حجت نہیں جیسا کہ نیت حجت نہیں۔[2]

---

[1] یہ مسئلہ اسی ضابطہ پر مبنی ہے کہ مخاطب کے قبول کرنے سے پہلے تک ایجاب سے رجوع کرنے کا اختیار برقرار رہتا ہے اور اگر مجلس عقد ہی میں مخاطب قبول کرے تو بیع تام ہو جاتی ہے اس کے بعد کسی ایک فریق کے لئے دوسرے کی رضامندی کے بغیر رجوع کرنے کا کوئی اختیار نہیں، مجلس عقد کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اگر مجلس میں قبول نہ کرے تو ایجاب باطل ہو جاتا ہے اس لئے بعد اگر قبول بھی کرے تو وہ قبول قبول نہیں بلکہ نیا ایجاب ہے جو کہ دوسرے فریق کے قبول کرنے سے پہلے حتمی نہیں۔

[2] قواعد کا تقاضا یہ ہے کہ زبانی قبول کا بھی اعتبار ہو کیونکہ تحریر زبانی ایجاب و قبول کا قائم مقام ہے جب قائم مقام کا اعتبار ہے تو اصل کا بطریق اولیٰ اعتبار کیا جانا چاہئے، خیار شرط کے ضمن میں فقہاء کرام کے ذکر کردہ جزئیات بھی اس پر شاہد ہیں کہ جس عاقد کو خیار حاصل ہو وہ دوسرے فریق کی غیر موجودگی میں بھی خیار ختم کر کے بیع لازم کر سکتا ہے البتہ بیع فسخ کرنے میں اختلاف ہے حضرات طرفین کے نزدیک چونکہ اس کی وجہ سے دوسرے فریق کو ضرر پہنچتا ہے اس لئے اس کو اطلاع دئے بغیر یکطرفہ فسخ کرنا درست نہیں، لیکن قبول کرنا بالاتفاق درست ہے، نیز اسی مسئلہ کے ضمن میں فتح القدیر، بحر، عنایہ وغیرہ تقریباً تمام فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ زبانی قبول بھی کافی ہے، تاہم ہمارے حضرت مؤلف

مسئلہ : قبول زبانی ہو یا تحریری، اسی وقت سے معتبر ہے جس وقت زبان یا قلم سے نکلے، ہاں اگر مکتوب الیہ کو وقت مقررہ پر نہ پہنچے تو اس کے لئے عذر ہے۔

مسئلہ : زید نے بکر کے نام پیغام بھیجا کہ میں نے اپنا مکان ایک لاکھ روپے میں فروخت کر دیا تم خرید لو، بکر نے زبانی یا تحریر کھلا خط بھیجا کہ میں نے خریدا، اب زید کے لئے انکار کی گنجائش نہیں، اس کو ہر صورت میں مکان بکر کے حوالہ کرنا ہوگا، ہاں اگر بکر کا پیغام معین وقت سے تاخیر کے ساتھ پہنچے تو زید کے لئے انتظار کرنا ضروری نہیں۔

ایجاب وقبول سے بیع تمام ہو گئی

شافعیہ نے کہا کہ بیع تام ہونے کے لئے ایجاب وقبول کے بعد مجلس بدل جانا شرط ہے، جب تک ایجاب وقبول کی مجلس برقرار ہے دونوں کو اپنے قول سے رجوع کرنے کا حق ہوگا، مثلاً زید نے ایک کپڑا فروخت کیا عمر نے خریدا، اب اس کے بعد اگر دونوں مجلس سے جدا ہو گئے تو بیع لازم ہو گئی ورنہ جب تک مجلس قائم ہے دونوں کے لئے رجوع کا اختیار باقی رہے گا، اور حنفیہ کے نزدیک ایجاب وقبول کے ساتھ ہی بیع لازم ہو گئی، چاہے دونوں کی مجلس برقرار رہے یا ختم ہو جائے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول اگرچہ ظاہر حدیث سے ثابت ہے تاہم اس کا معقول جواب ہدایہ اور حجج میں موجود ہے، خاص طور پر ہمارے زمانے میں یہ شرط رکھنا کہ عاقدین ہر دفعہ ایجاب وقبول کے بعد مجلس

رحمہ اللہ کی ذکر کردہ قید "جب کہ خط جواب طلب تھا" قابل توجہ ہے اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ مثلاً ایجاب کرنے والے نے لکھا کہ اگر آپ کو یہ معاملہ قبول ہے تو تحریری خط کے ذریعے اطلاع دو، تو اس صورت میں البتہ کتاب میں ذکر کردہ مسئلہ درست ہو سکتا ہے۔ اہل علم اس پر غور فرمائیں۔

صورة الكتاب أن يكتب: أما بعد، فقد بعت عبدي منك بكذا. فلما بلغه الكتاب وفهم ما فيه قال قبلت في المجلس انعقد.(فتح القدير، كتاب البيوع، ج٦ص ٢٥٥).

والكتاب كالخطاب، وكذا الإرسال حتى اعتبر مجلس بلوغ الكتاب وأداء الرسالة وصورة الكتاب أن يكتب أما بعد فقد بعت عبدي فلانا منك بكذا فلما بلغه الكتاب قال في مجلسه ذلك اشتريت تم البيع بينهما.(البحر الرائق، كتاب البيوع، ج٥ص ٢٩٠).

بدل لے، یہ انتہائی مشکل ہے۔[1]

ایجاب وقبول کی چار صورتیں

۱۔ قولی: ۲۔ تحریری۔ ۳۔ ضمنی: مثلاً زید نے بکر سے کہا کہ اپنا باغ دس ہزار کے عوض میں میری طرف سے صدقہ کردیں، بکر نے ایسا ہی کیا تو یہ ایجاب وقبول دونوں ضمنی ہیں، گویا کہ زید نے کہا کہ میں نے تجھ سے یہ باغ دس ہزار میں خریدا، اب تو میری طرف سے وکیل بن کر صدقہ کردے، بائع نے کہا کہ میں نے فروخت کردیا اور وکالۃً صدقہ کردیا۔[2]

۴۔ فعلی، جسے بیع تعاطی کہا جاتا ہے، یعنی خریدار نے مال اٹھالیا اور قیمت ادا کردی اور بائع خاموش رہا اور قیمت پر قبضہ کرلیا۔[3]

مسئلہ: بائع کا خاموش رہنا اس وقت قابل قبول ہوگا کہ وہاں خاموش رہنے کا کوئی سبب موجود نہ ہو، اس طرح تکلم سے کوئی مانع موجود نہ ہو اور اسے علم بھی ہوجائے کہ خریدار لے رہا ہے اور آخر مجلس تک خاموش رہے، یا ثمن بغرض ملک وحفظ قبضہ کرے، یا خریدار بائع کے سامنے مبیع پر کوئی مالکانہ تصرف کرے، لہٰذا اگر بائع نے قیمت کی رقم اس غرض سے اٹھائی کہ اس کو پرکھے، گنے، یا خاموشی اس لئے اختیار کی کہ بعد میں سوچ کر اس کو قبول کرے گا یا رد کردے گا تو یہ خاموشی رضاء کی دلیل نہ ہوگی۔[4]

---

[1] راجع للتفصيل: الحجة على أهل المدينة، كتاب البيوع، باب الرجلين يتبايعان ولا يذكران خيارا، ج٢ص٦٨٠. "الهداية " (كتاب البيوع، ج٣ص ٢٣). و"البدائع" (كتاب البيوع، شرائط لزوم البيع بعد انعقاده، ج٥ ص ٢٢٨). وان شئت تفصيل المبحث فعليك بالمبسوط للامام السرخسي رحمه الله (باب الاستبراء، ج١٣ص ١٥٧،١٥٦).

[2] الدر المختار: لو أمره بطحن الحنطة أو ذبح الشاة فيصير المشتري قابضا اقتضاء.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله فيصير المشتري قابضا اقتضاء) ما يقدر لتصحيح الكلام كأعتق عبدك عني بألف فإنه يقتضي سبق البيع ليصح العتق عن الآمر، وهنا كذلك، فإن صحة تصرف البائع عن المشتري تقتضي أن يقدر القبض سابقا عليه(باب البيع الفاسد، قبيل مطلب يملك المأمور ما لا يملكه الآمر، ج٥ ص ٩٢).

[3] (وأما) المبادلة بالفعل فهي التعاطي ويسمى هذا البيع بيع المراوضة وهذا عندنا (بدائع الصنائع ، كتاب البيوع، ج٥ ص ١٣٤).

[4] بما أن المقصد الأصلي من الإيجاب والقبول هو تراضي الطرفين ينعقد البيع بالمبادلة الفعلية الدالة على التراضي ويسمى هذا بيع التعاطي. (مجلة الأحكام العدلية ، البيوع، رقم المادة ١٧٥، ص ٣٦).

(إذا لم يصرح معه) مع التعاطي (بعدم الرضا) فلو دفع الدراهم وأخذ البطاطيخ والبائع يقول: لا أعطيها بها لم ينعقد (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب البيوع، ج٤ ص ٥١٤).

مسئلہ : نفیس اور غیر نفیس دونوں قسم کی چیزوں بیع تعاطی صحیح ہے۔(ہدایہ)[1]

مساومہ: بھاؤتاؤ کرنا یہ ایجاب و قبول نہیں ہے، کیونکہ ایجاب و قبول جملہ امور طے کرنے کے بعد انعقاد بیع کے لئے ہوتا ہے، برخلاف مساومہ کے کہ وہ تو بیع کے پسند کے لئے ہوتا ہے تاکہ ثمن اور متعلقات ثمن معلوم ہو جائے اور عاقدین اپنی اپنی مصلحتوں پر نظر کرلیں، لہٰذا صرف مساومہ بھاؤتاؤ سے عقد منعقد نہیں ہو گا۔[2]

بیع کے چار مراتب

بیع کے چار مراتب ہیں جو ایک دوسرے پر مرتب ہیں۔[3]

پہلا مرتبہ: انعقاد بیع۔ یعنی ایجاب و قبول کا باہمی ربط ہونا، اس کی چار شرطیں ہیں:

۱۔ عاقدین کا (متعدد) ہونا یعنی دو ہوں اور دونوں عاقل بالغ ہوں، کم سن بچے یا مجنون کے عقد کا اعتبار نہیں۔

۲۔ ایجاب و قبول کا ہونا: اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں باہم موافق ہوں اور مجلس عقد ہی میں دونوں مکمل ہوں اور ہر ایک دوسرے کے قول سے مطلع ہوں اور یہ ہنسی مذاق میں نہ ہوں بلکہ ایجاب و قبول دونوں حقیقت پر مبنی ہوں۔

۳۔ قیمت عرف میں مال ہو:

۴۔ مبیع مال متقوم ہو، بائع کی ملکیت میں موجود ہو اور اس کا فروخت کرنا شرعاً جائز ہو۔

---

[1] المعنى هو المعتبر في هذه العقود، ولهذا ينعقد بالتعاطي في النفيس والخسيس هو الصحيح لتحقق المراضاة. (الهداية، كتاب البيوع، ج٣ص ٢٣).

(وبالتعاطي) في الأشياء الخسيسة والنفيسة، نص عليه محمد لأنه يدل على الرضا المقصود من الإيجاب والقبول. (الاختيار لتعليل المختار، كتاب البيوع، ج٢ص ٤).

[2] کیونکہ ایجاب و قبول کے لئے ضروری ہے کہ ماضی کے الفاظ ہوں، یا وہ الفاظ ہوں جو متعاقدین کے عرف و زبان میں خاص انشاء عقد کے لئے مختص ہوں اور بھاؤتاؤ کے الفاظ اس طرح نہیں ہوتے۔

[3] تنبیہ: ان میں سے اکثر شرائط پہلے ذکر کیا جا چکے ہیں اور وہاں ان کی تخریج وغیرہ بھی ہو چکی ہے، یہاں جو بات نئی ہو جو پہلے ذکر نہ ہو تو صرف اس کی تخریج و تحقیق کی جائے گی۔

دوسرا مرتبہ صحت بیع: یعنی بائع کی ملکِ صحیح ثمن پر، اور خریدار کی ملکِ صحیح مبیع پر نفس عقد سے ثابت ہو جائے، اس کے لئے آٹھ شرطیں ہیں:

۱۔ انعقاد بیع کی تمام شرائط موجود ہوں۔

۲۔ عوضین کا مال متقوم ہونا۔[1]

۳۔ مقدار کا معلوم ہونا۔

۴۔ اوصاف یا اشارہ سے متعین ہونا۔

۵۔ دین (یعنی بیع کا مبہم نہ ہونا)

۶۔ بیع[2] کا مؤجل اور موعود نہ ہونا۔ یعنی ثمن پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے مبیع ایک مدت کے بعد حوالہ کیا جائے، یہ صحیح نہیں ہے اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، البتہ بیع سلم میں ایسا ہونا ضروری ہے جو حدیث سے ثابت ہے۔

۷۔ بیع کا مؤقت نہ ہونا، کہ یہ بیع ایک سال دو سال کے لئے ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی۔

۸۔ دونوں جانب نفع کے تصور کا ممکن ہونا۔

تیسرا مرتبہ، نفاذ بیع: یعنی جس بیع کا حکم فوراً مرتب ہو جائے، اس کہ چھ شرطیں ہیں:

۱۔ انعقاد بیع کے تمام شرائط موجود ہوں۔

۲۔ صحت بیع کے تمام شرائط موجود ہوں۔

۳۔ عاقدین کا عاقل بالغ آزاد ہونا، اگر غلام ہو تو آقا کی طرف سے اجازت یافتہ ہو۔

۴۔ مبیع غیر کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، جیسے کسی کے پاس بطور رہن یا بطور کرایہ دیا ہوا نہ ہو۔[3]

---

[1] ثمن کا مال متقوم ہونا تو شرائطِ صحت میں سے ہے لیکن مبیع کا مال متقوم ہونا شرائط صحت میں سے نہیں ہے بلکہ شرائط انعقاد میں سے ہے جیسا کہ خود حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے بھی کچھ سطر پہلے انعقاد بیع کے شرائط میں سے اس کو شمار فرمایا، اس لئے یہاں "عوضین" کے بجائے "ثمن" کا لفظ مناسب ہے، حضرات فقہاء کرام تصریح فرماتے ہیں کہ اگر ثمن مال متقوم نہ ہو تو بیع فاسد ہو گی، لیکن چونکہ شرائطِ انعقاد شرائطِ صحت بھی ہیں شاید اس لئے حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے اس کو یہاں ذکر فرمایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[2] زیر نظر نسخہ میں "بیع" کا لفظ ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے بظاہر کتابت کی غلطی ہے، اصل لفظ "مبیع" ہونا چاہئے۔

[3] الثاني أن لا يكون في المبيع حق لغير البائع، فإن كان لا ينفذ كالمرهون والمستأجر(البحر الرائق ،كتاب البيوع،ج٥ ص ٢٨١).وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، ج٤ ص ٥٠٥).

۵۔اس میں خیار شرط یا خیار رؤیت وغیرہ یا کوئی توقف نہ ہو۔[1]

۶۔عقد کرنے والا فضولی نہ ہو۔

چوتھا مرتبہ، لزوم بیع: یعنی اس میں فسخ بیع کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔

اس کی دو صورتیں ہیں:

ا: صورتاً۔یعنی بالفعل تو بیع لازم ہوگئی لیکن ممکن ہے کہ لازم نہ رہے، بلکہ فسخ ہو جائے[2]،اس میں انعقاد اور صحت بیع کے بعد تین باتیں مشروط ہیں:

ا۔قبضہ۔۲۔عدم تفریقِ صفقہ۔[3] ۳۔خیار رؤیت کا ساقط ہونا۔[4]

۲: حقیقتاً۔یعنی جو بیع کبھی فسخ نہ ہو سکے،اس کے لئے تین شرط ہیں:

ا۔خیار عیب ساقط ہو جائے۔۲۔بیع کے ساتھ کسی غیر کا حق متعلق نہ ہو۔ ۳۔قیمت بھی وصول ہوگئی ہو۔[5]

---

[1] حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے یہاں جو "نفاذ بیع" اور "لزوم بیع" کے مراتب ذکر فرمائے ہیں، یہ حضرت کی اپنی خاص اصطلاح ہے جو پورے کتاب البیوع اور اس کے متعلق مختلف و منتشر جزئیات پر غور کرنے اور نہایت باریک بینی پر مبنی معلوم ہوتی ہے، عام طور پر فقہائے کرام نفاذ کے لئے دو شرائط ذکر فرماتے ہیں کہ عاقدین مالک یا مختار ہوں اور مبیع کے ساتھ کسی غیر کا حق متعلق نہ ہوں، جہاں تک خیار شرط وغیرہ خیارات نہ ہونے کی بات ہو تو اس کو فقہاء کرام "لزوم عقد" کے شرائط میں ذکر فرماتے ہیں، لیکن مؤلف رحمہ اللہ کی ترتیب اس سے ذرا مختلف اور انوکھا ہے جو بیوع کے تمام جزئیات اور اس کے بنیاد و اساس سمجھنے کے لئے کافی مفید ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے بلکہ پوری امت کی طرف سے اس کاوش پر حضرت رحمہ اللہ کو جزائے خیر عنایت فرمائے۔

[2] مولف مرحوم کی اصطلاح کے مطابق لزوم بیع کا مفہوم ہے جبکہ عام فقہائے کرام بالفعل لازم ہونے کو لزوم سے تعبیر کرتے ہیں اگرچہ کبھی فسخ ہونے کا امکان باقی بھی رہے، یہ دونوں اصطلاحوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے، مؤلف رحمہ اللہ کی اس بحث کو دیگر فقہاء کرام عام طور پر یکجا ذکر نہیں کرتے لیکن مختلف جزئیات و تعلیلات کے ضمن میں اس کو تحریر فرماتے ہیں، تخریج کی ضمن میں اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

[3] قد مرّ تخريج هذين الشرطين.

[4] (ولو فسخه قبلها) قبل الرؤية (صح) فسخه (في الأصح) بحر؛ لعدم لزوم البيع بسبب جهالة المبيع فلم يقع مبرما (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية،ج٤ ص ٥٩٥).

[5] بیع فاسد کی ایک مشہور شکل "شراء ما باع۔۔" کے ضمن میں فقہاء کرام اس کو ذکر فرماتے ہیں، مندرجہ ذیل عبارات ملاحظہ فرمائیں:

وإذا اشترى الرجل بيعا بنسيئة أو ينقد ولم ينقد فليس ينبغي له أن يبيع ذلك من البائع بأقل من ذلك الثمن الذي أخذه به إن كان لم ينقده الثمن ولا ينبغي للبائع أن يشتريه منه بأقل من ذلك ولو فعل رددت البيع الآخر وان كان قد انتقد الثمن فلا بأس بأن يشتريه بأقل أو أكثر(كتاب الأصل للامام الشيباني،كتاب البيوع،باب العيوب في البيوع كلها ،ج٥ ص ٢٠٣).

خیارِ رؤیت کا مطلب

بغیر دیکھے جو چیز خریدی، دیکھنے کے بعد اگر پسند نہ آئے یا جو اوصاف بیان کئے تھے وہ موجود نہ ہوں، تو خریدار کو اختیار ہوتا ہے کہ مبیع واپس کر کے ثمن واپس لے لے۔[1]

مسئلہ: یہ اختیار عقد میں شرط رکھنے سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ شرط سے ساقط ہوتا ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر عقد میں خیار رؤیت رکھے تب یہ خیار ثابت ہوگا ورنہ نہیں، اسی طرح اگر وہ یہ کہے کہ میں نے خرید لیا ہے اب دیکھنے کی ضرورت نہیں، اس سے بھی یہ خیار ساقط نہیں ہوگا بلکہ بعد میں بھی اس کو اختیار حاصل ہوگا۔[2]

مسئلہ: رؤیت سے مراد (یہ ہے کہ) مبیع کے متعلق ایسا اجمالی علم حاصل ہو جائے جو عقد کے اوصاف مقصودہ پر مطلع کر دے۔

مبیع کے متعلق علم حاصل ہونے کے لئے مختلف مقاصد کے اعتبار سے مختلف ذرائع ہیں، رنگ اور خوشنمائی کے لئے دیکھنا، مزہ معلوم کرنے کے لئے چکھنا، آواز سننا، سختی نرمی معلوم کرنے کے لئے ہاتھ سے ٹٹولنا اور اندھے کے لئے صاف صاف اوصاف بیان کرنا یا اس کا ہاتھ لگا لینا کافی ہے۔[3]

مسئلہ: مبیع کا وہ جزء دیکھ لینا جو مقصود ہو اور اہم ہو، کافی ہے۔[1]

يجب أن يعلم أن شراء ما باع الرجل بنفسه أو بيع له بأن باع وكيله بأقل مما باع ممن باع أو ممن قام مقام البائع كالوارث قبل نقد الثمن لا يجوز إذا كانت السلعة على حالها لم ينتقص بعيب... لأجل شبهة الربا؛ لأن بين الثمن الثاني وبين الثمن الأول شبهة المقابلة من حيث إن العقد الثاني أوجب تأكيد الثمن الأول؛ لأن الثمن الأول كان بعرض السقوط بالرد وهذه العرضية تزول بالبيع الثاني. (المحيط البرهاني، كتاب البيوع، الباب السادس، نوع آخر في شراء ما باع بأقل مما باع، ج٦ ص ٣٨٥).

[1] من اشترى شيئا لم يره فله الخيار إذا رآه إن شاء أخذه وإن شاء تركه(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٦ ص ٢٨).

وكذا في الهداية (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج ٣ص ٣٤).

[2] (وله) أي للمشتري (أن يرده إذا رآه) .. (وإن رضي) بالقول (قبله) أي قبل أن يراه؛ لأن خياره معلق بالرؤية بالنص، ولا وجود للمعلق قبل الشرط. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج ٤ / ٥٩٤).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٦ ص ٢٩).

[3] قال: "ومن نظر إلى وجه الصبرة، أو إلى ظاهر الثوب مطويا أو إلى وجه الجارية أو إلى وجه الدابة وكفلها فلا خيار له" والأصل في هذا أن رؤية جميع المبيع غير مشروط لتعذره فيكتفي برؤية ما يدل على العلم بالمقصود (الهداية۔كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج ٣ص ٣٤).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج ٤ ص ٥٩٦).

مسئلہ : جب مبیع مختلف قسم کی چیزیں ہوں، تو ہر فرد کو الگ الگ دیکھنا ضروری ہے۔[2]

مسئلہ : کسی چیز کے تصویر کا دیکھنا کافی نہیں ہے۔(عالمگیری)[3] ہاں کسی آلہ یا فن کے ذریعے علم کافی حاصل ہو سکے تو جائز ہے۔[4]

مسئلہ : اگر ایک کارخانہ کی ایک ہی طرح کی بہت سے چیزیں خریدنی ہو تو ایک کو دیکھ لینا کافی ہے ہر ہر فرد کو دیکھنا ضروری نہیں، مثلاً ایک کارخانہ کی دس درجن پلیٹ خریدنے کا ارادہ ہے جو سب ایک ہی سائز اور ایک ہی نمبر کی ہوں، تو ایک کو دیکھ لینا کافی ہو گا، ہر ایک کا دیکھنا ضروری نہیں۔[5]

خیارِ رؤیت کا حکم

خریدار کو مبیع دیکھنے سے پہلے یا دیکھنے کے وقت اختیار ہے کہ خرید لے یا چھوڑ دے، یہ خیار رؤیت ان اموال میں ہو گا جو تعیین سے متعین ہوتے ہیں اور اپنے ملک اور قبضہ میں داخل کئے جاتے ہیں، لہٰذا بیع صرف میں خیار رؤیت حاصل نہ ہو گا کیونکہ اس میں دونوں بدل غیر متعین ہیں۔[6]

مسئلہ : بائع کو اپنے مال میں خیار رؤیت حاصل نہ ہو گا اگرچہ اس نے دیکھے بغیر بیچا ہو، کیونکہ وہ ملک سے خارج ہو گیا اور ثمن غیر متعین ہے۔[7]

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] فإن كان المبيع أشياء، فإن لم تتفاوت آحاده كالمكيل والموزون وعلامته أن يعرض بالنموذج، اكتفي برؤية واحد منها إلا إذا كان الباقي أردأ مما رأى فحينئذ يكون مخيرا، وإن تفاوتت كالثياب والدواب لزم رؤية كل واحد،(درر الحكام شرح غرر الأحكام،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج ٢ ص ١٥٧).

وكذا في تبيين الحقائق (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية،ج٤ ص ٢٦).

[3] ولو رأى ما اشتراه من وراء زجاجة أو في مرآة أو كان المبيع على شفا حوض فنظره في الماء فليس ذلك برؤية وهو على خياره(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب السابع في خيار الرؤية، الفصل الثاني،ج٣ ص ٦٣).

[4] کیونکہ خیار رؤیت کا اصل دار مدار اسی پر ہے جیسا کہ پہلے حواشی میں تحریر کیا گیا۔

[5] انظر تخريج المسئلة الثانية والرابعة.

[6] وشرط ثبوت الخيار أن يكون المبيع مما يتعين بالتعيين فإن كان مما لا يتعين بالتعيين لا يثبت فيه الخيار (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب السابع في خيار الرؤية، الفصل الاول،ج٣ ص ٥٨).

وكذا في بدائع الصنائع (كتاب البيوع، مبحث خيار الرؤية،ج٥ ص ٢٩٢).

[7] ومن باع ما لم يره فلا خيار له (مختصر القدوري، كتاب البيوع، باب خيار الرؤية ،ص٨١).

اور بیع سلم میں خیار رؤیت نہیں ہے کیونکہ عقد کے ساتھ قبضہ مشروط نہیں، عاقدین کو ان مالوں کے بارے میں خیار حاصل ہے جو ان کو ملیں گے نہ ان میں جو ان کی ملک سے خارج ہو جائے گی اس لئے کہ دونوں جانب اموال غیر متعینہ ہیں۔[1]

مسئلہ نمبر: صاحب بحر الرائق نے لکھا ہے کہ خیار رؤیت خیار موقت ہے، لہٰذا مشتری جب مبیع دیکھنے پر قادر ہو اور نہ دیکھے یا دیکھنے کے بعد خاموشی اختیار کرے تو یہ خیار ختم ہو جائے گا، کیونکہ امتداد زمان تجارت میں بنفسہ معتبر بات ہے۔[2]

مسئلہ نمبر: مشتری کو مبیع حاصل ہوا اور کسی وجہ سے خود نہیں دیکھ سکا تو اس پر لازم ہے کہ کسی کو دیکھنے کے لئے اپنا وکیل بنادے، ورنہ خیار رؤیت ساقط ہو جائے گا۔

مسئلہ: مبیع کا نمونہ دیکھ لینا کافی ہے۔[3]

مسئلہ: اگر مبیع کو خریدنے سے پہلے دیکھا تھا اور خریدتے وقت اس کے اوصاف یاد ہیں تو اب خیار رؤیت حاصل نہ ہوگا۔[4]

مسئلہ: خریدار کے وکیل کا دیکھ لینا تو کافی ہے لیکن قاصد کا دیکھ لینا معتبر نہیں۔[5]

وكذا في كنز الدقائق (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية ،ص ٤١٤)

[1] ولا يثبت خيار الرؤية فيما ملك ديناً في الذمة كالسلم والدراهم والدنانير عيناً كان أو ديناً(جامع الفصولين ،الفصل الخامس والعشرون في الخيارات، ج١ ص ٢٠٤)

وكذا في فتاوى قاضيخان (كتاب البيوع، فصل في خيار الرؤية،ج٢ ص ٩٣).

[2] صاحب بحر نے اس مسئلہ میں مشائخ حنفیہ کا اختلاف ذکر فرمایا کہ بعض مشائخ کے نزدیک موقت ہے اور بعض کے نزدیک مطلق ہے پھر دوسرے قول کی ترجیح نقل کر دی، اسی طرح صاحب نہر، در مختار وغیرہ نے بھی دوسرے قول کو ترجیح دی، جہاں تک حضرت مؤلف رحمہ اللہ کا بحر کے حوالہ سے اس کو موقت قرار دینا ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت کی اپنی ترجیح ہے ورنہ بحر میں اس کو قول کو راجح نہیں کہا۔

واختلفوا هل هو مطلق أو مؤقت فقيل مؤقت بوقت إمكان الفسخ بعدها حتى لو تمكن منه ولم يفسخ سقط خياره وإن لم توجد الإجازة صريحا ولا دلالة وقيل يثبت الخيار له مطلقا نص عليه في نوادر ابن رستم وذكر محمد في الأصل وهو الصحيح لإطلاق النص والعبرة لعين النص لا لمعناه اهـ.(البحر الرائق ، كتاب البيوع، باب خيار الرؤية ،ج٦ ص ٢٩).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب خيار الرؤية ،ج٤ ص ٥٩٥).

[3] قد مر تخريجه تحت المسئلة الثانية من هذا الباب.

[4] (شرى ما رأى) أي ما رآه قبل الشراء (إن تغير خير) لأنه اشترى ما لم يره إذ بالتغير صار شيئا آخر (وإلا) أي، وإن لم يتغير (فلا) أي لا خيار له؛ لأنه اشترى شيئا رآه إلا إذا لم يعرف أنه الذي رآه قبل العقد؛(درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب البيوع، باب خيار الرؤية ،ج ٢ ص ١٥٩).

[5] (ونظر وكيله بالقبض كنظره لا نظر رسوله) (تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٤ ص ٢٨).

مسئلہ: اگر مبیع عیب دار ہو جائے یا خریدار مر جائے یا کسی تصرف سے واپس کرنے کے قابل نہ رہے، یا خریدار مبیع کو دیکھتے ہی ناراضگی کا اظہار نہ کرے تو ان تمام صورتوں میں خیار رؤیت ساقط ہو جائے گا۔[1]

مسئلہ: اگر خیار رؤیت کے ذریعے مبیع واپس کرنا چاہے تو خریدار کے فعل یا حکم سے مبیع پر جو مصارف آئے یا بائع کا نقصان ہو تو خریدار پر ان کی تلافی لازم ہے، مثلاً زید نے عمر کو خط لکھا کہ کلکتہ سے فلان مال بھیجدو، یا کچھ خرید کر کہا کہ میرے گھر تک لے چلو، اوراب مال پہنچنے کے بعد جب مال دیکھا تو پسند نہ آیا، تو اب زید کے ذمہ لازم ہے کہ عمر کے آمد ورفت کے مصارف ادا کردے، اسی طرح امتداد زمان سے مال پر جو اثر ظاہر ہوا ہے کہ کچھ سڑ گیا یا ٹوٹ گیا، اس کا ضمان بھی زید کے ذمے لازم ہوگا۔ (عالمگیری)[2]

مسئلہ: اگر کچھ مال پر مصارف آئے مگر خریدار کے حکم سے نہ ہو بلکہ دکاندار نے خود خرچہ کیا تو وہ خریدار کے ذمے نہ ہوگا، جیسے بغیر طلب کے زید نے مال بھیج دیا عمر کو ضرورت نہ تھی یا پسند نہ آیا واپس کیا تو اب خرچہ عمر کے ذمہ نہ ہوگا۔[3]

اگر غائبانہ خرید وفروخت کرنا ہو تو ضروری ہے کہ اوصاف وغیرہ کی خوب صراحت ہو جائے تا کہ کسی کا

وكذا في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (رقم المادة ٣٣٣:، ج١ص٣٣٠).

[1] (قوله ويبطل بما يبطل به خيار الشرط) أي للمشتري يعني من صريح ودلالة وضرورة .. فإن كان ذلك التصرف لا يمكن رفعه كالإعتاق والتدبير أو تصرفا يوجب حقا للغير كالبيع المطلق أو بشرط خيار للمشتري والرهن والإجارة يبطله قبل الرؤية وبعدها (البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٦ ص ٣٠).

وكذا في الدرر شرح الغرر(كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٢ ص ١٥٩).

[2] ومؤنة رد المبيع بعيب أو بخيار شرط أو رؤية على المشتري،(الفتاوى الهندية،كتاب البيوع، الباب السابع، الفصل الاول، ج٣ص ٦١).

وكذا في جامع الفصولين (الفصل الخامس والعشرون في الخيارات، ج١ ص ٢٠٦).

[3] ضابطہ یہ ہے کہ ایسے غیر ضروری کام اگر کوئی ایک فریق دوسرے کی اجازت کے بغیر کرے تو یہ اس کی طرف سے تبرع سمجھا جائے گا دوسرے فریق سے اس کے اخراجات وصول کرنے کا حق نہیں، علامہ شامی رحمہ اللہ طویل بحث کے بعد بطور خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

والذي تحصل في هذا المحل أن الشريك إذا لم يضطر إلى العمارة مع شريكه بأن أمكنه القسمة فأنفق بلا إذنه فهو متبرع، وإن اضطر وكان الشريك يجبر على العمل معه فلا بد من إذنه أو أمر القاضي فيرجع بما أنفق، وإلا فهو متبرع إن اضطر وكان شريكه لا يجبر، فإن أنفق بإذنه أو بأمر القاضي رجع بما أنفق (حاشية ابن عابدين على الدر المختار ،كتاب الشركة، ج٤ ص ٣٣٤).

وكذا في البحر الرائق (باب التحكيم، ج٧ ص ٣٤)

نقصان نہ ہو۔

مسئلہ : زید کو مال وصول ہو گیا، لیکن ایک مدت اس کو نہ دیکھا، اسی طرح بلاضرورت مدت کو طول دینا عیب ہے۔[1]

خیارِ وصف

خیارِ وصف کا معنی یہ ہے کہ بائع نے مال کے جو اوصاف بیان کئے تھے، وہ غلط نکلیں تو خریدار کو اختیار ہو گا، چاہے تو پوری قیمت ادا کر کے خرید لے چاہے تو واپس کر دے، اگر بائع نے عین مال ہی کو بدل دیا تو بیع ختم ہو گئی۔

مسئلہ: بائع کو خیار وصف حاصل نہ ہو گا، یعنی اگر مال کا جو وصف بیان کیا تھا، مال اس سے عمدہ نکلا، تو اب بائع نہ عقد کو ختم کر سکتا ہے نہ ہی قیمت بڑھا سکتا ہے، وصف سے مراد وہ اوصاف ہیں جو بیان یا قرائن سے سمجھ میں آجائے، دلی تصور کا اعتبار نہیں۔[2]

خیارِ عیب

یعنی مال میں عیب نکل آنے کی وجہ سے واپس کرنے یا قیمت کم کرنے کا اختیار۔

عیب: مال میں موجود ہونے سے مراد وہ بات ہے جس سے تاجروں کی نظر میں مال کی قیمت کم ہو جائے۔[3]

مسئلہ : عیب امر وجودی ہے لہٰذا مال میں کسی صفت کے نہ ہونے کو عیب نہیں کہا جائے گا، ورنہ ہر چیز دوسرے کے مقابلے میں صفت نہ ہونے کی وجہ سے عیب دار ہو گی۔

---

[1] جبکہ اس کی وجہ سے بازاری قیمت میں کمی پیدا ہو جاتی ہو۔

قال القدوري في «كتابه» : كل ما يوجب نقصاناً في الثمن في عادات التجار فهو عيب لأن المالية مقصودة في البيع وما ينقص الثمن ينقص المالية فكان عيباً.(المحيط البرهاني، كتاب البيوع، الفصل الرابع عشر في العيوب، ج٦ص٥٤٢).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع،باب خيار العيب ،ج٥ص٤)

[2] من باع شيئا على أنه رديء فإذا هو جيد لا خيار للبائع. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، خيار الرؤية،ج٥ ص ٢٩٢).

وإن وجدها أكثر من الذراع الذي سماه فهو للمشتري ولا خيار للبائع"؛ لأنه صفة، فكان بمنزلة ما إذا باعه معيبا، فإذا هو سليم (الهداية ،كتاب البيوع، خيار الرؤية،ج ،٣ ص ٢٥).

[3] قال القدوري في «كتابه» : كل ما يوجب نقصاناً في الثمن في عادات التجار فهو عيب (المحيط البرهاني ،كتاب البيوع،الفصل الرابع عشر: في العيوب،ج٦ ص ٥٤٢).

مسئلہ : عیب مالیت کے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا ایسا سڑا ہوا یا نکما ہونا جس کی کچھ قیمت ہی نہ ہو، عیب نہیں بلکہ وہ مال ہی نہیں لہٰذا اس میں بیع باطل ہے، پس خربوزہ کا کم شاداب یا پھیکا ہونا عیب ہے، اگر بیع کرتے وقت کہا کہ میٹھا ہے بعد میں پھیکا نکلا تو خیار رؤیت حاصل ہو گا، اگر سڑا ہوا نکلا تو عیب نہیں بلکہ مال ہی نہیں جس کی وجہ سے عقد باطل ہو گیا۔[1]

مسئلہ : وہ چیز عیب نہیں ہے جس کا بائع ذکر کر دے یا دیکھتے ہی نظر آ جاتا ہے اور اس کو چھپایا بھی نہیں جیسے دکاندار نے کہا کہ یہ پھٹا ہوا یا رفو کردہ کپڑا[2] فروخت کیا، یا اس چادر میں بڑا سوراخ ہے، یا اس برتن کا بڑا ٹکڑا ٹوٹا ہوا ہے اور خربوزہ میں داغ کا نشان ظاہر ہو رہا ہے، اور یہ چیزیں بوسیدہ حالت میں نہیں خریدی گئیں تھیں، تو یہ عیب نہیں ہے۔[3]

مسئلہ : اگر بیچنے والے یا خریدار نے عیب سے براءت کا اظہار کیا، یا دونوں کی طرف سے رضاء پائی گئی، مثلاً بائع نہ کہا کہ تم اچھی طرح دیکھ کر لو بعد میں تمام عیوب سے میں بری ہوں، میں اسی حالت میں فروخت کرتا ہوں، یا خریدار نے کہا کہ مال جیسا بھی ہو میں نے خرید لیا ہے، اب بعد میں کسی عیب کی وجہ سے مال واپس نہیں ہو سکتا۔[4]

مسئلہ : اور جب عیب مشتری کے پاس پیدا ہو وہ بائع کے حق میں عیب نہیں ہے۔[5]

---

[1] وإذا اشترى الرجل جوزا أو بيضا فوجده فاسدا كله وقد كسره فله أن يرده ويأخذ الثمن كله وكذلك البطيخ والفاكهة إذا وجدها فاسدة كلها بعد ما يكسرها فله أن يرده إذا كان لا يساوي شيئا فهو فاسد(كتاب الأصل للامام الشيباني ،كتاب البيوع، باب العيوب في البيوع كلها،ج٥ ص ١٩٥).

وكذا في شرح مختصر الطحاوي للجصاص. كتاب البيوع، باب المصراة وغيرها،ج٣ ص ٧٣.

[2] رفو: پھٹے ہوئے کپڑے کی تاگوں سے مرمت کرنا۔ پھٹی ہوئی جگہ کو بھرنا۔ فیروز اللغات، ص ۷۱۴۔

[3] في مجلة الأحكام العدلية: (المادة ٣٤١) إذا ذكر البائع أن في المبيع عيب كذا وكذا وقبل المشتري مع علمه بالعيب لا يكون له الخيار بسبب ذلك العيب.

وفي درر الحكام تحته: لا يكون للمشتري خيار العيب: أولا: إذا ذكر البائع أن في المبيع عيب كذا وكذا وقبل المشتري مع علمه بالعيب. ثانيا: إذا رأى المشتري ذلك العيب وقت الشراء واشتراه مع علمه بالعيب. (كتاب البيوع، الباب السادس، رقم المادة: ٣٤١، ج١ص ٣٤٧).

[4] قال أصحابنا: إذا باع بشرط البراءة من العيوب كلها، صح البيع والشرط، ولم يجز له الرد بعيب.(التجريد للقدوري،كتاب البيوع، البيع بشرط البراءة من العيوب،ج٥ ص ٢٤٨٧).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٥ ص ٤٢)

[5] (مادة ٤٢١) يشترط أن يكون العيب الموجب لرد المبيع قديماً. (مرشد الحيران ،كتاب البيع، رقم المادة: ٤٢١،ص ٦٨)

عیب کی تین قسمیں:

پھر وہ عیب جس سے مشتری کو مال واپس کرنے کا حق پیدا ہو جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عیب بیع یا قبضہ مشتری سے پہلے موجود ہو،[1] اس کی تین قسمیں ہیں:[2]

۱۔ جو مبیع بعینہ باقی رہے جیسے غلام کا اندھا بہرا ہونا، کپڑے کا داغ یا سوراخ والا ہونا، یا پھل کا سڑا ہوا ہونا، ان صورتوں میں اگر خریدتے وقت یا قبضہ سے پہلے معلوم نہ ہو تو قبضہ کے بعد بھی عیب کا حکم لگایا جائے گا۔

۲۔ جن کا صرف اثر باقی رہے جیسے لونڈی کا زانیہ یا ولد الزنا ہونا، باوجود اس فعل قبیح کو ترک کرنے اور توبہ کر لینے کے، کہ عار اور نسب پر طعن عرفاً دور نہیں ہوتا، یا کسی جانور کو ایسا زہر دیا یا دوا کھلایا جس کا اثر بد کچھ وقت گزرنے کے بعد ظاہر ہو، جیسے کتوں کا کاٹا یا کشتوں کا اثر، یا کسی کپڑے میں تیزاب لگا دیا کہ استعمال کے وقت فوراً پھٹ جائے، یہ تمام باتیں عیب ہیں، خریدار کو ان کے متعلق علم نہ تھا۔

۳۔ وہ عیب نہ خود باقی رہے نہ اس کا اثر باقی رہے مگر اس عیب کے لوٹ آنے یا بار بار ہونے کا امکان ہے جیسے چوری کرنا، بھاگنے کی عادت، غلام میں یا جانور میں کوئی بدخوئی کی عادت، بائع کے پاس رہتے ہوئے یہ عادت تھی مشتری کے پاس دوبارہ ظاہر ہوئی تو اس کو عیب کہا جائے گا، اگر بائع کے پاس سرے سے موجود نہیں تھیں، بعد میں مشتری کے پاس پیدا ہوئیں تو وہ عیب نہیں ہیں۔

مسئلہ : جو جدید عیوب مشتری کے پاس پیدا ہوں، ان کی وجہ سے مشتری کو کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔[3]

خریدار کے پاس پیدا ہونے والے عیوب

عیب دار میں خریدار کے پاس پہنچ کر جو تصرفات اور عیوب پیدا ہوتے ہیں، وہ چھ طرح کے ہیں:

ولا بد في كونه عند البائع ولم يعلم به المشتري (النهر الفائق ،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج ٣ ص ٣٨٩)

[1] العيب الذي يحدث في المبيع وهو في يد البائع بعد العقد وقبل القبض حكمه حكم العيب القديم الذي يوجب الرد. (مجلة الأحكام العدلية،رقم المادة ٣٤٠،ص ٦٧).

[2] یہ تقسیم دو باتوں پر مبنی ہے۔ ۱: عیب ہر وہ چیز ہے جس کی وجہ سے تجار کے ہاں مبیع کی قیمت میں کمی آجائے چاہے بعینہ یہ عیب مبیع میں موجود ہو یا اس کا اثر باقی ہو یا صرف لوٹنے کا امکان ہو۔ ۲: اس آخری صورت میں صرف بائع کے پاس عیب کا پایا جانا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ خریدار کے پاس دوبارہ عیب پیدا ہو جائے۔

[3] قد مرّ تخريجه قبل ذكر هذه الاقسام الثلاثة.

۱۔مال میں وہ تصرف جس سے مال میں کچھ کمی زیادتی پیدا نہ ہو،استعمال کا اثر کچھ نہ ہو بلکہ جیسا تھا ویسا ہی ہے، جیسے کتب کو پڑھ لیا یا کپڑے کو احتیاط کے ساتھ پہن لیا،اب عیب سابق کی وجہ سے واپس کر سکتا ہے۔[1]

۲۔استعمال سے کچھ نقصان پیدا ہو گیا جیسے کپڑے کو کاٹ ڈالا،اب بائع کو اختیار ہے(کہ)اسی طرح مال کو ناقص واپس لے یا مشتری کو عیب سابق کے اندازہ سے تلافی کرے۔[2]

۳۔مشتری کے تصرف سے مبیع کے اندر کچھ زیادتی پیدا ہوئی جیسے کپڑے کو رنگ کر دیا،اب بائع کے لئے واپس کرنے کا حق نہ رہا،کیونکہ اس میں مشتری کا نقصان ہے لہٰذا مشتری نقصان کی تلافی کروا سکتا ہے۔[3]

۴۔قدرتی آفت سے مال ضائع ہو گیا جیسے جانور تھا مر گیا،یا پھل تھا سڑ گیا،اس کے بعد عیب سابق پر اطلاع ہوئی تو بائع سے بقدر نقصان قیمت واپس لے سکتا ہے۔[4]

۵۔اگر مشتری نے مال کو خرچ کر دیا یا ضائع کر دیا یا فروخت کر دیا یا کسی کو ہبہ کر دیا،ان تمام صورتوں میں عیب سابق کی وجہ سے نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے۔[5]

۶۔اگر مال کسی وجہ سے واپس کرنے کے قابل نہ رہے جیسے تیسری صورت میں ہے،اس کے بعد مشتری اس کو کھا پی لے تو بقدر نقصان قیمت واپس لے سکتا ہے،کیونکہ عیب پر مطلع ہونے کے بعد مشتری نے خود

---

[1] ولو اشترى فيلقا فشمه ثم وجد به عيبا فله الرد كذا في القنية.(الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب الثامن، الفصل الثالث فيما يمنع الرد بالعيب وما لا يمنع ،ج٣ ص ٧٩).

[2] "وإذا حدث عند المشتري عيب فاطلع على عيب كان عند البائع فله أن يرجع بالنقصان ولا يرد المبيع".. إلا أن يرضى البائع أن يأخذه بعيبه؛ لأنه رضي بالضرر.(الهداية ،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٣ ص ٣٨).

وكذا في فتاوى قاضيخان (كتاب البيوع، فصل فيما يرجع بنقصان العيب ولا يرد،ج٢ ص ١٠٣).

[3] فإن خاط الثوب أو صبغه أحمر، أو لت السويق بسمن ثم ظهر عيبه رجع بنقصانه وليس لبائعه أن يأخذه حتى لو باعه بعد رؤية عيبه لا يسقط الرجوع (ملتقى الأبحر مع مجمع الانهر،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج١ ص ٦٦).

وكذا في الفتاوى الهندية(كتاب البيوع، الفصل الثالث فيما يمنع الرد بالعيب وما لا يمنع ج٣ ص ٧٧).

[4] وإن مات العبد أو أعتقه رجع بنقصان العيب، فإن قتله أو أكل الطعام (سم) لم يرجع،(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، فصل في خيار العيب،ج٢ ص ٢٠).

وكذا في ملتقى الأبحر مع مجمع الانهر(كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج١ ص ٦٦).

[5] فإن باعه المشتري لم يرجع بشيء؛ لأن الرد غير ممتنع برضا البائع فيصير هو بالبيع حابسا للمبيع فلا يرجع بالنقصان (الهداية،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٣ ص ٣٨).

وكذا في الهندية كتاب البيوع، الفصل الثالث فيما يمنع الرد بالعيب وما لا يمنع ج٣ ص٨٣).

ناقابلِ واپسی نہیں بنایا بلکہ پہلے ہی سے ایسا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مشتری پر مال کو روکنا لازم ہو گیا تھا۔[1]

مسئلہ: ایک گھوڑا ہزار کا خریدا، دو ماہ گذرنے کے بعد عیب پر مطلع ہوا مگر اتنے دنوں میں اس قسم کے گھوڑوں کی قیمت کم ہو گئی اور مانگ کم ہو گئی، یہ امتداد زمانہ عیب حادث نہیں، مشتری کو واپس کرنے کا حق ہو گا۔[2]

مسئلہ: مبیع میں ایسے تصرفات کرنا جن پر جانچ پڑتال موقوف ہے، یہ جدید عیب نہیں ہے کہ بائع کہے کہ تم نے عیب دار بنا دیا، جیسے تربوز کو کاٹ کر دیکھا، کپڑا تھان سے پھاڑ کر دیا، ہندو حلوائی نے مٹھائی تول کر مسلمان کو دی، اس کے بعد پہلا عیب ظاہر ہوا، یہ سب امور اگرچہ عیب ہیں مگر ان کا اعتبار نہ ہو گا[3] (مسلمان کے چھونے کے بعد ہندو کے لئے وہ چیز کار آمد نہیں، مشتری کا چھونا عیب اس لئے نہیں ہے کہ چھونا قبضہ کی ضرورت میں داخل ہے)۔

بخلاف اس کے کہ بائع نے مال خریدار کے حکم سے دوسری جگہ بھیجا، اب یہ نیا عیب ہے کیونکہ اسی مقام پر حوالہ کرنا ممکن تھا، مشتری نے اپنی راحت یا مصلحت سے اسے دوسری جگہ طلب کیا لہٰذا وہی اس

---

[1] (أو لت السويق بسمن) وبالجملة خلط المشتري ملكه بملك البائع (فظهر عيبه) القديم (لا يأخذه) أي البائع (ويرجع به) أي يرجع المشتري بنقصان العيب.. (كما لو باعه) أي المشتري الثوب المخيط ونحوه (بعد رؤية عيبه أو مات العبد أو أعتقه قبلها) أي قبل رؤية عيبه (مجانا أو دبره أو استولدها) فإنه يرجع بالنقصان في هذه الصور،(درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج ٢ ص ١٦٢).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب البيوع،الفصل الرابع عشر: في العيوب،ج٦ص٥٦٥).

[2] اما النقصان بسبب السعر فغير مضمون في الغصب لأنه فتور يحدثه الله تعالى في قلوب العباد لا معنى يرجع إلى العين ولهذا لا يعتبر في الرهن والمبيع (تحفة الفقهاء، كتاب الغصب،ج٣ ص ٩١).

وكذا في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (كتاب الغصب، رقم المادة ٩٠٠،ج٢ ص ٥٥٣).

[3] یہ حکم تب ہے جبکہ عیب پر اطلاع پانے سے پہلے ایسا کیا جائے جیسا کہ تصرفات اور عیوب کے قسم دوم میں ذکر کیا جا چکا، اگر کوئی عیب پر پوری طرح اطلاع پانے کے بعد ایسے تصرفات کرے تو یہ اس کی طرف رضامندی سمجھی جائے گی اور اس کے بعد اس کو محض اس عیب کی وجہ سے مبیع واپس کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہو گا، البتہ اگر اس نے اپنے لئے خیار شرط مقرر کر رکھی ہو تو اس کا اختیار برقرار رہے گا۔

ولو ركبها؛ لينظر إلى سيرها لا يبطل خياره؛ لأنه لا بد له من ذلك للاختيار بخلاف خيار العيب أنه إذا ركبها بعدما علم بالعيب أنه يبطل خياره؛ لأن له منه بدا، ولا حاجة إلى الركوب هناك لمعرفة سيرها، فكان دليل الرضا بالعيب. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، خيار الشرط،ج٥ ص ٢٧٠).

وكذا في رد المحتار (كتاب البيوع، مطلب في تخيير المشتري إذا استحق بعض المبيع،ج ٥ ص ٣٣).

کا ذمہ دار ہوگا [1]، ایسے ہی مبیع میں ہر وہ تصرف جو ضرورت سے زائد ہو، عیبِ جدید ہے جیسے گوشت خرید کر قیمہ بنوالیا تربور کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کروالیا۔

مسئلہ: خیار عیب میں وراثت جاری ہوتی ہے، یعنی مورث نے کوئی چیز خریدی اس کا انتقال ہوا، بعد میں ورثہ عیب سابق پر مطلع ہوئے تو ان کو عیب کی وجہ سے رد کرنے کا حق ہوگا۔ [2]

دانستہ طور پر عیب دار چیز فروخت کرنا

"من باع مَعيبا لم يُنبّه لم يزلْ في مقتِ الله ويلعنه الملائكةُ" [3]

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے عیب دار چیز بیچی، خریدار کو اس پر مطلع نہیں کیا، وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت میں رہے گا، فقہاء کرام کے نزدیک عیب دار چیز بتائے بغیر فروخت کرنے سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے۔ [4]

---

[1] مشتری کو ذمہ دار ٹھہرانا تو درست ہے کیونکہ خیارِ عیب کی صورت میں سودا واپس کرنے کی ذمہ داری خریدار ہی پر عائد ہوتی ہے مگر صرف شہر کی تبدیلی کو اصطلاحی عیب قرار دینا اور اس پر عیب کے احکام جاری کرنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً اس تبدیلی کی وجہ سے خریدار کے ہاتھ سے مبیع واپس کرنے کا اختیار ساقط ہو جائے۔

وجد بالمبيع الذي له حمل ومؤنة عيبا ورده فمؤنة الرد على المشتري. البحر الرائق،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٦ص ٤٠. في الدر المختار:ولا يرد جبرا ماله حمل ومؤنة إلا في بلد العقد. وفي حاشية ابن عابدين تحته: أشار إلى أن تحميله بمنزلة حدوث عيب لما فيه من مؤنة الرد إلى موضع العقد، لكن هذا العيب غير مانع؛ لأن مؤنة الرد على المشتري فلا ضرر فيه على البائع.كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٥ص ١٦.

[2] وأجمعوا أن خيار العيب وخيار التعيين يورث(تحفة الفقهاء،كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٢ ص ٧٢).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج ١ص ١٩٧).

[3] *روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:* عن واثلة بن الأسقع قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من باع عيبا لم يبينه لم يزل في مقت الله ولم تزل الملائكة تلعنه.(مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه ، كتاب التجارات،باب من باع عيبا فليبينه،ج٣ ص ٣٠).

[4] إذا باع سلعة معيبة، عليه البيان وإن لم يبين قال بعض مشايخنا يفسق وترد شهادته، قال الصدر لا نأخذ به. اهـ. قال في النهر: أي لا نأخذ بكونه يفسق بمجرد هذا؛ لأنه صغيرة. اهـ قلت: وفيه نظر؛ لأن الغش من أكل أموال الناس بالباطل فكيف يكون صغيرة، بل الظاهر في تعليل كلام الصدر أن فعل ذلك مرة بلا إعلان لا يصير به مردود الشهادة، وإن كان كبيرة كما في شرب المسكر(حاشية ابن عابدين على الدر المختار ، باب خيار العيب،مطلب في جملة ما يسقط به الخيار،ج٥ ص ٤٧).

ولایت کا بیان

ولایت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ولایت عامہ: جو ہر حال میں ہر وقت ہر چیز پر نافذ ہو، یعنی انسان، اموال اور مخلوقات پر حسب مصلحت شرعیہ احکام نافذ ہوں، بعض مباحات سے روک دیں یا اسے لازم کر دیں، ولایت کی یہ قسم خاص ہے جناب نبی کریم ﷺ کے ساتھ، کوئی انسان اس میں آپ ﷺ کے برابر نہیں [1]، لیکن آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین، ان کے سلاطین عادل اور ان کے قاضیوں کے متعلق، وہ بھی نہ ہو تو بضرورت دوسرے سلاطین اسلام، وہ بھی نہ ہو، بمجبوری بعض احکام میں ہر حاکم مقتدر کو کچھ نہ کچھ نفاذ احکام کے اختیار ہیں، مگر احکام ہر درجہ میں بدلتے جائیں گے۔ [2]

۲۔ ولایت خاصہ: یعنی نابالغ بچے اور مجنون پر ولایت، اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کاملہ: نفس اور مال دونوں پر ولایت ہو جیسے نکاح کر دینا، تعلیم دینا، پرورش کرنا، ان کے لئے خرید وفروخت، ان کے ہدیے قبول کرنا۔

۲۔ قاصرہ: جس میں اموال پر دست اندازی نہ ہو سکے۔ [3]

ولایتِ کاملہ کی تفصیل

مسئلہ: ولایت کاملہ خاص ہے باپ کے لئے یا اس کے وصی، یا وصی کے وصی کے لئے۔

مسئلہ: اگر یہ نہ ہوں تو دادا یا ان کے وصی، یا وصی کے وصی کے لئے۔

---

[1] { لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا } [الأحزاب : ٢١]

[2] سيأتي تفصيله في مبحث مستقل انشاء الله تعالى.

[3] والولاية الخاصة إما أن تكون ولاية في النكاح والمال، والولي في ذلك الجد أو الأب أو أبو الجد، وإما أن تكون في النكاح فقط أو في المال فقط فالولي في النكاح فقط جميع العصبات والأم وذوي الأرحام، والولي في المال فقط أولا أبو الصغير. ثانيا الوصي الذي اختاره أبوه ونصبه في حال حياته إذا مات أبوه. ثالثا الوصي الذي نصبه الوصي المختار في حال حياته إذا مات. رابعا جده الصحيح أي أبو أب الصغير. خامسا الوصي الذي اختاره الجد ونصبه في حال حياته. سادسا الوصي الذي نصبه هذا(درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ،رقم المادة ٥٩،ج١ص ٥٨).

وكذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم(الفن الاول،، القاعدة السادسة عشرة: الولاية الخاصة أقوى من الولاية العامة ،ج١ ص ١٣٣)

مسئلہ: اگر یہ بھی نہ ہوں تو قاضی یا قاضی کے وصی کے لئے۔

مسئلہ: اگر یہ نہ ہوں تو ماں کی وصی کو مال کی حفاظت کی ولایت حاصل ہو گی، زمین کے سوا باقی منقولی چیزیں جو بچے کی ملک میں ہیں، ان کو فروخت کرنا یا بچہ کی ضروریات کو خریدنا اس کے اختیار میں ہو گا۔[1]

اموال میں تصرف کے تین اقسام

۱۔ نابالغ کا مال دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے یا نابالغ کے لئے خریدے، اس میں ان کو پورا اختیار ہے بشرطیکہ یہ لوگ متدین ہوں اور بچے کے لئے مصلحت پسند ہوں۔

۲۔ ایک نابالغ کا معاملہ دوسرے نابالغ سے کرنا جو اس کی ولایت میں ہے، یعنی نابالغ کے مال کو دوسرے نابالغ کے ہاتھ فروخت کرنا وغیرہ۔[2]

۳۔ نابالغ کا معاملہ اپنی ذات سے کرنا، باپ کے لئے جائز ہے کہ نابالغ کا معاملہ اپنی ذات سے کرے بشرطیکہ سوء اختیار مشہور نہ ہو۔ (عالمگیری)[3]

وصی اور قاضی کے لئے نابالغ کا معاملہ اپنی ذات سے کرنے کا حق نہیں ہے، لہٰذا نہ خود معاملہ کرے نہ وکیل

---

[1] في الدر المختار: (ووليه أبوه ثم وصيه) بعد موته ثم وصي وصيه كما في القهستاني عن العمادية (ثم) بعدهم (جده) الصحيح وإن علا (ثم وصيه) ثم وصي وصيه قهستاني زاد القهستاني والزيلعي ثم الوالي بالطريق الأولى (ثم القاضي أو وصيه) أيهما تصرف يصح فلذا لم يصح ثم (دون الأم أو وصيها) هذا في المال.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: وإن لم يكن واحد ممن ذكرنا فله الحفظ وبيع المنقول لا العقار والشراء للتجارة، وما استفاده الصغير من غير مال الأم مطلقا وتمامه فيها اهـ لكن بيع المنقول من الحفظ(كتاب الماذون، مبحث في تصرف الصبي ومن له الولاية عليه وترتيبها ،ج٦ ص ١٧٤).

راجع لتفصيل المبحث بدائع الصنائع (كتاب البيوع،شرائط النفاذ،ج٥ ص ١٥٥).

[2] ومن كان له ابنان صغيران فباع مال أحدهما من الآخر بأن قال بعت عبد ابني فلان من ابني فلان جاز وإذا بلغا فالعهدة عليهما في الصحيح... باع الأب ضيعة أو عقارا لابنه الصغير بمثل قيمته فإن كان الأب محمودا أو مستورا عند الناس يجوز وإن كان مفسدا لا يجوز وهو الصحيح(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب السابع عشر ،ج٣ ص ١٧٤).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب البيوع،الفصل الثامن عشر: في بيع الأب والوصي والقاضي مال الصبي وشرائهم له،ج ٧ص ٣٤).

[3] باع الأب ضيعة أو عقارا لابنه الصغير بمثل قيمته فإن كان الأب محمودا أو مستورا عند الناس يجوز وإن كان مفسدا لا يجوز وهو الصحيح.(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب السابع عشر ،ج٣ ص ١٧٤).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب البيوع،الفصل الثامن عشر: في بيع الأب والوصي والقاضي مال الصبي وشرائهم له،ج ٧ص ٣٤).

کے ذریعے کرے اور نہ دوسرے نابالغ کے لئے معاملہ کرے جوان کی ولایت میں ہے، نہ ہی اپنے مؤکل کے لئے کرے۔[1]

مسئلہ : قاضی نے کسی کو نابالغ کا وصی مقرر کر دیا اور اس وصی کے ساتھ صبی کے مال میں خرید و فروخت کیا تو یہ معاملہ جائز ہے۔[2]

مسئلہ : وصی یتیم کی زمین کو ضرورتِ شدیدہ کے بغیر فروخت نہیں کر سکتا، الاّ یہ کہ دوگنی قیمت ملے یا مورث پر قرض ہو۔[3]

مسئلہ : اگر یتیم کا نہ وصی ہے نہ ماں ہے نہ قاضی، تو بضرورت دوسرے رشتہ دار ولی ہوں گے، وہ بھی نہ ہوں تو دیانتدار مسلمان ولی ہو گا، اور ولایت قاصرہ دوسرے اقارب کو بھی حاصل ہے۔[4]

---

[1] بظاہر یہ امام محمد رحمہ اللہ کا موقف ہے، امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مدار نابالغ کے مفاد پر ہے، اگر وصی کے ساتھ معاملہ طے پانے میں بچے کا مفاد ظاہر ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

و لو اشترى مال اليتيم لنفسه إن كان ذلك خيرا لليتيم جاز و كذا إذا باع ماله من اليتيم إن كان خيرا لليتيم جاز. و هذا قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى أما على قول محمد رحمه الله تعالى إذا باع ماله من اليتيم أو اشترى مال اليتيم لنفسه لا يجوز على كل حال. فتاوى قاضيخان ،كتاب الوصايا،فصل في تصرفات الوصي في مال اليتيم،ج٣ص ٣٢٦.

[2] القاضي إذا اشترى من الوصي شيئا من مال اليتيم جاز وإن كان هذا القاضي جعله وصيا كذا في الفتاوى الكبرى. الفتاوى الهندية،كتاب البيوع، الباب السابع عشر ،ج٣ص ١٧٦.

[3] لا يجوز للوصي بيع عقار اليتيم عند المتقدمين، ومنعه المتأخرون أيضا إلا في ثلاثة كما ذكره الزيلعي: إذا بيع بضعف قيمته، وفيما إذا احتاج اليتيم إلى النفقة، ولا مال له سواه، وفيما إذا كان على الميت دين لا وفاء له إلا منه. وزدت أربعا فصار المستثنى سبعا.الخ. الأشباه والنظائر لابن نجيم مع الغمز،كتاب الوصايا،ج٣ص٢٥٧.

ولو باع الوصي التركة من غيره فإن كانت الورثة صغارا جاز بيعه في كل شيء ضياعا كان أو عقارا أو عروضا سواء كانوا حضورا أو غيابا على الميت دين أو لا لكن إنما يبيع بمثل القيمة أو بما يتغابن الناس في مثله قال شمس الأئمة الحلواني في شرح أدب القاضي للخصاف هذا جواب السلف وجواب المتأخرين أنه إنما يجوز بيع العقار بإحدى الشرائط الثلاث إما أن يرغب المشتري بضعف قيمته أو للصغير حاجة إلى ثمنه أو على الميت دين لا وفاء له إلا به.. الفتاوى الهندية،كتاب البيوع، الباب السابع عشر ،ج٣ص ١٧٦.

[4] يجوز شراء ما لا بد للطفل منه وبيعه لأخيه وعمه وأمه وملتقط إن هو في حجرهم دفعا للضرر عنه وتؤخره أمه فقط. تنقيح الفتاوى الحامدية،باب الوصي، ج٢ص ٢٩٥.

التصرف الذي من ضرورة حال الصغار كاشتراء المأكولات والملبوسات والمشروبات للصغير وبيع ما يكون بيعه ضروريا للصغير وما أشبه ذلك وهذا النوع من التصرفات كما يقدر عليه الأولياء المذكورون في هذه المادة يقدر عليه أيضا من تربى الصغير في

وکالت کے احکام

مسئلہ :وکالت کے لئے شرط یہ ہے کہ وکیل اور مؤکل مجنون نہ ہوں اور نابالغ نہ ہوں، ایسا غلام بچہ نہ ہو(جن پر ولی یا حاکم نے تصرف کرنے سے پابندی عائد کردی ہو) [1]

مسئلہ :جو چیز کسی کی ملک میں نہ ہو اس کو حاصل کرنے کے لئے وکیل بنانا جائز نہیں، جیسے جنگل سے گھاس یا لکڑیاں جمع کرنا، دریا سے پانی لانا، دریا میں غوطہ لگا کر موتی نکالنا، مٹھائی یا صدقہ وغیرہ کے تقسیم کے وقت ان کو لوٹنے کے لئے وکیل بنانا۔ [2]

مسئلہ :وکیل سے مفت کام کروانا، یا اجرت دے کر کام کروانا یا نفع میں شریک کر کے کام کروانا، سب جائز ہے۔

مسئلہ :ہر وہ تصرف جس کی نسبت وکیل اپنی طرف بھی کر سکتا ہے اور مؤکل کی طرف بھی، اس میں وکیل اصیل کی طرح مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں بن سکتا ہے، جیسے خرید و فروخت۔ [3]

مسئلہ :ہر وہ کام جس کی نسبت اپنی طرف نہیں کر سکتا ہے، اس میں حقوق عقد وکیل سے متعلق نہیں ہوں گے، جیسے نکاح و طلاق وغیرہ۔

حجرهم كالأخ والعم والأم والملتقط فهؤلاء يقدرون على هذه التصرفات بشرط أن يكون الصغير في عيالهم أو في حجرهم وتربيتهم.درر الحكام، ج٢ص ٦٩٦.

وراجع للتفصيل "شرح القواعد الفقهية" للشيح الزرقاء رحمه الله تعالى،ص٣١١.

[1] نابالغ سے نابالغ غیر عاقل مراد ہے۔منها ما يرجع إلى الموكل وهو أن يكون ممن يملك فعل ما وكل به بنفسه، فلا يصح التوكيل من المجنون والصبي الذي لا يعقل أصلا..(ومنها) : ما يرجع إلى الوكيل وهو أن يكون عاقلا فلا تصح وكالة المجنون والصبي الذي لا يعقل.(الفتاوى الهندية، كتاب الوكالة، الباب الاول،ج٣ ص ٥٦١).

[2] ولا تصح الوكالة بالمباحات كالاحتطاب والاحتشاش والاستقاء واستخراج الجوهر من المعادن فما أصاب الوكيل شيئا من ذلك فهو له وكذا التوكيل بالتكدي (تبيين الحقائق ،كتاب الوكالة،ج٤ ص ٢٥٧)

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الوكالة، الباب الاول،ج٣ ص ٥٦٤).

[3] وحقوق عقد يضيفه الوكيل إلى نفسه كبيع وإجارة وصلح عن إقرار تتعلق به إن لم يكن محجورا فيسلم المبيع ويتسلمه ويقبض الثمن ويطالب به ويرجع به عند الاستحقاق.. وحقوق عقد يضيفه إلى موكله تتعلق بالموكل كنكاح وخلع وصلح عن إنكار ودم عمد.(ملتقى الأبحر، كتاب الوكالة،ص٣١٠).

وكذا في الدرر والغرر (كتاب الوكالة،ج٢ ص ٢٨٣).

مسئلہ :وکیل کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی ذات کے لئے مالکانہ تصرف کرے کیونکہ اس میں وہ امین ہے۔[1]

مسئلہ :تصرف سے پہلے مؤکل وکیل کو معزول کر سکتا ہے، لیکن تصرف کر لینے کے بعد تسلیم وقبول کر لینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔[2]

مسئلہ :وکیل اپنی رقم وصول کرنے کے لئے مبیع کو مؤکل کے حوالہ کرنے سے روک سکتا ہے، مگر ایک مرتبہ حوالہ کرنے کے بعد واپس نہیں لے سکتا ہے۔[3]

مسئلہ :اگر وکیل مبیع کو قیمت وصول کرنے کی غرض سے نہ روکے تو امین ہے، اگر اس غرض کے لئے رکھا تو ضامن ہوگا، اور مبیع وکیل کے پاس رہن کے طور پر رہے گا۔[4]

---

[1] يد الوكيل يد أمانة (جامع الفصولين، الفصل السابع عشر ،ج١ ص ١٣٥). وكذا في فتح القدير ،كتاب الوكالة، فصل في الوكالة في الشراء،ج٨ ص ٥٩).

[2] (الوكالة من العقود الغير اللازمة) كالعارية ..(فللموكل العزل متى شاء ما لم يتعلق به حق الغير) (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الوكالة، باب عزل الوكيل،ج٥ ص ٥٣٦).

والتفصيل في الفتاوى الهندية (كتاب الوكالة،الباب التاسع فيما يخرج به الوكيل عن الوكالة ،ج٣ ص ٦٣٧).

[3] (وإذا دفع الوكيل بالشراء الثمن من ماله وقبض المبيع فله أن يرجع به على الموكل) .. (وله أن يحبسه حتى يستوفي الثمن) سواء كان نقد الثمن أو لم ينقده. (الجوهرة النيرة ،كتاب الوكالة،ج١ ص ٣٠٢).

وكذا في كتاب الأصل للامام الشيباني (كتاب البيوع والسلم،باب الوكالة في السلم،ج٢ ص ٤٢٢ ط قطر).

[4] *یہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مذہب ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ کے نزدیک رہن کی طرح نہیں ہوگا بلکہ مبیع کے حکم میں ہوگا، گویا مضمون ہونے میں تو اتفاق ہے لیکن ضمان کی نوعیت میں اختلاف ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ضمان الرہن لازم ہے جبکہ طرفین کے نزدیک ضمان المبیع واجب ہے، ضمان الرہن کا مطلب یہ ہے کہ قیمت اور ثمن میں سے جو کچھ کم ہو، وکیل اس کا ضامن ہوگا اور ضمان المبیع کا مطلب یہ ہے کہ جیسا اگر خریدار کو حوالہ کرنے سے پہلے بائع کے ہاتھ میں مبیع ہلاک ہو جائے تو مشتری کے ذمہ کچھ لازم نہیں ہوگا اسی طرح یہاں موکل کا ذمہ بھی فارغ ہو جائے گا، مثلاً اگر وکیل نے کوئی چیز دس روپے کی خریدی جبکہ اس کی عام بازاری قیمت پندرہ روپے ہیں، اور پھر بائع سے ثمن وصول کرنے کے لئے اپنے پاس اس کو محبوس رکھا یہاں تک کہ ہلاک ہوا تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک وکیل موکل سے پانچ روپے کا مطالبہ کر سکتا ہے جبکہ طرفین کے نزدیک موکل پر کچھ لازم نہیں ہوگا، مؤلف رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے لیکن عام فقہائے کرام کے نزدیک طرفین کا قول راجح ہے۔*

فإن هلك المبيع في يده قبل حبسه هلك من مال الموكل ولم يسقط الثمن وله أن يحبسه حتى يستوفي الثمن فإن حبسه فهلك كان مضمونا ضمان الرهن عند أبي يوسف وضمان المبيع عند محمد(مختصر القدوري ،كتاب الوكالة،ص ١١٦).

(وضمان المبيع عند محمد) وهو قول أبي حنيفة أيضاً، فيسقط الثمن قليلا كان أو كثيراً، قال في التصحيح: ورجح دليلهما في الهداية، واعتمده المحبوبي والنسفي والموصلي وصدر الشريعة(اللباب في شرح الكتاب،كتاب الوكالة،ج٢ص ١٤٣).

مسئلہ: وکیل کے لئے جائز نہیں ہے کہ جس چیز کے لئے وکیل بنایا اس کا معاملہ اپنی ذات کے ساتھ کردے، یعنی اپنے لئے خرید لے یا خود نکاح کرلے وغیرہ۔[1]

بیوع کی قسمیں

بیوع کی کل پندرہ قسمیں ہیں، مگر اس میں ایک قسم دوسری میں داخل بھی ہوسکتی ہے، اس کی وضاحت یوں ہے کہ ایجاب وقبول سے بیع منعقد ہوگی یا نہیں ہوگی؟ اگر منعقد نہیں ہوئی تو بیع باطل ہے، اگر منعقد ہوئی تو دو حال سے خالی نہیں، اس میں نافذ ہونے کے ساتھ کوئی قبح شرعی ہے یا نہیں؟ اگر قبح شرعی ہے تو لازم داخل عقد ہے یا مجاور؟ اگر داخل عقد ہے تو بیع فاسد ہے اگر صرف مجاور اور متعلق ہے گو بیع [2] مکروہ ہے، اگر قبح شرعی نہیں ہے تو دیکھیں گے کسی بات کا انتظار ہے یا نہیں؟ اگر انتظار ہے تو بیع موقوف ہے، اگر انتظار نہیں ہے مگر امکان فسخ ہے تو بیع نافذ ہے اور بظاہر فسخ کی کوئی وجہ نہ پائی جائے تو لازم ہے۔

پھر عوضین اگر ثمنیات (سونا وچاندی کے اقسام میں سے) ہیں تو بیع صرف ہیں، اگر ثمن (یعنی سونا وچاندی کے علاوہ) ہیں تو مقائضہ ہے، اگر ایک ثمن ہے دوسرا مثمن، اور بیع موعود مؤجل ہے تو بیع سلم ہے، اگر بیع مؤجل نہیں ہے تو بیع محض ہے، اگر مشتری معین نہ ہو تو مزایدہ، اور اگر ثمن بائع کی لاگت (یعنی بائع نے جتنے میں خریدا) کی طرف منسوب ہو تو تولیہ، اگر لاگت کی طرف منسوب ہونے کے ساتھ کچھ نفع بھی متعین ہو تو مرابحہ، اگر نقصان متعین ہو تو وضیعہ ہے اور انعقاد سے پہلے صرف وعدہ بیع ہو تو بیع کا عہد ہے۔

بیوع موقوفہ

بیع موقوف وہ بیع ہے جس میں صحت عقد کے بعد کسی بات کا انتظار ہو، اس کی کئی قسمیں ہیں[3]:

---

[1] (وليس للوكيل بشراء شيء بعينه شراؤه لنفسه) ؛ لأنه يؤدي إلى تغرير الآمر حيث اعتمد عليه (الدرر والغرر، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء ، ج٢ ص ٢٨٧).

وكذا في مجلة الأحكام العدلية (رقم المادة: ١٤٨٥ والمادة ١٤٩٦، ج١ ص٢٨٩).

[2] کاتب کی غلطی ہے، صحیح لفظ "تو بیع مکروہ ہے" ہے۔

[3] بیع موقوف دراصل بیع نافذ کی ضد ہے اور خیار شرط وغیرہ کا تعلق نفاذ کے ساتھ نہیں ہے اگر کسی معاملہ میں خیار شرط موجود بھی ہو تو بھی وہ نافذ ہوتا البتہ لازم نہیں ہوتا، اس لئے خیار شرط والے بیوعات کو بیوع موقوفہ میں شمار کرنا مناسب نہیں ہے لیکن اگر عام لغوی معنی پر نظر رکھی جائے کہ خیار شرط کی صورت میں بھی بیع اجازت پر موقوف ہوتی ہے اس لحاظ سے اس کو بیع موقوف میں داخل کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے،

خیار شرط: ایجاب و قبول ہو جانے کے بعد بائع یا مشتری اپنے لئے پسند نہ آنے کی صورت میں واپس کرنے کا اختیار رکھے یا دونوں کی طرف سے کسی اجنبی کو پسند کرنے یا واپس کرنے کا حق دیا جائے۔

مسئلہ: اگر خیار شرط بائع کی طرف سے ہو تو مبیع اس کی ملک سے نہ نکلے گی۔[1]

مسئلہ: اگر خیار شرط مشتری کے لئے ہے تو بائع کی ملک سے تو نکل جائے گی، اب امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مشتری کی ملک میں داخل نہ ہو گی اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مشتری کی ملک میں داخل ہو گی اور وہ مالک بن جائے گا۔[2]

مسئلہ: زید نے نذر مانی کہ اگر فلاں چیز کا مالک ہوا تو میرے ذمہ حج ہے پھر اس چیز کو خرید لیا[3] تو امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک نہ ملک ثابت ہو گی نہ حج لازم ہو گا، اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں امر ثابت ہوں گے۔

مسئلہ: اگر مبیع قبضہ کے بعد ہلاک ہو جائے تو اگر خیار بائع کے لئے ہو تو مشتری کے ذمہ قیمت لازم ہو گی[4]، اگر مشتری کے لئے ہو تو ثمن لازم ہو گا۔[5]

حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے بھی شاید اسی بناء پر یہ تفصیل ذکر فرمایا۔ (ملاحظہ فرمائیں، رد المحتار، کتاب البیوع، فصل فی الفضولی، مطلب فی بیع المرہون والمستاجر، ج ٦ ص ١١٢)۔

[1] وخيار البائع يمنع خروج المبيع عن ملكه (البحر الرائق، كتاب البيوع، باب خيار الشرط، ج ٦ ص ٩). وكذا في الهداية (كتاب البيوع، باب خيار الشرط، ج ٣ ص ٣٠).

[2] فتویٰ امام صاحب رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔ "وخيار المشتري لا يمنع خروج المبيع عن ملك البائع"..قال: "إلا أن المشتري لا يملكه عند أبي حنيفة، وقالا: يملكه"(كتاب البيوع، باب خيار الشرط، ج ٣ ص ٣٠). وكذا في مجمع الأنهر (كتاب البيوع، باب خيار الشرط، ج ٢ ص ٢٦).

قال في التحفة: والصحيح قول أبي حنيفة، واعتمده برهان الشريعة وصدر الشريعة والنسفي والموصلي.(اللباب في شرح الكتاب۔كتاب البيوع، باب خيار الشرط، ج٢ ص ١٣).

[3] یعنی خیار شرط کے ساتھ خرید لیا۔

[4] کیونکہ جب بائع کی ملکیت سے وہ چیز نکلی نہیں تو اس کی حیثیت مقبوض علی سوم الشراء کی ہے اور اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں قیمت لازم ہوتی ہے۔

[5] کیونکہ ہلاکت سے پہلے کوئی عیب وغیرہ بھی آچکا ہو گا اور اس عیب کی وجہ سے اب واپس کرنا ممکن نہ رہا جس کی وجہ سے عقد تام ہو گیا تو اب ہلاکت کی صورت میں ثمن لازم ہو گا۔

مدت خیار کی تین صورتیں

ا۔ کوئی مدت بیان نہیں کی کہ کتنے دنوں تک خیار شرط باقی رہے گی۔

۲۔ تین دن سے زیادہ مدت مقرر نہ ہو۔

۳۔ جس قدر چاہیں مدت مقرر کریں۔

پہلی صورت بالاتفاق ناجائز ہے[1]، دوسری صورت بالاتفاق جائز ہے تیسری صورت امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک ناجائز ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے۔[2]

بہتر یہ ہے کہ عقد طے ہو جانے کے بعد خیار حاصل کرے، اس کے لئے اگر کہیں جانا پڑے تو آمد ورفت کے ایام کو شمار نہ کرے، البتہ غور وفکر اور مشورہ کے لئے تین دن مقرر کئے جائیں تاکہ دونوں قول میں موافقت پیدا ہو اور تجار کے عرف کی بھی رعایت ہو جائے۔

مسئلہ: خیار شرط کی مدت کو کسی مقام یا کام کے ساتھ مقید کرنا جائز نہیں، مثلاً مجھے اختیار ہے جب تک لکھنو میں رہوں یا زید کے آنے تک (عالمگیری)[3]

مسئلہ: جس کو اختیار حاصل ہے وہ خیار کو ساقط کر کے بیع کو نافذ کر سکتا ہے مگر فسخ بیع کے لئے مدت کے اندر دوسرے کو اطلاع دینا ضروری ہے تاکہ وہ مایوس ہو کر دوسری تدبیر اختیار کر سکے۔[1]

---

[1] أما الأول فنقول إن الخيار المفسد ثلاثة أنواع.. بأن قال على أني بالخيار أو ذكر وقتا مجهولا بأن قال على أني بالخيار أياما ولم يبين وقتا معلوما والجواب في هذه الفصول الثلاثة أن البيع فاسد.(تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط ،ج٢ ص ٦٥).

[2] قدیم فقہائے کرام نے حضرت امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیا ہے جس کی تفصیل علامہ قاسم قطلوبغا رحمہ اللہ کی "التصحیح والترجیح"، علامہ میدانی رحمہ اللہ کے "اللباب" اور "فتاوی ہندیہ" میں موجود ہے جبکہ متاخرین فقہاء کرام نے صاحبین کے قول کو اختیار فرمایا ہیں، مجلہ میں بھی اسی قول کو لیا گیا ہے۔

يجوز أن يشرط الخيار بفسخ البيع أو إجازته مدة معلومة لكل من البائع والمشتري أو لأحدهما دون الآخر(مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ٣٠٠ ،ص٦٠).

وفي درر الحكام تحته: والصاحبين يجوز أن تكون مدة الخيار كما يتفق عليها كالأجل في البيع بالثمن المؤجل ويرى أن المجلة قد اختارت قول الإمامين(رقم المادة ٣٠٠ ، ج١ ص ٢٩٠).

[3] کیونکہ اس کی وجہ سے مدت خیار مجہول ہو جاتا ہے۔

مسئلہ : اگر کوئی معقول عذر ہو تو اطلاع کرنے کی شرط ساقط بھی ہو سکتی ہے جیسے فریق ثانی کا مکان معلوم نہ ہو یا معینہ وقتوں میں ملاقات نہ ہو یا اس مقام سے کہیں چلا گیا تو ایسی صورت میں صاحب خیار بیع کو فسخ کر سکتا ہے، اس پر گواہ بنالے کہ فلاں کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس کو اطلاع نہ کر سکا، اب میں خود معاملہ کو فسخ کر رہا ہوں (اس کا کچھ ذکر امام محمد رحمہ اللہ سے مروی ہے)۔[2]

مسئلہ : دو تین آدمیوں کو خیار حاصل ہے تو پہلے کا قول معتبر ہے، اگر دونوں دعویدار ہوں اور کسی ایک کے قول کا مقدم ہونا دلائل سے ثابت نہ ہو سکے تو بیع فسخ ہو جائے گی (شرح وقایہ)[3]

مسئلہ : جس طرح بائع اور مشتری دونوں اپنے لئے خیار رکھ سکتے ہیں، ایسا ہی ان دونوں کی طرف سے کسی تیسرے شخص کو بھی خیار حاصل ہو سکتا ہے۔[4]

مسئلہ : صاحبِ خیار پسند کرے، یا مر جائے یا مدت گزر گئی نہ مبیع کو پسند کیا نہ بیع کو فسخ کیا، یا مبیع میں کوئی عیب پیدا ہوا یا صاحب خیار مالکانہ تصرف کرلے (یعنی مبیع کوئی جانور تھا اس پر سامان لادے یا سواری کرنا شروع کرے، یا کپڑا تھا اس کو پہن لے وغیرہ بیع فرض کر کے ایجاب کرے) ان تمام صورتوں میں خیار

---

[1] "ومن شرط له الخيار فله أن يفسخ في المدة وله أن يجيز، فإن أجازه بغير حضرة صاحبها جاز. وإن فسخ لم يجز إلا أن يكون الآخر حاضرا عند أبي حنيفة ومحمد. وقال أبو يوسف: يجوز"(الهداية ،كتاب البيوع،باب خيار الشرط،ج٣ ص ٣١).وكذا في العناية (كتاب البيوع،باب خيار الشرط،ج ٦ ص ٣١٢).

[2] قال هشام: سألت محمداً: عن رجل باع داراً على أنه بالخيار ثلاثة أيام فتوارى المشتري في بيته أراد أن يمضي الثلاث، فيجب له البيع مثل يوجد في هذا بالأعذار، قال: نعم أبعث إليه من يعذره فإن ظهر وإلا أبطلت خياره إلا أن يجيء في الثلاث، قلت: فإن لم يأت الخصم في الأيام أتاك في وقت لا تستطيع أن تبعث إليه من قبلك الأعذار، فسألك أن تبطل الخيار عليه، قال: لا أفعل ذلك، قلت: فإن قال الخصم: إني قد أعذرت إليه وأشهدت فاختفى مني، فاشهد لي بذلك، قال: أقول اشهدوا أن هذا قد زعم أنه قد أعذر إلى صاحبه في الأيام الثلاثة كان يأتيه عند كل يوم، فتعذر إليه فيختفي منه، فإن كان الأمر كما قال فقد أبطلت عليه الخيار، فإذا ظهر بعد ذلك وأنكر سألت المدعي البينة على الخيار وعلى أعذاره كما كان ادعى. (المحيط البرهاني ،كتاب البيوع، الفصل الثاني عشر في البيع بشرط الخيار،ج٦ ص ٤٩٥).
وكذا في الفتاوي الهندية.(كتاب البيوع، الباب السادس،الفصل الثالث، ج٣ص٤٥).

[3] ومن اشترى شيئا وشرط الخيار لغيره فأيهما أجاز او نقض صحّ ذلك، فإن أجاز أحدهما وفسخ الاخر فالاوّل اولى ولو وُجدا معا فالفسخ أولى.(شرح الوقاية، كتاب البيوع، باب الخيار، ج٢ص٢٤).

[4] ولو شرط المشتري الخيار لغيره صحّ وأيّ أجاز أو نقض صحّ (كنز الدقائق ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ص ٤١٢).وكذا في الهداية (كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٣ ص ٣٢).

باطل ہوگا اور بیع لازم ہوگی۔[1]

مسئلہ : خیارِ شرط میں وراثت جاری نہیں ہوتی، صاحب خیار کی وفات کے بعد ورثہ کو واپسی کا حق حاصل نہ ہوگا لیکن خیار وصف اور تعین اور خیارِ عیب میں وراثت جاری ہوتی ہے۔(مجلہ)[2]

خیارِ بیع

خیارِ بیع ہمارے زمانے کے تاجروں میں بکثرت شائع ہے یعنی کسی تاجر کے پاس مال رکھ لیا جو بک جائے اس پر قیمت دیدینا اور باقی واپس کر دینا، اس کے جواز پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ خیار ہے یا دلالی؟ اگر خیار ہے تو مدت مجہول ہے اور اگر دلالی ہے تو اجرت مجہول ہے۔

جواب: مدت چاہے تین دن مقرر کریں یا زیادہ، ان دونوں کا مقصد رفع نزاع یا مشاورت کے لئے موقع لینا، بہر حال فریقین کی رضامندی سے یہ نزاع مرتفع ہو سکتا ہے کیونکہ جب چاہے واپسی کا اختیار ہے، نہ ادھر تنگی کا مجال ہے نہ ادھر جائے عذر، یا پسند کرنے والا مشتری ہے وہ جب آئے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اثر سے بھی یہ بات ثابت ہے۔

لا بأس بان يقول بع هذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهو لك[1]

---

[1] اعلم أن الخيار يسقط بثلاثة أشياء: أحدها الإسقاط صريحا كقوله: أسقطت الخيار أو أبطلته.. لأنه تصريح بالرضى فيبطل الخيار. والثاني الإسقاط دلالة، وهو كل فعل يوجد ممن له الخيار لا يحل لغير المالك لأنه رضي بالملك... والثالث سقوط الخيار بطريق الضرورة كمضي مدة الخيار وموت من له الخيار(الاختيار لتعليل المختار،كتاب البيوع، باب خيار الشرط قبيل خيار الرؤية،ج٢ ص ١٥).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الباب السادس،الفصل الثالث في بيان ما ينفذ به هذا البيع وما لا ينفذ ،ج٣ ص ٤٢).

[2] خيار الشرط لا يورث فإذا كان الخيار للبائع ومات في مدته ملك المشتري المبيع وإذا كان للمشتري فمات ملكه ورثته بلا خيار.(مجلة الأحكام العدلية ، رقم المادة ٣٠٦ص ٦١).

وأجمعوا أن خيار العيب وخيار التعيين يورث وأجمعوا أن خيار القبول لا يورث وكذلك خيار الإجازة في بيع الفضولي لا يورث وأما خيار الرؤية فهل يورث لم يذكر في البيوع وذكر في كتاب الحيل أنه لا يورث وكذا روى ابن سماعة عن محمد (تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٢ ص ٧٢).

یعنی اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کسی سے کہہ دے کہ یہ کپڑا میری طرف سے فروخت کرا تنی قیمت کے ساتھ، جو زیادہ ملے وہ تمہارا ہے، اس معاملہ کے جواز کے لئے یہ نص صریح ہے اور عرف بھی اس کا معین ہے، یہ وہم غلط ہے کہ فروخت کرنے والے کو متعین قیمت سے زائد تبرعاً ملے گا کیونکہ عقدِ معاوضہ تبرع کو نہیں چاہتا اور نہ تملیک کو لازم ہے۔

اس معاملہ کے جواز پر دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ عرض یعنی مال کو فروخت کرنے کے لئے پیش کرنا اور ایجاب عقد کو تام کرتا ہے اور خیار کو ساقط کرتا ہے اس میں یہی ہوتا ہے۔

جواب: اس میں تصرف مالک کی اجازت سے ہوتا ہے، یہی اس کا موضوع ہے اس کو مالکانہ تصرف نہیں کہا جاسکتا ہے اور مال کو فروخت کرنے کے لئے پیش کرنا مستقل خیار [2] نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی ایک طرح کا امتحان ہے کہ کوئی رغبت کرتا ہے یا نہیں؟ اگر رغبت کرتا ہے تو کتنی قیمت میں؟ [3]

---

[1] وقال ابن عباس: " لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب، فما زاد على كذا وكذا، فهو لك " وقال ابن سيرين: " إذا قال: بعه بكذا، فما كان من ربح فهو لك، أو بيني وبينك، فلا بأس به "(صحيح البخاري ،كتاب الاجارة،باب أجر السمسرة ،ج٣ ص ٩٢).

وكذا في شرح السنة للبغوي (كتاب البيوع، باب التوكيل،ج٨ ص ٢١٩).

[2] اصل نسخہ میں یہاں "مسقط" کا لفظ ہے۔(دیکھئے ص٦٠) اور یہی صحیح ہے۔

[3] "خیارِ بیع" کی یہ صورت آج کل بکثرت رائج ہے چنانچہ مختلف صناعتی (مینو فیکچر) کمپنیاں اپنی مصنوعات (پروڈکٹس) دکانداروں کے پاس رکھتی ہیں کہ نفع کے ساتھ فروخت کر لیا کرو، اسی طرح نشریاتی ادارے اپنی مطبوعات کتب خانوں والے کے پاس رکھ لیتی ہیں، اس کی فقہی تکییف خیارِ شرط کی ہے یا دلالی کی؟ تو مختلف اداروں کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے اس لئے تمام صورتوں کو کسی ایک حکم کے تحت داخل کرنا مشکل ہے البتہ بظاہر ضابطہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فریقین آپس میں زبانی ایجاب وقبول کریں یا دونوں کے درمیان یہی معمول ہو کہ دکاندار کے پاس مال رکھنے سے وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور پھر مقررہ ضابطہ کے مطابق قیمت دیگا، ان دونوں صورتوں میں مال رکھتے ہی بیع تام ہو جائیگی البتہ اگر مال فروخت نہ ہو تو معاہدہ کے مطابق فریقِ اول کو واپس کر سکتا ہے، اور اگر دونوں کی طرف سے نہ زبانی طور پر ایجاب وقبول کے الفاظ استعمال ہوں نہ ہی عملی طور پر اس کا تعامل ہو بلکہ یا تو زبانی طور پر طے کریں کہ یہ مال دکاندار کے پاس محض فروخت کرنے کے لئے پڑا رہے گا اور ملکیت اصل مالک کی ہو گی، یا زبانی تو صراحت نہ کریں لیکن دونوں کے درمیان یہی معمول ہو تو اس صورت میں دکاندار کو یکطرفہ دلال یعنی فریقِ اول کی طرف سے وکیل بالبیع سمجھا جائے گا، پھر اس دوسری صورت میں عموماً کمپنیوں کی طرف سے اجرت مقرر ہوتی ہے جس میں کوئی اشکال نہیں لیکن اگر کہیں اجرت مکمل طور پر معلوم نہ ہو مثلاً یہ طے ہو جائے کہ دکاندار سو روپے سے زائد جتنی قیمت پر بھی فروخت کرے گا وہ اس کا نفع

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ دلال کو کپڑا دیکر کہا کہ یہ کپڑا دس روپے کا ہے، اس سے جو زائد ملے وہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہو گا تو یہ اجرت فاسدہ ہے ایسا ہی یہاں پر۔

جواب: عالمگیری کے مسئلہ میں وجہ فاسد شراکت ہے جبکہ یہاں شراکت نہیں ہے۔

مسئلہ: اس جگہ دونوں مختار ہیں جب چاہے واپس لے لیں۔

مسئلہ: خیار شرط کے ساتھ جس کے قبضہ میں مال تھا، اس نے آگے کسی کو فروخت کر دیا پھر اپنی خوشی سے وہ مال واپس لے لیا تو اب مالک اول کو واپس لینے پر مجبور نہیں کر سکتا، الّا یہ کہ اس نے حاکم کے حکم سے واپس لیا ہو۔[1]

مسئلہ: ایسا قابض اپنے لئے خرید کر ارادہ نہیں بدل سکتا۔

خیار تعیین کی تعریف

خیار تعیین کا معنی ہے چند چیزوں میں سے بعض کو اپنے لئے پسند کرنے کا اختیار حاصل کرنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

ہو گا، تو فقہاء احناف کے نزدیک اصلاً یہ صورت عقدِ فاسد کی ہے کیونکہ اجرت مجہول ہے لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذکورِ بالا کی بنیاد پر بعض معاصر مفتیان کرام اس کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ محض اس قدر جہالت عموماً باعثِ نزاع نہیں ہوتی۔

[1] یہ حکم خیار عیب کا ہے جبکہ پہلے خریدار کو فروختگی سے پہلے عیب کا علم نہ ہو، اگر عیب پر اطلاع پانے کے باوجود آگے فروخت کیا تو اس کے بعد اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہے اگرچہ حکم حاکم سے بھی اس نے اپنے خریدار سے وہ مبیع واپس لی ہو، کیونکہ عیب کے علم ہونے کے باوجود فروخت کرنا رضامندی کی دلیل ہے اور اس سے عقد تام ولازم ہو گیا اب اس کے بعد واپسی کا اختیار باقی نہ رہا، اس سے معلوم ہوا کہ خیار شرط کی صورت میں یہ حکم منطبق کرنا درست نہیں ہے کیونکہ خیار شرط کی مدت میں جب خریدار اس چیز کو آگے فروخت کرے تو یہ اس کی طرف سے دلالۃً خیار ساقط کرنا ہے گویا اس نے خیار ساقط کر دیا، لہٰذا ایک بار خیار ساقط کرنے کے بعد دوبارہ واپس کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، لہذا متن کا مسئلہ محل نظر ہے۔ اہل علم غور فرمائیں۔

(باع ما اشتراه فرد) المشتري الثاني (عليه بعيب رده على بائعه لو رد عليه بقضاء) ؛ لأنه فسخ، ما لم يحدث به عيب آخر عنده فيرجع بالنقصان، وهذا (لو بعد قبضه) فله قبله رده مطلقا في غير العقار كالرد بخيار الرؤية أو الشرط درر. وهذا إذا باعه قبل اطلاعه على العيب، فلو بعده فلا رد مطلقا بحر،(الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٥ ص ٢٦).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب خيار العيب،ج٦ ص ٦٠).

ا۔ جن چیزوں میں اختیار حاصل ہے وہ سب ایک قسم کی اور ایک ہی قیمت کی ہیں، ان میں تین سے زیادہ میں اختیار جائز نہیں (کیونکہ ایک ادنٰی دوسرا درمیانہ اور تیسرا اعلیٰ ہے)۔

۲۔ دونوں کے جنس اور قیمت مختلف ہیں، اس میں جتنی چیزوں میں بھی اختیار ہو، کوئی مضائقہ نہیں، یہ مسئلہ ہدایہ وغیرہ کتابوں میں نہیں ہے، اس کے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں ضرورت تین پر ختم نہیں ہوسکتی، نہ ہی زیادہ چیزوں میں اختیار دینے سے کوئی ممانعت موجود ہے۔[1]

خیارِ تعیین کے مسائل

مسئلہ: خیار تعیین میں مدت کا مقرر کرنا ضروری ہے، اس کی وضاحت خیار شرط کے ضمن میں گزر چکی ہے۔[2]

مسئلہ: خیار تعیین کے ساتھ خیار شرط کا ہونا بھی لازم ہے چاہے کل واپس کرے چاہے بعض کا انتخاب کرے۔[3]

مسئلہ: خیار تعیین میں وراثت چلتی ہے یعنی ورثاء کو بھی انتخاب کا حق ہے۔[4]

مسئلہ: مبیع میں سے جتنی مقدار کی تعیین کرنا ہو وہ مضمون ہے (یعنی وہ ضمان میں داخل ہے) اس کے علاوہ باقی امانت ہے، مثلاً تین تھان ہیں کہا میں اس میں سے دو کا انتخاب کروں گا، تو یہ دونوں ضمان میں داخل ہوں

---

[1] صح خيار التعيين في القيميات لا في المثليات فيما دون الأربعة استحسانا كذا في النهر الفائق ولا يصح في الأربعة كذا في الكافي وهو أن يبيع أحد العبدين أو الثلاثة أو أحد الثوبين أو الثلاثة على أن يأخذ المشتري واحدا(الفتاوى الهندية، كتاب البيوع،الباب السادس،الفصل السادس في خيار التعيين،ج٣ ص ٥٤)

وجه الاستحسان أن شرع الخيار للحاجة إلى دفع الغبن ليختار ما هو الأرفق والأوفق والحاجة إلى هذا النوع من البيع متحققة.. غير أن هذه الحاجة تندفع بالثلاثة لوجود الجيد والرديء والوسط فيها فلا حاجة إلى الأربعة وثبوت الرخصة للحاجة.تبيين الحقائق، كتاب البيوع،باب خيار الشرط،ج٤ص٢١.

[2] (يلزم في خيار التعيين تعيين المدة) (مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة ٣١٧،ص ٦٣).

[3] ثم قيل يشترط أن يكون في هذا العقد خيار الشرط مع خيار التعيين وهو المذكور في الجامع الصغير قال شمس الأئمة هو الصحيح وقيل لا يشترط كما يشعر به كلام المصنف وهو المذكور في الجامع الكبير والمبسوط قالوا ووضعها في الجامع الصغير مع خيار الشرط اتفاق لا لأنه شرط قال فخر الإسلام وهو الصحيح (مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٢ ص ٣٢)والتفصيل في فتح القدير (كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٦ ص ٣٢٦).

[4] مر تخريجه عن تحفة الفقهاء ومجلة الاحكام العدلية.

گے تیسرا تھان امانت ہے۔[1]

مسئلہ : اگر مال میں عیب پیدا ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو جو حصہ مضمون تھا اسی کی طرف لوٹا یا جائے گا پھر امانت کی طرف، مثلاً تین تھان کپڑے نو سو روپے کے تھے، تھان کا انتخاب کرنا طے پایا تھا، اب ایک دو تھان ضائع ہو گئے تو تیسرے کو واپس کرنا ہو گا، اس کو خرید نہیں سکتے ، اگر تیسرا بھی ضائع ہوا تو امانت ضائع ہوا، اگر تیسرا عیب دار ہو گیا تو وہی مبیع ہے۔[2]

مسئلہ : اگر طے ہوا کہ تین میں سے ایک دو لیں گے اور ایک واپس کریں گے، تو اب صرف ایک نہیں لے سکتا کیونکہ تفریق صفقہ لازم آئے گا اور تینوں بھی نہیں لے سکتا کیونکہ اس سے صفقہ پر زیادتی لازم آئے گی۔[3]

خیار نقد کے احکام

یعنی اگر اتنی مدت میں مشتری قیمت ادا نہ کرے تو بیع ختم ہو جائے گی۔[4]

مسئلہ : اس کی مدت میں خیار شرط کی طرح اختلاف ہے۔

مسئلہ : یہ بیع جائز ہے ثمن ادا کرنے کے بعد خریدار مالک ہو گا، اس کو تصرف کا حق ہو گا۔

مسئلہ : قیمت کی ادائیگی سے قبل مشتری کو قبضہ نہ دیا جائے، اگر قبضہ میں دے بھی دیا تو مشتری اس کو

---

[1] وإذا وقع البيع على هذا فقبضهما المشتري فأحدهما ملك المشتري مضمون عليه بالثمن والآخر ملك البائع أمانة في يده هكذا في الحاوي(الفتاوى الهندية، كتاب البيوع،الباب السادس،الفصل السادس في خيار التعيين،ج٣ ص ٥٤).
وكذا في بدائع الصنائع (كتاب البيوع، حكم البيع، مبطلات الخيار،ج٥ ص ٢٦٢).

[2] فإن كان الخيار للمشتري وهلك أحدهما قبل القبض تعين الهالك للأمانة والقائم للبيع.. ولو هلك أحدهما بعد القبض تعين الهالك للبيع والقائم للأمانة فيرده. الفتاوى الهندية ، كتاب البيوع، الفصل السادس في خيار التعيين،ج٣ص ٥٥.
والتفصيل في بدائع الصّنائع، كتاب البيوع، ج٥ص٢٦٢.

[3] اور تفریقِ صفقہ اور زیادتی صفقہ، دونوں سے رضامندی متاثر ہوتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ بیع منعقد نہیں ہو گی، البتہ اگر دوسرا فریق اس زیادتی یا تفریق کو قبول کرے تو عقد منعقد ہو جائے گا، كما مرّ مفصّلا في مبحث تفريق الصّفقة.

[4] ولو اشترى شيئا على أنه إن لم ينقد الثمن إلى ثلاثة أيام فلا بيع بينهما جاز وإلى أربعة أيام لا يجوز عندهما. (الجوهرة النيرة ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج١ص ١٩١).
وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية (كتاب البيوع، باب الخيارات،ج١ ص ٢٥٧).

استعمال کر کے فائدہ حاصل نہ کرے۔[1]

مقبوض علی وجہ النظر (دیکھنے کے ارادے سے قبضہ)

مطلب یہ ہے کہ کسی مال کو صرف اس لئے لیا جائے کہ جانچ پڑتال کر کے اس کی اچھائی یا برائی کو دیکھا جائے اور لیتے وقت ثمن وغیرہ کا بھی ذکر نہ ہو۔

مسئلہ: زید نے کہا کہ یہ کپڑا اگر پسند آیا تو خرید لوں گا (اس میں قیمت کا کوئی ذکر نہیں)

مسئلہ: زید نے کہا کپڑا سو روپے کا ہے، عمر نے کہا لاؤ اس کو دیکھوں (خریدنے کا کوئی ذکر نہیں) تو یہ کپڑا عمر کے ہاتھ میں امانت ہے، اگر از خود ضائع ہو گیا تو عمر پر ضمان نہیں ہے اگر ضائع کر دیا تو اس کی قیمت دینی لازم ہو گی۔[2]

مسئلہ: اکثر خریدار دکان پر چیز اٹھا کر دیکھتے ہیں، یعنی پرکھتے ہیں یہ مقبوض علی وجہ النظر کے حکم میں ہے، پھر نظر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ایک یہ کہ دیکھنے والا اس کے بغیر صحیح فیصلہ نہ کر سکے، جیسے عطر کو سونگھنا، کپڑے کو پہن کر دیکھنا، گھوڑے پر (گاڑی وغیرہ پر) سواری کرنا، مٹھائی کو چکھنا، اس کے بغیر فیصلہ نہیں ہو سکتا، اتنی مقدار کا استعمال حلال

---

[1] وهو بمنزلة ما لو باع على أن البائع بالخيار ثلاثة أيام إن أعتقه البائع صح إعتاقه وإن أعتقه المشتري لا يصح.(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيع،فصل في الشروط المفسدة،ج ٢ ص ٨١).

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بائع یہ خیار اپنے لئے رکھے تو مبیع اس کی ملکیت سے نہیں نکلتی اور اگر مشتری کے لئے رکھا جائے تو امام صاحب کے نزدیک مشتری اس کا مالک نہیں بنے گا اور یہی قول مفتی بہ بھی ہے، تو دونوں صورتوں میں خریدار اس مبیع کا مکمل طور پر مالک نہیں بنا اس لئے وہ اس میں مالکانہ تصرف بھی نہیں کر سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

[2] قال في القنية: سم: عن أبي حنيفة قال له: هذا الثوب لك بعشرة دراهم فقال: هاته حتى أنظر فيه أو قال: حتى أريه غيري فأخذه على هذا وضاع لا شيء عليه؛ ولو قال: هاته، فإن رضيته أخذته فضاع فهو على ذلك الثمن. اهـ. قلت: ففي هذا وجدت التسمية من البائع فقط لكن لما قبضه المساوم على وجه الشراء في الصورة الأخيرة صار راضيا بتسمية البائع فكأنها وجدت منهما، أما في الصورة الأولى والثانية فلم يوجد القبض على وجه الشراء، بل على وجه النظر منه أو من غيره فكأنه أمانة عنده فلم يضمنه..... ولا يخفى أن عدم ضمانه إذا هلك. أما لو استهلكه القابض فإنه يضمن قيمته(رد المحتار، كتاب البيوع، باب خيار الشرط،مطلب في المقبوض على سوم الشراء، ج٤ ص ٥٧٣).

والتفصيل في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (كتاب البيوع، الباب الخامس، الفصل السادس فيما يتعلق بسوم الشراء وسوم النظر،ج١ ص ٢٨٣).

ہے،اس استعمال میں جو نقصان ہو جائے اس کا خریدار ضامن نہ ہو گا،ہاں البتہ طریق استعمال میں عرف اور عادت اور احتیاط سے تجاوز کرے جس کی وجہ سے نقصان پہنچ جائے تو پھر خریدار ضامن ہو گا۔

۲۔ دیکھنے پرکھنے کی جو ایک حد ہے،اس سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں،اگر زیادہ استعمال کر لیا جس کی وجہ سے نقصان پہنچ گیا تو یہ عذر نہ ہو گا بلکہ ضمان ادا کرنا لازم ہو گا۔[1]

مقبوض علی وجہ الشراء(خریداری کے ارادے سے قبضہ)

یعنی وہ مال جو خریدنے کے ارادے سے قیمت ذکر کر کے لیا جائے،لہٰذا زید نے کہا کہ یہ کپڑا مجھے دو،اگر پسند آیا تو ایک سو میں خریدوں گا اور دکاندار نے زید کو دیدیا،اب اس کے بعد اگر زید کے ہاتھ میں ضائع ہو جائے تو زید کو کپڑے کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔

"وفيه اي المقبوض على سوم الشراء القيمة انتهى(باب خيار الشرط، هدايه ج٣ص٣٩، وفيه تفصيل مزيد)[2]

قبضہ کی ان دونوں قسموں میں خیار شرط نہیں ہے کیونکہ اس میں ایجاب وقبول مکمل نہیں ہے(شامی)[3]

بیع فضولی

یعنی کسی غیر کے مال کو اس کی اجازت شرعی کے بغیر فروخت کرنا یا خریدنا،ہمارے احناف کے نزدیک یہ بیع جائز ہے،نافذ ہونا مالک کی اجازت پر موقوف ہے[1]،امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں،

---

[1] مقبوض علی وجہ النظر کی حیثیت امانت کی ہے اور امانت میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کم اور کیف میں معروف ومعتاد طریقہ پر استعمال ہو یعنی معروف طریقہ سے اور معروف مقدار کی حد تک استعمال ہو،اگر معروف طریقہ کے خلاف استعمال کیا یا طریقہ تو معروف تھا لیکن عام مقدار سے زیادہ استعمال کیا تو دونوں صورتوں میں ایسا کرنا تعدی سمجھا جائے گا جو کہ موجب ضمان ہے،عاریت کے ذیل میں انشاء اللہ کچھ تفصیل آجائے گی۔

[2] لو قبضه المشتري وهلك في يده في مدة الخيار ضمنه بالقيمة"؛ لأن البيع ينفسخ بالهلاك؛ لأنه كان موقوفا، ولا نفاذ بدون المحل فبقي مقبوضا في يده على سوم الشراء وفيه القيمة،(الهداية ،كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٣ ص ٣٠).

والتفصيل في الحاشية المتقدمة على حكم المقبوض على وجه النظر.

[3] (وصح) شرطه أيضا (في) لازم يحتمل الفسخ كمزارعة ومعاملة و إجارة وقسمة. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب الخيار،ج٤ص ٥٦٩).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب خيار الشرط،ج٦ ص ٣).

ہماری دلیل حدیث عروہ ابی جعد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک دینار کی ایک بکری لا کر دو، تو حضرت عروہ دو بکری لائے، پھر ایک دینار کے عوض ایک بکری فروخت کر دی اور ایک بکری دربار نبوی ﷺ میں پیش کی اور یہ دینار بھی پیش کر دیا، آپ ﷺ نے ان کے حق میں برکت کی دعاء فرمائی، یہ خرید و فروخت دونوں بطور فضولی انجام پایا۔[2]

بیع فضولی کے احکام

مسئلہ: قبضہ جائز ہو۔

مسئلہ: مالک کی نیت سے خرید و فروخت ہو ورنہ بیع باطل ہو گی (در مختار)[3] البتہ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں بھی بیع باطل نہیں ہو گی بلکہ مالک کی اجازت پر موقوف ہو گی۔ (شامی)[4]

---

[1] هشام عن محمد في رجل باع جارية بغير أمر صاحبها فقَالَ: رب الجارية: أحسنت أو وفقت. فالبيع جائز بالاستحسان . عيون المسائل، بيع الفضولي،ص١٣١.

ولمن باع فضولي ملكه أن يفسخه وله أن يجيزه بشرط بقاء العاقدين(ملتقى الأبحر ،كتاب البيوع،فصل في بيع الفضولي،ص١٣٤).

[2] حدثنا شبيب بن غرقدة، قال: سمعت الحي يحدثون، عن عروة: أن النبي صلى الله عليه وسلم «أعطاه دينارا يشتري له به شاة، فاشترى له به شاتين، فباع إحداهما بدينار، وجاءه بدينار وشاة، فدعا له بالبركة في بيعه.(صحيح البخاري، قبيل كتاب أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث: ٣٦٤٢)

وكذا في مسند احمد (مطبوع مؤسسة الرسالة)(حديث عروة، رقم الحديث: ١٩٣٥٦).

[3](وقف بيع مال الغير) لو الغير بالغا عاقلا، فلو صغيرا أو مجنونا لم ينعقد أصلا كما في الزواهر معزيا للحاوي وهذا إن باعه على أنه (لمالكه) أما لو باعه على أنه لنفسه.. فالبيع باطل. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، فصل فی بيع الفضولی،ج٥ ص ١٠٧).

[4] علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی اس کو بیع باطل ہی قرار دیا اور اصل مسئلہ میں انہوں نے در مختار کے جواب سے اتفاق فرمایا، البتہ بعض فقہاء کرام نے غلط فہمی کی وجہ سے بدائع کی ایک عبارت کی تغلیط و تضعیف کی تھی جو اس مسئلہ کے متعلق تھی، علامہ شامی رحمہ اللہ نے ان دونوں حضرات کے غلط فہمی کی وضاحت کر دی جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی اس کو بیع باطل قرار نہیں دے رہے لیکن حقیقت وہی ہے جو عرض کی گئی کہ علامہ شامی بھی اس کو بیع باطل قرار دیتے ہیں۔ (ان کی تفصیلی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔ رد المحتار، کتاب البیوع، فصل فی بیع الفضولی، ج۵ ص۱۰۷)۔

وضاحت: بعد میں قدیم نسخہ کی طرف مراجعت کرنے سے معلوم ہوا کہ "البتہ علامہ شامی" سے لیکر "موقوف ہو گی" تک کی عبارت اصل کتاب میں نہیں ہے بلکہ حاشیہ میں "فرید احمد" صاحب نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ فرمایا ہے، لیکن تسہیل شدہ نسخہ میں حاشیہ کی اس عبارت کو بھی اصل متن میں شامل کیا گیا جو کہ بالکل نامناسب ہے۔

مسئلہ : یہ بیع مالک کی اجازت تک موقوف رہے گی۔

مسئلہ: بائع و مشتری دونوں کو حق ہے کہ مالک کی اجازت سے پہلے بیع کو فسخ کر دے۔

مسئلہ: مبیع اگر موجود نہ ہو اسی طرح بائع و مشتری موجود نہ ہوں تو اجازت مفید نہیں۔[1]

مسئلہ: مالک اگر اس بیع پر راضی نہ ہو تو بائع اور قابض دونوں پر دعویٰ دائر کر سکتا ہے (عالمگیری)[2]

مسئلہ: اگر اجازت سے پہلے مالک کا انتقال ہو گیا تو اب ورثہ اس بیع کی اجازت نہیں دے سکتے۔[3]

مسئلہ: مالک کی اجازت کے بعد قیمت فضولی کے پاس بطور امانت ہے۔[4]

مسئلہ: مناسب یہ ہے کہ فضولی اس معاملہ کو اصل مالک کے حق میں مفید اور رضاء کے موافق جانتا ہو اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ معاملہ اجازت کے حصول تک باقی نہیں رہے گا، یا اس کے فروخت کرنے پر سخت مجبوری ہو جیسے راہن یا وہ مشتری جس نے مال خرید کر قبضہ کئے بغیر روپوشی اختیار کر لی اور مال کے ضائع ہونے یا صاحبِ حق کے منتشر ہونے کا خطرہ ہو، پس ایسے معاملہ سے دوسرے کو بھی مطلع کر دے۔

بیع مکرہ کی تعریف

مکرَہ وہ شخص ہے جس کو فروخت کرنے پر اس طرح مجبور کیا جائے کہ اگر معاملہ نہ کرو گے تو قتل کیا جائے گا یا قید میں ڈال دیا جائے گا یا سخت پٹائی کی جائے گی، اور مجبور کو ظن غالب ہو کہ واقعی اس کے اندر یہ قوت ہے کہ وہ مجھے قتل کر سکتا ہے۔[5]

---

[1] ولمن باع فضولي ملكه أن يفسخه وله أن يجيزه بشرط بقاء العاقدين والمعقود عليه والمالك الأول،(ملتقى الأبحر ،كتاب البيوع،فصل في بيع الفضولي،ص١٣٤).

[2] ولو هلك المبيع في يد المشتري فللمالك أن يضمن أيهما شاء. الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب الثاني عشر،ج٣ص ١٥٢.وكذا في البحر الرائق، كتاب البيوع، فصل في بيع الفضولي،ج٦ص١٦٢.

[3] وإذا مات المالك لا ينفذ بإجازة الوارث(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع،فصل في البيع الموقوف ،ج٢ ص ٨٧). وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الباب الثاني عشر في أحكام البيع الموقوف،ج٣ ص ١٥٢).

[4] ولو هلك الثمن في يد البائع قبل الإجازة أو بعدها هلك أمانة (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب الثاني عشر في أحكام البيع الموقوف،ج٣ ص ١٥٢).

[5] ويعتبر في الإكراه معنى في المكره ومعنى في المكره ومعنى فيما أكره عليه ومعنى فيما أكره به، فالمعتبر في المكره تمكنه من إيقاع ما هدد به، فإنه إذا لم يكن متمكنا من ذلك فإكراهه هذيان، وفي المكره المعتبر أن يصير خائفا على نفسه من جهة المكره في إيقاع ما هدد به عاجلا؛ لأنه لا يصير ملجأ محمولا طبعا إلا بذلك، وفيما أكره به أن يكون متلفا أو مزمنا أو متلفا عضوا أو موجبا غما بعدم الرضا،(الفتاوى الهندية ،كتاب الإكراه ،الباب الأول،ج٥ ص ٣٥).

بیع مکرہ کے احکام

مسئلہ : مجبوری دور ہونے کے بعد اختیار ہے کہ معاملہ کو نافذ رکھے یا ختم کردے۔[1]

مسئلہ : اگر بائع مجبور تھا اور مشتری نے مال پر قبضہ کر لیا تو بائع کو اختیار ہے کہ چاہے مشتری پر دعویٰ کرے یا جبر کرنے والے پر۔[2]

مسئلہ : اگر مشتری مجبور تھا تو بائع دیا ہوا مال جبر کرنے والے سے واپس لے، اگر مال نہ ملے تو قیمت لے لے (شرح وقایہ)[3]

مسئلہ : اگر دونوں ہی مجبور تھے تو امن ہونے کے بعد دونوں کو اختیار ہے کہ بیع کو برقرار رکھیں یا فسخ کردیں۔

مسئلہ : قبضہ کے بعد اگرچہ ملکیت حاصل ہو جائے گی لیکن فسخ کے احتمال کی وجہ سے مضمون بالقیمۃ ہے اور نفع حاصل کرنا ناجائز ہے۔[4]

مسئلہ : اگر بامر مجبوری مشتری نے قبضہ کیا اس کے بعد مال ہلاک ہو گیا تو مشتری تو بری الذمہ ہو گا البتہ جبر کرنے والے سے ضمان وصول کیا جائے گا۔(در مختار)[1]

---

[1] فلو أكره على بيع أو شراء أو إجارة أو إقرار بقتل أو ضرب شديد أو حبس ففعل ثم زال الإكراه، فإن شاء أمضاه، وإن شاء فسخه،(الاختيار لتعليل المختار، كتاب الاكراه، ج٢ ص ١٠٥).

وكذافي الفتاوى الهندية (كتاب الإكراه ،الباب الأول، ج٥ ص ٣٥).

[2] وللبائع تضمين أي شاء من المكره) بكسر الراء (والمشتري) ؛ لأن لكل واحد منهما دخلا في هلاك ماله واحد منهما بالذات وواحد آخر بالواسطة(مجمع الأنهر ،كتاب الاكراه، ج٢ ص ٤٣١).

[3] فإن قبض ثمنه أو سلّم طوعا نفذ وإن قبضه مكرها لا (اي لا ينعقد العقد) وردّه إن بقي.(شرح الوقاية، كتاب الإكراه، ج٣ص٣٣٩).ولو أكرهه على بيع عبده، وأكره المشتري على شرائه، وأكرههما على التقابض، فهلك الثمن، والعبد، ثم اختصموا، فضمان العبد للبائع، وضمان الثمن للمشتري على الذي أكرههما؛ لأن كل، واحد منهما ملجأ على دفع ماله إلى الآخر من جهته. (المبسوط للسرخسي، كتاب الاكراه، باب الإكراه على دفع المال واخذه، ج٢٤ ص ٨٠).

[4] في الدر المختار: (و) حينئذ (يملكه المشتري إن قبض فيصح إعتاقه) وكذا كل تصرف لا يمكن نقضه (ولزمه قيمته) وقت الإعتاق ولو معسرا، زاهدي لإتلافه بعقد فاسد.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله: ثم إن تلك العقود نافذة عندنا) أي عند أئمتنا الثلاثة وليست بموقوفة. (قوله: وحينئذ) أي حين إذ قلنا إنها نافذة غير موقوفة تفيد الملك بالقبض: أي يثبت بالبيع أو بالشراء مكرها الملك للمشتري لكونه فاسدا كسائر البياعات الفاسدة.(كتاب الاكراه، ج٦ص ١٣٠).

مسئلہ: ایسے جبری معاملہ کئی ہاتھ پہنچ جائے تب بھی حکم نہیں بدلتا(در مختار) جیسے زید نے بکر سے زبردستی ایک باغ خریدا، پھر خالد کے ہاتھ فروخت کردیا خوشی سے فروخت کیا یا زبردستی، بہرحال بکر کو واپس لینے کا حق ہوگا۔[2]

مسئلہ: جبر کی تعریف حالات کے لحاظ سے بدل جاتی ہے کیونکہ بعض امور شرفاء کے حق میں جبر ہیں، رزیل لوگوں کے حق میں جبر نہیں۔[3]

محبوس بحق غیر کا حکم

جو چیز غیر کے حق کی وجہ سے محبوس ہو مثلا مال مرہون یا کرایہ پر دیا ہوا سامان، یہ اگر غیر قابض(یعنی مرتہن یا مستاجر کے علاوہ) کے ہاتھ فروخت کیا جائے تو بیع مرتہن اور مستاجر کی اجازت پر موقوف رہے گی۔[4]

---

[1] أكرها على بيع عبد وشرائه وعلى التقابض فهلك الثمن والعبد ضمنهما المكره لهما. رد المحتار على الدر المختار،كتاب الإكراه، ج٦ص ١٣٢.

وكذا في الفتاوى الهندية ،كتاب الإكراه، الباب الثاني، ج٥ص٣٩.

[2] قال الشيخ عبد الوهاب الشعراني في كتاب المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى إلى ذمتين سألت عنه الشهاب ابن الشلبي فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك، أما من رأى المكاس يأخذ من أحد شيئا من المكس، ثم يعطيه آخر ثم يأخذه من ذلك الآخر فهو حرام اهـ. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، ج٦ ص ٣٨٥).

وكذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم (كتاب الحظر والإباحة ،ص٢٤٧).

[3] لأن من كان شريفا يغتم بكلام خشن فيعد مثل هذا في حقه إكراها إذ هو أشد له من ألم الضرب ومن كان رذيلا فلا يغتم إلا بضرب مؤلم أو بحبس شديد فلا يعد الضرب مرة بسوط ولا الحبس ساعة بل يوما في حقه إكراها لكون الأشخاص متفاوتين ولذا قيد ما يوجب الغم بإعدام الرضى. (مجمع الأنهر ،كتاب الاكراه، ج٢ ص ٤٣٠)

وكذا في الدر المختار (كتاب الاكراه، ج٦ص ١٢٩)

[4] إذا تعلق بالمبيع حق محترم للغير لا يملك البائع إبطاله يكون البيع فاسدا نحو أن يبيع الراهن المرهون أو المؤاجر المستأجر واختلفت العبارة في هذه المسألة في الكتب ذكر في بعضها أن البيع فاسد وفي بعضها أنه موقوف على إجازة المرتهن والمستأجر وهو الصحيح(تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ ص ٤٧).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، ج٦ص ٧٥).

بیع بالوفاء

زید نے کہا کہ یہ مکان لاکھ روپے میں فروخت کر دیا مگر مجھے اختیار ہو گا کہ چھ ماہ کے بعد پھر واپس لے لوں، یہ معاملہ بجمیع احکامہ رہن ہے اور انتقاع حرام ہے (یہی قول راجح ہے)۔ [1]

مسئلہ: یہ قول کہ واپس کا اختیار عقد کے اندر داخل نہ ہو تو نافذ ہو گی اور جو کچھ بعد میں کہا، وہ دوسری بات ہے۔ (شامی) [2]

بیوع نافذہ یعنی بیوع صحیحہ

بیع صحیح کی تعریف:

بیع صحیح وہ بیع ہے جس میں صحت بیع کے تمام شرائط پائی جائیں اور فساد، بطلان یا توقف کی کوئی وجہ نہ ہو۔ [3]

بیع صحیح کے احکام

مسئلہ: عاقد متعدد ہوں ایک نہ ہو، یعنی ایجاب و قبول کرنے والے دو ہوں۔

مسئلہ: معاملہ بیع سے واقف ہو۔

مسئلہ: ایجاب و قبول حقیقی ہوں، کسی دل لگی یا مذاق میں نہ ہو۔

---

[1] قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام. وقال السيد الإمام: قلت: للإمام الحسن الماتريدي: قد فشا هذا البيع بين الناس، وفيه مفسدة عظيمة، وفتواك أنه رهن وأنا أيضا على ذلك فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هذا ونظهره بين الناس، فقال المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذلك بين الناس فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله اهـ. قلت: وبه صدر في جامع الفصولين فقال رامزا لفتاوى النسفي: البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالا للربا وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكه،(رد المحتار،باب الصرف،مطلب في بيع الوفاء،ج٥ ص ٢٧٦)
وكذا في جامع الفصولين (الفصل الثامن عشر في بيع الوفاء ،ج١ ص ١٣٨).

[2] وقيل إن بلفظ البيع لم يكن رهنا، ثم إن ذكرا الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعا فاسدا، ولو بعده على وجه الميعاد جاز لزم الوفاء به؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس، وهو الصحيح كما في الكافي والخانية (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،باب الصرف،مطلب في بيع الوفاء،ج٥ ص ٢٧٧)

[3] اس باب کے اکثر مسائل کی تخریج پہلے ہو چکی ہے، یہاں صرف ان مسائل کی تخریج کی جاتی ہے جو پہلے مذکور نہ ہوں۔

مسئلہ : عاقدین ایسے غلام نہ ہوں جس پر پابندی عائد ہے، ایسا نابالغ بچہ نہ ہو جس کو ولی کی طرف سے اجازت نہیں۔

مسئلہ : ایجاب وقبول ایک ہی مجلس کے اندر مکمل ہو جائے۔

مسئلہ : ایجاب وقبول میں موافقت ہو۔

مسئلہ : عاقدین ایک دوسرے کی بات سے مطلع ہو جائیں۔

مسئلہ : مبیع اور اس کی قیمت دونوں مال متقوم ہوں۔

مسئلہ : بیع میں ایسی شرط نہ رکھی جائے جس میں مبیع قابل انتفاع نہ رہے، مثلاً بادام اس شرط پر فروخت کی کہ نکمی (بے کار) ہوں کیونکہ یہ وصف بدون شرط بھی مفسد ہے تو شرط لگانے کے بعد بطریق اولیٰ مفسد ہوگا، ہاں البتہ شرط سے کوئی مفید غرض متعلق ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (عالمگیری) [1]

مسئلہ : بیع میں ایسی شرط بھی نہ رکھی جائے جو شرعاً گناہ ہو، جیسے لونڈی اس شرط پر خریدی کہ گانا گانے میں ماہر ہے یا مرغا اس شرط پر خریدا کہ لڑائی میں ماہر ہے کیونکہ گناہ کی بات مقصود و مشروط بنانا جائز نہیں، ہاں البتہ بطور براءت عیب جائز ہے مثلاً یہ کہنا کہ اس گناہ کی بات سے یہ پاک ہے (عالمگیری) [2]

مسئلہ : ایسی صفت بھی مشروط نہ ہو جس کو ثابت کرنا، ظاہر کرنا بالفعل بائع کے اختیار میں نہ ہو، جیسے یہ چڑیا خوب بولتی ہے، یہ گھوڑی حاملہ ہے، یہ مرغی روزانہ انڈا دیتی ہے، یاں البتہ ایسی باتیں بیان کر دینا جائز ہے، ذمہ داری اور الزام مفسد ہے۔ [1]

---

[1] اشترى جوزا على أنه فاسد لا يجوز البيع إلا أن يكون كثيرا يشتري مثله للحطب(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسده،ج٣ ص ١٣٧)

وكذا فى فتاوى قاضي خان (كتاب البيوع،فصل في الشروط المفسدة، ج٢ص٨٠)

[2] اشترى جارية على أنها تغني كذا كذا صوتا فإذا هي لا تغني جاز ولا خيار له قالوا وهذا إذا ذكر هذه الصفة على وجه التبري عن العيب وفي الفتاوى أن البيع بهذا الشرط فاسد على قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى وإحدى الروايتين عن محمد رحمه الله تعالى والمأخوذ به هو الأول(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب العاشر،ج٣ ص ١٣٧).

لكن في بدائع الصنائع : ولو اشترى جارية على أنها مغنية على سبيل الرغبة فيها فالبيع فاسد؛ لأن التغنية صفة محظورة لكونها لهوا فشرطها في البيع يوجب فساده، ولو اشترى جارية على أنها مغنية على وجه إظهار العيب جاز البيع؛ لأن هذا بيع بشرط البراءة عن هذا العيب فصار كما لو باعها بشرط البراءة عن عيب آخر فإن وجدها لا تغني لا خيار له؛ لأن الغناء في الجواري عيب فصار كما لو اشترى على أنه معيب فوجده سليما. (كتاب البيوع، شرائط الصحة،ج٥ ص ١٦٩).

مسئلہ : مبیع میں ثبوتِ ملک ممنوع نہ ہو جیسے ایسی مسجد فروخت کرنا جو آباد ہو، وحشی جانور کو شکار سے پہلے فروخت کرنا وغیرہ۔

مسئلہ : مقدور التسلیم ہوں، معدوم غیر مقدور نہ ہوں۔

مسئلہ : دونوں عوضین متعین ہوں، وصف اور مقدار معلوم ہوں، اس میں جہالت اور ابہام نہ رہے۔

مسئلہ : مبیع پر قبضہ کرنے کے لئے نہ مدت متعین کرے نہ وعدہ کرے۔

مسئلہ : بیع موقت نہ ہو۔

مسئلہ : حقیقی یا حکمی طور پر سود سے پاک ہو۔

مسئلہ : مبیع کسی غیر کے حق میں مشغول نہ ہو جیسے رہن یا اجارہ۔

مسئلہ : بیع میں کسی قسم کا خیار نہ ہو۔

مسئلہ : جانبین سے نفع کا تصور ہو سکے۔

مسئلہ : اگر ادھار بیچا ہے تو ادائیگی کی مدت متعین ہو۔

مسئلہ : کوئی ایسی شرط نہ لگائی جائے جس میں بائع، مشتری یا مبیع کو فائدہ حاصل ہو۔

مسئلہ : صفقہ کو متفرق نہ کیا جائے۔

بیع لازم کی تعریف

بیع لازم وہ بیع ہے جس میں ذیل کی شرائط پائی جائیں:

۱۔ مال پر مشتری کا قبضہ ہو گیا ہو۔

۲۔ اس میں خیار رؤیت باقی نہ رہا ہو۔

۳۔ خیار عیب، قیمت کی وصولیابی اور مبیع کوئی اور مستحق کا نہ ہونا، اگرچہ لزوم بیع میں شرط نہیں ہے تاہم ان

---

[1] ولو اشترى قمرية على أنها تصوت أو طيرا على أنه يجيء من مكان بعيد أو كبشا على أنه نطاح أو ديكا على أنه مقاتل فالبيع فاسد عند أبي حنيفة رحمه الله وهو إحدى الروايتين عن محمد رحمه الله لأنه شرط فيه غرر والوقوف عليه غير ممكن؛ لأنه لا يحتمل الجبر عليه فصار كشرط الحبل.(بدائع الصنائع، كتاب البيوع، شرائط الصحة، ج٥ ص ١٦٩).

وكذا في المحيط البرهاني في الفقه النعماني (كتاب البيوع، الفصل السابع، ج٦ ص ٣٩٧).

کے بغیر فسخ بیع کا احتمال ختم نہیں ہوتا۔

بیع صرف کی تعریف واحکام

بیع صرف وہ بیع ہے جس میں ثمن اور مبیع دونوں سونا و چاندی کی جنس سے ہوں۔[1]

بیع صرف کی شرط یہ ہے کہ اسی مجلس میں بیع تمام ہو جائے، خیار شرط اور خیار رؤیت کا جھگڑا باقی نہ رہے۔[2]

مسئلہ : زید نے سونے کا کنگن خریدا، اگر اسی مجلس میں پسند کر کے خرید لیا تو صحیح ہے ورنہ بیع نہ ہو گی۔[3]

مسئلہ : اگر مجلس عقد میں دونوں عوض یا ایک عوض پر قبضہ نہ ہوا، بیع منعقد نہ ہو گی اگرچہ مجلس ختم ہونے کے بعد قبضہ کر لے۔[4]

---

[1] واضح رہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک بیع صرف سونا و چاندی کے آپس میں تبادلہ کا نام ہے صرف دونوں طرف سے ثمن کا ہونا بیع صرف نہیں ہے، لہذا اگر دونوں طرف مروجہ کاغذی کرنسی ہو تو اس پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے اگرچہ اس کے بعض احکام دیگر معاملات سے کچھ مختلف ہی ہیں۔

(هو) لغة الزيادة. وشرعا (بيع الثمن بالثمن) أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ (جنسا بجنس أو بغير جنس) كذهب بفضة(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب البيوع، باب الصرف،ج٥ ص ٢٥٧).

وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام تاب البيوع، باب الصرف،ج٢ ص ٢٠٣)

[2] مجلس عقد کے برخاست ہونے سے پہلے خیار شرط کو ختم کرنا ضروری ہے جیسا کہ مؤلف رحمہ اللہ نے فرمایا، لیکن خیار رؤیت اگر باقی بھی رہے تو بھی اس سے عقد پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے اس کو یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں ہے تاہم اگر پرانے زمانے کی طرح سونا یا چاندی کی کرنسی ہو تو چونکہ اس کے ضائع ہونے سے عقد فسخ نہیں ہوتا کیونکہ وہ ثمن ہونے کی وجہ سے متعین نہیں ہوتے اس لئے اس میں خیار رؤیت بھی حاصل نہیں ہے اور اگر زیورات وغیرہ ہوں تو اس میں خیار رؤیت حاصل ہو گا اور اس کی وجہ سے معاملہ میں کوئی فساد نہیں آئے گا۔

(شرط التقابض) لحرمة النساء..(ويفسد) الصرف (بخيار الشرط والأجل) لإخلالهما بالقبض (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب البيوع، باب الصرف،ج٥ ص ٢٥٩).

وإن افترقا ولأحدهما خيار رؤية بأن كان مصوغا أما في المضروب فلا يثبت خيار الرؤية لأنه لا فائدة فيه كما في المسلم فيه فلا يفسد العقد لأنه خيار حكمي وكذا خيار العيب..

والمفسد خيار الشرط لا غير(تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب الصرف،ج٣ ص ٢٨).

وكذا في فتح القدير (كتاب الصرف،ج٧ص١٣٢).

[3] کیونکہ تقابض نہیں پایا گیا۔

[4] قال: "ولا بد من قبض العوضين قبل الافتراق" لما روينا، ولقول عمر رضي الله عنه: وإن استنظرك أن يدخل بيته فلا تنظره..والمراد منه الافتراق بالأبدان(الهداية ،كتاب الصرف،ج٣ ص ٨١).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، باب الصرف،ج١ ص ٢٢٢).

مسئلہ : اگر دونوں جانب ایک ہی جنس ہو، جیسے صرف چاندی یا صرف سونا، تو مجلس کے قبضہ کے ساتھ وزن کا برابر ہونا بھی ضروری ہے، اس میں صناعت وغیرہ کا اعتبار نہیں۔ [1]

مسئلہ : اگر بیس تولہ وزن کے سونے کا کنگن خالص بغیر پگھلائے سونے کے عوض فروخت کرے تو کمی وزیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ : چاندی کے تمام زیورات کو خالص چاندی کے عوض برابر وزن کے ساتھ بیچنا لازم ہوگا، اس میں تفاوت حرام ہے۔

مسئلہ : دس تولہ کے طوق کو ایسے دس اشرفیوں کے عوض فروخت کرنا جن کا وزن دس تولہ سے کم ہو، جائز نہیں۔

مسئلہ : اگر جنس بدل جائے تو مساوات کی شرط ختم ہو جائے گی، سونے کی ایک اشرفی کو چاندی کے دو درہم کے عوض فروکت کرنا جائز ہے۔ [2]

مسئلہ : یہ حکم سونا چاندی کے ساتھ خاص ہے، دوسری دھاتیں اگر رنگ وقیمت میں ان کے مساوی ہوں مگر بیع صرف کے احکام میں داخل نہیں جیسے گلٹ وغیرہ۔ [3]

فصل: مخلوط سونا و چاندی کے حکم میں

سونے اور چاندی میں کوئی اور چیز ملانے کی چار صورتیں ہیں:

ا۔ منفصل: یعنی سونا اور چاندی میں کوئی دوسری چیز اس طرح ملی ہوئی ہو کہ آسانی کے ساتھ اس کو جدا کیا جا سکتا ہے، یا اس کا علیحدہ حساب اور وزن کیا جا سکتا ہے، جیسے تلوار میں چاندی کا قبضہ، گھڑے میں سونے کی

---

[1] فلو تجانسا شرط التماثل، والتقابض، وإن اختلفا جودة وصياغة، وإلا شرط التقابض.كنز الدقائق،كتاب الصّرف، ص٤٤٤.

وكذا في مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، باب الصرف،ج٢ ص ١١٦).

[2] وإن لم يكونا من جنس واحد بأن باع الذهب بالفضة يشترط التقابض فيه ولا يشترط التساوي لحديث عبادة بن الصامت(تبيين الحقائق ،كتاب الصرف،ج٤ ص ١٣٥).

وكذا في اللباب في شرح الكتاب (كتاب الصرف،ج٢ص٤٧).

[3] كما مر في الحاشية الاولى من هذا الباب.

زنجیر، بالیوں میں موتی، ان میں جتنی مقدار میں سونا اور چاندی ہیں، ان میں تو بیع صرف کے تمام احکام جاری ہوں گے، دوسری چیزوں میں بیوع کی عام شرطیں کافی ہیں۔ [1]

مسئلہ نمبر 1: ایک درہم اور دو اشرفی ہیں، دوسری طرف دو درہم اور ایک اشرفی ہیں، ان کو آپس میں نقد فروخت کرنا جائز ہے، ایک درہم ایک اشرفی کے مقابلے میں ہو جائے گا اور دو درہم دو اشرفیوں کے مقابلے میں ہو جائیں گے۔ [2]

مسئلہ نمبر 2: ایک زیور میں دس ۱۰ تولہ سونا اور ایک کم قیمت موتی ہے اس کو ۹/۱۰ تولہ سونے کے عوض فروخت کرنا ناجائز ہے، اس لئے کچھ سونا اور کچھ موتی زائد دیا جاتا ہے، مگر گیارہ تولہ سونا یا سو تولہ سونا کے عوض فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ یہ تمام زائد سونا ایک موتی کے عوض ہے۔

مسئلہ نمبر 3: ایک چار ماشہ چاندی کی انگوٹھی جس میں شیشہ کا نگینہ لگا ہوا ہے، ایک درہم کے عوض خریدنا جائز ہے، کیونکہ زائد چاندی نگینہ کے مقابلے میں ہو جائے گا۔ [3]

مسئلہ نمبر 4: ایک زیور جس میں ایک تولہ اور شیشہ کا نگینہ ہے، اس کو دس تولہ اور ایک الماس کے نگ کے عوض میں فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ ایک تولہ ایک تولے سونے کے عوض ہو گا، بقیہ سونا اور الماس کا نگ شیشہ کے نگینہ کے عوض ہو گا۔ [4]

---

[1] إذا تفرقا قبل أن يتقابضا أو قبض أحدهما دون الآخر فإنه ينظر إن كانت الحلية مما لا يتخلص عن السيف إلا بضرر فسد البيع كله وإن كانت تتخلص بغير ضرر جاز في السيف وفسد في الحلية لأن العقد بقدر الحلية يكون صرفا وفي حق السيف يكون بيعا مطلقا والتقابض شرط صحة الصرف لا غير(تحفة الفقهاء، كتاب الصرف، باب آخر منه أصل الباب،ج٣ ص ٣٣).

وكذا في بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع(كتاب الصرف، شرائط الصرف،ج٥ ص ٢١٧).

[2] (وصح بيع درهمين ودينار بدرهم ودينارين) بصرف الجنس بخلاف جنسه (و) مثله (بيع كر بر وكر شعير بكري بر وكري شعير و) كذا (بيع أحد عشر درهما بعشرة دراهم ودينار) (الدر المختار وحاشية ابن عابدين كتاب البيوع، باب الصرف،ج٥ ص ٢٦٤).

وكذا في ملتقى الأبحر (كتاب الصرف،ص ١٦٦)

[3] مرّ تخريجه في الحاشية المتقدمة.

[4] مرّ تخريجه في الحاشية المتقدمة.

۲۔ مخلوط متصل: ایسے متصل جن کو الگ کرنا یا علیحدہ کرکے اندازہ لگانا مشکل ہو جیسے کمخاب، یا بھاری ملمع، اس میں بھی سونا چاندی کے بقدر بیع صرف کا حکم جاری ہوگا اور نقد دینا لازم ہے، لیکن جب وزن معلوم نہ ہو تو اس قدر نقد دینا لازم ہے جو یقینی طور پر سونے چاندی کے وزن سے کم نہ ہو۔[1]

مسئلہ نمبر 5 : کمخاب کا تھان خریدا جس میں غالباً دس تولہ چاندی کے تار ہوں گے، تو اب دس تولہ سے زیادہ چاندی دینا لازم ہے، اگر ایسا تھان سونے کے عوض میں خریدا جائے تو سونے کی کچھ مقدار نقد دینا لازم ہے۔

۳۔ مغشوش یعنی کھوٹا: جس سونے یا چاندی میں غش ملا ہوا ہے اس میں غالب کا اعتبار ہے، ایک تولہ میں چھ ماشہ یا اس سے زیادہ چاندی ہو تو چاندی کے حکم میں ہے اور چھ ماشہ سے کم ہو تو دوسرے سامان کی طرح ہے، اس کی خرید و فروخت میں وہی رعایت رکھی جائے جو سونے چاندی سے مخلوط چیزوں میں کی جاتی ہے۔[2]

مسئلہ نمبر 6: جب ایک طرف غش ملا ہوا سونا یا چاندی ہو اور دوسری طرف خالص سونا چاندی ہو تو خالص کا اس مقدار سے زیادہ ہونا ضروری ہے جو مخلوط میں ہے تاکہ سونا سونے کے عوض میں اور زائد سونا غش کے عوض میں ہو جائے۔[1]

---

[1] اس میں اور پہلی قسم میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں اگر سونا و چاندی کے بقدر رقم نہیں دی تو صرف سونے اور چاندی کی حد تک بیع فاسد ہو جائے گی دوسری چیز میں بیع نافذ ہے جبکہ یہاں دوسری صورت میں پورے مبیع میں بیع فاسد ہو جائے گی کیونکہ یہاں سونے کو غیر سونے سے جدا کرنا مشکل ہے تو مبیع مقدور التسلیم نہ رہا۔

(وإن تفرقا) أي المتعاقدان (بلا قبض) شيء (صح) البيع (في السيف دونها) أي دون الحلية. (وإن تخلص) السيف عن الحلية (بلا ضرر) لأنه أمكن إفراده بالبيع فصار كالطوق والأمة (وإلا) أي، وإن لم يتخلص بلا ضرر (بطل) البيع (فيهما) أي في السيف والحلية(مجمع الأنهر ،باب الصرف،ج٢ ص ١١٨)

وكذلك إذا كان لا يعلم أو اختلف التجار في ذلك فإن علم أن الحلية أقل في المجلس يكون جائزا عندنا وإن علم بعد الافتراق لا يجوز عندنا (تحفة الفقهاء، كتاب الصرف، باب آخر منه أصل الباب،ج٣ ص ٣٣).

ولو افترقا بلا قبضٍ صحّ في السّيف دونها إن تخلّص بلا ضررٍ، وإلّا بطلا (كنز الدقائق،كتاب الصرف،ص٤٤٥)

[2] (والغالب الغش منهما) أي الدراهم والدنانير (في حكم العروض) اعتبار للغالب (فصح بيعه) أي بيع الغالب الغش (بالخالص) من الدراهم والدنانير (إن كان) أي الخالص (أكثر) من المغشوش صرفا للجنس إلى الجنس وغيره إلى الزائد (درر الحكام شرح غرر الأحكام ،باب الصرف،ج٢ ص ٢٠٥).

وكذا فی تبيين الحقائق (كتاب الصرف،ج٤ ص ١٤١).

مسئلہ نمبر 7: ایک گلاس کھوٹی چاندی کا جس میں دو تولہ چاندی ہے باقی دوسری چیز، تو اس کی قیمت دو تولہ چاندی سے زیادہ ہونی چاہئے تاکہ دو تولہ دو تولے کے عوض میں باقی میں عوض میں۔

مسئلہ نمبر 8: ان صورتوں میں جو چاندی کا روپیہ دیا جائے گا وہ پہلے اسی سونا چاندی کا عوض سمجھا جائے گا جو مخلوط میں ہے تاکہ عقد بیع صحیح ہو جائے۔

۴۔ تابع: یعنی سونا یا چاندی دوسری چیزوں میں اس طرح ملی ہوتی ہے کہ نہ علیحدہ ہو سکے نہ ہی اس کی مقدار کا تخمینہ ہو سکے، جیسے ہلکا سا ملمع، ایسی صورت میں اگر ان اشیاء کی قیمت میں سونا و چاندی کا ہونا معتبر ہو، ان کا لحاظ رکھا جاتا ہے تو اس مقدار پر بیع صرف کے احکام جاری کرنا اولیٰ ہے ورنہ نہیں۔[2]

مسئلہ نمبر 9: جس چیز کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں سونا یا چاندی ملی ہوئی ہے، مگر یہ سونا چاندی نہ عرفی طور پر جدا ہو سکتے ہیں نہ ظاہر میں، ہاں کسی باریک تدبیر سے نکل سکتی ہے تو وہ سونا چاندی کے حکم میں نہیں، اسی قبیل سے ہے پھول وغیرہ۔[3]

نئی دھاتوں کا حکم

مسئلہ نمبر 11: جو دھاتیں قدیم زمانہ میں مسلمانوں کو نہیں ملیں بعد میں دریافت ہوئیں، ان کے متعلق یہ خیال کیا جائے کہ یہ سونا ہے یا چاندی، تو ان کی اصلی حالت معلوم ہونے تک ان کے متعلق سونا چاندی کا

---

[1] مرّ تخريجه.

[2] [تتمة] قال في كافي الحاكم: وإذا اشترى لجاما مموها بفضة بدراهم أقل مما فيه أو أكثر فهو جائز؛ لأن التمويه لا يخلص؛ ألا ترى أنه إذا اشترى الدار المموهة بالذهب بثمن مؤجل يجوز ذلك وإن كان ما في سقوفها من التمويه بالذهب أكثر من الذهب في الثمن اهـ. والتمويه: الطلي. ونقل الخير الرملي نحوه عن المحيط، ثم قال: وأقول يجب تقييد المسألة بما إذا لم تكثر الفضة أو الذهب المموه. أما إذا كثر بحيث يحصل منه شيء يدخل في الميزان بالعرض على النار يجب حينئذ اعتباره ولم أره لأصحابنا: لكن رأيته للشافعية وقواعدنا شاهدة به فتأمل (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،باب الصرف ،مطلب في بيع المموه ،ج٥ ص ٢٦٢).وكذا في منحة الخالق (كتاب البيوع، باب الصرف،ج٦ ص ٢١٣).

[3] بخلاف الغش المغلوب لأنه يحترق ويهلك ولا لون حتى لو عرف أن الفضة أو الذهب الذي في الغش الغالب يحترق ويهلك كان حكمه حكم النحاس الخالص فلا يعتبران أصلا ولا يجوز بيعه بجنسه متفاضلا إن كان موزونا للربا(البحر الرائق ،كتاب الصرف،ج٦ ص ٢١٧).

وانظر الحاشية المتقدمة ايضا.

حکم نہیں لگایا جا سکتا۔[1] خالص سونا اور چاندی کے زیور میں کچھ نگ (یعنی شیشہ وغیرہ) بڑھا دئے جائیں تو ان کی وجہ سے زیادہ قیمت لینے کا حق ہو جاتا ہے، مثلاً سونے کے کنگن کو چاندی کے عوض فروخت کرے یا چاندی کے چھڑے سونے کے عوض فروخت کرے یا کچھ پیسے بڑھا دے تاکہ نہ شرع کی طرف سے سود کا الزام عائد ہو اور نہ سنار کی اجرت ضائع ہو۔[2]

کانیں اور سونے کی مٹی کا حکم

معادن (کانیں) اور مٹی کے سونے کی خرید و فروخت کرنے کی تین شرطیں ہیں:

ا۔ اپنی جنس کے ساتھ نہ فروخت کرے جیسے سونے کی مٹی سونے سے، اگر ہم جنس کے ساتھ تبادلہ کرنا پڑے تو دوسری جانب بھی کچھ ملا دیں، جیسے سونے کی مٹی کو خالص سونے کے عوض فروخت کرنا ہو تو خالص سونے کے ساتھ کچھ ملا دیں، اسی طرح اگر چاندی کے مٹی کو خالص چاندی کے عوض فروخت کرنا ہو تو خالص کے ساتھ کچھ چیز ملائیں تاکہ خالص خالص کے بدلہ میں ہو جائے اور ملاوٹ ملاوٹ کے بدلہ میں۔[3]

۲۔ سونے چاندی کے مٹی کا عوض (قیمت) نقد دیا جائے، وعدہ نہ ہو، ہاں البتہ سونے کی مٹی کو سونا چاندی کے علاوہ کسی اور چیز میں فروخت کیا تو عوض کے متعلق وعدہ صحیح ہو گا۔[4]

---

[1] کیونکہ ابھی تک اس کا سونا اور چاندی یقینی نہیں تھا تو محض اس شک کی وجہ سے اس کو سونا چاندی کا حکم نہیں دیا جا سکتا "لان الیقین لا یزول بالشک"۔

[2] اس زمانہ میں چونکہ سونا کے اشرفی اور چاندی کے روپیہ مروج تھے اس لئے اس تدبیر کو اختیار کئے بغیر سنار کے مزدوری کی کوئی صورت نہیں تھی ، اس صورت میں زائد قیمت شیشہ کے نگ کے بدلے ہوجائے گی اور باقی سونا سونے کے بدلے یا چاندی چاندی کے بدلے ہو جائے گا، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی، لیکن موجودہ زمانہ میں چونکہ کاغذی کرنسی ہی کا رواج ہے اس لئے ان تدابیر کو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ مروجہ نوٹ کے ذریعے سونا چاندی خرید نا بیع صرف نہیں ہے جس میں تفاضل ناجائز ہو۔

[3] لو اشترى تراب ذهب بذهب أو تراب فضة بفضة لا يجوز إلا إذا علم أن ما فيه مثل ما يعطي وكذا لو باعه بذهب وفضة لا يجوز (الفتاوى الهندية،كتاب الصرف،الفصل الرابع في الصرف في المعادن وتراب الصواغين ،ج٣ ص ٢٢٦) .
والتفصيل فى المحيط البرهاني في الفقه النعماني (كتاب الصرف،الفصل الثالث والعشرون: في الصرف في المعادن وتراب الصواغين، ج٧ ص ٢٣٩) .

[4] کیونکہ مٹی میں جس قدر سونا چاندی ہو اس کی حد تک بیع صرف ہے اور بیع صرف میں مجلس عقد میں دونوں بدلین پر تقابض ضروری ہے، لیکن کاغذی نوٹ کے ذریعے خریدنے کی صورت میں چونکہ بیع صرف نہیں ہے اس لئے وعدہ بھی کافی ہے، تقابض ضروری نہیں۔

۳۔اس مٹی سے سونا یا چاندی کی کچھ مقدار ضرور نکلنا چاہئے ورنہ بیع منعقد نہ ہوگی کیونکہ یہاں مٹی کی بیع نہ مقصود ہے نہ ملحوظ۔[1]

مسئلہ: اس میں خیار رؤیت ثابت نہیں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ کچھ مقدار مٹی صاف کرکے دیکھ لے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔[2]

مسئلہ: سنار کو چاہئے کہ جب تک اس کا حق مٹی میں نہ ہو، فروخت نہ کرے، کیونکہ اس مٹی کے اندر جو سونا چاندی ہے، اس کا نہیں ہے اگر حق نہ ہوتے ہوئے بھی فروخت کررہا ہے تو قیمت کو اصل مالک کی طرف سے نیت کرکے صدقہ کردے۔[3]

دوسرے شہروں سے سونا چاندی خریدنے کا حکم

دوسرے شہروں سے سونا چاندی خریدنے کی چار صورتیں ہیں:

۱۔بائع زیور بھیج دے مگر قیمت نوٹ کو ٹھہرائے، درہم یا دینار نہ دی جائے۔

۲۔خریدا نوٹ بھیج کر مال طلب کرے، یہ جائز ہے کیونکہ نوٹ میں بدلین پر مجلس میں قبضہ شرط نہیں، گویا ایسا ہے کہ زیور کو دو من گندم کے عوض فروخت کیا۔[4]

۳۔منی آرڈر یا ہنڈی کے عوض فروخت کرنا، یا یہ کہ مال بھیج دو مال پہنچتے ہی قیمت بھیج دی جائے گی، یہ جائز

---

[1] ذكر الشعبي رضي الله عنه أنه قال: لا خير في بيع تراب الصواغين، وهذا عندنا إذا لم يعلم هل فيه شيء من الذهب أو الفضة أولا(المحيط البرهاني، كتاب الصرف،الفصل الثالث والعشرون ،ج٧ ص ٢٣٩).

[2] بظاہر یہ کاتب کی غلطی یا مؤلف رحمہ اللہ کا تسامح ہے، اس صورت میں خیار شرط لگانا درست نہیں ہوتا کیونکہ وہ تقابض کے خلاف ہے، خیار رؤیت ثابت ہوتا ہے، امام محمد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وإذا اشترى الرجل تراب فضة بتراب فضة فإن ذلك لا يجوز، لأني لا أدري أيهما أكثر. وكذلك تراب الذهب بتراب الذهب. فإن كان تراب ذهب بتراب فضة فهو جائز، وكل واحد منهما بالخيار إذا رأى ما فيه. (الأصل للشيباني ،كتاب الصرف،باب الصرف في المعدن والكنز وتراب الصواغين، ج٣ص٤٣).

ويشترط عدم التأجيل والخيار) أي وعدم الخيار: أي خيار الشرط بخلاف خيار رؤية أو عيب.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب الصرف،ج٥ ص ٢٥٧).

[3] مر بيانه في شرائط البيوع.

[4] واضح رہے کہ مؤلف رحمہ اللہ کے نزدیک نوٹ سونے یا چاندی کی رسید نہیں ہے بلکہ پرانے زمانے کے سکہ کی طرح ہے اس لئے ان دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا، کچھ صفحات بعد اس کی تفصیل آجائے گی، انشاءاللہ تعالیٰ۔

نہیں کیونکہ مجلس میں بدلین پر قبضہ نہیں ہوا۔[1]

۴۔اگر ڈاک خانہ کے ذریعے اس طرح بھیجا جائے کہ ڈاکیا مال حوالہ کر کے اسی مجلس میں قیمت درہم/دینار کی صورت میں وصول کرے گا، یہ جائز ہے کیونکہ اس میں ڈاکیا بائع کا وکیل ہے تو بدلین پر قبضہ ایک مجلس میں ہوا، اگر مال ریلوے (یا کارگو وغیرہ) کے ذریعہ بھیجا اور بلٹی ڈاکخانہ کے ذریعے روانہ کیا کہ اتنے درہم لے کر بلٹی خریدار کے حوالہ کرنا، اسی طرح درہم ادا کرتے ہی خریدار کو بلٹی مل جاتی ہے اور مال بعد میں وصول ہو گا تو مجلس واحد میں بدلین پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت ناجائز ہے۔

حیلہ: بیع صرف میں قیمت کی ادائیگی پر فوری قدرت نہ ہو تو یہ حیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ پہلے بائع کو اسی مجلس میں قیمت ادا کر دے، اس کے بعد ان سے بطور قرض واپس لے۔[2]

دوسری صورت یہ ہے (کہ) عقد منعقد ہونے سے پہلے بائع سے رقم قرض لے، اس کے بعد اس رقم سے بقدر سونا چاندی خریدے، یہ حیلہ جائز ہے شرعاً۔

سکوں کے احکام

سکہ: حکومت کا نافذ کردہ ایک حکم ہے یا لوگوں میں جاری ایک عرف ہے جس سے وہ ایک متعین قیمت میں بدون رد و انکار کے رائج ہوتا ہے۔[3]

سکہ دو قسمیں ہیں:

خلقی: سونے اور چاندے کے سکے۔

عرفی: جو لوگوں نے اس کے سکہ ہونے پر اتفاق کر لیا جو اب ہر ملک کی کرنسی کہلاتی ہے جس کی قیمت

---

[1] جبکہ بیع صرف میں بدلین پر مجلس عقد ہی میں قبضہ کرنا ضروری ہے جس کی تفصیل باحوالہ گزر چکی۔

[2] یہ حیلہ قابل غور ہے جب خریدار کے پاس قیمت دینے کی استطاعت ہی نہیں ہے تو ادائیگی کیسے کرے؟ البتہ ایسا ممکن ہے کہ خریدار کے پاس رقم تو موجود ہو مگر فی الحال خود اسے ضرورت ہو اور بائع کو دینے کے لئے تیار نہ ہو، ورنہ تو عام طور پر اگر بالکل ہی رقم نہ ہو تو دوسری صورت ہی اختیار کی جائے جس میں شرعاً کوئی محذور لازم نہیں آتا۔

[3] اس باب کے اکثر مسائل کی تخریج پہلے ہو چکی ہے، یہاں صرف ان مسائل کی تخریج کی جاتی ہے جو پہلے ذکر نہ ہوں۔

حکومت متعین کرتی ہے۔

عرفی کی دو قسمیں ہیں:

ا۔متقوم: جو سکہ قرار پانے سے پہلے بھی اس کی کچھ قیمت ہے جیسے فلوس کہ اس کی اصل تانبہ ہے۔

۲۔متبذل: جو سکہ متعین ہونے سے پہلے (اور)[1] اس کے سکہ کی حیثیت ختم ہونے کے بعد ایسی کم قیمت کی ہو جائے جو موجودہ قیمت کے مقابلے میں بالکل بے وقعت ہو جیسے کاغذی نوٹ۔

سکہ خلقی کے احکام:

مسئلہ: ہمیشہ غیر متعین ہوتا ہے۔

مسئلہ: خرید و فروخت میں وہ ثمن ہے اگرچہ اس کا نام مبیع رکھا جائے۔

مسئلہ: سکہ ہونے سے ان کی قیمت میں نہ کمی ہوتی ہے نہ اضافہ، نہ ان میں تفاوت جائز ہے یعنی تفاوت حرام ہے کہ سونے کے ٹکڑے کو اشرفی کے عوض یا چاندی کے ٹکڑے کو درہم کے عوض کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کیا جائے۔

مسئلہ: اس میں بیع صرف کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

مسئلہ: اگر مستحق کو ان کے ذریعہ ادائیگی کی جائے تو وہ نہ لینا چاہے تو اس کو لینے پر قضاءً مجبور کیا جائے گا[2] مگر بعض صورتوں میں مجبور نہیں کیا جائے گا:

ا۔اکراہ ہو۔[3]

۲۔وزن سے کم یا زیادہ قیمت رکھی گئی ہو۔

۳۔ان سکوں کے رواج ختم ہونے کا خوف ہو۔[1]

---

[1] قوسین کے درمیان والا لفظ مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں، کلام جوڑنے کے لئے لگایا گیا۔

[2] کیونکہ یہ خلقی ثمن ہے، خریدار کو اس سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں۔

لا يتعين الثمن بالتعيين في العقد مثلا لو أرى المشتري البائع ذهبا مجيديا في يده ثم اشترى بذلك الذهب شيئا لا يجبر على أداء ذلك الذهب بعينه بل له أن يعطي البائع ذهبا مجيديا من ذلك النوع غير الذي أراه. إياه. (مجلة الأحكام العدلية ، رقم المادة ٢٤٣ص ٤٩).

[3] کیونکہ اس صورت میں تو اصل عقد ہی لازم نہیں۔

۴۔ایسے شہر میں جانے کاارادہ ہے جہاں اس کارواج نہیں۔

۵۔جبکہ خاص قسم کے سکے دینے کا عہد کیاہو۔

٦۔ جبکہ اس کو نہ لینے کے متعلق عقد کرتے وقت صراحۃً کہہ دیاہو،ان تمام صورتوں میں سکہ لینے پر مجبور نہ ہو۔[2]

مسئلہ :جب یہ سکے واجب الادا ہو اور مارکیٹ میں ان کارواج ختم ہو گیا ہو تب بھی معاملہ باقی رہے گا اور بعینہ یہی واجب ہوں گے بخلاف فلوس (کے) اگر فلوس کارواج ختم ہو جائے تو معاملہ باقی نہیں رہے گا۔[3]

مسئلہ :ان میں زکوۃ فرض ہے۔

سکہ متقوم کے احکام

مسئلہ :جو سکہ کامل ہو کسی دوسرے کا حصہ نہ ہو جیسے نوٹ پانچ کا، دس کا، سو کا،ہزار کاوغیرہ۔

مسئلہ :کسر جو دوسرے سکہ کا جزء ہو جیسے پیسے، چونی،اٹھنی، جنہیں حکومت نے روپے کا جزء قرار دیاہے،ان کی قیمت ہمیشہ برابر رہتی ہے۔

فلوسِ صحیح کا حکم

مسئلہ:سکہ قرار پانے کے بعد عددی ہوگا وزنی نہیں رہے گا، لہٰذا جائز ہے(کہ) سکہ سے تانبا کو کمی زیادتی کے ساتھ خریدے،اسی طرح ایک پیسہ سے دو پیسوں کو خریدے،بشرطیکہ نقد خریدے(کیونکہ

---

[1] ان دونوں صورتوں میں اگر خریدار کو مجبور کیاجائے تواس کاواضح نقصان ہے۔

[2] ان دونوں صورتوں میں خریدار کااصل مقصود فوت ہورہاہے۔

إذا بين وصف لثمن وقت البيع لزم على المشتري أن يؤدي الثمن من نوع النقود التي وصفها مثلا لو عقد البيع على ذهب مجيدي أو إنكليزي أو فرنساوي أو ريال مجيدي أو عمودي لزم على المشتري أن يؤدي الثمن من النوع الذي وصفه وبينه من هذه الأنواع. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ٢٤٢،ص٤٩).

[3] في الدر المختار:لو اشترى بقطع رائجة فكسدت بضرب جديدة يجب قيمتها يوم البيع من الذهب لا غير إذ لا يمكن الحكام الحكم بمثلها لمنع السلطان منها، ولا يدفع قيمتها من الفضة الجديدة لأنها ما لم يغلب غشها فجيدها ورديئها سواء إجماعا. وفي رد المحتار تحته: لم أر من صرح بحكم الدراهم الخالصة أو المغلوبة الغش سوى ما أفاده الشارح هنا. وينبغي أنه لا خلاف في أنه لا يبطل البيع بكسادها، ويجب على المشتري مثلها في الكساد، والانقطاع والرخص والغلاء، أما عدم بطلان البيع، فلأنها ثمن خلقة فترك المعاملة بها لا يبطل ثمنيتها فلا يتأتى تعليل البطلان المذكور، وهو بقاء البيع بلا ثمن. (كتاب البيوع،مطلب مهم في أحكام النقود إذا كسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت،ج٤ ص ٥٣٣).

عددی اور وزنی دو مختلف جنس ہیں) لیکن فلوس کسریٰ میں جائز نہیں۔[1]

مسئلہ : مثمن ثمن بن جاتے ہیں۔[2] فلوس کو نقدین (درہم دینار کاغذی نوٹ) کے علاوہ کسی اور چیز سے تبادلہ کیا جائے تو ہر موقع پر یہ ثمن قرار پائیں گے، لہٰذا جائز ہے غیر متعین فلوس کے عوض میں کوئی سامان خریدا جائے، یا متعین فلوس کے عوض خریدے لیکن دیتے وقت بدل کر دوسرا دیدے کیونکہ ثمن قرار پانے کی وجہ سے اب یہ متعین نہ رہا۔

مسئلہ : دکاندار کو پیسہ دکھا کر کہا کہ اس کا نمک دیدو، پھر بدل کر دوسرا پیسہ دیدیا تب بھی جائز ہے۔

مسئلہ : عاقدین کو اختیار حاصل ہے، ان فلوس کی صرف ثمنیت یا عددیت وثمنیت دونوں باطل کر دیں، مگر جب ثمنیت باطل ہو اس سے تعدد کا باطل ہونا لازم نہیں، لیکن جب عددیت باطل ہو گی اس سے ثمنیت خود بخود باطل ہو جائے گی۔[3]

---

[1] وإن كانوا يتبايعون بها عددا جاز؛ لأنها صارت عددية بتعامل الناس، وصارت كالفلوس الرائجة(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط جريان الربا في البيع،ج٥ ص ١٩٨).

وكل شيء نص رسول الله صلى الله عليه وسلم على تحريم التفاضل فيه كيلا فهو مكيل أبدا وإن ترك الناس الكيل فيه مثل الحنطة والشعير والتمر والملح وكل ما نص على تحريم التفاضل فيه وزنا فهو موزون أبدا مثل الذهب والفضة وما لم ينص عليه فهو محمول عادات الناس(مختصر القدوري ،كتاب البيوع، باب الربا،ص ٨٧).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، باب الربا، ج١ص ٢١٣).

[2] یعنی مبیع بھی بن سکتے ہیں اور ثمن بھی۔

أن (الأموال ثلاثة) الأول (ثمن بكل حال وهو النقدان) صحبته الباء أو لا، قوبل بجنسه أو لا (و) الثاني (مبيع بكل حال كالثياب والدواب و) الثالث (ثمن من وجه مبيع من وجه كالمثليات) فإن اتصل بها الباء فثمن وإلا فمبيع. وأما الفلوس فإن رائجة فكثمن وإلا فكسلع(الدر المختار وحاشية ابن عابدين كتاب الصرف،ج٥ ص ٢٧٢).

وكذا في مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر (قبيل كتاب الكفالة،ج٢ ص ١٢٣).

[3] قال: "ويجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانهما" عند أبي حنيفة وأبي يوسف، وقال محمد: لا يجوز لأن الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما، وإذا بقيت أثمانا لا تتعين فصار كما إذا كانا بغير أعيانهما وكبيع الدرهم بالدرهمين. ولهما أن الثمنية في حقهما تثبت باصطلاحهما إذ لا ولاية للغير عليهما فتبطل باصطلاحهما وإذا بطلت الثمنية تتعين بالتعيين ولا يعود وزنيا لبقاء الاصطلاح على العد(الهداية ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٦٣).

قال رضي الله عنه: ومشايخنا رحمهم الله لم يفتوا بجواز ذلك في العدالى والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا، فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربا،(الهداية ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٨٤).

وكذلك الفلوس، فلا بأس بأن يُستبدل فلس بفلسين أو أكثر يداً بيد، ولا خير فيه نسيئة. وهذا قول أبي يوسف. وقال محمد: لا يجوز ذلك يداً بيد ولا نسيئة؛ لأن الفلوس ثمن.(الأصل للشيباني ،كتاب البيوع، والسلم،ج٢ ص ٤١٢ ط قطر). وقول محمد هو الراجح في هذا الباب (انظر:بحوث في قضايا فقهية معاصرة ،ج١ ص ١٦٥).

مسئلہ : ایک فلوس کے عوض دو چار فلوس خرید نا جائز ہے، کیونکہ جب ثمنیت باطل کر دی گئی، عددی رہ گئی ان میں ربوا نہیں ہے۔[1]

مسئلہ : پیسوں کو پیسوں کے عوض وزن کر کے فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں نہ ثمنیت ملحوظ ہے نہ تعدد باقی ہے، باعتبار وزن تانبے کی طرح فروخت کئے گئے اور دوسرے اموال کی طرح متعین بھی ہو جائیں گے۔[2]

مسئلہ : ایسے دو قسم کے پیسے جو رواج وقیمت میں مساوی اور وزن میں متفاوت ہوں، ان کو آپس میں فروخت کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ عرفی ثمن کے لحاظ سے برابر فروخت کر دیں۔

۲۔ ثمنیت کو باطل کر کے وزناً فروخت کریں، مگر دونوں صورتوں میں نقد فروخت کرنا ہوگا۔[3]

مسئلہ : ان میں بیع صرف کا حکم جاری نہ ہوگا اور بدلین پر مجلس میں قبضہ بھی شرط نہیں، لہٰذا اگر ایک پیسہ نقد ہو اور اس کے عوض کو متعین کر کے مجلس عقد ختم ہونے کے بعد دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے جس طرح کہ دوسرے اموال میں جائز ہے البتہ نقد ہونا چاہئے ادھار نہ ہو۔[4]

مسئلہ : اگر بیع میں ان سکوں کو عوض ٹھہرایا جائے اور اس کے بعد ان سکوں کا رواج ختم ہو جائے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بعینہ یہی سکے دئے جائیں گے (ہدایہ)[1] امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہاں ان سکوں

---

[1] انظر الحاشیة المتقدمة. تسہیل شدہ نسخہ میں مرتّب کی طرف سے یہاں یہ اضافہ کیا گیا ہے: "(یہ دونوں مسئلہ اس وقت کے اعتبار سے تھے جب حکومت کی طرف سے ان کے لئے کوئی قیمت مقرر نہیں تھی، لیکن یہ تمام چیزیں اب قانون کے دائرہ میں آگئی ہیں، اس لئے اب ایک کو دو کے عوض فروخت کرنا یا ثمنیت کو باطل کرنا عاقدین کے لئے جائز نہیں ہے۔ از ابن شائق)"

[2] ایضا. تسہیل شدہ نسخہ میں مرتّب کی طرف سے یہاں یہ اضافہ کیا گیا ہے: " نوٹ: یہ مسئلہ صرف علماء کے سمجھنے کے لئے ہے (از مسہّل)"

[3] ایضا. تسہیل شدہ نسخہ میں مرتّب کی طرف سے یہاں یہ اضافہ کیا گیا ہے: "نوٹ: صورت نمبر ۲ پر عمل موجودہ وقت میں جائز نہیں۔ (از ابن شائق)"

[4] بیع صرف اس لئے نہیں ہے کہ صرف خاص سونا یا چاندی کے آپس میں تبادلہ کا نام ہے جبکہ فلوس حقیقت میں نہ سونا ہے نا چاندی، اور چونکہ بدلین پر مجلس عقد میں قبضہ کرنا بیع صرف کے خصوصیات میں سے ہے اس لئے یہاں یہ ضروری نہیں۔ اور مؤلف رحمہ اللہ نے جو فرمایا کہ "البتہ نقد ہونا چاہئے ادھار نہ ہو" شاید یہ اس لئے ہے کہ جب فلوس کو متعین کیا گیا تو اب تعیین کے بعد تاجیل کی شرط شرط فاسد ہے کیونکہ مبیع متعین کی تاجیل شرعاً درست نہیں۔

کی اس دن کی قیمت دی جائے گی جس دن مبیع پر قبضہ ہوا اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس دن کی قیمت دی جائے گی جس دن ان سکوں کا رواج ختم ہو گیا(قاضی خان)[2] اور فتویٰ امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر ہے(ہدایہ)[3]

لیکن اگر سکے متعین کر دئے کہ انہی سکوں کے عوض خریدا تو اب وہی واجب ہوں گے، چاہے ان کا رواج رہے یا نہ رہے قیمت بڑھے یا گھٹے(عالمگیری)[4]

---

[١] ہدایہ میں دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں، ایک ان فلوس کے ساتھ بیع وشراء کرنے کا اور دوسرا ان فلوس کو بطور قرض لینے کا، فلوس کے ساتھ بیع وشراء کرنے کی صورت میں اگر ان کا رواج ختم ہو جائے تو بعینہ یہی سکے لازم نہیں ہوں گے بلکہ امام صاحب کے نزدیک بیع ہی باطل ہو جائے گی البتہ قرض لینے کی صورت میں اگر ایسا اتفاق ہو جائے تو بعینہ سکہ دیئے جائیں گے، ہدایہ کی عبارت درج ذیل ہے:

"وإذا اشترى بها سلعة فكسدت وترك الناس المعاملة بها بطل البيع عند أبي حنيفة. وقال أبو يوسف رحمهما الله: عليه قيمتها يوم البيع. وقال محمد رحمه الله: قيمتها آخر ما تعامل الناس بها"..."ولو استقرض فلوسا نافقة فكسدت عند أبي حنيفة رحمه الله يجب عليه مثلها" لأنه إعارة، وموجبه رد العين معنى والثمنية فضل فيه إذ القرض لا يختص به. (الهداية ،كتاب الصرف، ج٣ ص ٨٥).

وكذا في فتاوى قاضي خان كما يأتي في الحاشية التالية.

[٢] رجل اشترى بالعدلي شيئا فكسد قبل القبض فسد البيع في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى وكذا إذا اشترى بالفلوس فكسدت يعين لا تروج رواج الأثمان وإن غلا أو رخص لا يفسد البيع ولا خيار لأحدهما وإن استقرض عدليا أو فلوسا فكسد عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى عليه مثلها كاسدة ولا يضمن فيمتها وقال أبو يوسف رحمه الله تعالى عليه قيمتها من الذهب والفضة يوم قيضها وقال محمد رحمه الله تعالى عليه قيمتها من الذهب والفضة في آخر يوم كانت رائجة فكسدت(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، الفصل الاول، ج٢ ص ٦٩).

[٣] وقول محمد رحمه الله أنظر للجانبين، وقول أبي يوسف أيسر. (الهداية ،كتاب الصرف، ج٣ ص ٨٥).

ولو استقرض الفلوس الرائجة أو العدالى فكسدت قال أبو حنيفة رحمه الله تعالى يجب عليه مثلها كاسدة ولا يغرم قيمتها وقال أبو يوسف رحمه الله تعالى قيمتها يوم القبض وقال محمد رحمه الله تعالى يغرم قيمتها في آخر يوم كانت رائجة وعليه الفتوى(فتاوى قاضيخان ،ج٢ ص ١٢٥).

[٤] یہ حکم ہر سکّہ کے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ سکّہ جس میں پیتل وغیرہ دھات زیادہ ہو اور عام سامان کے طور پر اس کا لین دین ہوتا ہو، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری کی عبارت یہ ہے: وإن كانت الدراهم ثلثاها صفرا وبيعت وزنا بيع السلع يجب أن تتعين بالتعيين فيبطل البيع بهلاكها قبل التسليم كذا قاله مشايخنا.(الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل الأول في بيع الدين، ج٣ ص ١٠٥).

ولو اشترى رجل من آخر ثوباً بدراهم بعينها من التي ثلثاها صفر وهي عندهم وزناً أو عدداً فلم يتفرقا حتى ضاعت لم ينتقض البيع حتى يعطيه مثلها؛ لأنها إن كانت تباع عدداً فهي بمنزلة الفلوس الرائجة، وأيهما كان لا يتعين بالتعيين فهلاكها لا يوجب انتقاض البيع.. وكذلك الجواب فيما إذا كان نصفها فضة ونصفها صفراً؛ لأنه إذا كان هكذا فهو بمنزلة فضة ضم إليها فلس رائج فلا يتعين أيضاً، وإن كانت الدراهم ثلثاها صفر بيعت وزناً كالسلع يجب أن تتعين بالتعيين، فيبطل البيع بهلاكها قبل التسليم، كذا قاله مشايخنا رحمهم اللّه. المحيط البرهاني ،كتاب البيوع، الفصل السادس، ج٦ص ٣٣٠.

مسئلہ: اگر رواج تو ہے لیکن بعد میں قیمت بڑھ گئی تو کچھ تفاوت نہ ہو گا (قاضی خان) اور شامی میں ہے کہ اس وقت بھی سکوں کی قیمت واجب ہو گی۔[1]

مسئلہ: علامہ شامی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کھوٹے درہموں کا بھی یہی حکم ہے مگر ان میں بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے۔[2]

مسئلہ: اگر بیع میں فلوس متعین کر دئے اس کے بعد وہ ہلاک ہو گئے تو اس سے بیع فسخ نہ ہو گی۔[3]

مسئلہ: ہو سکتا ہے کہ پیسے بھی آنے اور پائی کے معنی میں مستعمل ہوں اور جزئیت ملحوظ اور عددیت متروک ہو۔

مسئلہ: اگر کہا کہ یہ چاروں کتابیں ایک روپے کے ہیں، ایک کتاب سولہ پیسے کی، یا ایک روپے کے ۳۲ جز کے حساب سے ایک کتاب دو پیسے میں ہے، اب مراد جزئیت ہے۔

مسئلہ: ان پیسوں کو درہم اور اشرفی کے عوض کمی زیادتی، نقد ادھار ہر طرح فروخت کرنا جائز ہے۔[4]

مسئلہ: فلوس میں چاندی کی طرح زکوۃ واجب ہے کیونکہ یہ بھی ثمنیت اور تجارت کے لئے موضوع ہیں، یا روپیہ کے جزء بننے کے لئے موضوع ہیں، اگر ان کا رواج ختم ہو جائے تو یہ مال کے حکم میں ہو جائیں گے، ان کی خریداری میں تجارت کی نیت ہو گی تو ان کی مالیت پر زکوۃ واجب ہو گی ورنہ نہیں۔[5]

ٹوٹے ہوئے پیسوں کا حکم

ان کا حکم صحیح فلوس کی طرح ہے مگر بعض احکام میں اختلاف ہے:

۱۔ عاقدین اس کی ثمنیت اور عددیت باطل نہیں کر سکتے بر خلاف صحیح کے، کیونکہ وہ سرکاری قانون سے

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، مطلب مهم في أحكام النقود إذا كسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت، ج٤ ص ٥٣٣).

[2] انظر الحاشية المتقدمة.

[3] کیونکہ وہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوئے، اس لئے اس سے معاملہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بلکہ اس جتنے دیگر فلوس دینا کافی ہے۔

[4] کیونکہ یہ بیع صرف نہیں ہے البتہ احد البدلین پر قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الکالئ بالکالئ لازم نہ آئے۔

[5] " الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق أو الذهب " لقوله عليه الصلاة والسلام فيها " يقومها فيؤدي من كل مائتي درهم خمسة دراهم " ولأنها معدة للاستنماء بإعداد العبد فأشبه المعد بإعداد الشرع(الهداية ،كتاب الزكاة، فصل في العروض، ج١ ص ١٠٣).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الزكاة، الباب الثالث،الفصل الثاني في العروض،ج١ ص ١٧٩).

ثمن بنا ہے جس کی خلاف ورزی جرم ہے [1]، ہاں البتہ حکومت کی طرف سے کوئی ممانعت نہ ہو تو اختیار ہے، یہ قول صاحبین کے مذہب کے مطابق ہے کیونکہ صاحبین کے نزدیک ایک پیسے کو دو پیسوں کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ [2]

۲۔ان پیسوں سے خرید و فروخت کیا جائے تو اگر نقداً ہے تو ذات فلوس کا اعتبار ہے اگر ادھار ہے تو جزئیت و ثمنیت کا اعتبار ہے۔

مسئلہ : ایک چاندی کے روپیہ کے عوض ۷۰/یا ۵۰ پیسے خریدا جائے، اگر نقد ہے تو جائز ہے کیونکہ اس میں جنس و قدر نہیں ہے اگر ادھار ہے تو جائز نہیں اس میں سود لازم آئے گا بر خلاف صحیح کے، کیونکہ روپیہ ۶۴ پیسوں کا ہوتا ہے اس لئے کہ چونسٹھ جزء ۵۰/۷۰ کے مقابل ہیں، اس طرح یہ بھی جائز نہیں کہ ایک پیسہ سے دو چار پیسے خریدے جائیں۔

مسئلہ : ۱۶ پیسے امانت رکھوائے، اس کے بعد اس کی قیمت گھٹ گئی یا بڑھ گئی، یا ان کا رواج نہیں رہا تو بعینہ وہی پیسے واپس کئے جائیں گے کیونکہ ذات موجود ہے۔ [3]

اگر امین نے ان پیسوں کو آگے فروخت کر دیا یا اپنے پیسوں کے ساتھ ملا دیا جس کی وجہ سے امین پر ضمان لازم ہو گیا تو اس صورت میں قیمت یعنی روپے کے چوتھائی دینا ہو گی اب جزئیت کا اعتبار ہو گا۔ [4]

---

[1] لہذا متعاقدین اس کی ثمنیت کو ختم نہیں کر سکتے جیسا کہ فقہاء کرام نے "بیع الفلس بالفلسین" کے ضمن میں امام محمد رحمہ اللہ کے دلائل کے ذیل میں لکھا ہیں۔

[2] یہ موقف صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں کا نہیں ہے بلکہ صرف امام محمد رحمہ اللہ کا ہے۔

"ويجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانهما" عند أبي حنيفة وأبي يوسف، وقال محمد: لا يجوز لأن الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما، وإذا بقيت أثمانا لا تتعين فصار كما إذا كانا بغير أعيانهما وكبيع الدرهم بالدرهمين. (الهداية، كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٦٣).

[3] ولو استقرض فلوسا نافقة فكسدت عند أبي حنيفة رحمه الله يجب عليه مثلها" لأنه إعارة، وموجبه رد العين معنى والثمنية فضل فيه إذ القرض لا يختص به. (الهداية ،كتاب الصرف،ج٣ ص ٨٥).

وكذا في فتاوى قاضي خان (كتاب البيوع، الفصل الاول،ج٢ ص ٦٩).

[4] کیونکہ ان تصرفات کے بعد وہ امین نہیں رہا بلکہ غاصب بنا اور غصب کی صورت میں غصب کے دن والی قیمت لازم ہوتی ہے۔

وهذا كالاختلاف بينهما فيمن غصب مثليا وانقطع قال أبو يوسف تجب قيمته يوم الغصب وعند محمد يوم الانقطاع(تحفة الفقهاء ،كتاب الصرف، فصل فى القرض،ج٣ ص ٣٥).

مسئلہ : ایک چیز ۳۲ روپے کی خریدی، بعد میں پیسوں کا رواج ختم ہو گیا تو اس چیز کی قیمت نصف روپیہ دینا لازم دینی ہو گی، اگر رواج ہے لیکن قیمت میں کمی زیادتی ہوئی تو وہی پیسے دئے جائیں گے مگر نصف روپے کے بقدر۔

امید ہے کہ امام صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ کا اس مسئلہ کے متعلق اختلاف نہیں ہو گا،[1] کیونکہ امام صاحب جو فسخ باب بیع کا قائل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پیسے بالکل بے قیمت ہو گئے اور بدل کا ہلاک ہونا فساد عقد کا موجب ہے اور یہاں فلوس مستقل نہ تھے بلکہ معنًی روپے کا جز ہے وہ جزء موجود ہے۔

مسئلہ : ان پیسوں کو اشرفی کے عوض بیچنا ہو تو کمی زیادتی نقد ادھار ہر طرح فروخت کرنا جائز ہے۔[2]

مسئلہ : ان پر زکوۃ باعتبار جزئیت واجب ہے جب کہ صحیح میں باعتبار قیمت مستقلہ، ۲۴۳۲ فلوس ہوں تو نصاب کامل ہے اور زکوۃ واجب ہے ہاں جب یا جس مقام پر فلوس کا رواج ختم ہو جائے تو وہاں زکوۃ واجب نہ ہو گی، دوسرے اموال کی طرح متعین ہو جائیں گے۔[3]

نوٹوں کے احکام

مسئلہ : ابتداء میں کاغذی نوٹ قرض کا عہد نامہ تھا، بعد میں سرکاری حکم کے ذریعے واجب القبول بنایا گیا، اگر عام لوگوں کو دوسرے اموال کی طرح نوٹوں کے متعلق بھی اختیار ہو کہ خریدیں یا نہ خریدیں تو یہ تمسک (سند) ہے، اور جبکہ عام لوگ اس کے قبول کرنے میں ایسا ہی مجبور ہیں جس طرح سکوں میں، تو بضرورت کاغذی نوٹ کو سکہ کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ : نوٹ اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں بلکہ جس کی طرف ان نوٹوں کو منسوب کیا گیا ہے اس کا حکم دیا جائے گا (اب ہمارے ہاں جو نوٹ ہیں، یہ چاندی کے درہم کی طرف منسوب ہیں، انھی کے مقابلے میں

وقولهما: أنظر للمقرض من قول الإمام، لأن في رد المثل إضرار به ثم قول أبي يوسف: أنظر له أيضا، لأن قيمته يوم القرض أكثر من يوم الانقطاع وهو أيسر أيضا فإن ضبط وقت الانقطاع عسر اه ملخصا. ولم يذكر حكم الغلاء والرخص، وقدمنا أول البيوع أنه عند أبي يوسف تجب قيمتها يوم القبض أيضا، وعليه الفتوى كما في البزازية والذخيرة والخلاصة، وهذا يؤيد ترجيح قوله في الكساد أيضا (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، فصل فى القرض،ج٥ ص ١٦٣).

[1] اس اختلاف کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

[2] مر تخريجه.

[3] مر تخريجه قبل.

بنایا گیا ہے لہذا چاندی کے حکم میں ہو گا، اشرفی سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ نوٹوں کو اشرفی کے مقابلے میں نہیں بنایا گیا ہے) نوٹوں کو درہم کے عوض میں کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں۔ [1]

غلط رائے کی تردید

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ایک کاغذ کی طرح ہے لہذا ایک ہزار کو دو ہزار کے عوض فروخت کرنا جائز ہے، بائع اور مشتری کو اختیار ہے کیونکہ کاغذ کی بیع ہے اور نوٹ زر کی سند ہے۔ [2]

نوٹ کے سندِ زر ہونے کی دلیل:

۱۔ نوٹ کے گم ہونے یا خراب ہونے کی صورت میں اس کا بدل ادا کرنا حکومت کے ذمہ واجب ہے۔

۲۔ بائع ذمہ دار ہے کہ مشتری جب چاہے روپے واپس لے سکتا ہے۔

۳۔ ہر نوٹ کی قیمت علیحدہ طور پر معتبر اور مرقوم ہے حالانکہ سب کی مقدار صناعت اور صورت ایک جیسی ہے۔

۴۔ اگر سند نہ ہوتی مستحق کو قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جاتا۔

لیکن ان حضرات کی یہ رائے صحیح نہیں، حضرت فخر الہند سند العلماء سید الفقہاء استاذی وملاذی ابو الحسنات محمد عبد الحیؒ رحمہ ربہ الغنی نے بھی اپنے فتاویٰ میں میرے قول کی تائید فرمائی ہے اور ان لوگوں کے

---

[1] مروجہ نوٹ کا چاندی کے ساتھ تعلق ہے نہ ہی سونے کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے تو یہ بس کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی ہے لیکن لوگوں کے عرف و تعامل اور حکومتی قوانین کی وجہ سے اس کی حیثیت ثمن عرفی کی ہوگئی ہے، اس لئے سونے وچاندی کے ساتھ اس کا کمی وبیشی کے ساتھ تبادلہ بالکل درست ہے، حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک اس کی حیثیت ثمن حقیقی یعنی سونا اور چاندی کی ہے اور آنجناب کے استاذ علامہ عبد الحہ لکھنوی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے تھی، معاصر عرب علماء میں سے بھی اکثریت کی یہی رائے ہے یہی وجہ ہے کہ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے قرارداد بھی اسی کے مطابق ہے، لیکن برصغیر پاک وہند کے جمہور مفتیان کرام کے نزدیک یہ ثمن حقیقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہی ہے لہٰذا ان حضرات کے نزدیک ثمنِ حقیقی کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے۔

نوٹ کے اسی نوعیت کے پیش نظر مؤلف رحمہ اللہ نے اس پر مختلف مسائل متفرع فرمائے، ان بارہ مسائل میں سے اکثر مسائل اسی تکییف پر مبنی ہے، لیکن اب چونکہ جمہور کی یہ رائے رہی نہیں، اس لئے ہر مسئلہ میں مختصراً جمہور کی رائے ذکر کی جائے گی، دلائل کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے تفصیلی کتب ملاحظہ فرمائیں۔

[2] برصغیر میں سے رام پور کے بعض علماء اور مولوی احمد رضا خان بریلوی صاحب کا یہی خیال تھا، خان صاحب نے اس پر "کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم" کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، جو فتاویٰ رضویہ کے ضمن میں بھی اور اس سے الگ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔

قول پر رد فرمایا ہے۔[1]

مسئلہ : نوٹ پر چاندی کے روپے کے حساب سے زکوۃ ہے کیونکہ حکماً اور قصداً نوٹ چاندی کے روپے ہیں۔[2]

مسئلہ : جب نوٹ کو نوٹ کے عوض یا چاندی کے روپے کے عوض بدلا جائے تو باعتبار قیمت مساوی ہونا شرط ہے اور باعتبار اصل وصورت مجلس میں بدلین پر قبضہ بھی شرط نہیں، تو نقد اور ادھار دونوں طرح فروخت کرنا جائز ہے۔[3]

مسئلہ : اگر چاندی یا اس کے برتن، زیورات وغیرہ نوٹ کے ذریعہ خریدیں تو تفاوت حرام ہے اور ادھار جائز ہے۔[4]

مسئلہ : جب کسی نوٹ پر سرکاری حکم سے بٹہ لگے (یعنی کمی آجائے) تو قیمت یہی سمجھی جائے گی جو اب حکومت نے مقرر کر دیا ہے اور مالکان نوٹ کا اس وقت جو نقصان ہوا وہ حکومت کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ رعایا کے مال میں حکومت کا تصرف معتبر نہیں۔[5]

---

[1] دیکھئے: مجموعۃ الفتاویٰ، ج ۲ ص ۱۳۷، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

[2] جمہور کے نزدیک نوٹ بالکل چاندی کی طرح نہیں ہے البتہ قوت خرید کے لحاظ سے جب اس کی قیمت چاندی کے منصوص نصاب تک پہنچ جائے تو دیگر شرائط کی رعایت کے ساتھ زکوۃ لازم ہوگی۔

[3] اگر نوٹ کے بدلے چاندی خریدی جائے تب تو مساوات اور تقابض کچھ ضروری نہیں، لیکن اگر نوٹ کے بدلے نوٹ کا تبادلہ ہو اور دونوں نوٹ ایک ہی ملک کے ہوں تو اس میں مساوات ہے البتہ تقابض یہاں بھی ضروری نہیں، بلکہ دونوں صورتوں میں کسی ایک جانب ملنے والے عوض پر قبضہ کر لینا کافی ہے، تقابض کے لازم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیع صرف کا خاصہ ہے اور یہ دونوں صورتیں بیع صرف کی نہیں ہیں، پہلی صورت میں چونکہ چاندی اور نوٹ کا جنس بحالت موجودہ ایک نہیں ہے اس لئے مساوات بھی کوئی ضروری نہیں جبکہ ایک ملک کے دو نوٹوں کا جنس متحد ہے اس لئے قیمتِ اسمیہ کے لحاظ سے مساوات لازم ہے اور دونوں صورتوں میں احد البدلین پر قبضہ اس لئے لازم ہے تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے جو کہ ممنوع ہے۔

[4] تفاوت بھی جائز ہے۔

[5] حکومت پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جب نوٹ ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں رواج نہ ہو تو اس کے سکہ ہونے کا حکم باقی نہ رہے گا کیونکہ قیمت وہی چاندی کا روپیہ ہے بلکہ وہ قرض کی اب سند ہو گئی۔[1]

مسئلہ: اب دوسرے قرضوں کی طرح اس کی زکوۃ بھی وصولیابی کے بعد واجب ہو گی۔

مسئلہ: اور اس کو فروخت کرنا جائز نہ ہو گا مگر یہ کہ مدیون یا اس کے وکیل کے ہاتھ فروخت کیا جائے، اور ایسی حالت میں کمی کرنا اسقاط قرض کے طور پر جائز ہے لیکن زیادتی جائز نہیں ہے۔[2]

مسئلہ: ایسے سکوں (کاغذی نوٹ) سے کچھ خریدا جائے یا یہ نوٹ واجب الادا ہو بعد میں ان کا رواج نہ رہے تو روپیہ (یعنی چاندی کا درہم) ادا کرنا لازم ہو گا۔[3]

مسئلہ: اگر نوٹ کسی کے پاس امانت ہوں یا رہن کے طور پر رکھے ہوئے ہوں یا کسی کے حکم سے خریدے ہوں، اس کے بعد ان کا رواج ختم ہو جائے تو جس کے قبضہ میں ہے وہ بعینہ اسی نوٹ کو واپس کر دے، ان پر کسی قسم کا ضمان نہیں آئے گا، لیکن اگر امین کے ذمہ اس نوٹ کو اپنے مال کے ساتھ ملانے یا صاحب مال کے مطالبہ کے بعد روکنے کی وجہ سے ضمان لازم ہو تو اب اس کی قیمت لازم ہو گی۔

مسئلہ: امانت یا نابالغ یا وقف (چاندی کے) روپے کے نوٹ خریدنے کی اسی کو اجازت ہو گی جس کو قرض دینے کی اجازت ہے۔

مسئلہ: مستحق (قرض خواہ) کے حکم یا رضامندی سے نوٹ کہیں جمع کر دئے جائیں یا روانہ کر دئے یا اپنے قبضہ سے خارج کئے جائیں اور وصول ہونے سے پہلے ہی ان کا رواج ختم ہو گیا تو مدیون (مقروض) ذمہ دار نہ ہو گا۔

مسئلہ: جس طرح چاندی کے روپے میں اختلاف معتبر ہے مثلاً سکہ انگریزی یا شاہی وغیرہ، ایسا ہی نوٹوں کا اختلاف بھی معتبر ہے نوٹ بمبئی، نوٹ کلکتہ وغیرہ۔

---

[1] دینے والے نے جب حق دار کے حوالہ کی تو اس کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اس کے بعد اگر رواج ختم ہو جائے تو حق دار کا اپنا نقصان ہے۔

[2] فروخت کرنا جائز ہے اور کمی وبیشی کا حکم پہلے تحریر کیا جاچکا۔

[3] اس کا حکم بھی پہلے لکھا جاچکا ہے۔

نوٹوں کی مختلف حیثیت

کاغذ جو سرکار انگریزی کے حکم یا اعتماد یا رضامندی سے عام روپے کی جگہ سمجھا جائے، اس کی کئی قسمیں ہیں:

ا۔ وثیقہ: یہ ایک معاہدہ ہے جسے انگریزی حکومت نے ہندوستان میں جاری کیا تھا کہ روپے کی ایک مقدار حکومت کے پاس جمع کروائے، اس کے عوض میں ماہوار یا سہ ماہی اس اور اس کے نسل کے لئے کچھ نوٹ متعین ہو جائیں گے، یہ جمع کردہ روپے (چاندی کے درہم) نہ واپس ہوں گے، نہ اس کو ہبہ کئے جا سکتے ہیں نہ ہی کسی کی ملک میں منتقل ہو سکیں گے۔

وثیقہ کا شرعی حکم

ا۔ اس وثیقہ سے ملنے والا نفع سود ہے اور عدم واپسی کی شرط بے کار اور لغو ہے (شرعاً وہ اصل رقم واپس لے سکتا ہے۔)[1]

۲۔ اصل سرمایہ جو حکومت کے پاس جمع شدہ ہے چونکہ اس کو واپس لینا قانونی طور پر ممنوع ہے اس لئے مال ضمار کے حکم میں ہے اور منافع بھی سود کی خرابی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کی امید نہیں ہے اور اس پر زکوۃ بھی واجب نہیں ہے۔[2]

۳۔ اگر مالک سود کو اصل کی نیت سے وصول کرے تو دینے کا قول اور ارادہ اس کے خلاف ہو (یعنی وہ سود کی نیت سے دے رہا ہے) تو اس کی وجہ سے مال کا لینا حرام نہ ہو گا۔[1]

---

[1] عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: "كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. السنن الكبرى للبيهقي، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، رقم الحديث:١٠٩٣٣،ج٥ ص ٥٧٣.

والقرض لا يتعلق بالجائز من الشروط والفاسد فيها لا يبطله ولكنه يلغو.مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، قبيل باب الربا،ج٢ ص ٨٣.

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، فصل في القرض،ج٥ ص ١٦٥).

[2] لا تجب الزكاة في المال الضمار عندنا خلافا لهما. وتفسير مال الضمار هو كل مال غير مقدور الانتفاع به مع قيام أصل الملك كالعبد الآبق والضال، والمال المفقود، والمال الساقط في البحر، والمال الذي أخذه السلطان مصادرة،(بدائع الصنائع ،كتاب الزكاة، الشرائط التي ترجع إلى المال،ج٢ ص ٩).

وكذا في الهداية (كتاب الزكاة،ج١ ص ٩٦).

مسئلہ: زید نے ایک ہزار (چاندی کے) روپے جمع کئے اور سو روپے وصول کرنے کے بعد ارادہ کر لیا کہ سود نہیں لوں گا، تو اب لازم ہے کہ آئندہ صرف نو سو روپیہ وصول کرے، اگر ہزار پہلے وصول کیا تو جو سو روپے پہلے لے چکا ہے وہ سود ہوگا کیونکہ دائن اور مدیون دونوں کی نیت سود ہی کی ہے البتہ بعد میں جو ایک ہزار وصول کیا وہ اس کا حلال سرمایہ ہے یہی حکم اس کی اولاد میں ہے۔

مسئلہ: اور اس پر لازم ہے کہ اپنے ورثہ کو بھی اپنے اس ارادے سے مطلع کر دے کہ میں نے آئندہ سود نہ لینے کا ارادہ کیا ہے تاکہ وہ بھی اصل سرمایہ کی مقدار سے زائد وصول نہ کریں اس کے بعد اگر ورثہ نے اصل مال سے زیادہ وصول کیا تو وہی گناہگار ہوں گے، یہ بری الذمہ ہوگا۔

مسئلہ: اگر ورثہ کو یقینی معلوم نہ ہو کہ مورث نے اصل سرمایہ میں سے کچھ وصول کیا تھا تب بھی اندازہ کر کے کچھ مقدار چھوڑ دیں۔

مسئلہ: اصل مال وصول کرنے کے بعد باقی کو چھوڑ دینا واجب ہے (لیکن اس زمانے میں فتویٰ اس پر ہے کہ بینک میں سود چھوڑنا جائز نہیں، بلکہ وصول کر کے بلانیت ثواب صدقہ کر دے۔ از ابن شائق)[2]

سودی نوٹ کا حکم

مسئلہ: یہ یقینی طور پر سند کے حکم میں ہے۔

مسئلہ: ان کی بیع و شراء مدیون (قرض لینے والا) کے علاوہ کسی اور کے ساتھ ناجائز ہے۔[3]

---

[1] أن كل من يقضي له بالنفقة عند غيبة من عليه جاز له أن يأخذ إذا قدر بلا قضاء، فالوالدان والولد والزوجة إذا قدروا على مال من جنس حقهم جاز لهم أن ينفقوه على أنفسهم إذا احتاجوا. (فتح القدير ،باب النفقة،ج٤ ص ٤٢٣).

للغريم أن يأخذ منهما(اي من الدراهم والدنانير) إذا ظفر بهما، وهما من جنس حقه.تبيين الحقائق،كتاب الزكاة،ج١ ص ٢٥٥.

لكن رأيت في شرح نظم الكنز للمقدسي من كتاب الحجر. قال: ونقل جد والدي لأمه الجمال الأشقر في شرحه للقدوري أن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس كان في زمانهم لمطاوعتهم في الحقوق. والفتوى اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أي مال كان لا سيما في ديارنا لمداومتهم للعقوق: (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب السرقةج٤ ص ٩٥).

[2] تفصیلی فتویٰ کے لئے ملاحظہ فرمائیں: احسن الفتاویٰ، باب الربا والقمار، عنوان "بنک میں سود چھوڑنا جائز نہیں" ج۷ ص۱۸،۱۷،۱۶۔

[3] وأفتى المصنف ببطلان بيع الجامكية، لما في الأشباه بيع الدين إنما يجوز من المديون،(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع،مطلب في بيع الجامكية،ج ٤ ص ٥١٧).

وبيع الدين لا يجوز، ولو باعه من المديون أو وهبه جاز (الأشباه والنظائر لابن نجيم ،الفن االثالث، انواع الديون،ص ٣٠٩).

مسئلہ : اس سے جو منافع ملے، وہ سود ہونے کی بناء پر حرام ہے۔[1]

مسئلہ : ایسے نوٹ فروخت کرنا ہو تو اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ حکومت جو خریدے قیمت کم دے تو گویا قرض کا کچھ حصہ معاف کر دیا تو یہ جائز ہے، لیکن اگر قیمت مقدار سے زائد وصول کیا تو زائد کا استعمال سود ہونے کی بناء پر ناجائز ہے۔

۲۔ کوئی دوسرا خریدے لیکن سونا چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کو قیمت ٹھہرائے تا کہ یہ نوٹ ثمن کا حوالہ قرار پائے عین ثمن نہ ہو۔

۳۔ بائع (چاندی کا) روپیہ قرض لے کر نوٹ کو بطور سند دہانید حوالہ کرے، ان تمام صورتوں میں نوٹ دینا گویا بطور سند دہانید ہے۔

مسئلہ: سود سے بچنے کے لئے مذکورہ بالا تدبیر یہاں بھی کافی ہے۔

ٹکٹ کا حکم

یہ اجرتی رسید ہے تا کہ کام کرنے والے کو بلا تردد حسب معاہدہ آسانی کے ساتھ یہ ٹکٹ وصول ہو جیسے ریل یا ڈاک کے ٹکٹ۔

مسئلہ : چونکہ ان ٹکٹوں کے استعمال کی حاجت بہت زیادہ اور عرف غالب ہے، دوسرے اموال کی طرح ان کی بیع بھی جائز ہے، نقد ہو یا ادھار، اسی طرح کمی یا زیادتی کے ساتھ ہو۔[2]

---

[1] لانه حصل بقرض شرط فيه المنفعة وهو ربا صراح كما مر.

[2] مروجہ ٹکٹ کا تبادلہ در حقیقت اجارہ ہے اور ٹکٹ کی حیثیت ایک اجرتی رسید ہی کی ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ حامل ٹکٹ کو خاص منفعت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے، جہاں تک کمی وزیادتی کے ساتھ دینے کا مسئلہ ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اصل ٹکٹ جاری کرنے والے تو کسی بھی قیمت پر اس کو جاری کر سکتے ہیں کیونکہ پیسے دیکر ٹکٹ وصول کرنا اجارہ ہے اور اجرت مقرر کرنے میں لین دین کرنے والے خود مختار ہیں، البتہ جس شخص نے ان سے ٹکٹ حاصل کر لیا وہ اگر اپنا یہ ٹکٹ کسی اور پر فروخت کرنا چاہے تو اصل قیمت یا اس سے کم قیمت پر تو فروخت کر سکتا ہے لیکن جس قیمت پر خود لیا ہے اس سے زیادہ پر لینے کی صورت میں حنفیہ کے نزدیک یہ زیادتی اس کے حلال نہیں ہے بلکہ اس کو صدقہ کرنا چاہئے البتہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے۔

وإذا استأجر دارا وقبضها ثم آجرها فإنه يجوز إن آجرها بمثل ما استأجرها أو أقل، وإن آجرها بأكثر مما استأجرها فهي جائزة أيضا إلا إنه إن كانت الأجرة الثانية من جنس الأجرة الأولى فإن الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها، وإن كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة.(الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة،الباب السابع في إجارة المستأجر،ج٤ص ٤٢٥).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب الاجارة، الفصل السابع: في إجارة المستأجر،ج٧ ص ٤٢٩).

مسئلہ : تجارت کی نیت کے بغیر بھی ان میں زکوۃ واجب ہے اس لئے کہ حکم نفی میں ہے۔[1]

مسئلہ :ان کاغذات سے اگر فائدہ حاصل نہ کرے تو آپ میں معاہدات قانونی کی پابندی شرط ہے۔

مسئلہ :ایسے ٹکٹ کو حکومت کی اجازت کے بغیر مقدار حق سے زیادہ استعمال شرعاً ممنوع ہے۔[2]

خلافِ قانون ٹکٹ کا استعمال

مسئلہ : ریلوے کے مستقل[3] ٹکٹ کو دھوکہ سے دوبارہ استعمال کرنا، جہاں تک کا ٹکٹ لیا ہے اس سے زیادہ دور کا سفر کرنا، یا ایک ٹکٹ پر جتنے سامان لے جانے کی اجازت ہے اس سے زیادہ سامان لے جانا، ادنی درجہ کا مال اعلیٰ درجہ میں بھیجنا، یا ادنی درجہ کا ٹکٹ خرید کر اعلیٰ درجہ میں سفر کرنا، یا سامان کے بنڈل وغیرہ میں خط کا رکھنا، اسی طرح وہ تمام کام جو حکومت کی طرف سے ممنوع ہیں، اگر لاعلمی یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کی امید ہے[4] اگر قصداً یہ کام کئے، قضاءً و دیانۃً چونکہ قوانین پر عمل کرنا لازم ہے[5] اس لئے اتنا کرایہ حساب کر کے حکومت کے کھاتہ میں واپس کرے۔[6]

---

۱ مروجہ ٹکٹ کی حیثیت چونکہ اجارہ کے رسید کی ہے جیسا کہ ابھی تحریر کیا گیا اس لئے نیت تجارت کے بغیر اس میں زکوۃ لازم نہیں۔

۲ کیونکہ اجازت کی حد تک ہی اجارہ منعقد ہوا ہے، اجازت کی مقدار سے زیادہ منفعت وصول کرنا خیانت اور مالک کی رضامندی کے بغیر چوری چھپکے اس کی چیز استعمال کرنا ہے جس کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

۳ کاتب کی غلطی ہے، اصل لفظ "مستعمل" ہونا چاہیئے۔

٤ توبہ کرنے سے گناہ کے مغفرت کی توامید ہے لیکن کرایہ جمع کرنا ضروری ہے جیسا قصداً استعمال کرنے کی صورت میں مؤلف رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

٥ ان صورتوں کے ناجائز ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر دھوکہ سے اس کا استعمال کیا جارہا ہے۔

رجل استأجر دارا شهرا فسكنها شهرين ذكر في الأصل أنه لا يلزمه أجر الشهر الثاني ولم يفصل بين المعد للاستغلال وغيره فإنه ذكر المسألة في الحمام وأجاب كما ذكر في الدار والحمام معد للاستغلال وفي بعض الروايات قال يلزمه اجر الشهر الثاني ومن أصحابنا من فرقوا بين الروايتين فقالوا إذا لم يكن معد للاستغلال لا يلزمه أجر الشهر الثاني كما قال في الكتاب وإن كان معد للاستغلال يلزمه أجر الشهر الثاني سواء استأجر حماما أو دارا أو أرضا وعليه الفتوى(فتاوى قاضيخان ،كتاب الإجارات،فصل في الألفاظ التي تنعقد بها الإجارة، ج٢ ص ١٥٤).

من استعمل مال غيره بدون عقد ولا إذن فإن كان معدا للاستغلال لزمته أجرة المثل وإلا فلا , لكن لو استعمله بعد مطالبة صاحب المال بالأجرة لزمه إعطاء الأجرة وإن يكن معدا للاستغلال لأنه باستعماله في هذا الحال يكون راضيا بإعطاء الأجرة. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ٤٧٢ ،ص٩٠).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة، ج٦ ص ٨٤).

سرکاری قوانین کا حکم

سرکاری قوانین تین شرطوں سے عام ہوتے ہیں اور ہر ایک پر لاگو ہوتے ہیں:

۱۔ان قوانین کا کافی اعلان کیا گیا ہو۔

۲۔یہ قوانین شرعی قوانین کے خلاف نہ ہوں بلکہ مباحات سے متعلق ہوں۔[1]

۳۔یہ قوانین انتظامی امور سے متعلق ہوں، تجارتی حیثیت سے نہ ہوں، پس ریل اور ڈاک کے اکثر قوانین تجارتی ہیں، ایسے قوانین کا تعلق احکام شرعیہ کے لحاظ سے ایسے لوگوں سے ہے جو قوانین سے واقف ہوں یا جن کو ان محکموں سے ملازمت کا تعلق ہوں، یہ قوانین ہر ایک کے لئے عام نہیں ہے۔

اسٹامپ کا شرعی حکم

اسٹامپ[2] جن کا کوئی معتبر معاوضہ نہیں ہے عام طور سرکاری قانون کے تحت جاری کئے گئے ہیں، ضرورۃ اب دوسرے مالوں کی طرح ان کو فروخت کرنا بھی جائز ہے، نقد یا ادھار، اسی طرح کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا بھی جائز ہے۔[3]

ہنڈی اور منی آرڈر کا حکم

ہنڈی اور منی آرڈر یہ ایک سند ہے اس کے ذریعے آدمی ہر جگہ روپیہ بھیج سکتا ہے، اس کے جواز وعدم جواز کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں جو باہم متعارض ہیں، میرے نزدیک اکابرین امت سے اس بارے میں کوئی روایت منقول نہیں ہے، سفتجہ جس کی کراہت منقول ہے وہ ہنڈی نہیں ہے، ہنڈی کو غرض بیع یا امانت قرار دے کر فاسد یا مکروہ سمجھنا ایک زبردستی والی بات ہے، بلکہ ہنڈی حوالہ ہے جس کے

---

[1] إلا أن يأمرهم بمعصية فلا تجوز طاعتهم إياه فيها؛ لقوله عليه الصلاة والسلام لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق(بدائع الصنائع،كتاب السير، بيان ما يندب إليه الإمام عند بعث الجيش أو السرية إلى الجهاد،ج٧ ص ٩٩).

وكذا في شرح السير الكبير. (باب ما يجب من طاعة الوالي وما لا يجب،ج١ص ١٦٥).

[2] اسٹام،اسٹامپ: دستاویز لکھنے کا سرکاری کاغذ جس پر سکہ مع قیمت چھپا ہوتا ہے۔(فیروز اللغات، ص٩٣)۔

[3] لانه مال متقوم فيجوز بيعه كما قال الكمال رحمه الله: "لو باع كاغدة بألف يجوز ولا يكره "(فتح القدير،كتاب الكفالة،ج٧ ص ٢١٢).

وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب الكفالة،ج٢ ص ٣٠٤).

لئے کچھ اجرت متعین کی گئی ہے، محتال علیہ یا وکیل کو بعض امور متعلقہ کی اجرت لینا جائز ہے کیونکہ اس کی ممانعت منقول نہیں ہے۔[1]

لہٰذا کچھ اجرت لی جائے اور جس مقام پر جس وقت جسے دینا شرط طے پایا جائے، دیدیا جائے، اس کی نظیر منقول ہے جیسے ہبہ بالعوض کہ ابتداءً تبرع ہے مگر انتہاءً اس کا عوض لیا جاتا ہے اور ہنڈی کے حرام ہونے کے دلائل سے صرف نظر لازم ہے کیونکہ ایسے دلائل ہرگز قابل تسلیم نہیں جو ہنڈی کے ممنوع اور مکروہ ہونے کے موجب ہوں تاکہ تجارت میں توسع اور معاملات میں آسانی پیدا ہو اور اموال کی حفاظت ہو سکے، عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچانا اور ان کو تنگی اور حرج سے بچانا ہمیشہ شارع علیہ السلام کے پیش نظر رہا ہے۔

ہنڈی کی جائز و ناجائز صورتیں:

۱۔ منی آرڈر: جس کے پاس روپیہ بھیجنا ہو اسے گھر بیٹھے ایک وقت مقررہ پر رقم مل جاتی ہے۔

۲۔ درشنی ہنڈی: یعنی فوراً قابل ادائیگی، محتال علیہ کو رسید دکھادی تو وہ فوری طور پر رقم ادا کردے۔

۳۔ روپے اتنی مدت کے بعد ملے گا اگر فوری لینا ہو تو اس پر سود دینا ہوگا، اس میں مدت مقرر کرنے میں تو کوئی حرج نہیں البتہ سود کی شرط حرام ہے اس سے بچنا لازم ہے، مدت کی تعیین ایسی ہے جیسے حوالہ میں مدت متعین ہے اور اجیر کے لئے بھی مدت عمل کا تقرر درست ہے۔

۴۔ مہاجن سے روپیہ لے لیا جائے اس کے بعد کسی کے نام چٹ لکھ دیا کہ فلاں سے فلان شہر میں اتنے روپیہ لے لو، اگر وہ نہ دے تو میں ذمہ دار ہوں، یہ بھی حوالہ ہے اس میں مقررہ رقم سے زیادہ لینا سود ہوگا۔[2]

---

[1] نظیرہ ما قالوا "یجوز للقاضي أخذ الأجرة على كتبه السجلات والمحاضر وغيرها من الوثائق بمقدار أجرة المثل وذلك لأن القاضي إنما يجب عليه القضاء وإيصال الحق إلى مستحقه فحسب أما الكتابة فزيادة عمل يعمله للمقضى له وعلى هذا قالوا لا بأس للمفتي أن يأخذ شيئا على كتابة جواب الفتوى وذلك لأن الواجب على المفتي الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان".(لسان الحكام، الفصل الأول في آداب القضاء وما يتعلق به ،ص٢١٩).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (قبيل كتاب الشهادات، ج٥ ص ٤٦١).

[2] مدیون کے کہنے سے کفالہ یا حوالہ لینا در حقیقت قرض دینا ہے بلکہ قرض دینے کا التزام اور وعدہ کرنا ہے اس پر اصل مقدار سے زیادہ لینا سود ہے۔وإذا أمر رجل رجلا بأن ينقد عنه فلانا ألف درهم فنقدها؛ رجع بها على الآمر؛ لأن هذا من الآمر استقراض من المأمور

۵۔ زید کے نام ایک متعین مقدار کی ہنڈی کلکتہ لکھدی اور مہاجن کے حوالہ کر دی، ابھی تک مہاجن سے روپیہ وصول نہیں ہوا، اب مہاجن زید سے مطالبہ کرے گا، اگر وہ ہنڈی وصول ہو گئی تو روپیہ لکھنے والے دیں گے مگر ہر دو صورت میں ایک متعین مقدار کا مستحق ہے، یہ اجرت ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔[1]

بیع مقائضہ کا حکم

اسباب کو اسباب کے مقابلہ میں فروخت کرنا(کتاب الوکالة من الهداية" وكذا المقايضة بيع من وجه وشراء من وجه" وفي الحاشية " لانه من حيث ان في اخراج السعلة من الملك بيع ومن حيث ان فيه تحصيل السلعة في الملك شراء" انتهى)[2]

مطلب مقائضہ یہی ہے کہ دونوں عوضین میں سے کوئی ایک بھی ثمن نہ ہو بلکہ دونوں اسباب ہوں، اس میں دونوں بدل مبیع دونوں عاقدین بائع ہیں، اس میں مشتری اور ثمن کے جو مخصوص احکام ہیں، وہ جاری نہ ہوں گے۔

مسئلہ : ایجاب و قبول مکمل ہونے کے بعد دونوں کو ایک ساتھ قبضہ کا حق حاصل ہے۔[3]

مسئلہ : دونوں عوضین میں تعین شرط ہے(کہ کونسی چیز ہے کتنی مقدار میں ہے) قبضہ ہو یا نہ ہو۔[4]

وأنه لا يتحقق نقده عنه إلا بعد أن يكون المنقود ملكا له ولا يصير ملكا له بالاستقراض منه فكأنه استقرض منه الألف ووكل صاحب دينه بأن يقبض له ذلك أولا ثم لنفسه؛(المبسوط للسرخسي ،كتاب الكفاله،باب الأمر بنقد المال،ج٢٠ ص ٥٥)
وكذا في بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، بيان ما يجوز من التصرف في المسلم فيه وما لا يجوز ،ج٥ ص ٢١٤).

[1] مؤلف رحمہ اللہ نے شرح وقایہ کے حاشیہ میں اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے، مزید کلام کے لئے اس کو ملاحظہ فرمائیں: (تكملة عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية، قبيل كتاب القضاء، ج٣ص١٢٠).

[2] الهداية (كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء،ج٣ ص ١٤٥).
وكذا في البحر الرائق (كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء،ج ٧ ص ١٦٧).

[3] ولو تبايعا عينا بعين سلما معا لما ذكرنا أن المساواة في عقد المعاوضة مطلوبة للمتعاوضين عادة، وتحقيق المساواة ههنا في التسليم معا،(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، حكم البيع،ج٥ ص ٢٣٨).
وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب البيوع،ج٢ ص ٨).

[4] کیونکہ بیع مقائضہ میں ہر عوض من وجہ مبیع ہوتا ہے اور مبیع کو متعین کرنا ضروری ہے، بیع صرف کے علاوہ دیگر بیوعات میں قبض کرنا ضروری نہیں تاہم مبیع میں تاجیل کی شرط لگانا بھی مفسد ہے اس لئے اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔(الا فی السلم والا ستصناع)۔

بیع سلم

بیعِ سلم وہ بیع ہے جس میں ثمن کی ادائیگی نقد ہوتی ہے جب کہ مبیع ادھار، اس عقد کو سلم، مشتری کورب السلم، ثمن کوراس المال، بائع کو مسلم الیہ اور مبیع کو مسلم فیہ کہتے ہیں۔ [1]

بیع سلم کی شرائط

بیع سلم جائز ہونے کی آٹھ شرطیں ہیں:

شرط نمبر 1: مدت کا متعین ہونا جو بعض ائمہ کے نزدیک تین دن ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایک ماہ ہے اور یہی صحیح ہے۔ [2]

مسئلہ: اگر سلم کی مدت نہ ہو تو وہ بیع ہو گی بیع سلم نہ ہو گی۔

شرط نمبر 2: مسلم فیہ کے اوصاف معلوم ہوں یعنی جنس اور نوع کو بیان کر دیا جائے جیسے تنزیب فلان قسم کی گندم، فلان شہر کی فلان قسم کی۔ [3]

مسئلہ: ایسی چیز جس میں اوصاف متعین نہ ہو یا جنس نوع وغیرہ مذکور نہ ہو، اس میں سلم جائز نہیں۔ [1]

قال محمد في الجامع الكبير:رجل اشترى من آخر عبداً بكر حنطة بعينها وتقابضا فهلك العبد، ثم إنهما تقايلا العقد فيما بينهما جازت الإقالة؛ لأن الكر لما كان متعيناً كان هذا بيع العين بالعين، وفي بيع العين بالعين كل واحد منهما مبيع في حق نفسه ثمن في حق ما يقابله؛ لأن العقد لا بد له من معقود عليه، وليس أحدهما بأن يجعل معقوداً عليه أولى من الآخر فجعلنا كل واحدمن العوضين مبيعاً في حق نفسه ثمناً في حق ما يقابله. المحيط البرهاني ،كتاب البيوع، الفصل العشرون في الإقالة،ج٧ ص ٥٢.

وكذا في الهدايه (قبيل باب المرابحة والتولية، ج٣ص٥٦).

[1] هو بيع آجل بعاجل (ملتقى الأبحر، كتاب البيوع،باب السلم،ص ١٣٧).

وكذا في اللباب في شرح الكتاب (كتاب البيوع،باب السلم،ج٢ ص ٤٢).

[2] والأجل شرط لجواز السلم عندنا وأدناه شهر هو المختار(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ٥٨).

في الدر المختار: (وشرطه) أي شروط صحته التي تذكر في العقد سبعة (بيان جنس.. (وأجل وأقله) في السلم (شهر) به يفتى.وفي رد المحتار تحته:(قوله به يفتى) وقيل ثلاثة أيام وقيل أكثر من نصف يوم، وقيل ينظر إلى العرف في تأجيل مثله والأول أي ما في المتن أصح وبه يفتى زيلعي وهو المعتمد بحر وهو المذهب.(كتاب البيوع، باب السلم،ج٥ ص ٢١٤).

[3] شرائط السلم ثمانية اشياء في قول ابي حنيفة أولها ان يعين الجنس حنطة او شعيرا، والثاني أن يعين المقدار كيلا او وزنا.. والرابع ان يبين الصفة جيدا او رديئا او وسطا (النتف في الفتاوى للسغدي،باب السلم، شرائط السلم،ج١ ص ٤٥٩).

مسئلہ : جو چیز مثلی نہ ہو (مثلاً حیوان وغیرہ) ان میں سلم جائز نہیں۔[2]

شرط نمبر 3: مسلم فیہ ثمن (یعنی سونا چاندی کے جنس سے) نہ ہو بلکہ مثمن ہو۔[3]

شرط نمبر 4: مسلم فیہ وزنی، کیلی یا ذرعی (یعنی گز کے ذریعہ ناپی جاتی ہو) یا عددی ہو تاکہ اندازہ متعین ہو سکے۔[4]

مسئلہ : عددی متقارب یا ذرعی متقارب یعنی مثلی کو وزن یا کیل سے فروخت کرنا۔

مسئلہ : حیوانات اور دیگر ذوات القیم چیزوں میں اوصاف کے ذریعہ تعیین ممکن نہ ہونے کی وجہ سے بیع سلم جائز نہیں ہے۔[5]

مسئلہ : جواہرات میں بیع سلم جائز نہیں، اگرچہ وزن ان میں معتبر ہے کیونکہ ان کے افراد میں حسن وصفات کے لحاظ سے بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے۔[6]

مسئلہ : چھوٹی موٹی چیزیں جو عدد یا وزن سے بکتی ہیں، ان میں بیع سلم جائز ہے بشرطیکہ ان کی شناخت اور

---

[1] وكل ما أمكن ضبط صفته ومعرفة مقداره جاز السلم فيه وما لا يمكن ضبط صفته ولا يعرف مقداره لا يجوز السلم فيه(مختصر القدوري ،كتاب البيوع، باب السلم،ص٨٩).

له: (وما لا يمكن ضبطه ولا معرفة مقداره لا يجوز السلم فيه) لأنه مجهول يفضي إلى المنازعة. (الجوهرة النيرة ،كتاب البيوع، باب السلم،ج١ص ٢٢٠).

[2] مثلی ہونا کوئی ضروری نہیں بلکہ کسی چیز کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ اس کی صفات و مقدار کو اچھی طرح متعین کیا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے بہت سے ذوات القیم اشیاء میں بھی بیع سلم کی اجازت دی ہے بلکہ خود کتاب الاصل میں اس کے جزئیات موجود ہیں، تاہم چونکہ عام طور پر مثلی اشیاء کے صفات و مقدار کو طے کرنا آسان ہوتا ہے اور قیمی اشیاء کے صفات کو مکمل طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا اس لئے بعض کتابوں میں یہاں مثلی اور قیمی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

قيد بالمتقارب ومنه الكمثرى والمشمش والتين لأن العددي المتفاوت لا يجوز السلم فيه، وما تفاوتت ماليته متفاوت، كالبطيخ والقرع والرمان والسفرجل وغيرها؛ فلا يجوز السلم في شيء منها عددا للتفاوت إلا إذا ذكر ضابطا غير مجرد العدد كطول وغلظ وغير ذلك كما في البحر وغيره. (مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ٩٨).

[3] خرج بقوله (مثمن) الدراهم والدنانير لأنها أثمان فلم يجز فيها السلم خلافا لمالك(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب السلم،ج ٥ ص ٢٠٩).

[4] مرّ تفصيله وتخريجه في الشرط الثاني انفا.

[5] أيضا.

[6] أيضا.

تعیین میں جوہریوں کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ان میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ [1]

مسئلہ : کسی ایسے پیمانے یا وزن سے بیع سلم جائز نہیں جس کے ختم ہونے کی صورت میں اس وزن کو پہچاننا مشکل ہو۔ [2]

شرط نمبر ۵ : اور ضروری ہے کہ بیع کے وقت سے لے کر ادا کے وقت تک **مسلم فیہ** بازار میں دستیاب رہے تاکہ بیع معدوم لازم نہ آئے۔ [3]

مسئلہ : جس موسم میں پھل نہ درختوں پر ہوں نہ بازار میں، ان کو بیع سلم کے طور پر فروخت کرنا جائز نہیں۔ [4]

مسئلہ : مسلم فیہ کو ایسے چیز کی طرف منسوب کرنا جو اس کو خاص کردے، جائز نہیں، جیسے اسی کھیت یا اسی مخصوص گاؤں کا گندم ہوگا، کیونکہ اس میں **مسلم فیہ** کے ہلاک ہونے کا خطرہ زیادہ ہے، ہاں البتہ کسی شہر کی طرف منسوب کرنے میں **مسلم فیہ** کو ہلاکت کا خطرہ کم ہو تو اس کے لئے نسبت جائز ہے، اسی طرح فلان شہر کی مصنوعات یا فلاں کارخانہ کی مصنوعات کہنا بھی معتبر ہے صناعت خاص نہ ہو۔ [5]

شرط نمبر ۶ : مسلم فیہ ایسی چیز ہو جس کے بار برداری کا خرچہ برداشت کرنا پڑے تو مسلم فیہ حوالہ کرنے کا مقام متعین کرنا ضروری ہے ورنہ مکان عقد خود بخود حوالگی کے لئے متعین ہو جائے گا، مگر یہ بات جہاں

---

[1] أيضا.

[2] (ولا يصح بمكيال بعينه لا يعرف مقداره) لأنه ربما هلك المكيال قبل حلول الأجل فيعجز عن التسليم. وكذا ذراع بعينه، أو وزن حجر بعينه، ولا بد أن يكون المكيال مما لا ينقبض وينبسط كالخشب والحديد ليكون معلوما فلا يؤدي إلى النزاع. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ٣٧)
وكذا في ملتقى الأبحر (كتاب البيوع، باب السلم،ص ١٤٠)

[3] قال أصحابنا: لا يصح السلم حتى يكون المسلم فيه موجودًا من حين العقد إلى حين المحل. (التجريد للقدوري ،كتاب البيوع، اشتراط وجود المسلم فيه ...،ج ٥ ص ٢٦٥٨).
وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب السلم،ج٥ ص ٢١٢).

[4] لفوات الشرط الخامس المتقدم.

[5] (وبر قرية وتمر نخلة بعينه) أي لا يجوز السلم فيهما لاحتمال أن يعتريهما آفة فلا يقدر على تسليمها وإليه أشار عليه السلام بقوله إذا منع الله الثمرة فبم يستحل أحدكم مال أخيه ولو كانت النسبة لبيان النوع بأن كان له نظير فلا بأس به وكذا إذا نسبه إلى إقليم لا يتوهم انقطاعه كالشام والعراق. (تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٤ ص ١١٤).
وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب السلم،ج٦ص ١٧٣).

چاہے دے کر فارغ ہو جائے، تو یہ رب السلم (مشتری) کے رضاء پر موقوف ہے۔
صحیح بات یہ ہے کہ مشتری ہر قسم کے مسلم فیہ میں ادائیگی کا مقام متعین کرا سکتا ہے کیونکہ اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔[1]

شرط نمبر 7: راس المال کو پورا پورا مجلس عقد میں ادا کرنا ضروری ہے ورنہ مسلم فیہ میں سلم نہ ہو گا۔[2]

مسئلہ: بیس من گندم دس ہزار میں خریدا اس میں دس من نقد حوالہ کر دیا، اب سلم صرف دس من میں ہو گا۔[3]

شرط نمبر ۸: راس المال اور مسلم فیہ میں تبدیلی جائز نہیں ہے یعنی اگر کسی وجہ سے مسلم فیہ ادا نہ ہو سکے یا اقالہ کر لیا جائے تو رب السلم (مشتری) اپنا راس المال ہی واپس لے گا دوسری کوئی چیز نہیں لے سکتا، ہاں اگر مسلم فیہ (بائع) مجبور ہو جائے مثلاً راس المال ثمن تھا، جس کی ادائیگی پر قدرت نہیں، لیکن دوسری کوئی چیز دینے پر قدرت ہے یا راس المال مثمن (اجناس) تھا لیکن خرچ ہو گیا تو اس صورت میں اس کی قیمت دینا جائز

---

[1] وكل شيء من السلم له حمل ومئونة فلا بد من أن يشترط المكان الذي يوفيه فيه، فإن لم يشترط ذلك فسد السلم في قول أبي حنيفة.. وكل شيء ليس له حمل ولا مئونة فلا بأس بالسلم فيه ولا يشترط المكان الذي يوفيه. قال يعقوب ومحمد: ما كان له حمل ومئونة وما لم يكن له حمل ولا مؤنة سواء. (كتاب الأصل للامام الشيباني ،كتاب البيوع والسلم،ج٢ ص ٣٧٤ ط قطر)

وأما ما ليس له حمل، ومؤونة كالمسك والكافور ونحوهما لا يشترط ذلك بالإجماع، وهل يتعين مكان العقد؟ عنه روايتان، الأصح أنه يتعين، ولو شرط له مكانا قيل لا يتعين لعدم الفائدة، وقيل يتعين للفائدة، لأن قيمة العنبر في المصر أكثر منها في السواد، ولأن فيه أمن خطر الطريق. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ٣٥).

في الجامع الصغير: كل شيء أسلم فيه له حمل ومؤنة ولم يشرط مكان الإيفاء فهو فاسد وما لم يكن له حمل ومؤنة فهو جائز ويوفيه في المكان الذي أسلم فيه وهذا قول أبي حنيفة (رضي الله عنه) وقال أبو يوسف ومحمد (رحمهما الله) وكذلك ماله حمل ومؤنة فهو جائز وان يشرط مكان الايفاء. وفي النافع الكبير تحته: قوله في المكان الذي أسلم فيه ما ليس له حمل ومؤنة لا يشترط بيان مكان الإيفاء فيه لصحة العقد بالإجماع لكن هل يتعين مكان العقد مكانا للايفاء ذكر ههنا انه يتعين وذلك في كتاب الإجارات أنه لا يتعين فإنه قال يوفيه فى أي مكان شاء وبه أخذ بعض مشايخنا قوله فهو جائز هذا الاختلاف مبني على أن مكان العقد هل يتعين مكانا. .باب السلم،ص٣٢٣.

[2] رجل أسلم إلى رجل مائتي درهم في كرحنطة مائة منها دين على المسلم إليه ومائة نقد فالسلم في حصة الدين باطل (الجامع الصغير مع شرحه النافع الكبير ،باب السلم،ص ٣٢٣).

ولا يصح السلم حتى يقبض رأس المال قبل أن يفارقه.(مختصر القدوري ،كتاب البيوع، باب السلم،ص ٨٨).

[3] انظر الحاشية المتقدمة.

ہے بشرطیکہ کچھ زیادتی نہ کرے۔[1]

مسئلہ : راس المال پر قبضہ سے پہلے اس میں کسی کو شریک کرنا یا اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں۔[2]

مسئلہ : اگر راس المال مثلی چیزوں سے نہ ہو تو اس کی قیمت لگا لینا بھی مناسب ہے تاکہ واپسی کی صورت میں قیمت کی تعیین میں جھگڑا پیش نہ آئے۔

مسئلہ : اگر رأس المال قدری (یعنی کیلی یا وزنی) ہو تو اس کی مقدار کا ذکر بھی ضروری ہے۔[3]

مسئلہ : اگر رأس المال کا کوئی مستحق نکل آئے اور مالک اجازت نہ دے یا مسلم فیہ بازاروں سے ختم ہو جائے، دونوں صورتوں میں عقد سلم باطل ہو جائے گا۔[4]

مسئلہ : مسلم فیہ دستیاب نہ ہو یا مسلم الیہ (بائع) مسلم فیہ کی ادائیگی سے عاجز ہو جائے تو رب السلم (مشتری) یا تو انتظار کرے یا راس المال کو واپس لے ورنہ تو اس کی قیمت واپس لے۔[1]

---

[1] (ولا يصح التصرف في رأس المال والمسلم فيه قبل القبض بشركة أو تولية) لأن المسلم فيه مبيع والتصرف في المبيع المنقول قبل القبض لا يجوز ورأس المال مستحق القبض في المجلس والتصرف فيه مفوت له فلم يجز(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٦ ص ١٧٩).

وكذا في فتح القدير (كتاب البيوع، باب السلم،ج ٧ ص ١٠١).

[2] ولا يجوز التصرف في المسلم فيه قبل القبض ولا في رأس المال قبل القبض. الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ص ٣٨.

(ولا يصح التصرف في رأس المال والمسلم فيه قبل القبض بشركة أو تولية) لأن المسلم فيه مبيع والتصرف في المبيع المنقول قبل القبض لا يجوز ورأس المال مستحق القبض في المجلس والتصرف فيه مفوت له فلم يجز.(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٦ ص ١٧٩).

ولا يجوز التصرف في رأس المال ولا في المسلم فيه قبل قبض (مختصر القدوري ،كتاب البيوع، باب السلم،ص ٨٨).

وكذا في الجوهرة النيرة ،كتاب البيوع، باب السلم،ج١ ص ٢١٩.

[3] (و) السادس بيان (قدر رأس المال إن كان كيليا أو وزنيا أو عدديا) أي وشرطه بيان قدر رأس المال إذا كان العقد يتعلق على مقداره وإن كان مشارا إليه عند الإمام (مجمع الأنهر، كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ١٠١).

وكذا في اللباب في شرح الكتاب (كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ٤٣).

[4] وإن استحق رأس المال فأجاز المستحق قبل الافتراق أو بعده جاز وإن لم يجز أخذ دراهمه إن كان قبل الافتراق واستبدل جاز وإن كان بعد الافتراق لم يجز (فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ ص ٦٢).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع،الباب الثامن عشر في السلم، الفصل الأول،ج٣ ص ١٧٨).

مسئلہ : سلم میں خیار رؤیت اور خیار شرط نہیں ہے۔[2]

مسئلہ : اگر مسلم الیہ انتقال کر جائے تو مدت پوری ہونے سے پہلے بھی رب السلم مسلم فیہ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔[3]

مسئلہ : مسلم الیہ کی طرف سے وکیل مقرر کرنا جائز نہیں البتہ سفیر مقرر کرنا جائز ہے۔[4]

بیع مزایدہ (نیلام) کے احکام

نیلام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔[5]

---

١ "فإن تقايلا السلم لم يكن له أن يشتري من المسلم إليه برأس المال شيئا حتى يقبضه كله" لقوله عليه الصلاة والسلام: "لا تأخذ إلا سلمك أو رأس مالك" أي عند الفسخ، ولأنه أخذ شبها بالمبيع فلا يحل التصرف فيه قبل قبضه(الهداية ،كتاب البيوع، باب السلم، ج٣ ص ٧٤).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب البيوع، باب السلم، ج ٢ ص ١٠٣).

٢ خیار رؤیت اور خیار عیب بیع سلم میں بھی حاصل ہوتے ہیں، البتہ خیار شرط کو مجلس ہی میں ختم کرنا ضروری ہے جیسا کہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا۔

(أما) الذي يرجع إلى نفس العقد فواحد وهو أن يكون العقد باتا عاريا عن شرط الخيار للعاقدين أو لأحدهما، لأن جواز البيع مع شرط الخيار في الأصل ثبت معدولا به عن القياس..بخلاف خيار الرؤية والعيب؛ لأنه لا يمنع ثبوت الملك فلا يمنع صحة القبض،(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، السلم،شرائط الركن،ج٥ ص ٢٠١).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع،الباب الثامن عشر في السلم، الفصل الأول،ج٣ ص ١٧٨).

٣ ولا يبطل الأجل بموت رب السلم ويبطل بموت المسلم إليه حتى يؤخذ المسلم من تركته حالا. (البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب السلم، ج٦ص ١٧٤).

(ويبطل) الأجل (بموت المسلم إليه لا بموت رب السلم فيؤخذ) المسلم فيه (من تركته حالا) لبطلان الأجل بموت المديون لا الدائن.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب السلم،ج ٥ص ٢١٥).

٤ اس کا کوئی صریح جزئیہ تو نہیں ملا، البتہ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلم فیہ مسلم الیہ کے ذمہ دین ہے جو اس نے رب المال کو ادا کرنا ہے، وکیل چونکہ خرید و فروخت وغیرہ معاملات کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس لئے اگر وہ اپنی طرف سے اس طرح مسلم فیہ حوالہ بھی کرے تو بھی مسلم الیہ کا ذمہ فارغ نہیں ہو گا اس لئے وکیل مقرر کرنا کافی نہیں ہے، اور سفیر چونکہ محض معبر ہوتا ہے معاملات کو اپنے موکل کی طرف ہی منسوب کرتا ہے اس لئے اس صورت میں یہ خرابی لازم نہیں آئے گی۔

٥ عن أنس بن مالك، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم باع حلسا وقدحا، وقال: من يشتري هذا الحلس والقدح، فقال رجل: أخذتهما بدرهم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: من يزيد على درهم، من يزيد على درهم؟، فأعطاه رجل درهمين: فباعهما منه: هذا حديث حسن،(سنن الترمذي ابواب البيوع،باب ما جاء في بيع من يزيد ،رقم الحديث:١٢١٨).

وكذا في سنن أبي داود (كتاب الزكاة،باب ما تجوز فيه المسألة، رقم الحديث:١٦٤١).

مسئلہ: یہ جو نیلام کا قانون ہے کہ بولی ختم ہوتے ہی بائع بیچنے پر مجبور ہو جائے اس سے بیع باطل ہو گی۔[1]

مسئلہ: اگر بائع نے کہا کہ دس روپے میں فروخت کرتا ہوں، پھر دس روپے پر ہی بولی ختم ہوئی تو بیع لازم ہو جائے گی۔[2]

مسئلہ: نیلام میں بھی اگر مبیع نہ دیکھا تو خیار رؤیت باقی رہے گا۔[3]

مسئلہ: حق مرافق (یعنی جو حق بائع کا اس گھر یا باغ میں ہو، وہ مشتری کو ملے گا، نصف کا مالک ہو یا کل کا، مرتہن ہو یا راہن یا کچھ تعلق ہی نہ ہو، یہ بیع مجہول ہے) جو سرکاری نیلاموں میں بیچا جاتا ہے، اگر بائع کا اس میں کچھ حق ہے تو حق مجہول ہونے کی وجہ سے فاسد ہے اور کچھ نہیں ہے تو مبیع نہ ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہے۔[4]

بیع تولیہ، مرابحہ، وضعیہ کا حکم

تولیہ: جس قیمت پر خریدا ہے، اسی پر فروخت کرے، کوئی نفع نہ لے۔

مرابحہ: جس قیمت پر خریدا ہے اس پر متعین نفع لے کر فروخت کرنا۔

وضعیہ: اصلی قیمت سے معین نقصان کے ساتھ فروخت کرنا۔[5]

ان تینوں بیعوں کی بنیاد امانت داری پر ہے لہٰذا خیانت کا شبہ بھی جائز نہ ہو گا۔[6]

---

[1] نیلامی کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ بائع قیمت کا بھی اعلان کرے اور دوسری صورت یہ ہے کہ صرف بیچنے کا اظہار کرے قیمت کا تعین نہ کرے، پہلی صورت میں بائع کے اعلان کو ایجاب اور آخری خریدار کی بات کو قبول کہا جائے گا جس سے بیع مکمل ہو جائے گی جیسا کہ مسئلہ نمبر ۲ میں مؤلف رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے اور دوسری صورت میں خریدار کی بات کو ایجاب کہا جائے گا جس کے بعد بائع کی مرضی ہے اس کو قبول کرے یا نہ کرے اور اس صورت میں چونکہ بیع تام نہیں ہوا اس لئے بائع کو مجبور کرنا جائز نہیں، یہاں مؤلف رحمہ اللہ یہی کہنا چاہتے ہیں۔

[2] انظر الحاشية المتقدمة.

[3] قد مرّ بيانه.

[4] یعنی "حق مرافق" کو جب تک پوری طرح متعین نہ کیا جائے کہ فروخت کنندہ کا کیا حق ہے؟ تو اس کو بیچنا جائز نہیں کیونکہ اگر حق نہ ہو تو بیع المعدوم ہے اور اگر کچھ حق موجود ہو تو چونکہ اس کو متعین نہیں کیا گیا بلکہ مجہول ہے اس لئے اس کی بیع فاسد ہے، اس لئے متعین کرنا ضروری ہے۔

[5] راجع لجميع هذه التعريفات "تحفة الفقهاء "(كتاب البيوع، باب الاقالة والمرابحة، ج٢ ص ١٠٥).

[6] كان مبناهما على الأمانة والاحتراز عن الخيانة وعن شبهتها، (الهداية ،كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، ج٣ ص ٥٦).
وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، ج٦ ص ١١٦).

مسئلہ :ان تینوں قسم کی بیع میں ضروری ہے کہ مال نقد خریدا ہو اور مثلی ہو کیونکہ غیر مثلی کی قیمت حاجت اور ضرورت کے لحاظ سے کم وزیادہ ہوتی رہتی ہے،[1] البتہ وہ چیز جس کے قبضہ میں ہے اسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ جو دیا تھا بعینہ وہی دیا جائے گا۔[2]

مسئلہ :ادھار نہ خریدار ہو، اگر مشتری کو معلوم ہو جائے کہ ادھار خریدا ہے تو واپس کر سکتا ہے بشرطیکہ مبیع کسی تصرف سے نا قابل واپسی نہ بن گیا ہو۔[3]

مسئلہ :وہ مال کسی دوسرے مال کے ساتھ ایک صفقہ میں نہ خریدا ہو کیونکہ صفقہ واحدہ میں اگر ہر چیز کی قیمت جدا جدا بھی بیان کر دیا جائے تب بھی نہ تفصیل معتبر ہے نہ ہی مراعات کے شبہ سے خالی ہے۔[4]

مسئلہ : ثمن مخلوط نہ ہو مثلاً بائع نے دس (چاندی) کے روپے اور ایک تلوار دے کر گھوڑا خریدا۔

مسئلہ : کسی حیلے بہانے سے قیمت میں کمی زیادتی نہ ہوئی ہو مثلاً ایک کتاب دس روپے میں خرید کر بیس میں فروخت کی پھر اسی قیمت میں خرید لی، تو اب کتاب مفت کی ہوگئی اب دوبارہ کتاب ۲۵ روپے میں

---

[1] مطبوعہ تسہیل شدہ نسخہ میں عبارت اسی طرح ہے، لیکن یہ قابل اشکال ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ مبیع کا مثلی ہونا ضروری ہے جبکہ فقہاء کرام ثمنِ اول کے مثلی ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں، اصل نسخہ کی عبارت پر یہ اشکال نہیں ہوتا، چنانچہ اس میں عبارت یوں ہے: "ضرور ہے کہ وہ مال نقد سے خریدا ہو یا مثلیات سے"۔(ص۷۸)۔

[2] (وشرطهما كون الثمن الأول مثليا) لأنه إذا لم يكن له مثل لو ملكه ملكه بالقيمة، وهي مجهولة،(البحر الرائق،كتاب البيوع،باب المرابحة والتولية،ج٦ ص ١١٨).

قال: "ولا تصح المرابحة والتولية حتى يكون العوض مما له مثل"؛ لأنه إذا لم يكن له مثل لو ملكه ملكه بالقيمة وهي مجهولة "ولو كان المشتري باعه مرابحة ممن يملك ذلك البدل وقد باعه بربح درهم أو بشيء من المكيل موصوف جاز" لأنه يقدر على الوفاء بما التزم(الهداية ،كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية،ج٣ ص ٥٦).

[3] (وإن اشترى بنسيئة ورابح بلا بيان خير المشتري) أي من اشترى ثوبا بعشرة نسيئة وباعه بربح واحد حالا ولم يبين ذلك فعلم المشتري خيانته يصير مخيرا إن شاء رده وإن شاء قبله لأن للأجل شبها بالمبيع(مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر،كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٢ص ٧٨)وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب البيوع، باب المرابحة،ج ٢ / ١٨٣).

[4] لو اشترى أشياء صفقة واحدة بثمن واحد ليس له أن يبيع بعضها مرابحة على حصتها من الثمن؛ لأن ذلك لا يكون إلا باعتبار القيمة، وتعيينها لا يخلو عن شبهة الغلط (فتح القدير،كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٦ص٥٠٣).

وأراد بالأشياء القيميات، أما لو اشترى كيلياً أو وزنياً ثم أراد أن يبيع قفيزاً مرابحة جاز اتفاقاً، لأن القفيز من القفيزين لا يتفاوت فتصير حصة كل قفيز معلومة كذا في (السراج)، (النهر الفائق كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٣ ص ٤٥٨).

وكذا في حاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٥ ص ١٣٨).

خریدی تو کتاب کی قیمت صرف پانچ روپے رہ گئی، لہٰذا مفت پڑنے کی صورت میں تولیۃ اور مرابحۃ بیچنا جائز نہ ہوگا، ہاں مفت نہ ہو بلکہ قیمت کم ہو (کر) پانچ رہ گئی، اب پانچ پر تولیۃ یا مرابحۃ فروخت کر سکتا ہے، مگر اس صورت میں صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک یہ معاملہ جدید ہوگا، پہلے معاملے کا اعتبار نہیں۔ [1]

فائدہ: ایسی صورت میں مناسب یہی ہے کہ صورت حال واضح کرے تاکہ دھوکہ فریب کا احتمال ہی نہ رہے۔

مسئلہ: میراث کا جو مال ملا، اس کو تقسیم کے حساب سے تولیۃ یا مرابحۃ فروخت کرنا جائز ہے، اور اگر تقسیم نہ ہوا ہو تو مورث (میت) کے خرید کا اعتبار ہے، ایسا ہی ہبہ کا حکم ہے (شامی) یعنی ہبہ کرنے والے نے جتنے میں خریدا ہے اس پر آگے تولیۃ یا مرابحۃ کیا جا سکتا ہے۔ [2]

مسئلہ: مال کو خرید کر دکان تک لانے پر جو خرچہ ہو جائے، اس کو قیمت میں شامل کرنا جائز ہے، البتہ یہ نہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدا بلکہ کہے کہ اتنے میں پڑی ہے۔ [3]

مسئلہ: مبیع پر ایسے مصارف جن سے قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے، لاگت میں شامل ہے جیسے بار برداری، نقش و نگار م رنگ وغیرہ اور جن مصارف سے مال کی قیمت میں اضافہ نہ ہو جیسے چوکیدار کی تنخواہ، جانور کا دانہ پانی، سامان رکھنے کی جگہ کا کرایہ، کرایہ میں داخل نہیں، ایسے زائد مصارف کو مشتری کی اجازت سے قیمت میں ملا لینا جائز ہے۔ [1]

---

[1] محمد عن يعقوب عن أبي حنيفة (رضي الله عنهم) رجل اشتر ثوبا فباعه بربح ثم اشتراه فإن باعه بربح طرح عنه كل ربح ربح فيه قبل ذلك وإن كان استغرق الثمن لم يبعه مرابحة وقال ابو يوسف ومحمد (رحمهما الله) يبيعه مرابحة على الثمن الآخر(الجامع الصغير،كتاب البيوع، باب في المرابحة والتولية،ص ٣٤٦).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب في المرابحة والتولية،ج٦ ص ١٢١)

[2] في الدر المختار :(المرابحة) مصدر رابح وشرعا (بيع ما ملكه) من العروض ولو بهبة أو إرث أو وصية أو غصب فإنه إذا ثمنه (بما قام عليه وبفضل) مؤنة.

وفي حاشية ابن عابدين تحته:قال في الفتح: وصورة المسألة أن يقول: قيمته كذا أو رقمه كذا فأرابحك على القيمة أو الرقم اه. وظاهره أنه لا يقول قام علي بكذا وبه صرح في البحر في الرقم، والظاهر أن الهبة ونحوها كذلك(كتاب البيوع، باب في المرابحة والتولية،ج٥ ص ١٣٢).

[3] انظر الحاشية الاتية.

مسئلہ: مال پر وہ مصارف جو تاجروں کے عرف میں مال کے ساتھ بڑھائے جاتے ہیں، ان کو بیان کئے بغیر قیمت میں بڑھالینا جائز ہے۔[2]

مسئلہ: اصل ثمن یا لاگت اور مقدار نفع کا مجلس عقد میں معلوم ہو جانا ضروری ہے، یہ کہنا کافی نہیں کہ دو فیصد نفع لے رہا ہوں، ہاں یہ کہے کہ کل لاگت ہزار ہے ۲ فیصد نفع لے رہا ہوں تو یہ جائز ہوگا۔[3]

مسئلہ: جب مشتری کو بعد میں معلوم ہو جائے کہ بائع نے دھوکہ دیا ہے تو بیع تولیہ میں واپس کرنے اور مرابحہ میں قیمت کم کرنے کا اختیار ہے، امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں میں قیمت کم کرنے یا واپس کرنے کا اختیار ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں میں زائد قیمت ساقط کرنے کا اختیار ہے۔[4]

---

[1] اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جن اخراجات کو قیمت میں شامل کرنے کا عرف ہو اس کو لاگت کے طور پر قیمت میں شامل کر کے جائز ہے اور جن اخراجات کو اس طرح ملانے کا عرف نہ ہو ان کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔

ثم الأصل أن كل نفقة ومؤونة حصلت في السلعة وأوجبت زيادة في المعقود عليه إما من حيث العين أو من حيث القيمة وكان ذلك معتادا إلحاقا برأس المال عند التجارة فإنه يلحق برأس المال كأجرة القصارة والخياطة والكراء وطعام الرقيق وكسوتهم وعلف الدواب وثيابهم ونحو ذلك فيبيعه مرابحة عليه ولا يقول عند البيع إن ثمنه كذا ولكن يقول يقوم علي بكذا فأبيعك على هذا مع ربح كذا حتى لا يكون كاذبا في كلامه.(تحفة الفقهاء كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، ج ٢ ص ١١٠)

وكذا المضارب ما أنفق على الرقيق من طعامهم وكسوتهم وما لا بد لهم منه بالمعروف يلحق برأس المال لجريان العادة بذلك وما أنفق على نفسه في سفره لا يلحق به؛ لأنه لا عادة فيه، والتعويل في هذا الباب على العادة.(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، المرابحه،بيان ما يلحق برأس المال وما لا يلحق به في المرابحة ،ج٥ ص ٢٢٣).

[2] انظر الحاشية المتقدمة.

[3] وإن باعه بربح ده يازده لا يجوز إلا إذا علم الثمن في المجلس فيجوز(الفتاوى الهندية،كتاب البيوع،الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، ج٣ ص ١٦٠).

ومن ولي بما قام عليه ولم يعلم مشتريه قدره فسد، وإن علمه في المجلس خير. (ملتقى الأبحر،كتاب البيوع، باب المرابحة،ص١١٢)

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٥ ص ٢٩٦).

[4] قال: (فإن علم بخيانة في التولية أسقطها من الثمن) وهو القياس في الوضيعة.(وفي المرابحة إن شاء أخذه بجميع الثمن، وإن شاء رده) وهذا عند أبي حنيفة. وقال أبو يوسف: يحط فيهما، وحصة الخيانة من الربح.وقال محمد: يخير فيهما(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٢ص ٢٩).

وفي اللباب في شرح الكتاب بعد ذكر هذا الاختلاف: قال في التصحيح: واعتمد قول الإمام النسفي والبرهاني وصدر الشريعة. (كتاب البيوع، باب المرابحة،ج٢ص ٣٤).

مسئلہ : مبیع سے کوئی ایسا نفع حاصل نہ کیا ہو جس سے قیمت گھٹ جائے جیسے کپڑے کو پہن لینا قیمت کے کم ہونے کا باعث ہے، آئینہ میں دیکھنا نفع حاصل کرنا تو ہے مگر اس سے قیمت کم نہیں ہوتی۔[1]

مسئلہ : مبیع میں اختیاری طور پر کوئی عیب پیدا نہ کیا ہو، چوہے کا کاٹ جانا اختیاری عیب نہیں، اٹھانے یا اتارنے میں ٹوٹ پھوٹ، یا کپڑے تہ کرنے میں بیجا شکن اختیاری ہے۔[2]

مسئلہ : جو عیب خریدار سے پہلے تھا وہ اب غیر اختیاری ہو گیا، بیع تولیہ سے مانع نہیں، ہاں عیب کو بیان کر دینا بہتر ہے۔

بیع مکروہ کے احکام

بیع مکروہ وہ بیع ہے جو کسی قبیح شرعی کی وجہ سے گناہ کا سبب بنی ہو مگر اس کا اثر بیع کے صحت و نفاذ سے متعلق نہ ہو، اور اس کی کئی صورتیں ہیں:

پہلی قسم کراہت باعتبار مبیع:

جیسے آلات لہو ولعب مثل گنجفہ، نرد شیر، شطرنج، کنگوا، باسریاں، انگریزی ہوں یا دیسی ہاتھ سے بجنے والی، پتھر سے بنی ہوئی تصویر[3]، بت، لوہے پیتل کے زیورات، افیون، بھنگ، گانجا، چرس، چانڈو، (ایک قسم کا نشہ) لڑائی کے مرغ، بٹیر، اڑنے والے کبوتر اور کتے وغیرہ۔[4]

دوسری قسم کراہت باعتبار ثمن:

جبکہ ظن غالب ہو کہ قیمت حرام مال سے ادا کی جا رہی ہے، جیسے سود خور اور فاحشہ عورت جن کی کمائی زنا

---

[1] کیونکہ یہ تعییب یعنی اختیاری عیب ہے جیسا کہ اس کے بعد متصل مسئلہ میں مذکور ہے۔

[2] ويرابح بلا بيان لو اعورت المبيعة أو وطئت وهي ثيب، أو أصاب الثوب قرض فأر أو حرق نار، وإن فقئت عينها أو وطئت وهي بكر أو تكسر الثوب من طيه ونشره لزم البيان(ملتقى الأبحر ،كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية،ص ١١١).

وكذا في مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر (كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية،ج ٢ص ٧٨).

[3] اگر خود یہ پتھر قیمتی نہ ہو تو تصویر کی بیع کو مکروہ قرار دینا محل نظر ہے، ظاہر یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے کیونکہ تصویر غیر متقوم ہے۔

[4] ألا ترى أنه يكره بيع المعازف ولا يكره بيع الخشب وعلى هذا الخمر مع العنب(الهداية،باب البغاة، قبيل كتاب اللقيط،ج٢ ص ٤١٤).

وكذا في فتح القدير (باب البغاة، قبيل كتاب اللقيط،ج ٦ص ١٠٧).

والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين(باب البغاة، قبيل كتاب اللقيط،ج ٤ ص ٢٦٨).

وغناء پر ہے، رشوت خور چور، غرض یہ کہ ہر وہ شخص جس کی آمدنی حرام ذرائع سے ہو۔[1]

تیسری قسم کراہت باعتبار بائع:

ایسے شخص سے کوئی چیز خریدنا جس کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ اس نے حرام وناجائز طریقہ سے اس مال کو حاصل کیا ہے جیسا کہ عالمگیری میں ہے کہ جس بازار میں عام طور پر حرام مال بکتا ہو وہاں تحقیق کر کے خریدنا چاہئے۔[2]

مسئلہ : مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اگر قطعی طور پر معلوم ہو تو ایسے خرید وفروخت ناجائز مکروہ تحریمی ہے اور اگر قطعی طور پر معلوم نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے۔[3]

چوتھی قسم کراہت باعتبار مشتری:

آلات جنگ، ہتھیار، گولی، بارود، گھوڑے (موجودہ زمانے میں ٹینک، توپ، ہوائی بحری جنگی جہاز وغیرہ، از ابن شائق) کفار کے ہاتھ فروخت کرنا مکروہ ہے جبکہ جنگ درپیش ہو، اسی طرح لونڈی کو کافر کے ہاتھ فروخت کرنا، یا امرد غلام کو بدفعلی کرنے والے مردوں کے ہاتھ فروخت کرنا۔[4]

---

[1] الشراء بغير المتقوم فاسد. (مجلة الأحكام العدلية ، رقم المادة ٢١٢،ص ٤٢).
وكذا في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (رقم المادة ٢١٢، ج١ ص ١٨٦).

[2] غلب على ظنه أن أكثر بياعات أهل السوق لا تخلو عن الفساد فإن كان الغالب هو الحرام يتنزه عن شرائه ولكن مع هذا لو اشتراه يطيب له المشترى شراء فاسدا إذا كان عقد المشتري الأخير صحيحا كذا في القنية. (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع،الباب الخامس والعشرون في البيع والاستيام على سوم الغير، ج٥ص٣٦٤).
وسئل أبو القاسم عمّن يحتاج إلى شراء الأشياء، ويخاف الوقوع في الحرام، هل يجب عليه أن يسأل عن كل أحد يريد الشراء عنه عن حال ما يريد شراءه؟ قال: الأشياء على ظاهرها التي جرت العادة عليه حتى تجيء العوارض، وإذا كان نقدا قد غلب الحرام على أهله أو كان البائع ممن يتخذ المال من خبث، فالسؤال حسن.(المحيط البرهاني ،كتاب البيوع، الفصل الخامس والعشرون: في البياعات المكروهة ،ج٧ ص ١٤٠).
وكذا في الأشباه والنظائر مع شرحه غمز عيون البصائر(الفن الاول،لقاعدة الثانية إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام ،ج١ ص ٣٤٤).

[3] ايضا.

[4] (ومنها) بيع السلاح من أهل الفتنة وفي عساكرهم؛ لأن بيعه منهم من باب الإعانة على الإثم والعدوان وأنه منهي، ولا يكره بيع ما يتخذ منه السلاح منهم كالحديد وغيره؛ لأنه ليس معدا للقتال فلا يتحقق معنى الإعانة،(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، حكم البيوع، مبحث البيوع المكروهة،ج٥ ص ٢٣٣).

پانچویں قسم باعتبار امور خارجیہ:

جیسے کہ جمعہ کے اذان اول کے بعد خرید وفروخت مکروہ ہے کیونکہ جمعہ کے لئے جو سعی واجب ہے اس میں خلل آئے گا ہاں البتہ بائع اور مشتری دونوں جامع مسجد کی طرف جارہے ہوں اور چلتے چلتے بیع وشراء کے متعلق گفتگو جاری رکھی تو جائز ہے کیونکہ اس صورت میں خلل واقع نہیں ہوگا۔[1]

مسئلہ: اگر متعدد مساجد میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہو تو جس مسجد میں جمعہ ادا کرنے کا ارادہ ہو، اس مسجد کے اذان کے ساتھ خرید وفروخت ترک کردے۔[2]

۲۔ لوگوں کی ترغیب کے لئے قیمت بڑھا کر بولی لگانا، ارشاد نبوی ﷺ ہے "الناجش اکل الربا"[3] صرف

(ويكره) تحريما (بيع السلاح من أهل الفتنة إن علم) لأنه إعانة على المعصية (وبيع ما يتخذ منه كالحديد) ونحوه يكره لأهل الحرب (لا) لأهل البغي لعدم تفرغهم لعمله سلاحا لقرب زوالهم، بخلاف أهل الحرب زيلعي. قلت: وأفاد كلامهم أن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما وإلا فتنزيها نهر.(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،قبيل باب اللقيط،ج٤ص ٢٦٨).

[1] وإذا أذن المؤذنون الأذان الأول ترك الناس البيع والشراء وتوجهوا إلى الجمعة " لقوله تعالى: {فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ}وإذا صعد الإمام المنبر جلس وأذن المؤذنون بين يدي المنبر بذلك جرى التوارث ولم يكن على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا هذا الأذان ولهذا قيل هو المعتبر في وجوب السعي وحرمة البيع والأصح أن المعتبر هو الأول إذا كان بعد الزوال لحصول الإعلام به(الهداية ،باب صلاة الجمعة،ج١ ص ٨٤).

فإن البيع قد يخل بواجب السعي إذ قعدا أو وقفا يتبايعان، وأما إذا تبايعا يمشيان فلا إخلال فيصح بلا كراهة. وقد تقدم في كتاب الصلاة أن المعتبر في ذلك هو الأذان الأول إذا كان بعد الزوال(العناية شرح الهداية،كتاب البيوع،فصل فيما يكره، ج٦ص ٤٧٨).

الفائدة: والشارح الزيلعي رحمه الله لم يسلّم هذه المسئلة بل ذكر اشكالا عليها وتبعه في البحر والمجمع وغيرهما من الكتب، لكن اجاب عنه في النهر الفائق فليراجع.

[2] اس میں دو قول ہیں، ایک یہی قول ہے جو مؤلف رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اور دوسرا قول یہ ہے کہ پہلی اذان کا اعتبار ہے، حضرت مؤلف اور بعض دیگر فقہاء کرام کے نزدیک یہی پہلا قول ہی راجح ہے۔

وسئل ظهير الدين عمن سمع في وقت من جهات ماذا عليه قال إجابة أذان مسجده بالفعل(البحر الرائق ،كتاب الصلاة، باب الاذان،ج١ ص ٢٧٣).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الصلاة، باب الاذان،ج١ص ٣٩٩).

وفي النهر الفائق: ولو سمع أكثر من واحد أجاب الأول لظاهر الأمر في قوله: "فقولوا مثل ما يقول"(كتاب الصلاة، باب الاذان،ج١ص ١٧٥).

[3] عن ابن أبي أوفى، رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال:الناجش آكل الربا(مسند البزار ،مسند عبد الله بن ابي اوفى، رقم الحديث٣٣٤٩، ج ٨ ص ٢٨٢).

دکھانے کو قیمت بڑھانے والا سود خور ہے۔

مسئلہ : خرید نے کا ارادہ ہو تو دوسروں سے قیمت بڑھانا جائز ہے۔[1]

۳۔ ایک خریدار سے بیع طے پایا جائے اس کے بعد دوسرے خریدار سے اسی مال کے متعلق گفتگو کرنا مکروہ ہے۔[2]

۴۔مال کا عیب چھپانا مکروہ ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے عیب چھپانے والے پر لعنت فرمائی، عالمگیری میں ہے کہ مال کا عیب چھپانے والے مردود الشہادۃ ہے۔[3]

۵۔بیرون شہر سے مال لانے والے تاجروں کے ساتھ شہر سے نکل کر اوپر ہی اوپر معاملہ طے کر لینا مکروہ ہے، اگر ضرورت سے نکلا اور اتفاقاً کسی سے معاملہ طے پایا گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔[4]

مسئلہ :اور شہر سے نکل کر مال خریدنے میں شہر والوں کا نقصان نہ ہو، تو باہر نکل خریدنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ بعض احادیث میں خروج مروی ہے۔[1]

وکذا اخرجه الامام البخاري في صحيحه موقوفا(كتاب البيوع،باب النجش، ومن قال لا يجوز ذلك البيع).

[1] والنجش بفتحتين ويروى بالسكون وهو أن يستام السلعة بأزيد من ثمنها وهو لا يريد شراءها بل ليراه غيره فيقع فيه، وإنما كرها لما روي عن ابن عمر رضي الله عنهما أنه عليه السلام نهى عن النجش(تبيين الحقائق كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٤ ص ٦٧).

النجش بفتحتين ويروى بالسكون أيضا وهو أن يزيد في ثمن المبيع ولا رغبة له فيه ولكنه يحمل الراغب على أن يزيد في الثمن(الجوهرة النيرة،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ١ص ٢٠٦).

[2] (و) كره (السوم) أي الاستشراء بثمن كثير (على سوم غيره) أي استشراء غيره بثمن قليل (إذا رضيا) ظرف السوم (بثمن) معلوم ولم يبق بينهما إلى العقد لقوله عليه الصلاة والسلام لا يستام الرجل على سوم أخيه ولا يخطب على خطبة أخيه وهو نفي في معنى النهي فيفيد المشروعية قيد بقوله إذا رضيا لأنهما إذا لم يتراضيا فلا يكره(مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ٦٩).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ١ص ٢٠٦).

[3] مرّ تخريجه.

[4] (وتلقي الجلب) بمعنى المجلوب أو الجالب، وهذا (إذا كان يضر بأهل البلد أو يلبس السعر) على الواردين لعدم علمهم به فيكره للضرر والغرر (أما إذا انتفيا فلا) يكره. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٥ص ١٠٢).ومحمل النهي عندنا إذا كان يضر بأهل البلد أو لبس أما إذا انتفيا فلا بأس به،(البحر الرائق، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٦ص ١٠٨).

قال: "وعن تلقي الجلب" وهذا إذا كان يضر بأهل البلد فإن كان لا يضر فلا بأس به، إلا إذا لبس السعر على الواردين فحينئذ يكره لما فيه من الغرور والضرر. (الهداية ،كتاب البيوع،فصل فيما يكره،ج٣ ص ٥٣).

مسئلہ : شہر میں جو مال کی قیمت ہے، اس کو چھپا کر باہر کے تاجروں سے سستا خریدا تو اس میں زیادہ کراہت ہے۔[2]

۶۔ دیہاتی تاجروں کی طرف سے دلال (ایجنٹ) بن کر شہر والوں کو بیچنا بھی مکروہ ہے۔

مسئلہ : اگر اہل شہر پر زمانہ قحط نہ ہو یا شہر والوں کو نقصان نہ پہنچتا ہو تو دیہاتیوں کی طرف سے دلال بننا جائز ہے۔ (عالمگیری)[3]

مسئلہ : اگر شہری دیہاتیوں کا دلال نہ بنے، صرف خیر خواہی کے طور پر درمیان میں پڑ کر معاملہ طے کروا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (بخاری)[4]

مسئلہ : ایسے شہر جہاں دلال کے بغیر خرید وفروخت مشکل ہو وہاں دلالی کرنا بھی جائز ہے اس لئے کہ علت کراہت (شہر والوں کو نقصان پہنچانا) مرتفع ہے۔[5]

ذخیرہ اندوزی کے احکام

ساتویں قسم: کراہت بالاحتکار

"احتکار" کا لغوی معنیٰ: غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کرنا کہ جب مہنگا ہو جائے فروخت کروں گا۔[6]

اصطلاحی معنیٰ: ہر وہ چیز جو انسان یا حیوان کی غذا ہو ایسی جگہ جہاں کے غلہ یا چارے کی اس شہر والوں کو

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] ايضا.

[3] كره بيع الحاضر للبادي وهذا إذا كان أهل البلدة في قحط وهو أن يبيع من أهل البلد رغبة في الثمن الغالي فيكره فإن لم يكن كذلك فلا بأس به (الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب العشرون، ج٣ ص ٢١١).
وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب البيوع، قبيل باب الاقالة، ج٢ ص ١٧٨).

[4] عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تلقوا الركبان، ولا يبع حاضر لباد، قال: فقلت لابن عباس: ما قوله لا يبيع حاضر لباد قال: لا يكون له سمسارا(صحيح البخاري ،كتاب البيوع،باب هل يبيع حاضر لباد بغير أجر، وهل يعينه أو ينصحه، رقم الحديث: ٢١٥٨).

[5] (وكذا بيع الحاضر للبادي) لقوله عليه الصلاة والسلام : لا يبيع حاضر لباد وهو أن يجلب البادي السلعة فيأخذها الحاضر ليبيعها بعد وقت بأغلى من السعر الموجود وقت الجلب، وكراهته لما فيه من الضرر بأهل البلد حتى لو لم يضر لا بأس به لما فيه من نفع البادي من غير تضرر غيره. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ص ٢٦).

[6] (ح ك ر) : (الاحتكار) حبس الطعام للغلاء (المغرب في ترتيب المعرب، الحاء مع الكاف ،ج١ ص ١٢٤).

ضرورت تھی، وہاں سے لاکر ایسے وقت پر ذخیرہ کرلینا جبکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔[1]

مسئلہ : میوہ جات اور کپڑے وغیرہ میں احتکار نہیں ہے (کیونکہ ان پر زندگی کا مدار نہیں ہے، ہاں جس علاقے میں میواؤں پر زندگی بسر ہوتی ہو وہاں احتکار ہے) غلے گھاس بھوسے میں احتکار ہے۔

مسئلہ : جس جگہ کے غلہ چارے پر ان لوگوں کا گذر نہ ہو، وہاں بھی ذخیرہ اندوزی احتکار نہیں ہے۔[2]

مسئلہ : یہ روکنا شہر والوں کے لئے مضر نہ ہوں۔[3]

مسئلہ : اپنی زمین کا غلہ کوئی روک کر رکھے اس میں بھی احتکار نہیں ہے۔[4]

مسئلہ : احتکار مکروہ تحریمی ہے۔[5]

مسئلہ : اگر احتکار سے عام لوگوں کو ضرر پہنچتا ہو تو حاکم ان کو احتکار سے روکے، اگر حاکم کے حکم سے بھی احتکار کی شرارت سے باز نہ آئے تو بقول امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ حاکم اس کو قید اور تعزیر کی سزا دے سکتا ہے۔(ہدایہ)[1]

---

[1] "ويكره الاحتكار في أقوات الآدميين والبهائم إذا كان ذلك في بلد يضر الاحتكار بأهله وكذلك التلقي. فأما إذا كان لا يضر فلا بأس به" والأصل فيه قوله عليه الصلاة والسلام الجالب مرزوق والمحتكر ملعون(الهداية ،كتاب الكراهية،فصل في البيع،ج٤ص٣٧٧).

[2] الاحتكار على وجوه: أحدها حرام وهو أن يشتري في المصر طعاما ويمتنع عن بيعه عند الحاجة إليه ولو اشترى طعاما في غير المصر ونقله إلى المصر وحبسه قال الإمام لا بأس به؛ لأن حق العامة إنما يتعلق بما جمع من المصر أو جلب من فنائه، وقال الثاني: يكره، وقال محمد: كل بقعة يمتد منها إلى المصر في العادة فهي بمنزلة فناء المصر يحرم الاحتكار منه وهذا في غاية الاحتياط اهـ. (البحر الرائق ،كتاب الكراهية،فصل في البيع،ج ٨ص ٢٢٩).

[3] وإذا كان الاحتكار والتلقي في بلد لا يضر فلا بأس وإذا أضر فهو مكروه (الجامع الصغير ،باب الكراهية في البيوع ،ص٤٨١)

[4] (ولا احتكار في غلة ضيعته) لأنه خالص حقه (ولا فيما جلبه من بلد آخر) عند الإمام لعدم تعلق أهل بلد بطعام بلد آخر (وعند أبي يوسف يكره) أن يحبس ما جلبه من بلد آخر.. (وكذا) يكره (عند محمد إن كان يجلب منه إلى المصر عادة) فهو بمنزلة فناء المصر لتعلق حق العامة بخلاف ما إذا كان البلد بعيدا لم تجر العادة بالحمل منه إلى المصر؛ لأنه لم يتعلق به حق العامة (وهو) أي قول محمد (المختار) (مجمع الأنهر ،كتاب الكراهية، الاحتكار، ج٢ ص ٥٤٨).وكذا في الهداية (كتاب الكراهية،فصل في البيع،ج٤ص٣٧٧).

[5] (وأما) حكم الاحتكار فنقول يتعلق بالاحتكار أحكام (منها) الحرمة لما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال المحتكر ملعون والجالب مرزوق ولا يلحق اللعن إلا بمباشرة المحرم(بدائع الصنائع ف، كتاب الاستحسان،ج٥ ص ١٢٩).

اور قاضی خان میں مذکور ہے امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک ضرر عام کی صورت میں محتکر کا غلہ عام لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور جب لوگوں کو کہیں اور سے غلہ مل جائے تو واپس کر دیا جائے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔[2]

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کافرہ عورت کا پانی اس کی اجازت کے بغیر سب کو پلا دیا اور اس کے عوض کچھ اسے عطا فرمایا مگر اس عورت کا مشکیزہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ سے ویسا ہی بھرا رہا۔[3]

مسئلہ: اس زمانے میں تجارت کی عام سہولت ریل ڈاک کی موجودگی کی وجہ سے احتکار مشکل ہے، نہ کوئی مقام کسی قوم کے لئے خاص ہے نہ لانے اور لے جانے میں کوئی زائد ضرر ہے اس لئے کہ آج گیا تو کل ضرورت پر پہنچ گیا۔

مسئلہ: اکثر مسلمان غلہ کی تجارت سے گھبراتے ہیں، یہ ان کی کم فہمی ہے، حرمین (مکہ و مدینہ) میں خلفاء راشدین کے زمانے میں صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی غلہ فروش تھے، جو منافع تجارتی اور مصالح سیاسی غلہ کی تجارت میں ہے کسی اور میں نہیں، پس بلا شک وشبہ غلہ کی تجارت جائز ہے۔[4]

---

[1] وإذا رفع إلى القاضي هذا الأمر يأمر المحتكر ببيع ما فضل عن قوته وقوت أهله على اعتبار السعة في ذلك وينهاه عن الاحتكار، فإن رفع إليه مرة أخرى حبسه وعزره على ما يرى زجرا له ودفعا للضرر عن الناس،(الهداية ،كتاب الكراهية،فصل في البيع،ج٤ص٣٧٨).ويجب أن يأمره القاضي ببيع ما فضل عن قوته وقوت أهله، فإن لم يبع عزره والصحيح أن القاضي يبيع إن امتنع اتفاقا(درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب الكراهية،فصل في البيع،ج ١ ص ٣٢٢).

[2] وقال القدوري رحمه الله تعالى قد قال أصحابنا إذا خاف الإمام الهلاك على أهل المصر يأخذ الطعام من المحتكر وينفقه عليهم فإذا وجدوا ردوا مثله وليس هذا بحجر إنما هو ضرورة.(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، فصل فيما يتضرر به الجيران ويخاصمه في ذلك ،ج٢ ص ١٤٣). (ومنها) أنه إذا خاف الإمام الهلاك على أهل المصر أخذ الطعام من المحتكرين وفرقه عليهم فإذا وجدوا ردوا عليهم مثله لأنهم اضطروا إليه ومن اضطر إلى مال الغير في مخمصة كان له أن يتناوله بالضمان(بدائع الصنائع ،كتاب الاستحسان،ج٥ ص ١٢٩).

[3] كذا في المعجم الكبير للطبراني (ج١٨ ص ١٣٢) وكذا في سبل الهدى والرشاد (الباب العاشر في تكثيره صلى الله عليه وسلّم ماء المزادتين،ج٩ص ٤٦١).

[4] صاحب ہدایہ وغیرہ بہت سے فقہاء کرام نے جو اس کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے ان کے پیش نظر بھی احتکار کے ممانعت سے متعلق احادیث تھے، لہٰذا اگر کوئی تاجر احتکار سے بچ کر غلہ فروشی کر رہا ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔
والحاصل أن التجارة في الطعام غير محمودة. (الهداية ،كتاب الكراهية، فصل في البيع،ج٤ ص ٣٧٧).

مسئلہ : چاندی اور سونے میں کوئی اور چیز ملانا مکروہ ہے، مگر بناوٹ کی ضرورت سے ملانے میں کوئی حرج نہیں۔(عالمگیری)[1]

مسئلہ : مدِّزکوۃ میں مال دیکر دوبارہ اس مال کو خود خرید لینا مکروہ ہے۔[2]

مسئلہ : لوہے کی انگوٹھی اور تانبے پیتل وغیرہ کے زیور فروخت کرنا مکروہ ہے(عالمگیری)۔[3]

مسئلہ : کھانے کی چیزوں کو آزمانے کے لئے چکھ لینے کی تین صورتیں ہیں:

ا۔اگر چکھتے وقت خریدنے کی نیت نہیں تھی تو مکروہ ہے۔[4]

۲۔ خریدنے کی نیت تھی مگر چکھنے کے بعد بدون کسی عیب کے ارادہ بدل گیا،اب اسی مقدار کی قیمت دے یا معاف کرالے۔[5]

فالحاصل أن التجارة في الطعام مكروه فإنه يوجب المقت في الدنيا والإثم في الآخرة(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الكرااهية، فصل في الاحتكار،ج٤ ص ١٦٢).

وفي حاشية الشلبي على تبيين الحقائق: (قوله: غير محمودة) أي بطريق الاحتكار، وأما الاسترباح فيه بلا احتكار فلا بأس به كذا في الفوائد الشاهية. اهـ(كتاب الكراهية، فصل في البيع،ج٦ ص ٢٨).

[1] عن أبي يوسف رحمه الله تعالى أكره للرجل أن يعطي الزيوف، والبهرجة، والستوقة، والمكحلة، والبخارية، وإن بين ذلك وتجوز بها عند الأخذ من قبل أن إنفاقها ضرر بالعوام وما كان ضررا عاما فهو مكروه وليس يصلحه تراضي هذين الحاضرين. الفتاوى الهندية ،قبيل كتاب الكفالة،ج٣ص ٢٥٢.

والتفصيل في الموسوعة الفقهية الكويتية، تحت مادة" ذهب" المعاملة بالمغشوش من الذهب،ج٢١ص ٢٨٦.

[2] روي أن سيدنا عمر رضي الله عنه تصدق بفرس له على رجل ثم وجده يباع في السوق فأراد أن يشتريه فسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك فقال لا تعد في صدقتك وسيدنا عمر رضي الله عنه قصد الشراء لا العود في الصدقة لكن سماه عودا لتصوره بصورة العود، وهو نهي ندب؛ لأن الموهوب له يستحي فيسامحه في ثمنه فيصير كالراجع في بعضه والرجوع مكروه. (بدائع الصنائع،كتاب الهبة، حكم الهبة،ج٦ ص ١٣٢).

وعندنا لا يكره؛ لأنه استبدال وليس برجوع، وتأويل الحديث لاحتمال أنه نهى لمكان المحاباة أي إذا علم المتصدق عليه أن المتصدق هو الذي يشتريه فربما يحابيه في الثمن، فيصير قدر المحاباة يشبه الرجوع في الصدقة، فيكره ذلك، وأما إذا كان يعلم أنه لا يحابي المتصدق لمكان الصدقة، لا يكون رجوعا في الصدقة، ولا يشبه الرجوع فلا يكره. (شرح السير الكبير ، باب الوصية في سبيل الله تعالى والمال يعطى،ج١ ص ٢٠٨٠).

[3] ويكره بيع خاتم الحديد والصفر ونحوه (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع،الباب الخامس والعشرون،ج٥ ص ٣٦٥).

وكذا في رد المحتار (كتاب الحظر والاباحة،فصل في اللبس،ج٦ ص ٣٦٠).

[4] کیونکہ فروخت کنندہ کی طرف سے چکھنے کے لئے عملاً یہی شرط ہوتی ہے اس کے بغیر وہ چکھنے پر راضی نہیں ہوتا۔

[5] اخلاقی طور پر تو ایسا ہی کرلینا چاہئے کہ یا قیمت دیدے یا معاف کرالے،البتہ فقہی و قانونی لحاظ سے ایسا کرنا شاید لازم نہیں ہے، لأنّه إباحة وهِبة مِن البائع بشرط الشّراء ولا يلزمُ العملُ بمثل هذه الشّرائط.

۳۔ خریدنے کی نیت تھی مگر پسند نہ آنے کی وجہ سے نہیں خریدا، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔[1]

آلاتِ معصیت کی بیع:

۱۲۔ ہر وہ چیز جس کا استعمال عام طور پر گناہ کے کام میں ہی ہوتا ہے لیکن درمیان میں فاعلِ مختار کا فعل ہے جیسے تاری کا درخت، کنکوا کی ڈور، لڑنے والے مرغ، بٹیر، اڑانے کے کبوتر، تُلسی کا درخت[2]، پوجنے کے قابل پتھر، شراب بھرنے کی بوتل، ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جس کے متعلق غالب گمان یہ ہے کہ وہ حرام میں استعمال کرے گا، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک مکروہ ہے، امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بھی فروخت نہ کرنا اولیٰ اور احوط ہے۔[3]

مسئلہ: ایسے آلات جن کا استعمال سوائے حرم کے دوسرے کسی کام کے عرفاً عادۃ نہ ہوتا ہو تو ان کو فروخت کرنا بالاتفاق مکروہ تحریمی ہے، جیسے کنکوا، افیون، بھنگ، گانجا، چرس، مدک، چانڈو، جیسے ہمارے دیار میں معمول ہے، گنجفہ، شطرنج، چوسر کی نردیں، سارنگی، ستار طنبور، ڈھولک، بانسری اور ہر قسم کے باجے دیسی ہوں یا ولایتی (انگریزی) یعنی خوب بخود بجنے والی (ٹی وی، سی وی آر وغیرہ) کیمیا، یا لچر بوچ فاسقانہ قصوں کی کتابیں اور فنون محرمہ جیسے راگ، نجوم وفال وغیرہ کے رسالے جبکہ اصول کے بیان، علوم ومباحث فنون، یا مفید نصیحتوں تخویف وتہدید سے خالی ہوں، اسی طرح بارات کی آرائش اور آتش بازیاں اور ریشمی اور تار کے وہ کپڑے جو صرف مرد ہی پہن سکتے ہیں اور زردوزی کے مردانہ جوتے وغیرہ، ان سب کا بیچنا مکروہ ہے۔[4]

---

[1] لأنّه هو المتعارفُ فكأنّه استعملَ مالَ الغير بإذنه.

[2] تُلسی: ایک پودا جسے ہندو لوگ پوجتے ہیں۔ فیروز اللغات، ص ۳۷۵۔

[3] (وضمن بكسر معزف) .آلة اللهو . (قيمته) خشبا منحوتا (صالحا لغير اللهو .. (وصح بيعها) كلها وقالا لا يضمن ولا يصح بيعها، وعليه الفتوى. الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الغصب، ج٦ص ٢١١.

وكذا في الدّرر والغرر. كتاب الغصب، ج٢ص٢٦٨.

[4] لأن الانتفاع بهذه الأشياء حرام ومحليته يعتمد جواز الانتفاع بها..والحاصل:أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع (المحيط البرهاني ، كتاب البيوع، الفصل السادس، ج٦ص٣٤٧).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (باب البيع الفاسد،مطلب في بيع دودة القرمز، ج٥ص ٦٨).

مذاہبِ باطلہ کی کتابیں فروخت کرنا

مسئلہ : مذاہبِ باطلہ کی وہ کتابیں جن میں مذاہب حقہ کی تردید ہو اور دین باطل کفر و شرکیہ اقوال کی تائید اس طرح بدعت و ضلالت اور گمراہیوں کی تائید ہو اور کفر و شرک کے احکام اور عبادات سے بھری ہوئی ہو، ایسی کتابوں کو لکھنا، چھاپنا فروخت کرنا سب حرام ہے، باعتبار مالیت تو بعض کی بیع نافذ ہوگی اور بعض کی فاسد ہوگی، ہاں ان پر تردید کرنے کی غرض سے مطالعہ کرنا، خرید نا جائز ہے اور تجارت کی لالچ میں خرید نا گناہ عظیم ہے۔[1]

مسئلہ : بیع کی مکروہ ہونے کی علت کسی وجہ سے غیر معتبر یا مغلوب ہو جائے یا اس سے بچنے کی صورت نہ رہے تو صرف احتیاط یا کراہتِ تنزیہی باقی رہ جاتی ہے۔

رفع علت: رفع علت کی مثال جیسے آلات حرب، جنگ کے زمانے میں کفار کے ہاتھ فروخت کرنا مکروہ ہے، اور زمانہ امن و صلح میں فروخت کرنا مکروہ نہیں ہے لیکن فروخت نہ کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔[2]

علتِ مغلوبی: علت کراہت مغلوب ہونے کی مثال جیسے کتابوں، برتنوں، کپڑوں وغیرہ کے ساتھ تصویریں جن کی نہ قیمت ہے نہ اعتبار سے، (یعنی ان چیزوں میں تصویر کی خریداری مقصود نہیں ہے، تاہم خریدنے کے بعد ان تصاویر کے چہرہ مسخ کر دینا چاہیے، از ابن شائق)[3]

وأما القرد. فعن أبي حنيفة رضي الله عنه روايتان. (وجه) رواية عدم الجواز أنه غير منتفع به شرعا فلا يكون مالا كالخنزير.. والصحيح هو الأول؛ لأنه لا يشترى للانتفاع بجلده عادة بل للهو به، وهو حرام فكان هذا بيع الحرام للحرام، وأنه لا يجوز. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه،ج٥ ص ١٤٣).

ومنها أنه إذا كان شيء يحتمل مفسدة كان من حقه أن يكره كقوله صلى الله عليه وسلم: " فلا يغمس يده في الاناء، فإنه لا يدري أين باتت يده". حجة الله البالغة ،باب الأحكام التي يجر بعضها لبعض،ج١ص٣١٠.زمزم پبلشرز.

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] قال: "ويكره بيع السلاح في أيام الفتنة" معناه ممن يعرف أنه من أهل الفتنة؛ لأنه تسبيب إلى المعصية وقد بيناه في السير، وإن كان لا يعرف أنه من أهل الفتنة لا بأس بذلك؛ لأنه يحتمل أن لا يستعمله في الفتنة فلا يكره بالشك. (الهداية ،كتاب الكراهية،فصل في البيع،ج ٤ ص ٣٧٨).وكذا في الجوهرة النيرة (قبيل كتاب الوصايا،ج٢ ص ٢٨٦).

[3] يغتفر في التوابع ما لا يغتفر في غيرها وقريب منها: يغتفر في الشيء ضمنا ما لا يغتفر قصدا..ومنه غصب قنا فأبق من يده، وضمنه المالك يملكه الغاصب، ولو شراه قاصدا لم يجز،(الأشباه والنظائر،الفن االاول، القاعدة الرابعة"التابع تابع"،ص ١٠٣).

ضرورت: جیسے چہرہ والے نوٹ، روپے، یا وہ چیزیں جن میں تصویریں ہیں، ان سے بچنا ممکن نہ ہو تو مجبوری کی بناء پر ایسی چیزیں خریدنا جائز ہے، تاہم ایسی چیزیں بنانے والے گناہگار ہوں گے اور جو احتیاط کرے ایسی چیز نہ خریدے، وہ ثواب کے مستحق ہوں گے۔[1]

تصاویر کے احکام

کسی بھی جاندار کی تصویر بنانے والے پر حدیث میں لعنت وارد ہوئی ہے اور جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں کتے اور تصویریں ہوں، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔(مشکوۃ)[2]

اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا کہ اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جو تخلیق میں میری مشابہت اختیار کرے، وہ ایک ذرہ (چیونٹی) تو پیدا کرے، ایک دانہ تو پیدا کر کے دکھلائیں۔(مشکوۃ بحوالہ بخاری و مسلم)[3]

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ گھر میں کوئی تصویر والی چیز نہیں چھوڑتے تھے(بخاری و مسلم)[4]

---

[1] الضرورات تبيح المحظورات،ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة، وإساغة اللقمة بالخمر، والتلفظ بكلمة الكفر للإكراه وكذا إتلاف المال، وأخذ مال الممتنع الأداء من الدين بغير إذنه ودفع الصائل، ولو أدى إلى قتله.(الأشباه والنظائر لابن نجيم،الفن الاول، القاعدة الخامسة" الضرر يزال"ص٧٣).اما اتخاذ الصورة الشمسية للضرورة او الحاجة كحاجتها في جواز السفر وفي التاشيرة فينبغي ان يكون مرخصا فيه.(تكملة فتح الملهم، مسئلة التصوير في الاسلام، ج٤ص١٤٢).

[2] عن أبي طلحة قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: «لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا تصاوير.(مشكاة المصابيح ،كتاب اللباس، باب التصاوير، الفصل الاول،ج٢ ص ١٢٧٣).

وكذا في صحيح مسلم (كتاب اللباس والزينة،باب لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة ، رقم الحديث: ٢١٠٦.

[3] وعن أبي هريرة قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: " قال الله تعالى: ومن أظلم ممن ذهب يخلق كخلقي فليخلقوا ذرة أو ليخلقوا حبة أو شعيرة "(مشكاة المصابيح ،كتاب اللباس، باب التصاوير، الفصل الاول،ج٢ ص ١٢٧٤).

وكذا في صحيح مسلم (كتاب اللباس والزينة،باب لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة ، رقم الحديث: ٢١١١.

[4] عن علي، قال: كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في جنازة، فقال: " من يأتي المدينة فلا يدع قبرا إلا سواه، ولا صورة إلا طلخها، ولا وثنا إلا كسره " قال: فقام رجل فقال: أنا. ثم هاب أهل المدينة فجلس، قال علي: فانطلقت، ثم جئت فقلت: يا رسول الله لم أدع بالمدينة قبرا إلا سويته، ولا صورة إلا طلختها، ولا وثنا إلا كسرته، قال: فقال: " من عاد فصنع شيئا من ذلك فقد كفر بما أنزل الله على محمد(مسند أحمد ،مسند علي ابن ابي طالب، رقم الحديث:١١٧٠،ج٢ ص ٣٦٦ ط الرسالة).

مسئلہ : تصویر بنانا، بنوانا، فروخت کرنا، قلمی ہو یا عکسی، مجسم ہو یا منقش صرف چہرہ ہو یا پوری، یہ بڑا گناہ کا کام ہے، حرام ہے۔[1]

تصاویر کے گناہ کے درجات

سب سے بڑا گناہ انبیاء کرام علیہم السلام یا فرشتے صالحین کی تصویریں بنانا، گناہ ہونے کے علاوہ گستاخی بھی ہے کیونکہ ان کی تعظیم اس حالت میں شرعاً ممنوع ہے اور مٹانا واجب ہے، لہٰذا اس سے ان کی توہین ہوئی، یہ سخت گناہ ہوا[2]، یہی حکم ہے کہ اگر کسی نے نادانی سے ایسی تصویریں بنالیں تو ان کو مٹادیجائیں، جیسے مسجد ضرار کو ڈھادی گئی تھی، اس کے مٹانے میں پرواہ نہ کریں کیونکہ ان تصویروں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔[3]

وہ تصویریں جن کی پرستش کی جاتی ہیں، وہ تصویریں جن کی پرستش نہیں کی جاتی، اگر ان تصویروں کو مقصوداً بالذات خریدے اور ان میں کاری گری کے سوا کوئی اور مال نہ ہو تو ان کی بیع باطل ہے[4]، اگر ان میں کچھ اور مال بھی لگاہوا ہے تو مال کی مقدار میں بیع بکراہت شدیدہ نافذ ہوگی، اگر ایسی تصویریں کسی کتاب یا برتن وغیرہ پر ہیں اور ان کی وجہ سے قیمت یا رغبت میں اضافہ ہوتا ہو تو مکروہ ہے[5] اگر ان کی وجہ سے رغبت نہ بھی ہو تب بھی کراہت سے خالی نہیں ہے ہاں البتہ ان سے بچنا مشکل ہو جیسے روپیہ کاغذ، ٹکٹ، کارڈ وغیرہ جن پر تصویریں چھپی ہوتی ہیں تو چھاپنے والے تو گناہگار ہوں گے عام لوگوں کو گناہ

---

[1] قال أصحابنا وغيرهم تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم وهو من الكبائر وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيره فحرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق الله وسواء كان في ثوب أو بساط أو دينار أو درهم أو فلس أو إناء أو حائط(عمدة القاري شرح صحيح البخاري ،كتاب اللباس،باب عذاب المصورين يوم القيامة ،ج٢٢ ص ٧٠).
وكذا في البحر الرائق (كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة ومايكره فيها،ج٢ ص ٢٩).

[2] یہ کئی کبائر کا مجموعہ ہے اس لئے بالکل حرام اور ناجائز ہے بلکہ بے احتیاطی کی صورت میں تو کفر کا اندیشہ ہے، مزید تفصیل کے لئے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا رسالہ "تصحیح العلم فی تقبیح القلم" ملاحظہ فرمائیں جو امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۲۵۹ پر درج ہے۔

[3] لان التصوير معصية ورفع المعصية واجب بقدر الامكان كما صرحوا به في حكم البيع الفاسد والطلاق البدعي، فليراجع.

[4] باطل یعنی بیع فاسد ہے کیونکہ تصویر شرعاً مال متقوم نہیں اگرچہ لوگ اس کی رغبت رکھتے ہیں۔

[5] کیونکہ ایسی صورت میں یہ وصف مرغوب کے حکم میں ہوگا اور وصف مرغوب گویا کہ مشروط ہوتا ہے تو گویا معاملہ میں گناہ ومعصیت کی شرط لگائی گئی۔

نہیں ہو گا۔[1] (تاہم استعمال سے پہلے اس کا چہرہ مسخ کر دے، ازابن شائق)

بیع فاسد کے احکام:

بیع فاسد کی تعریف: وہ بیع ہے جو اصل کے اعتبار سے نافذ ہو لیکن صحت بیع کی شرائط میں سے کسی شرط کے فوت ہونے کی وجہ سے فاسد ہو جائے، اس میں ملک حرام حاصل ہوتی ہے لہٰذا یہ بیع منعقد ہے اور فسخ کرنا واجب ہے۔[2]

واجب الفسخ: واجب الفسخ فقہاء اس بیع کو کہتے ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے مشروع ہو اور وصف کے اعتبار سے ممنوع یا باعتبار اصول مشروع اور باعتبار اوصاف ممنوع۔

بیع فاسد ہونے کی وجوہات

بیع فاسد ہونے کی وجوہات چھ ہیں:

(سبب) اول: احتمال نزاع

۱۔ مبیع غیر مقدور التسلیم ہو جیسے پالتو جانور چھوٹ کر بھاگ جائے۔

۲۔ مبیع بائع کی ملک میں نہ ہو جیسے گندم جو بازار میں ہو اور بائع کی ملک میں نہ ہو۔

۳۔ مبیع یا ثمن کی ذات معلوم نہ ہو جیسے کوئی ایک گھوڑا فروخت کیا متعین نہیں کیا کونسا گھوڑا ہے؟ یا کہا کچھ قیمت دوں گا معلوم نہیں کتنی قیمت دیں گے۔

۴۔ مبیع و ثمن کے اوصاف معلوم نہ ہوں، جیسے میں نے پانچ روپے میں خریدا، یا دس من گندم فروخت کیا، اب معلوم نہیں کونسا سکہ ہے؟ کس وزن کا ہے؟ گندم کس وصف کا ہے عمدہ ہے یا ردی؟

۵۔ مبیع اور ثمن کی مقدار معلوم نہ ہو جیسے چہرہ دار روپیوں سے خریدا، ڈھاکہ کی ململ تھان فروخت کیا، اب معلوم نہیں کتنے روپے میں کتنے تھان خریدے گئے۔

---

[1] مرّ تخريجه غيرَ مرة.

[2] ان صفحات میں جو مسائل ذکر کئے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کی تخریج "بیع کی شرائط" کے ضمن میں ہو چکی ہے اس لئے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، جو مسئلہ نیا ذکر ہو گا صرف اس کی تخریج کی جائے گی۔

۶۔ مبیع میں اس طرح استثناء کرنا جس سے بیع مجہول ہو جائے جیسے میں نے اس درخت کے تمام پھل فروخت کئے سوائے پانچ کلو کے، یا اس باغ کے تمام درخت فروخت کئے سوائے ایک درخت کے۔

۷۔ مبیع میں کوئی ایسا حصہ مستثنیٰ کیا جو علیحدہ قابل استعمال نہ ہو جیسے جانور بیچا مگر اس کے حمل کو مستثنیٰ کیا۔[1]

۸۔ دین میں مدت ثمن کو مجہول کرنا۔

۹۔ مبیع کو حوالہ کرنے میں بائع کا زیادہ نقصان کا لازم آنا، جیسے اس چھت کے دھنیاں بیچیں (جس کے اکھڑنے میں ضرر ہے)

۱۰۔ وزن یا پیمائش کے لئے مخصوص آلہ آئندہ کے لئے مقرر کرنا جیسے گھی ایک پتھر سے فی کلو ۲۰ روپے کے حساب سے، یا یہ کپڑا اس چھڑی سے فی چھڑی ۲۵ روپے، اب اگر اسی مجلس میں ناپ کر دیا تو بہتر ہے یعنی بیع منعقد ہو جائے گی، اگر اسی مجلس میں ناپ کر نہیں دیا تو چونکہ اس خاص پیمانے کے ہلاک ہونے اور نزاع پیش آنے کا احتمال ہے اس لئے بیع فاسد ہو گی۔[2]

۱۱۔ مبیع میں ایسے اوصاف کی شرط لگانا جو بائع کے اختیار میں نہیں، جیسے اس درخت کا آم اتنا بڑا ہوتا ہے، یہ بکری اتنی دودھ دیتی ہے (اس وصف کے لحاظ سے قیمت متعین کرے) تو یہ شرط مفسد ہے، یہ اوصاف بیع میں شرط نہ ہوں ویسے ذکر کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں (عالمگیری)[3]

---

[1] لو استثنى من المبيع ما يجوز إفراده بالعقد جاز الاستثناء كما لو باع صبرة إلا صاعا منها أو دنا من خل أو دهن إلا عشرة أمناء وكذلك لو كان عدديا متقاربا جاز البيع ولو استثنى منه ما لا يجوز إفراده بالعقد لا يصح استثناؤه كما لو باع جارية إلا حملها أو شاة إلا عضوا منها أو قطيعا من الغنم إلا شاة أو سيفا محلى إلا حليته لم يجز(الفتاوى الهندية كتاب البيوع، الباب التاسع فى بيع الاشياء المتصله،ج۳ ص ۱۳۰).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج۲ ص ٦۳).

[2] قوله وبوزن حجر لا يعرف مقداره) هذا إذا كان الإناء والحجر بحالهما أما لو تلفا قبل أن يسلم ذلك فسد البيع لأنه لا يعلم مبلغ ما باعه منه (الجوهرة النيرة ،كتاب البيوع،ج۱ ص ۱۸٦).

وكذا في تبيين الحقائق (كتاب البيوع،ج٤ ص ٥).

[3] ولو باع شاة على أنها تحلب كذا كذا فالبيع فاسد باتفاق الروايات وكذلك لو اشتراها على أنها تضع بعد شهر فالعقد فاسد... اشترى جارية على أنها تغني كذا كذا صوتا فإذا هي لا تغني جاز ولا خيار له قالوا وهذا إذا ذكر هذه الصفة على

(سبب) دوم: بعض شرط کو ترک کرنا لازم ہے۔

ا۔ جیسے بیع کو موقت کرنا۔

۲۔ مبیع کو مؤجل کرنا۔

۳۔ ثمن غیر متقوم ہونا جیسے شراب، خنزیر سے کپڑا وغیرہ خریدنا (شراب اور خنزیر کی قیمت لازم ہو گی)۔

(سبب) سوم: مبیع کا استعمال جائز نہ ہونا

ا۔ مردار کی کھال کو دباغت سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے (ہاں دباغت کے بعد فروخت کرنا جائز ہے چاہے حلال جانور ہو یا حرام) اگر جانور کو ذبح کیا تو دباغت سے پہلے فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

۲۔ بیع میں ایسی صفت کا شرط لگانا جو کہ گناہ ہے جیسے یہ مینڈھا ایسا لڑتا ہے، یہ لونڈی خوب ناچتی ہے۔

(سبب) چہارم: سود کا شبہ ہونا

ا۔ جیسے کوئی چیز خرید کر پھر اسی بائع کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا، ہاں البتہ بعض صورتوں میں بائع کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے۔

ا۔ مبیع میں تغیر پیدا ہو جائے۔

۲۔ دوسرا ثمن پہلے ثمن کی جنس سے نہ ہو۔

۳۔ تمام قیمت ادا کر چکا ہو (بعض کا ثمن ادا کر دینا کافی نہیں۔)[1]

بیع مزابنہ کا حکم

مزابنہ کا معنی خشک کھجور کو درخت پر لگے ہوئے تر کھجور کے عوض تخمین اور اندازہ

وجه التبري عن العيب(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع،الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسده ،ج٣ ص ١٣٧).والتفصيل في بدائع الصنائع (كتاب البيوع، شرائط الصحة في البيوع، ج٥ص١٦٩).

[1] (و) فسد (شراء ما باع بنفسه أو بوكيله) من الذي اشتراه ولو حكما كوارثه (بالأقل) من قدر الثمن الأول (قبل نقد) كل (الثمن) الأول. صورته: باع شيئا بعشرة ولم يقبض الثمن ثم شراه بخمسة لم يجز وإن رخص السعر للربا..(ولا بد) لعدم الجواز (من اتحاد جنس الثمن) وكون المبيع بحاله (فإن اختلف) جنس الثمن أو تعيب المبيع (جاز مطلقا) (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٧٣).

وكذا في شرح مختصر الطحاوي للجصاص (كتاب البيوع، باب المصراة وغيرها، ج٣ ص ٧٧).

سے فروخت کرنا،اس میں چونکہ کمی زیادتی کا احتمال ہے اس لئے جائز نہیں ہے،اسی طرح اشیاء ربویہ میں سے کسی کو دوسرے کی عوض تخمینہ سے فروخت کرنا جیسے گندم کی ایک ڈھیر کو دوسرے کے عوض اندازہ سے فروخت کرنا۔[1]

(سبب) پنجم: ایجاب وقبول کے طریقوں میں احتمال

ا۔ ملامسہ۔ ۲۔ بیع منابذہ۔ ۳۔ بیع بالقاء الحجر۔[2]

(سبب) ششم: بیع فاسد[3]

مقتضاء عقد کے خلاف شرائط سے بھی عقد فاسد ہو جاتا ہے (لیکن ہدایہ اور اس کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مقتضاء عقد کے مطابق ہو یا مناسب ہو، یا منصوص بالجواز ہو، یا اس کا ہونا متعارف ہو، اس سے عقد میں فساد لازم نہیں آتا، سید ارشد حسن)

وہ شرط یا تو اس میں بائع کا فائدہ ہو گا جیسے مکان فروخت کیا اس شرط پر کہ بائع اس میں ایک ماہ تک قیام کرے گا، یا مشتری کا اس میں فائدہ ہو جیسے گھوڑا خریدا اس شرط پر کہ دوسرا گھوڑا بھی میرے ہی ہاتھ فروخت کرنا ہو گا، کسی اور کو فروخت نہیں کر سکتے، یا مبیع اگر انسان ہو تو اس سے اس کو فائدہ ہو جیسے لونڈی

---

[1] "و(لايجوز) بيع المزابنة، وهو بيع الثمر على النخيل بتمر مجذوذ مثل كيله خرصا" لأنه عليه الصلاة والسلام "نهى عن المزابنة والمحاقلة" فالمزابنة ما ذكرنا، (الهداية ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج ٣ ص ٤٤).

قال المصنف (وهذا) يعني البيع مجازفة مقيد بغير الأموال الربوية إذا بيعت بجنسها، فأما الأموال الربوية إذا بيعت بجنسها فلا يجوز مجازفة لاحتمال الربا، وهو مانع كحقيقة الربا.(فتح القدير ،كتاب البيوع، ج٦ص ٢٦٤)

[2] بیع ملامسہ کا معنی یہ ہے کہ بائع ومشتری بھاؤ تاؤ کر رہے ہوں اس دوران مشتری مبیع کو ہاتھ لگائے، بس ہاتھ لگانے سے بائع کا اختیار ختم ہو جائے گا اور وہ ہر حال میں مبیع مشتری کے ہاتھ فروخت کرے گا، منابذۃ کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری کی طرف مبیع پھینکدے اور پھینکتے ہی خریدار کا اختیار سلب ہو جائے، اور بالقاء الحجر کی صورت یہ تھی کہ خریدار مبیع کو کوئی کنکر وغیرہ مارتا جس کے بعد بائع کی مرضی ختم ہو جاتی تھی اور وہ چاہے نہ چاہے فروخت کرتا، ان تینوں بیوعات کے ناجائز ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس میں دونوں فریق کی رضامندی برقرار نہیں رہتی بلکہ ایک فریق فروختگی یا خریداری پر مجبور ہو جاتا ہے۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وعلى هذا يخرج بيع المنابذة، والملامسة، والحصاة الذي كان يفعله أهل الجاهلية: كان الرجلان يتساومان السلعة فإذا أراد أحدهما إلزام البيع نبذ السلعة إلى المشتري؛ فيلزم البيع رضي المشتري أم سخط، أو لمسها المشتري، أو وضع عليها حصاة فجاء الإسلام فشرط الرضا وأبطل ذلك كله،(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط الصحة في البيوع، ج٥ ص ١٧٦).

[3] مطبوعہ نسخہ میں یہ لفظ اسی طرح ہے، سیاق وسباق کے لحاظ سے "شرطِ فاسد" ہونا چاہئے۔

فروخت کی اس شرط پر کہ اس کو ام ولد بنانا، یا غلام فروخت اس شرط پر کہ اس کا نکاح کروادینا، ان تینوں صورتوں میں عقد فاسد ہوگا۔

لیکن ان تینوں میں سے کسی کا فائدہ نہ ہو جیسے بکری فروخت کی اس شرط پر کہ اس کو ذبح کرنا، یا مکان فروخت کیا اس شرط پر کہ اس کی مرمت کرنا، تو یہ شرط لغو ہے بیع صحیح ہے [1]، اور بیع میں ایسی شرط جو کسی اجنبی کے حق میں ہو جیسے میں نے یہ چیز فروخت کی اس شرط پر کہ زید کو قرض دینا، بکر کو نوکری دینا ہوگا وغیرہ، یہ شرط اکثر فقہاء کے نزدیک لغو ہے [2] (اگر اس شرط پر غلام فروخت کیا کہ زید کا کھانا پکا کر دے گا تو احقر کے نزدیک صفقۃ فی صفقۃ کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی، ابن المؤلف)

ہاں البتہ یہ شرط ایسی ہوں کہ اس کی بنیاد پر بعد میں دعویٰ اور منازعت پیدا ہوتے ہوں، تو یہ دونوں شرطیں بھی مفسد بیع ہوں گے۔ (البحر الرائق) [3]

مسئلہ: ہر وہ شرط جو حقوق مسلمہ کو ثابت کرے جیسے اداء ثمن کے لئے کوئی ضامن مشتری سے لیا جائے، یا ضمان الدرک (یعنی اگر مبیع کے کل یا بعض کا کوئی مستحق نکل آیا تو اس کا میں ذمہ دار ہوں) اسی طرح خیار شرط وغیرہ صحیح اور معتبر ہیں، ان سے بیع فاسد نہیں ہوتی۔ [1]

---

[1] ولو شرطا شرطا فيه ضرر لأحد العاقدين بأن باع ثوبا أو حيوانا سوى الرقيق بشرط أن لا يبيعه ولا يهبه ذكر في المزارعة الكبيرة ما يدل على أن البيع بهذا الشرط لا يفسد فإنه ذكر أن أحد المزارعين لو شرط في المزارعة أن لا يبيع الآخر نصيبه أو لا يهبه قال المزارعة جائزة والشرط باطل لأنه ليس لأحد المتعاملين فيه منفعة هكذا ذكر الحسن في المجرد وروى أبو يوسف في الأمالي خلافه وهو قوله إن البيع بمثل هذا الشرط فاسد والصحيح هو الأول(تحفة الفقهاء،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ٥٣).

(فيصح) البيع (بشرط يقتضيه العقد).. (أو لا يقتضيه ولا نفع فيه لأحد) ولو أجنبيا ابن ملك، فلو شرط أن يسكنها فلان أو أن يقرضه البائع أو المشتري كذا فالأظهر الفساد ذكره أخي زاده وظاهر البحر ترجيح الصحة (كشرط أن لا يبيع) عبر ابن الكمال بيركب (الدابة المبيعة) فإنها ليست بأهل للنفع (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،مطلب في البيع بشرط فاسد،ج٥ ص ٨٦).

[2] المراد بالنفع ما شرط من أحد العاقدين على الآخر، فلو على أجنبي لا يفسد ويبطل الشرط، لما في الفتح عن الولوالجية: بعتك الدار بألف على أن يقرضني فلان الأجنبي عشرة دراهم فقبل المشتري لا يفسد البيع؛ لأنه لا يلزم الأجنبي ولا خيار للبائع (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،مطلب في البيع بشرط فاسد،ج٥ ص ٨٥).

وكذا في البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد ،ج٦ ص ٩٣).

[3] الحاشية السابقة.

مسئلہ ۸: ہر وہ شرط جو تاجروں کے عرف میں جاری ہو جائے اور مقتضاء بیع کے خلاف نہ ہو تو ایسی شرط لگانا جائز ہے جیسے کپڑا خریدا کہ اس سے تہ کر دو، ٹوپی قالب پر چڑھادو، مال کو مشتری کے گھر پہنچانا ہو گا۔[2]

بیع فاسد کا حکم

۱۔قبضہ سے پہلے اس کا کوئی حکم نہیں۔

۲۔اور قبضہ کے بعد بطور حرام ملک میں آجاتی ہے مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ بائع کی طرف سے رضامندی ہو اور قبضہ کی اجازت ہو اور مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے، اگر مجلس عقد کے بعد قبضہ ہوا یا بائع کی اجازت کے بغیر قبضہ کر لیا تو ملک حاصل نہ ہو گی۔[3]

۳۔قبضہ کے بعد اگر مال بعینہ موجود ہو تو مال واپس کر کے بیع کو فسخ کرنا واجب ہے، قاضی کے حکم کی ضرورت نہیں (تنویر الابصار)۔[4]

۴۔اگر مشتری یا بائع میں سے کوئی عقد فاسد کو برقرار رکھنے پر اصرار کرے اور دوسرا انکار کرے اگر قاضی کے عدالت میں مقدمہ پیش ہو جائے تو قاضی جبراً فسخ کرادے (در مختار)[1]

---

[1] ونعني به أنه يؤكد موجب العقد إذ تأكيد موجب الشيء يلائم ذلك الشيء، وذلك كالبيع بشرط أن يعطي المشتري كفيلاً بالثمن، والكفيل معلوم بالإشارة أو التسمية ..جاز البيع استحساناً، والكفالة إن لم تكن من مقتضيات البيع إلا أنها تؤكد موجب العقد، فما يؤكدها يكون ملائماً للعقد، فلا يؤثر في فساد العقد. وكذلك البيع بشرط أن يعطي المشتري بالثمن رهناً والرهن معلوم بالإشارة أو التسمية جاز البيع استحساناً(المحيط البرهاني ،كتاب البيوع، الفصل التاسع في الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسد،ج٦ ص ٣٨٩).

ومعنى كون الشرط يقتضيه العقد أن يجب بالعقد من غير شرط، ومعنى كونه ملائما أن يؤكد موجب العقد(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد ،ج٦ ص ٩٢).

[2] وإن شرطا شرطا لا يقتضيه العقد ولا يلائمه ولأحدهما فيه منفعة إلا أنه متعارف بأن اشترى نعلا وشراكا على أن يحذوه البائع جاز استحسانا والقياس أن لا يجوز وهو قول زفر۔ولكن أخذنا بالاستحسان لتعارف الناس كما في الاستصناع (تحفة الفقهاء،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ٥٢).وكذا في الهداية (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ ص ٥٠).

[3] مر بيانه.

[4] (و) يجب (على كل واحد منهمافسخه قبل القبض) ويكون امتناعا عنه ابن الملك (أو بعده ما دام) المبيع بحاله جوهرة (في يد المشتري إعداما للفساد) ؛ لأنه معصية فيجب رفعها بحر (و) لذا (لا يشترط فيه قضاء قاض) ؛ لأن الواجب شرعا لا يحتاج للقضاء(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٩٠).وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، احكام البيع الفاسد،ج٦ ص ١٠٣).

۵۔اگر قبضہ کے بعد مال بعینہ ملک میں موجود نہ ہو تو خریدار پر واجب ہے کہ مال کی قیمت ادا کرے اس دن کی قیمت جس دن مال پر قبضہ ہوا تھا، اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس دن مال ہلاک ہوا اس دن کی قیمت ادا کرے (شامی)[2]

٦۔ بیع فاسد میں اگر مشتری کسی طرح مال بائع کے ہاتھ میں واپس پہنچادے تو فوراً بیع فسخ ہو جائے گی اور مشتری بری ہو جائے گا (تنویر الابصار)[3]

۷۔ حق فسخ مال کی ملک میں موجودگی کے ساتھ متعلق ہے، بائع اور مشتری زندہ ہوں یا نہ ہوں۔ (تنویر الابصار)[4]

۸۔اگر بیع فاسد کے بعد بائع کا انتقال ہو گیا جبکہ مشتری مال کی قیمت ادا کر چکا تھا تو دوسرے قرض خواہوں کے مقابلے میں مشتری زیادہ حق دار ہے یعنی زید نے بکر سے ایک مکان بیع فاسد کے طور پر خرید کر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد بکر قرض دار ہونے کی حالت میں مفلس ہو کر مر گیا، اب قرض خواہوں کو حق ہے کہ مکان زید سے واپس کرالیں، اب اس کو فروخت کرنے کے بعد سب سے پہلے زید کی ادا کردہ قیمت واپس کی جائے گی اس کے بعد جو باقی بچے وہ دوسرے قرض خواہ لیں گے۔[5]

۹۔ عقد فاسد میں قبضہ سے ملک حرام حاصل ہوتی ہے، لہٰذا اس کے بعد اگر مشتری نے کوئی تصرف کیا مثلاً

---

[1] (وإذا أصر) أحدهما (على إمساكه وعلم به القاضي فله فسخه) جبرا عليهما حقا للشرع بزازية(الدر المختار ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٩١).

[2] (ملكه)..(بمثله إن مثليا وإلا فبقيمته) يعني إن بعد هلاكه أو تعذر رده (يوم قبضه) ؛ لأن به يدخل في ضمانه فلا تعتبر زيادة قيمته كالمغصوب. (الدر المختار،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٨٩).

[3](وكل مبيع فاسد رده المشتري على بائعه بهبة أو صدقة أو بيع أو بوجه من الوجوه) كإعارة وإجارة وغصب (ووقع في يد بائعه فهو متاركة) للبيع (وبرئ المشتري من ضمانه) قنية. (الدر المختار، باب البيع الفاسد، مطلب رد المشترى فاسدا إلى بائعه فلم يقبله ج٥ ص٩١).

[4] (و) يجب (على كل واحد منهمافسخه قبل القبض) ويكون امتناعا عنه ابن الملك (أو بعده ما دام) المبيع بحاله جوهرة (في يد المشتري إعداما للفساد) ؛ لأنه معصية فيجب رفعها بحر .....(ولا يبطل حق الفسخ بموت أحدهما) فيخلفه الوارث به يفتى (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٩٠).

[5]أحقية المشتري في المبيع بيعا فاسدا: إذا توفي البائع مفلسا بعد فسخ البيع الفاسد، أو قبله؛ يكون المبيع في يد المشتري كرهن وهو أحق به من سائر الغرماء(درر الحكام،كتاب البيوع، الباب السابع،رقم المادة ٣٧٢،ج١ ص ٣٩٨).
وكذا في الدر المختار (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٩٦).

آگے کسی کے ہاتھ فروخت کردیا یا ہبہ کردیا یا صدقہ کردیا تو یہ تصرفات نافذ ہو جائیں گے۔

الف۔ عقد فاسد سے جو ملک حاصل ہوتی ہے، اس سے نفع نہ اٹھائے، کھانے پینے وغیرہ کے اعتبار سے۔

ب۔ اسی طرح اگر مبیع لونڈی ہے تو اس سے ہم بستری نہ کرے، نہ نکاح کرکے نہ بلا نکاح کے۔

ج۔ ایسی زمین میں شفعہ کا حق حاصل نہ ہوگا۔[1]

۱۰۔ بیع فاسد سے ملک میں جو حرمت آتی ہے وہ حرمت متعدی نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے بعد وارث لوگ کسی جائز طریقہ سے اس کے مالک بن جائیں تو ان کے لئے اس کا استعمال حلال ہے کراہت کے ساتھ (شامی) بشرطیکہ معلوم ہو کہ پہلے کے پاس ملک حرام تھی۔ (الاشباہ)

قال في الاشباه: إذا قبض المشتري المبيع بيعا فاسدا ملكه إلا في مسائل: الأولى: لا يملكه في بيع الهازل كما في الأصول. الثانية: لو اشتراه الأب من ماله لابنه الصغير وباعه له كذلك فاسدا لا يملكه به بالقبض حتى يستعمله، كذا في المحيط. الثالثة: لو كان مقبوضا في يد المشتري أمانة لا يملكه به. (رد المحتار ج٤ص٩)[2]

۱۱۔ مذکورہ بالا حکم ان اموال کے متعلق ہے جن میں فساد عقد کے علاوہ اور کوئی خرابی نہ ہو جیسے کپڑے کو ثمن مجہول کے ساتھ فروخت کیا جس کی وجہ سے عقد فاسد ہوگیا، اگر اس میں فساد عقد کے علاوہ کوئی ذاتی خبث بھی ہو جیسے شراب وخنزیر یا کوئی چیز جس کی خرید وفروخت ممنوع ہو تو ایسی چیزوں میں بیع کو جائز کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

۱۲۔ جو نقود ایسے معاملات فاسدہ سے حاصل ہوں ان سے حرمت متعلق نہ ہوگی، کیونکہ نقود متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے، اس کی مزید تفصیل حرام اور نجس اشیاء کے بیان کے ضمن میں گذر گئی ہے، ایسے ناجائز معاملات کا وبال اور ملک حرام کا گناہ ضرور گردن پر رہے گا۔[3]

---

[1] المشتري إذا قبض المبيع في الفاسد بإذن بائعه ملكه. وتثبت أحكام الملك كلها إلا في مسائل؛ لا يحل له أكله ولا لبسه، ولا وطؤها لو كانت جارية ولو وطئها ضمن عقرها، ولا شفعة لجاره لو كانت عقارا. الخامسة: لا يجوز أن يتزوجها البائع من المشتري كما ذكرناه في الشرح. (الأشباه والنظائر لابن نجيم ،الفن الثاني ،كتاب البيوع،ص ١٧٥).
وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٥ص٩٠).

[2] الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع،ج٤ ص ٥٠٨).

[3] مر بيانه وانظر الحاشية الاتية ايضا.

۱۳۔اگر بیع فاسد میں مبیع پر قبضہ کے بعد کچھ فائدہ حاصل کیا تو اس نفع کو صدقہ کر دے۔[1]

بیع فاسد کے تین درجات

۱۴۔فقہاء کے نزدیک بیع فاسد میں سود کا شبہ ہے[2]، لہٰذا فساد کے تین درجات ہیں:

اول درجہ: جس کا فساد ظاہر ہو یعنی اس کا فاسد ہونا بائع اور مشتری دونوں جانتے ہوں، اس کا حکم بیان ہو گیا۔

دوم درجہ، جائز الفساد: جب کہ بائع و مشتری دونوں یا ایک کو اس کا فاسد ہونا معلوم نہ ہو، جیسے زید نے عمر کا ہاتھ غصب کر کے بکر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بکر نے محمود کے ہاتھ فروخت کیا، پھر زید نے عمر کو قیمت ادا کر کے اس غصب شدہ مال پر ملک حاصل کر لی، اب زید نے جو بکر کے ہاتھ فروخت کیا وہ بیع صحیح ہو گئی اور بکر نے جو محمود کے ہاتھ فروخت کیا وہ بیع فاسد ہوئی (ہدایہ) اور ایسی ہی جب وجہ فساد ظاہر نہ ہو۔[3]

تو اس کا حکم یہ ہے کہ فساد کے علم ہونے سے پہلے جو تصرف کر لیا، نفع حاصل کر لیا وہ حلال ہے اور علم ہو جانے کے بعد تصرف جائز نہیں ہے بلکہ اگر مال موجود ہے تو اس کو واپس کرنا واجب ہے اگر موجود نہ ہو تو نہ گناہ ہے نہ تاوان لازم ہے۔[4]

---

[1] (وطاب للبائع ربح ثمنه) من دراهم المبيع أو دنانيره (بعد التقابض) أي اشتراك البائع والمشتري في قبض المبيع والثمن لتملكه ولم يطب قبله لعدم تملكه (لا) أي لا يطيب (للمشتري ربح مبيعه فيتصدق) المشتري (به) أي بالربح وجوبا(مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج ٢ ص ٦٧).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب البيوع، الفصل الخامس والعشرون: في البياعات المكروهة،ج٧ ص ١٤١).

[2] صرح الولوالجي رحمه الله تعالى من الفصل السابع بأنه معصية يجب رفعها وسيأتي في باب الربا أن كل عقد فاسد فهو ربا(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٦ ص ٧٤).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٥ ص ٤٩).

[3] غصب عبدا وباعه من إنسان ثم إن المشتري باعه من آخر ثم إن المالك ضمن الغاصب فإنه ينفذ البيع الأول ويبطل بيع المشتري كذا في الفصول العمادية(الفتاوى الهندية،كتاب البيوع، الفصل الثالث في بيع المرهون والمستاجر،ج٣ ص ١١١).

وكذا في الهداية (كتاب البيوع،فصل في بيع الفضولي،ج ٣ ص ٦٨).

[4] قال محمد: حدثنا أبو حنيفة يرفعه إلى عائشة رضي الله عنها أن امرأة سألتها فقالت: إني اشتريت من زيد بن أرقم جارية بثمانمائة درهم إلى العطاء ثم بعتها منه بستمائة درهم قبل محل الأجل، فقالت عائشة رضي الله عنها بئسما شريت وبئسما اشتريت، أبلغي زيد بن أرقم أن الله أبطل حجه وجهاده مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إن لم يتب، فأتاها زيد بن أرقم معتذرا، فتلت عليه قوله تعالى {فمن جاءه موعظة من ربه فانتهى فله ما سلف}.(العناية شرح الهداية كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٦ ص ٤٣٣).وكذا في المبسوط للسرخسي(كتاب البيوع، باب العيوب في البيوع،ج١٣ ص ١٢٢).

درجہ سوم، فساد لازم: جو کسی طرح رد ہی نہ ہوسکے، یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ عوضین میں سے ایک ملک کو قبول نہ کرتا ہو جیسے شراب دے کر کپڑا خریدا، اب قیمت ادا کرنے کے بعد کپڑے میں ملک حاصل ہوسکتی ہے مگر شراب میں تو کسی طرح ملک نہیں ہوسکتی ہے۔[1]

بیع باطل کے احکام

ہر وہ چیز جس پر ملک ثابت نہیں ہوسکتی اس کی بیع باطل ہے، جیسے آدمی، خشکی یا تری کے جانوروں کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنا، پانی کو اپنے معدن میں ہوتے ہوئے فروخت کرنا، جیسے دریا، کنواں، اور جب پانی کو کسی برتن یا ٹنکی میں محفوظ کرلیا جائے تو اب مملوک ہے اس کو فروخت کرنا جائز ہے، جنگل اور اس میں اُگے ہوئے درخت، پہاڑ کی خودرو گھاس محفوظ کرلینے سے پہلے فروخت کرنا بیع باطل ہے[2]، آگ کو فروخت کرنا جبکہ لکڑی یا کوئلہ کے ساتھ نہ ہو، باطل ہے، آباد مسجد، مکہ مکرمہ کی سرزمین، حرم کے اندر کا شکاری جانور، انسانی اعضاء کی خرید وفروخت بھی باطل میں داخل ہے چاہے وہ انسان آزاد ہو یا غلام۔

۲۔ یعنی ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل نہ ہوسکے جیسے عبد مدبر یا مکاتب، ان کی بیع باطل ہے۔

۳۔ معدوم چیز کی بیع بھی باطل ہے، جیسے پھل کو نکلنے سے پہلے فروخت کرنا، حمل کو پیدائش سے پہلے فروخت کرنا، حق دین، حق علو۔

۴۔ مشکوک الوجود، یعنی مبیع کی حوالگی مشکوک ہو جائے جیسے حمل، ایڈیکا، لچا، تھنوں میں دودھ، یا وہ شکار فروخت کرتا ہوں جو اس جال میں پھنس جائے، یا اس غوطہ میں جو موتی ملے وہ میں نے آپ کے ہاتھ فروخت کردیا۔

---

[1] اب اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں عاقدین کی ذمہ داری ہے کہ اس کو فسخ کریں، اگر فسخ کرنے سے پہلے خریدار نے اس میں کوئی ایسا تصرف کیا جس کی وجہ سے اب مبیع واپس کرنا ممکن نہ رہا تو اس صورت میں خریدار پر اس چیز مثلاً اس جتنی شراب کی قیمت دینی لازم ہوگی۔

اذا اشترى عبدا بخمر او خنزير فقبضه وأعتقه أو وهبه فهو جائز وعليه القيمة(الجامع الصغير، كتاب البيوع، باب مايجوز بيعه ومالايجوز،ص ٣٣٠).

وكذا في الهداية (كتاب البيوع، فصل في احكامه،ج٣ ص ٥٢).

[2] لعدم الملك.

۵۔ وہ مبیع مال ہی نہ ہو، جیسے خون، مردار، مرا ہوا جانور، پیشاب یا اس جیسی بالکل نکمی چیز، ان سب کو یا کسی فرد کو بیچنا بیع باطل ہے، مبیع مال غیر متقوم ہو جیسے شراب، خنزیر کو روپے کے عوض فروخت کرنا۔

۶۔ مبیع کا ذکر نہ ہو کہ کیا چیز ہے؟ مثلاً یوں کہے کہ میں نے ایک ہزار کا خریدا اور مال کا ذکر نہیں کیا، اس کے برخلاف اگر مال ذکر کیا اور ثمن ذکر نہیں کیا مثلاً یوں کہے کہ میں نے یہ کپڑا خریدا اور ثمن کے ذکر سے سکوت اختیار کیا تو یہ بیع فاسد ہے باطل نہیں۔

۷۔ مبیع غیر کی مملوک ہو جیسے غصب شدہ مال یا چوری کا مال یا فضولی کا اپنے لئے بیچنا (فضولی کا اپنے لئے بیچنے کا باطل ہونا صاحب درر، اور بحر الرائق کی تصریح کے مطابق ہے اور شامی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق مالک کی اجازت پر موقوف ہے۔)[1]

۸۔ عقد جانبین کے لئے نفع کے تصور سے خالی ہو تب بھی بیع باطل ہے جیسے ایک درہم کو دو[2] درہم کے عوض فروخت کرنا۔

۹۔ مبیع متعین نہ ہو تب بھی بیع باطل ہے، لہٰذا بیع صرف میں عاقدین نے اگر مجلس عقد میں قبضہ نہیں کیا تو بیع باطل ہو گا کیونکہ نقدین قبضہ کے بغیر متعین نہیں ہوتے اور جو چیز متعین نہ ہو وہ مبیع نہیں بن سکتا، پس جب ایک طرف یا دونوں طرف سے قبضہ نہ ہوا تو نہ مبیع پایا گیا نہ بیع ہو گی۔[3]

---

[1] مر تخريجه.

[2] بظاہر یہ کاتب کی غلطی ہے اصل عبارت "ایک درہم کو ایک درہم کے عوض۔۔" ہونی چاہئے، ایک درہم کے بدلے دو درہم بیچنے میں خریدار کا واضح فائدہ موجود ہے اس لئے یہ بیع باطل نہیں، البتہ ربا اور بیع فاسد ہے جس کی تفصیل "سکوں کے احکام" میں گزر چکی ہے۔

[3] "فإن افترقا في الصرف قبل قبض العوضين أو أحدهما بطل العقد" لفوات الشرط وهو القبض ..إلا إذا أسقط الخيار في المجلس فيعود إلى الجواز لارتفاعه قبل تقرره (الهداية ،كتاب البيوع،كتاب الصرف،ج٣ ص ٨١)

قوله: (وإن افترقا في الصرف قبل قبض العوضين أو أحدهما بطل العقد) وفائدته أنه لو قبضه بعد ذلك لا ينقلب جائزا ويدل هذا القول أن التقابض في الصرف شرط الجواز لا شرط الانعقاد قال في النهاية: التقابض في الصرف شرط لبقاء العقد لا لانعقاده وصحته؛ لأنه قال في الكتاب: بطل العقد ولا بطلان إلا بعد الانعقاد والصحة. (الجوهرة النيرة ،كتاب البيوع، باب الصرف،ج١ ص ٢٢٢)

وراجع الدر المختار وحاشية ابن عابدين ايضا (كتاب البيوع، باب الصرف،ج٥ ص ٢٥٨).

۱۰۔ بائع کی رضا کے بغیر جو بیع ہوئی وہ بھی باطل ہے جیسے مذاق میں خرید وفروخت یاانکار کے باوجود یکطرفہ قبول کرنا، یا وہ نیلام جس میں بیع منعقد ہونے کے لئے بائع کی رضامندی شرط نہ ہو بلکہ آخری بولی پر ہر صورت میں دیناہی پڑے گا۔[1]

۱۱۔ عاقدایک ہی ہو، جیسے ایک شخص دونوں جانب سے عقد کا متولی بنے یاعاقد مجنون ہو۔

مسئلہ: یتیم کامال غبن فاحش کے ساتھ فروخت کرنا بیع باطل ہے۔(درر)

بیعِ باطل کاحکم

بیع باطل کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے قبضہ کے باوجود اس سے ملک حاصل نہیں ہوتی،اب اگرمال پر قبضہ ہواتواس کے بارے ایک قول یہ ہے کہ یہ مال امانت ہے یعنی ضائع ہو جائے تو ضمان نہیں آئے گا،دوسرا قول یہ ہے کہ ضمان آئے گا یہی قول صحیح ہے۔[2]

باطل کی دوقسمیں:

---

[1] فریقین کی رضامندی عقد کے درست ہونے کے لئے ضروری ہے لیکن اس کی حیثیت شرط صحت کی ہے شرط انعقاد کی نہیں ہے،لہٰذااگر کوئی فریق رضامند نہ ہو لیکن اس کے باوجود ایجاب وقبول ہو جائے تو یہ بیع اصطلاحی معنی میں بیع باطل نہیں کہلائے گی بلکہ بیع فاسد ہے جو کہ اس فریق کی رضامندی پر موقوف ہے۔

(ومنها) الرضا لقول الله تعالى: {إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم} عقيب قوله {يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل} وقال عليه الصلاة والسلام لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب من نفسه» فلا يصح بيع المكره إذا باع مكرها وسلم مكرها؛ لعدم الرضا، فأما إذا باع مكرها وسلم طائعا فالبيع صحيح على ما نذكره في كتاب الإكراه؛ ولا يصح بيع الهازل؛ لأنه متكلم بكلام البيع لا على إدارة حقيقته فلم يوجد الرضا بالبيع، فلا يصح(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط الصحة، ج٥ ص ١٧٦).

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں(حاشیہ ابن عابدین علی الدر المختار، کتاب البیوع،ج۴ص۵۰۸،۵۰۷)۔

[2] والبيع الباطل لا يفيد الملك وإن اتصل به القبض حتى لو كان المبيع عبدا فأعتقه لا ينفذ إعتاقه والفاسد عندنا يفيد الملك إذا اتصل به القبض(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، فصل في البيع الباطل،ج٢ص٦٧).

(و) البيع الباطل (حكمه عدم ملك المشتري إياه) إذا قبضه (فلا ضمان لو هلك) المبيع (عنده) ؛ لأنه أمانة وصحح في القنية ضمانه، قيل وعليه الفتوى. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع،مطلب بيع المضطر وشراؤه،ج٥ ص ٥٩).وكذا في بدائع الصنائع ،حكم البيع، البيع الباطل،ج٥ ص ٣٠٥).

ورجح في مجلة الاحكام العدلية القول الاول من ان المقبوض بالبيع الباطل امانة في يد المشتري، انظر المجلة، رقم المادة ٣٧٠.

۱۔ ظاہر البطلان: جبکہ بائع اور مشتری دونوں بیع کے باطل ہونے سے واقف ہوں، یا وجہ باطل کی اصلاح ممکن نہ ہو جیسے مردار، شراب، خنزیر کی بیع اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔[1]

۲۔ جائز البطلان: جبکہ بائع اور مشتری دونوں یا کسی ایک کو اس بیع کا باطل ہونا معلوم نہ ہو، جیسے کسی کے چھوڑے ہوئے جانور کو پکڑ کر فروخت کر دیا، یا غیر کا مال اپنا کہہ کر فروخت کیا، یہ عقد اولاً صحیح اور نافذ ہے جب اس پر دعویٰ ہوا اور حقیقت ظاہر ہو گئی تو عقد باطل ہو گیا، مگر اس اظہار سے پہلے جو تصرف کر لیا وہ جائز ہو گیا اور جو فائدے حاصل کئے وہ بھی حلال ہیں، اگر مبیع موجود ہے تو اس کو واپس کرنا واجب ہے اور قیمت کا ضمان بائع پر ہے۔[2]

مال کے فروخت نہ ہونے کی پانچ بنیادی وجوہات

۱۔ اباحت عامہ: جیسے خودرو گھاس جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو، یا وہ شکار جو کسی کی ملک میں نہ ہو یا پانی دریا سمندر میں ہو۔

۲۔ نجاست: جیسے شراب اور خنزیر، مگر پانس اور سرگین کی خرید و فروخت ضرورت کے وقت جائز ہے، اور ان کا استعمال توہین اور ابتذال کا موجب ہے۔

۳۔ وہ چیز جو قابل انتفاع نہ ہو جیسے بے کار چیز اور کیڑے مکوڑے۔

۴۔ معصیت محضہ: یعنی ہر وہ چیز جو صرف گناہ کے کام میں استعمال ہوتی ہو۔

۵۔ ممانعت شرعی: یعنی جن کو فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہو، جیسے مسجد، آزاد انسان، مکہ کی زمین، ان کو فروخت کرنا شرعاً ناجائز ہے بیع باطل ہے، اسی طرح جن چیزوں کو فروخت کرنے کی یا اجرت لینے کی شریعت میں ممانعت وارد ہوئی ہو جیسے زنا کی اجرت۔

اگر اس میں ان پانچ علتوں میں سے کوئی علت پائی جائے تو بیع ممنوع ہو گی ورنہ مکروہ یا خلاف اولیٰ۔

فائدہ: حدیث میں اجرت زنا، حجامت اور کتے کی قیمت، تینوں کے کھانے سے ممانعت وارد ہوئی ہے، مگر زنا

---

[1] كما مرّ في حكم البيع الباطل.

[2] كما مرّ في درجات البيع الفاسد.

حرام تھا اس لئے اس کی اجرت بھی حرام رہی، مگر حجامت (یعنی سنگا لگوانا) گناہ نہیں، اسی طرح کتا نجس العین نہیں، ان کی بیع اور اجرت کو مکروہ یا خلاف اولیٰ کہا گیا ہے، ایسے کیڑے مکوڑوں کا بیچنا خلاف اولیٰ ہے ادنیٰ، حقیر اور بے فائدہ چیز ہونے کی وجہ سے یہ حکم ہے۔[1]

---

[1] عن رافع بن خديج، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم، يقول: شر الكسب مهر البغي، وثمن الكلب، وكسب الحجام (صحيح مسلم ،كتاب المساقاة، باب تحريم ثمن الكلب، وحلوان الكاهن، ومهر البغي،رقم الحديث: ١٥٦٨.)

عن رافع بن خديج، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: كسب الحجام خبيث، وثمن الكلب خبيث، ومهر البغي خبيث(سنن أبي داود، ابواب الاجارة،باب في كسب الحجام، رقم الحديث:٣٤٢١).

ولا تجوز إجارة الإماء للزنا؛ لأنها إجارة على المعصية وقيل: فيه نزل قوله تعالى {ولا تكرهوا فتياتكم على البغاء إن أردن تحصنا لتبتغوا عرض الحياة الدنيا}وروي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه نهى عن مهر البغي وهو أجر الزانية على الزنا وتجوز الإجارة للحجامة وأخذ الأجرة عليها؛ لأن الحجامة أمر مباح وما ورد من النهي عن كسب الحجام في الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال:من السحت عسب التيس وكسب الحجام؛ فهو محمول على الكراهة لدناءة الفعل(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط ركن الاجارة، ج٤ص١٩٠).

سود کا بیان

ربٰو الغت میں مطلقاً زیادتی کو کہتے ہیں۔

سود کی اصطلاحی تعریف

سود ہر وہ زیادتی حقیقی یا حکمی جو عقد میں بلا عوض مشروط ہو، لہٰذا بیع فاسد اور ادھار بیع میں زیادتی حکمی ہے اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنے میں زیادتی حقیقی ہے، اور قرض انتہاءً معاوضہ ہے لہٰذا قرض دے کر نفع وصول کرنا حرام ہوا، ہدیہ وغیرہ میں عوض کا کوئی ذکر نہیں ہوتا اس لئے اگر عوض قبول کرنے والے نے کچھ ہدیہ سے زیادہ واپس کیا تو یہ زیادتی حلال ہے، اور شرط لگائے بغیر جو کچھ دیا یا لیا جائے اس سے سود کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ احسان اور تبرع ہے۔[1]

سود کا حکم:

سود شرعاً حرام ہے اس کی حرمت کا انکار کفر ہے اور عقلاً نہایت مذموم ہے، کیونکہ سود قرض پر لیا جائے یا بیع پر، تبرعات کی غرض اور وضع کے مخالف ہونے کی وجہ سے مبطل ہے۔[2]

اس لئے قرض محض احسان و تبرع ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ قرض دینے پر خیرات کرنے کے مقابلے میں اٹھارہ گنا زیادہ ثواب ملتا ہے[1]، جب قرض پر نفع لے لیا تو نہ احسان رہا، نہ ثواب، پس حقیقت

---

[1] هو فضل مال خال عن عوض شرط لأحد العاقدين في معاوضة مال بمال(ملتقى الأبحر ،كتاب البيوع،باب الربا،ص١١٩).

الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه(الهداية ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٦١).

[2] والربا محرم بالكتاب والسنة وإجماع الأمة أما الكتاب فقوله تعالى {وأحل الله البيع وحرم الربا}...وأجمعت الأمة على تحريمه حتى يكفر جاحده. (تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، باب الربا،ج ٤ ص ٨٥).

قال الإمام الإسبيجابي اتفقوا على أنه إذا أنكر ربا النساء يكفر، وفي ربا الفضل في القدر اختلاف فإن ابن عباس رضي الله تعالى عنه لا يرى الربا إلا في النسيئة(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٦ ص ١٣٧).

میں وہ قرض قرض ہی نہ رہا، اور بیع موضوع ہے رفعِ حاجت اور حصول نفع کے لئے، ہم جنس کے معاوضہ میں تو حاجت معلوم ہے جیسے گندم کو گندم کے عوض فروخت کرنا، اور مقدار دونوں کی مساوی ہو تو منفعت معدوم ہو گئی تو بیع کا جو مقصد تھا وہ فاسد ہو گیا۔

سود کی حرمت قرآن وحدیث سے

جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے "وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا" اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا، دوسری جگہ [فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِه] یعنی اگر سود کو نہیں چھوڑو گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو، اور جناب نبی کریم ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، گواہی دینے والے اور لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے، اور جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جان بوجھ کر سود کا ایک درہم کھانا چھتیس بار زنا سے بدتر ہے (احمد و طبرانی)۔[2]

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "سود کے گناہ کے ستّر حصے ہیں، کم سے کم درجہ ایسا ہے جیسا کہ کسی نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے"[3]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ سود لینے اور دینے والا گناہ میں برابر ہیں البتہ سود کھانے کا گناہ سود لینے سے زیادہ

---

[1] عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "رأيت ليلة أسري بي على باب الجنة مكتوبا: الصدقة بعشر أمثالها، والقرض بثمانية عشر، فقلت: يا جبريل ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: لأن السائل يسأل وعنده، والمستقرض لا يستقرض إلا من حاجة"

قال الأرنؤوط واصحابه: إسناده ضعيف لضعف خالد بن يزيد بن أبي مالك. عبيد الله بن عبد الكريم: هو أبو زرعة الرازي الحافظ. (سنن ابن ماجه ،ابواب الصدقات،باب القرض،ج٣ ص ٥٠١ ت الأرنؤوط)

عن أبي أمامة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم رأيت على باب الجنة مكتوبا القرض بثمانية عشر والصدقة بعشر فقلت يا جبرئيل ما بال القرض بثمانية عشر والصدقة بعشر قال لأن صاحب القرض لا يأتيك إلا وهو محتاج وربما وضعت الصدقة في غني(نوادر الأصول في أحاديث الرسول، الأصل الثامن والسبعون والمائة، ج٢ ص ٢٨٠)

[2] عن عبد الله بن حنظلة غسيل الملائكة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " درهم ربا يأكله الرجل وهو يعلم، أشد من ستة وثلاثين زنية " (مسند أحمد ،حديث عبد الله بن حنظلة،رقم الحديث: ٢١٩٥٧،ج٣٦ص٢٨٨ ط الرسالة).

وكذا في المعجم الكبير للطبراني (عمرو بن دينار عن ابن عباس، رقم الحديث: ١١٢١٦ ،ج١١ ص ١١٤).

[3] عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "الربا سبعون حوبا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه" .قال الأرنؤوط واصحابه:إسناده ضعيف لضعف أبي معشر وهو نجيح بن عبد الرحمن السندي وقد تابعه غير واحد ممن لا يعتد بمتابعته(سنن ابن ماجه، ابواب التجارات،باب التغليظ في الربا،رقم الحديث:٢٢٧٤،ج٣ ص ٣٧٧ ت الأرنؤوط)

ہے۔"[1] سود کی حرمت کا انکار کفر ہے اس کا ارتکاب فسق ہے اور گناہ کبیرہ ہے اور اس سے سوء خاتمہ کا خطرہ ہے۔[2]

سود کا وبال

ارشاد باری تعالیٰ ہے"[يمحق الله الربا] اللہ تعالیٰ سود خور کا مال ضائع کرتا ہے، خواہ دنیا میں کمال بخل کی وجہ سے یا ضائع کرنے، یا بے برکتی کی صورت میں آخرت میں ضائع ہی فرماتے ہیں اس پر عذاب میں مبتلا کر کے، اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: سود کا مال اگرچہ شروع میں بڑھتا ہوا نظر آتا ہے لیکن آخر کار گھٹ جاتا ہے۔"[3]

سود کی قسمیں

پھر ہماری تحقیق میں سود کی سات ۷ قسمیں ہوئیں:

۱۔ ربا قرض: یعنی قرض دار قرض خواہ کو ماہانہ یا یومیہ سود کی ایک مقدار شرط کے مطابق ادا کرے، امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ جب قرض کی ادائیگی کی مدت پوری ہو جاتی تو قرض خواہ کہتا کہ یا تو قرض ادا کر دو یا سود دینا قبول کرو۔(اس کی تفصیل کتاب الدیون میں آئے گی)[4]

---

[1] بعینہ یہی الفاظ تو نہیں مل سکے، البتہ یہ مفہوم مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے:
عن جابر، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء (صحيح مسلم،باب لعن آكل الربا ومؤكله، رقم الحديث:١٥٩٨).
وكذا في مسند أبي يعلى الموصلي ،مسند جابر، رقم الحديث: ١٨٤٩،ج٣ ص ٣٧٧).

[2] مرّ تخريجه.

[3] عن ابن مسعود، أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: " الربا وإن كثر، فإن عاقبته تصير إلى قل(مسند أحمد ،مسند عبد الله بن مسعود، رقم الحديث:٣٧٥٤،ج٦ ص ٢٩٧ ط الرسالة).

[4] مالك عن زيد بن أسلم؛ أنه قال: كان الربا في الجاهلية، أن يكون للرجل على الرجل الحق، إلى أجل. فإذا حل الحق، قال: أتقضي، أم تربي؟ فإن قضى أخذ. وإلا زاده في حقه. وأخر عنه في الأجل.(موطأ مالك ،باب ماجاء في الربا في الدين،ج٤ص ٩٧١ ت الأعظمي).
وكذا في السنن الكبرى للبيهقي (باب تحريم الربا وانه موضوع، رقم الرواية:١٠٤٦٧،ج٥ ص ٤٥١).

۲۔ ربارہن: یہ کہ مرتہن راہن سے وصول کرے، یاشئی مرہونہ سے فائدہ حاصل کرے، اس کے احکام کتاب الرہن میں آئیں گے۔

۳۔ رباحبس: یہ ہمارے ہاں ہندوستان میں انگریزی حکومت کی طرف سے رائج ہوا ہے، نوٹ اور وثیقہ مدیون یعنی انگریز حکومت اصل مال کو واپس نہیں کرتی، پس اس حبس بے جا کے اعتبار سے اس کا نام رباحبس رکھنا بہتر ہے، اس کے تفصیلی احکام نوٹ کے بیان میں گذر چکے ہیں۔

ربا شرکت: یعنی ایک دوسرے کے لئے نفع متعین کرے، بقیہ تمام نفع ونقصان کو اپنے ذمہ رکھے (اس کا ذکر شراکت میں آئے گا)

ربا فساد: یعنی بیوع فاسدہ۔[1]

ربا نسیئہ: یعنی ادھار لین دین۔

ربا فضل: یعنی نقد معاملات میں جو زیادتی ملتی ہے۔

ربا الفضل کی تین قسمیں

۱۔ منصوص: جو حدیث میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے" الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر الملح بالملح مثلا بمثل ويدا بيد" چاندی، سونا، گندم، جو، کھجور، نمک کو برابر اور ہاتھ در ہاتھ فروخت کرے" فمن زاد او استزاد فقد ربی "جسنے زیادہ سے زیادہ مانگا، اس نے سود کھایا، "الاخذ والمعطي فيه سواء"(رواہ مسلم)[2] یعنی لینے اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں، ظاہر یہ کے نزدیک ان چیزوں کے علاوہ بقیہ چیزوں میں سود نہیں ہے۔

۲۔ اجماعی: ہر وہ چیز جس میں تمام مجتہدین کے نزدیک علت ربا موجود ہے جیسے وہ غلے جو ناپ یا تول سے بکیں، ہمارے نزدیک غلہ میں علت ربا جنس اور قدر ہے جبکہ امام مالک وشافعی رحمہما اللہ کے ہاں طعم ہے۔

۳۔ مجتہد فیہ: بعض کے نزدیک اس میں سود ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے کیونکہ مجتہدین انہی اشیاء ستہ ربویہ کی علت پر قیاس کرکے دوسری چیزوں میں سود کا حکم جاری فرماتے ہیں۔

---

[1] مر تفصيله في حكم البيع الفاسد قبل هذا الباب.

[2] اخرجه الامام مسلم في صحيحه في باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا، برقم:١٥٨٤.

سود کی علت میں ائمہ کا اختلاف

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کھانے والے چیزوں میں علت ربا طعم ہے اور نقود میں ثمنیت ہے اور جنس شرط ہے، اور مساوات کا ہونا سود سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے (یعنی برابر برابر فراخت کریں گے تو سود نہیں آئے گا) مثلاً گندم میں غلہ ہونا علت ربا ہے جب گندم کو گندم کے بدلے میں فروخت کریں گے تو علت پائی گئی لہٰذا کمی زیادتی سے سود لازم آنے کی وجہ سے کمی زیادتی حرام ہے، سونا اور چاندی میں ثمنیت علت ہے لہٰذا ان کو آپس میں فروخت کریں گے تو وزن میں برابر ہونا ضروری ہے۔

اگر خلاف جنس کے ساتھ فروخت کریں مثلاً گندم کو جو کے ساتھ، سونے کو چاندی کے ساتھ تو کمی زیادتی جائز ہے، البتہ ادھار ان کے نزدیک بھی حرام ہے، اس دوسری حدیث کی وجہ سے کیونکہ علت ربا موجود ہے مگر جنسیت مفقود ہے۔ **حدیث** "اذا اختلف الجنسان فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد" یعنی جب جنس بدل جائے تو جس طرح چاہو بیچو، مگر ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہیئے، اس سے معلوم ہوا ادھار بیچنا حرام ہے۔[1]

مالکیہ نے کہا علتِ ربا قوت اور ادخار ہے (یعنی غذائی اشیاء ہوں اور وہ ذخیرہ کرنے کے قابل ہوں جلد خراب ہونے والی نہ ہوں) لہٰذا ان کے نزدیک سبزیوں میں سود نہیں ہے، اور ابن ماجشون ہر نفع والی چیز میں ربا کے قائل ہے۔[2]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک علت جنس اور قدر ہے (یعنی ثمن اور مبیع ایک جنس کے ہوں اور کیلی یا وزنی ہوں)[1]

---

[1] العزيز شرح الوجيز (كتاب البيع، القول في باب الربا، ج٤ ص ٦٥).

وكذا في المهذب في فقة الإمام الشافعي للشيرازي(كتاب البيوع،باب الربا، ج٢ ص ٢٦).

[2] قد اختلف فيها على عشرة أقوال: ذكر المصنف منها قولين (الأول) أنها الاقتيات والادخار قال ابن الحاجب: وعليه الأكثر قال بعض المتأخرين: وهو المعول عليه في المذهب وتأول ابن رشد المدونة عليه قال بعض المتأخرين: وهو المشهور من المذهب... وقيل: العلة المالية فلا يباع ثوب بثوبين، ونسب لابن الماجشون قال ابن بشير، وهذا يوجب الربا في الدور والأرضين ولا يمكن قوله (مواهب الجليل في شرح مختصر خليل ،كتاب البيوع، فصل في علة طعام الربا، ج٤ ص ٣٤٦)

وكذا في بداية المجتهد ونهاية المقتصد (كتاب البيوع، الباب الثاني، ج٣ ص ١٤٩).

معاوضات کی چار قسمیں

۱۔ جس میں قدر اور جنس نہ ہو جیسے کپڑے کو چائے کے عوض فروخت کیا جائے، اس کا سود سے کوئی تعلق نہیں ہے چاہے نقد فروخت کریں یا ادھار۔

۲۔ قدر و جنس دونوں موجود ہوں جیسے گندم سے گندم خریدے، اس میں کمی زیادتی حرام ہے چاہے نقداً فروخت کریں یا ادھار، اور ادھار بھی حرام ہے۔

۳۔ صرف قدر ہے جنس نہیں ہے جیسے گندم کو جو کے عوض فروخت کرنا۔

۴۔ صرف جنس ہے جیسے ایک ہی جنس کے کپڑوں کو آپس میں فروخت کرنا، ادھار سود ہے نقد حلال ہے۔[2]

مسئلہ : گندم سے گندم، جو سے جو، لوہا کو لوہے کے عوض، تانبا کو تانبے کے، گیرو گیرو کے عوض (یعنی گل ارمنی کو آپس میں فرخت کرنا) فروخت کریں، تو دو شرطیں ہیں:

۱۔ مقدار برابر ہوں۔

۲۔ دونوں یا ایک عوض ادھار نہ ہو بلکہ دونوں نقد ہوں، ورنہ سود لازم آئے گا۔[3]

مسئلہ : گندم کو جو کے عوض، لوہا تانبے کے، زعفران شکر کے، جس طرح چاہیں فروخت کریں مگر شرط یہ ہے کہ ادھار نہ ہو، کیونکہ اس میں دونوں علت ربا موجود نہیں، صرف ایک علت موجود ہے، صرف جنس یا صرف قدر۔[4]

مسئلہ : وہ آم جو عدداً بکتے ہوں، باہم جنس ہیں، قیمت کم یا زیادہ، اس میں کمی زیادتی حلال ہے کیونکہ قدر

---

[1] وعلة ربا الفضل هي القدر المتفق مع الجنس أعني الكيل في المكيلات والوزن في الأثمان والمثمنات (تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٢ ص ٢٥).

والتفصيل في بدائع الصنائع (كتاب البيوع، شرائط الصحة، مبحث الربا،ج٥ ص ١٨٣).

[2] فإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنساء وإذا وجدوا حرم التفاضل والنساء وإذا وجد أحدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء(مختصر القدوري ،كتاب البيوع، باب الربا،ص٨٧)

وكذا في الهداية (كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٦١)

[3] لوجود كلي الوصفين "اتحاد الجنس والقدر".

[4] انظر الحاشية المتقدمة.

نہیں ہے۔[1]

مسئلہ : جو آم وزن سے بکتے ہیں، ان میں مساوات ضروری ہے فضل اور نسیہ دونوں حرام ہیں۔[2]

مسئلہ : وزن سے بکنے والے آم کو عدداً بکنے والے آم کے عوض فروخت کرنے میں چونکہ صرف جنس پایا گیا، اس لئے کمی زیادتی حلال ہے، ادھار حرام ہے۔

مباحثِ جنسیت

صاحب نہایۃ المحتاج[3] رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو اشیاء اسم خاص اور متحد معنی کے اندر داخل ہیں، وہ سب ایک جنس ہیں، پس کپڑا ایک اسم عام ہے، اس کے تحت مختلف اغراض و معانی کے کپڑے ہیں، جیسے گاڑھا (موٹا) تزیب، اطلس وغیرہ، اور تنزیب یا نین سکھ یا اطلس یا گاڑھا یہ اسم خاص ہے، اطلس کے مثلاً جتنے تھان ہوں گے، لفظ اطلس ان سب کے معنی کو متحد رکھتا ہے۔[4]

فائدہ: نام کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ عموم و شمول: یعنی عام ہو اور اس کے تحت مختلف غرض و صنعت اور مختلف قسم کے افراد داخل ہوں جیسے غلہ، کپڑا، میوہ، دھات وغیرہ، یہ منطقیوں کے نزدیک اسم جنس ہے مگر فقہاء کے نزدیک نہیں۔

۲۔ اصل اور حقیقت کے اعتبار سے: جیسے گندم، جو، انار، کھجور، نین سکھ، تنزیب، لوہا، پیتل وغیرہ۔

۳۔ باعتبار وصف اور حسن، جیسے تنزیب اعلیٰ درجہ کا یا ادنیٰ درجہ کا، یا انار طائف کا، یا کابل کا یا ہندوستان وغیرہ

---

[1] لعدم كونه كيليا ولاوزنيا.

[2] لوجود كِلي وصفي الربا.

[3] یہ علامہ شمس الدین رملی شافعی رحمہ اللہ کی کتاب ہے جو انہوں نے امام نووی رحمہ اللہ کے مشہور متن "منہاج الطالبین" کے شرح کے طور پر لکھی ہے اور اس میں فقہاء شافعیہ کے راجح اقوال، بعض فقہای کرام کے فتاویٰ، فقہی جزئیات و فروع کے لئے اصول و قواعد وغیرہ ذکر کرنے کا کافی حد تک اہتمام کیا ہے، دار الفکر بیروت سے مختلف فقہاء شافعیہ کے حواشی کے ساتھ ۸ جلدوں میں شائع ہے۔

[4] (إن كانا) .. (جنسا) واحدا بأن جمعهما اسم خاص من أول دخولهما في الربا واشتركا فيه اشتراكا معنويا كتمر برني ومعقلي، وخرج بالخاص العام كالحب وبما بعده الأدقة فإنها دخلت في الربا قبل طرو هذا الاسم لها فكانت أجناسا كأصولها، وبالأخير البطيخ الهندي والأصفر فإنهما جنسان كالتمر والجوز الهنديين مع التمر والجوز المعروفين(نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج، كتاب البيع، باب الربا، ج٣ ص ٤٢٤).

کا، یہ دونوں قسم فقہاء کے نزدیک جنس واحد ہیں اور ان میں ربا متحقق ہے، پس انار انار کے عوض، تنزیب تنزیب کے عوض فروخت کیا جائے، اور یہ چیزیں اگر قدری ہوں تو کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا یا ادھار فروخت کرنا دونوں حرام ہیں، اگر ایک جنس نہ ہو تو صرف ادھار حرام ہے، نقداً کمی زیادتی حلال ہے۔[1]

مسئلہ: خشک اور تر کھجور ایک جنس ہیں (ہدایہ)[2]

مسئلہ: اسپات (ایک قسم کا سخت لوہا) کھپڑی، فولاد، اگرچہ سب لوہے ہیں، مگر ہم جنس نہیں۔[3]

مسئلہ: تانبا، پیتل، رانگا، سب اگرچہ دھاتیں ہیں مگر ہم جنس نہیں، ہر ایک الگ الگ جنس ہے۔[4]

مسئلہ: الماس، یاقوت، زمرد، عقیق، زبرجد، فیروزہ، اگرچہ سب پتھر ہیں مگر ہم جنس نہیں۔[5]

مسئلہ: عقیق یمنی اور عقیق جگری، ایسے ہی انار ولایتی اور ہندی ایک جنس ہیں۔[6]

تنبیہ: اسم خاص کے تحت دو ایسی چیزیں جن کی اصلیں متحد نہ ہوں، ہم جنس نہیں ہوں گی، جیسے عطر، تیل، دودھ، گوشت وغیرہ اسم خاص ہیں، لیکن ان کے ماتحت مختلف اصل کی چیزیں داخل ہیں، مثلاً عطر گلاب، عطر عنبر، مشک، عطر حنا، عطر جوہی، یہ سب اگرچہ اسم خاص عطر کے تحت داخل ہیں لیکن ہم جنس نہیں، اسی طرح بکری کا دودھ، گائے کا دودھ، اونٹنی کا دودھ، ایسے ہی ان کے گوشت ہم جنس نہیں بلکہ گائے کا گوشت الگ جنس ہے، بکری کا الگ، اونٹنی کا الگ۔[7]

---

[1] فقہاءِ احناف کے نزدیک اختلاف جنس کا مدار تین چیزوں پر ہے ان میں سے کسی ایک چیز کے اختلاف سے بھی اختلاف جنس کا حکم لگایا جائے گا۔ ۱: مادہ و حقیقت۔ ۲: اغراض و مقاصد۔ ۳: صناعت و کاریگری۔

فصار ما يوجب اختلاف الأمور المتفرعة ثلاثة أشياء: اختلاف الأصول، واختلاف المقاصد، وزيادة الصنعة. (فتح القدير ،كتاب البيوع، باب الربا،ج۷ ص ۳۵).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب الربا،ج۵ ص ۱۸۳).

[2] "ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلا بمثل عند أبي حنيفة"(الهداية كتاب البيوع، باب الربا،ج ۳ ص ٦٤).

[3] لعله لعدم اتحاد المقاصد بكل من هذه الانواع.

[4] لعدم الاتحاد في الاسم الخاص والمقاصد.

[5] ايضا.

[6] لعدم التفاوت في الامور الثلاثة المتقدمة.

[7] للتفاوت في الاصل والمادة كما تقدم عن الفتح والدر.

ويجوز بيع اللحمان المختلفة بعضها ببعض متفاضلا وكذلك ألبان البقر والغنم وحل الدقل بخل العنب(مختصر القدوري ،كتاب البيوع، باب الربا،ص ۸۷).

دو چیزوں میں تفاوت

تفاوت دو چیزوں میں دو وجہ پر ہوتا ہے:

۱۔ خلقی: جیسے پھلوں میں ہوتا ہے، کسی مقام پر موسم یا خلقی تاثیر سے ایک پھل خوش رنگ، خوش ذائقہ اور خوشبودار زیادہ قیمتی ہے وہی پھل دوسرے مقام پر بدبودار، بدرنگ، بدمزہ کم قیمت ہے، اس کی نسبت جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے" جيدها ورديها سواء "اچھے برے سب برابر ہیں، پس دیسی انار اور ولایتی (مغربی ممالک کا) انار آپس میں بیچا جائے تو برابر بیچنا ہوگا، کمی زیادتی جائز نہیں۔

مسئلہ: یہ مساوات کا حکم صرف ربا کے معاملہ کے بارے میں ہے ورنہ ضمان متلفات یعنی دیسی انار کسی کے ضائع کردئے تو ضمان میں ولایتی اعلیٰ قسم کے انار نہیں دلائیں گے بلکہ دیسی انار یا اس کی قیمت دلائی جائے گی۔[1]

۲۔ تفاوت کسبی: کسی چیز میں کوئی وصف انسانی کاریگری سے پیدا ہوتے ہوں، پس ان میں اگر اصل اور مادہ بعینہ باقی ہے سوائے صناعت کے کوئی ایسی چیز زیادہ نہیں ہوئی جس کے ملانے سے کچھ اثر پیدا ہوا ہو، جیسے سوت اور سوتی کپڑا، ریشم اور اطلس، لکڑی، لوہے، تانبے، چمڑے، مٹی وغیرہ کی چیزیں، تیل اور تل یہ سب ہم جنس ہیں، اس لئے کہ اصل اور مادہ بعینہ موجود ہے سوائے صناعت کے کچھ زیادتی نہیں ہوئی، اور اگر اصل اور مادہ پر کسی چیز کا اضافہ ہوا جیسے کاجل اور روشنائی، یا روئی اور کپڑا، رس اور چینی اور مٹھائی، یا انار سیب بہی، انگور اور اس کے شربت، مربے وغیرہ، یہ سب آپس میں غیر جنس ہیں، اس لئے ان کی اصل بعینہ موجود نہیں رہی۔[2]

وكذا في الهداية (كتاب البيوع، باب الربا، ج٣ ص ٦٥)

[1] (قوله وجيد مال الربا ورديئه سواء) أي فلا يجوز بيع الجيد بالرديء مما فيه الربا إلا مثلا بمثل لإهدار التفاوت في الوصف هداية (قوله لا حقوق العباد) عطف على مال الربا قال في المنح: قيد بمال الربا، لأن الجودة معتبرة في حقوق العباد، فإذا أتلف جيدا لزمه مثله قدرا وجودة إن كان مثليا، وقيمته إن كان قيميا،(رد المحتار، كتاب البيوع، باب الربا، ج ٥ ص ١٧٩).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب الربا، ج٦ ص ١٤١).

ولا خير في الزيت بالزيتون؛ لأنه لا يدري لعل ما في الزيتون أكثر مما أخذ من الزيت. فإن كان ما في الزيتون من الزيت يعلم ذلك فلا بأس به، ويكون الفضل الذي في الزيت بما بقي من ثُفْل الزيتون. وكذلك الشَّيْرَج بالسمسم. وكذلك العصير

مگر سونا اور چاندی کسی دوسری چیز میں مل جائے تو سونا چاندی کا اعتبار ہوگا، کیونکہ سونا چاندی کم ہو یا زیادہ، مقصود و معتبر ہوتا ہے، ان کی اصلیت یعنی ثمنیت کسی حال میں بھی باطل نہیں ہوتی، بخلاف دوسری چیزوں کے کہ جب وہ کسی اور چیز میں مل کر مخلوط ہو جائے تو ان کا حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا کھوٹا اور کھرا سونا یا چاندی کی باہم خرید و فروخت میں کمی زیادتی جائز نہیں، ہاں البتہ ملاوٹ (غش) غالب ہو تو اس کا حکم تبدیل ہوگا۔[1]

قدر کی تفصیلات

مسئلہ: قدر سے مراد وزن اور کیل ہے (یعنی ناپ تول) اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے اگر کسی چیز کا اندازہ ہو سکے تو اس کا اعتبار نہیں، لہٰذا گز اور عدد قدر شرعی نہیں ہیں۔[2]

مسئلہ: دس گز تنزیب کو دو گز تنزیب کے عوض، اسی طرح دو چاقو کو ایک چاقو کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔[3]

مسئلہ: وزن اور کیل جنس واحد نہیں ہے، لہٰذا کیلی چیز کو وزنی چیز کے عوض فروخت کیا جائے تو قدر کا اعتبار نہ ہوگا جیسے دودھ کو چینی کے عوض فروخت کرے۔

مسئلہ: مختلف ہلکی بھاری چیزوں کے مختلف اوزان مقرر ہیں، وہ اوزان آپس میں ہم جنس نہیں ہیں، اسی طرح مختلف کیل بھی آپس میں ہم جنس نہیں ہیں، جیسے کانٹا جس میں تولے ماشے کا وزن ہے، تک (بڑی ترازو) جس میں منوں کا حساب ہے، ایسے ہی کیل اور پیمانہ غلہ اور دودھ کا، چونے اور سرخی کے پیمانے مختلف

بالعنب. وكذلك اللبن بالسمن. وكذلك الرُّطَب بالدِّبْس. ولا خير في شيء من هذا حتى تعلم أنت ما في السمسم من الدهن، وما في العنب من العصير، وما في اللبن من السمن، وما في الرطب من الدبس، أقل مما تعطي(الأصل للشيباني ،كتاب البيوع والسلم،ج٢ ص ٤٠٩).

وكذا في تبيين الحقائق (كتاب البيوع، باب الربا،ج٤ ص ٩٦).

[1] مر تفصيلاته في بيع الصرف.

[2] (بمعيار شرعي) وهو الكيل والوزن فليس الذرع والعد بربا (الدر المختار ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٥ ص ١٦٩).

وكذا في النهر الفائق كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٤٧٠).

[3] لیکن ادھار جائز نہیں کیونکہ جنس تو ایک ہی ہے مگر کیل اور وزن میں اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے قدر متحد نہیں۔

جنس ہیں، لہٰذا ایسے مختلف الوزن اور کیل کی چیزوں کو آپس میں فروخت کیا جائے تو قدر معتبر نہ ہو گا۔ [1]

مسئلہ: غلہ کو چونے کے عوض یا چینی کے یا عطر کے عوض فروخت کیا جائے تو قدر کا اعتبار نہ ہو گا کیونکہ ہر ایک کے تولنے کے اوزان مختلف ہیں۔

کیلی اور وزنی کی پہچان

مسئلہ: جو چیزیں حضور ﷺ کے زمانے میں کیلی یا وزنی تھیں، وہ شرعاً ہمیشہ ویسی ہی رہیں گی، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک عرف کے بدلنے سے کیلی یا وزنی کا بدلنا بھی جائز ہے، کیونکہ نص کا مدار عرف پر ہے اور اس حکم کا تعلق عرف اور معاملات ہی سے ہے اور انسان کی عادت کو بدلنا بہت دشوار بات ہے، البتہ برکت اسی میں ہے کہ جس کے ساتھ جناب بنی کریم ﷺ کا فعل اور قول متعین ہو چکا ہے اسی پر عمل کیا جائے۔ [2]

مسئلہ: جو چیزیں حضور ﷺ کے زمانے میں قدری نہ تھیں ان کا قدری ہونا ثابت نہیں ہوا، اس میں عرف حاکم ہے چاہے قدری کو غیر قدری کر دے، یا غیر قدری کو قدری بنا لے جیسے کاغذ وغیرہ، اس زمانے میں وزن سے بکتا ہے اس لئے قدری ہو گیا ہے۔ [3]

کیلی وزنی کی وضاحت

ہر چیز میں ایک ادنٰی مقدار ہوا کرتی ہے جس کا معاملات میں حساب نہیں کیا جاتا ہے یعنی اس کو قیمت میں شمار نہیں کرتے کہ یہ مقدار وزن سے زیادہ ہے اس کی قیمت اتنی ادا کریں، جیسے غلوں میں تولے ماشے، عطروں

---

[1] إذا أسلم النقود في الزعفران ونحوه يجوز، وإن جمعهما الوزن لأنهما لا يتفقان في صفة الوزن، فإن الزعفران يوزن بالأمناء وهو مثمن يتعين بالتعيين، والنقود توزن بالسنجات وهو ثمن لا يتعين بالتعيين. ولو باع بالنقود موازنة وقبضها صح التصرف فيها قبل الوزن، وفي الزعفران وأشباهه لا يجوز، فإذا اختلفا فيه صورة ومعنى وحكما لم يجمعهما القدر من كل وجه فتنزل الشبهة فيه إلى شبهة الشبهة وهي غير معتبرة. (الهداية ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٦٢).
وكذا في العناية شرح الهداية (كتاب البيوع، باب الربا،ج٧ ص ١٣).

[2] قال: (وما ورد النص بكيله فهو كيلي أبدا، وما ورد بوزنه فوزني أبدا، اتباعا للنص. وعن أبي يوسف أنه يعتبر فيه العرف أيضا، لأن النص ورد على عادتهم فتعتبر العادة، وما لا نص فيه يعتبر فيه العرف لأنه من الدلائل الشرعية. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٢ ص ٣١).
وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب البيوع، باب الربا،ج٢ ص ١٨٧).

[3] الحاشية السابقة.

میں رتیاں، ان کا اعتبار نہیں ہوا کرتا، کسی چیز کا دوسری چیز کے ساتھ متحد ہونا یا قدری ہونا اسی ادنی مقدار کے اعتبار سے ہے یعنی جن چیزوں کی ادنی مقدار مساوی ہے وہ سب متحد القدر ہیں، اگر ادنی مقدار مساوی نہیں تو متحد القدر بھی نہیں۔

لہٰذا بھوسا، لکڑی، کانپ، سرخی، کوئلہ متحد القدر ہیں، ہر قسم کے اناج (گندم جو وغیرہ) ہم وزن ہیں، ہر قسم کی مٹھائیاں، روغن زرد، شہد و بالائی متحد القدر ہیں، لوہا، تانبا، پیتل رانگا وغیرہ متحد القدر ہیں، سونا چاندی ہم وزن ہیں، عطر و مشک و زعفران ہم وزن ہیں، یاقوت، الماس، مروارید ہم وزن ہیں۔

اگر ادنی مقدار ملحوظ و مساوی ہو تو صرف دو چیزوں کا ایک میزان میں تولا جانا یا ایک پیمانہ میں ناپا جانا کافی نہیں ہے، کیونکہ جو ادنی مقدار لوہے اور تانبے میں محسوب ہے وہ مٹھائیوں میں نہیں ہے، اور جن کا حساب مٹھائیوں میں ہوتا ہے وہ غلہ میں نہیں ہے اور جس ادنی مقدار کا غلہ میں حساب کیا جاتا ہے وہ بھوسے اور کوئلہ میں نہیں اور جس مقدار کو جواہرات میں لحاظ کیا گیا ہے وہ سونا چاندی میں نہیں ہے، دیکھئے سونا چاندی کو جانچنے کے لئے گھسا جاتا ہے جواہرات کو گھسا نہیں جاتا ہے جواہرات کا اتنا مقدار بھی ضائع نہیں کیا جاتا۔

عطر روغن وغیرہ خوشبو سونگھنے کے لئے دیا اور ملایا جاتا ہے مگر سونا چاندی اتنا بھی کسی کو مفت نہیں دیا جاتا، اور غلہ، چینی، شیرینی کی جو مقدار نمونہ کے طور پر دیدی جاتی ہے یا کھلائی جاتی ہے عطر ہرگز نہیں مل سکتا۔

مگر ایسی چیزوں میں قدر کے متحد ہونے یا مختلف ہونے کا فیصلہ انتہائی غور و فکر، تفقہ، معاملہ کی سمجھ، اور عرف کی جانچ پڑتال پر موقوف ہے، ممکن ہے کہ ہماری مثالیں کسی جگہ کے عرف خلاف ہونے کی وجہ سے غلط ہو جائیں۔

مسئلہ: اکثر کسرات یعنی مقدار معینہ سے معمولی زیادتی جن علاقوں میں ملحوظ و معتبر نہ ہو اور ان کے مقابلے میں کچھ قیمت بھی نہ ہو، اگر وہی کسرات معتبر ہو جائے تو اس کے مقابلے میں قیمت بھی کم اور زیادہ ہو جائے گی۔

مسئلہ: جو مقدار قدر سے خارج ہے اور معاملات میں اس کا لحاظ نہیں ہوتا ہے، اس میں سود کا حکم جاری نہ ہوگا، مثلاً دو چٹکی آٹا کو ایک چٹکی آٹا کے مقابلہ میں فروخت کرنا، (ہدایہ) کیونکہ سود اس میں ہوتا ہے جس میں قدر نافذ ہو جب یہ مقدار قدر ہی میں نہیں آتی تو اس میں سود کا حکم بھی نہیں لگایا جائے گا۔[1]

---

[1] "ويجوز بيع الحفنة بالحفنتين والتفاحة بالتفاحتين" لأن المساواة بالمعيار ولم يوجد فلم يتحقق الفضل،(الهداية ،كتاب البيوع، باب الربا،ج٣ ص ٦١).
وكذا في فتاوى قاضيخان (كتاب البيوع،باب في بيع مال الربا بعضه ببعض،ج٢ ص ١٣٨).

مبیع کے ملحقات کی تین قسمیں

وہ چیزیں جو مبیع کے تابع ہو کر بیع میں داخل ہو جاتی ہیں، ان کی کوئی مستقل الگ سے قیمت نہیں ہوتی، ان ملحقات کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ممنوع الاستثناء: یعنی ان کو مبیع سے مستثنیٰ کرنا شرعاً ممنوع ہے جیسے مبیع حاملہ ہو، اس کا حمل بیع کے وقت ذکر کئے بغیر بھی بیع میں داخل ہوگا، خارج کرنے سے خارج نہیں ہو سکتا۔

۲۔ تابع: مبیع سے جو اصل غرض متعلق ہے اس کے ساتھ وہ متصل باتصال قرار ہو جیسے تالا کی چابی، یا کتاب کی جلد، یا دیوار میں جڑی ہوئی کیلیں، یا زمین میں لگے ہوئے درخت، یہ ساری چیزیں ذکر کے بغیر ہی مبیع کے ساتھ شامل ہو کر بکتی ہیں مگر یہ کہ صراحت کے ساتھ ان کو مبیع سے جدا کیا جا سکتا (ہے)۔

۳۔ ملحق: یعنی جو مبیع کے اصل غرض میں داخل نہیں اور نہ ہی مبیع کے ساتھ متصل باتصال قرار ہے، ان کے ساتھ مل کر بیع میں داخل ہونے کے لئے صراحۃً اس طرح ذکر کرنا ضروری ہے کہ میں نے یہ گھر تمام حقوق کے ساتھ فروخت کیا، یا تمام توابع اور منافع کے ساتھ فروخت کیا، یہ چیز اپنے ساز وسامان اور ملحقات کے ساتھ فروخت کی۔[1]

امام محمد رحمہ اللہ کی ایک روایت کے مطابق یہ بھی ناجائز ہے، علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور آپ کے بعد کے فقہاء کرام مثلاً صاحب بحر، نہر، منح، حاشیہ درر اور رد المحتار وغیرہ میں اس کو تائید کی گئی ہے۔

ولا يسكن الخاطر إلى هذا بل يجب بعد التعليل بالقصد إلى صيانة أموال الناس تحريم التفاحة بالتفاحتين والحفنة بالحفنتين، أما إن كانت مكاييل أصغر منها كما في ديارنا من وضع ربع القدح وثمن القدح المصري فلا شك، وكون الشرع لم يقدر بعض المقدرات الشرعية في الواجبات المالية كالكفارات وصدقة الفطر بأقل منه لا يستلزم إهدار التفاوت المتيقن، بل لا يحل بعد تيقن التفاضل مع تيقن تحريم إهداره، ولقد أعجب غاية العجب من كلامهم هذا. وروى المعلى عن محمد أنه كره التمرة بالتمرتين وقال: كل شيء حرم في الكثير فالقليل منه حرام. (فتح القدير ،كتاب البيوع، باب الربا، ج٧ص ٩).

وروى المعلى عن محمد أنه كره التمرة بالتمرتين وقال: كل شيء حرم في الكثير فالقليل منه حرام اهـ فهذا كما ترى تصحيح لهذه الرواية وقد نقل من بعده كلامه هذا وأقروه عليه كصاحب البحر والنهر والمنح والشرنبلالية والمقدسي. (حاشية ابن عابدين، كتاب البيوع، باب الربا، ج٥ ص ١٧٦).

[1] الأصل أن مسائل هذا الفصل مبنية على قاعدتين: إحداهما ما أفاده بقوله: (كل ما كان في الدار من البناء) المعنى كل ما هو متناول اسم المبيع عرفا يدخل بلا ذكر وذكر الثانية بقوله: (أو متصلا به تبعا لها دخل في بيعها) يعني أن كل ما كان متصلا بالبيع اتصال قرار وهو ما وضع لا لأن يفصله البشر دخل تبعاوما لا فلا وما لم يكن من القسمين فإن من حقوقه ومرافقه دخل بذكرها، وإلا لا،(الدر المختار وحاشية ابن عابدين كتاب البيوع، فصل فيما يدخل في البيع تبعا وما لا يدخل.،ج٤ ص ٥٤٧).

والتفصيل في درر الحكام (كتاب البيوع، الباب الثاني، الفصل الرابع، رقم المادة: ٢٣١، ج١ص٢٠٩).

مسئلہ: جو چیز عرفاً مبیع کے تابع ہے وہ بدون ذکر بھی مبیع میں داخل ہو کر فروخت ہو گی، جیسے جانور کے ساتھ اس کے لگام وغیرہ۔[1]

مسئلہ: زمین فروخت کی تو اس میں لگی ہوئی کھیتی بیع میں داخل نہ ہو گی، کیونکہ کھیتی علیحدہ کرنے کے لئے لگائی گئی ہے، اسی طرح درخت کی بیع میں پھل داخل نہیں ہے۔[2]

مسئلہ: زمین کی بیع میں اس میں لگے ہوئے درخت خود بخود داخل ہوں گے، کیونکہ اسے زمین کے ساتھ اتصال قرار حاصل ہے۔[3]

مسئلہ: خریدنے کے بعد زمین سے یا جانور کے پیٹ سے کوئی چیز نکلے، اگر وہ چیز اسی میں پیدا ہوتی ہے جیسے معدنی چیزیں (تیل، کوئلہ وغیرہ) یا چڑیا کے انڈے، یا سیپی میں موتی، تو یہ خریدار کی ملک ہو گی، اور اگر اس میں پیدا نہیں ہوتی ہے تو وہ بائع کی ملک ہو گی جیسے مچھلی یا مرغی کے پیٹ سے موتی، یا زمین سے خزانہ۔[4]

مسئلہ: جو چیز بیع میں تبعاً داخل ہوتی ہے وہ مبیع کے اوصاف کی طرح ہے، اس کے مقابلے میں ثمن کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔[5]

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] (ولا يدخل الزرع في بيع الأرض) بلا ذكر بالإجماع لأنه متصل به للفصل فأشبه المتاع الموضوع في البيت. (ولا) يدخل (الثمر في بيع الشجر إلا باشتراطه) أي باشتراط دخول الزرع في بيع الأرض ودخول الثمر في بيع الشجر (مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، فصل فيما يدخل في البيع تبعا،ج٢ ص ١٦).

وكذا في الهداية (كتاب البيوع، فصل ومن باع دارا دخل بناؤها في البيع،ج ٣ ص ٢٦).

[3] انظر الضابطة المتقدمة.

[4] إذا اشترى دارا أو حانوتا فانهدم حائط فوجد فيه رصاصا أو خشبا أو ساجا إن كان من جملة البناء كالخشب الذي تحت الدار يوضع ليبنى عليه ويسمى سنج بالفارسية فهو للمشتري وإن كان مودعا فيه فهو للبائع كذا في المحيط.(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع،الباب الخامس فيما يدخل تحت البيع وما لا يدخل، الفصل الاول،ج٣ ص ٣٢).

لو اشترى أرضا بحقوقها وانهدم حائط منها، فإذا فيه رصاص أو ساج أو خشب إن من جملة البناء كالذي يكون تحت الحائط يدخل، وإن شيئا مودعا فيه فهو للبائع، وإن قال البائع: ليس لي فحكمه حكم اللقطة، فقولهم شيئا مودعا يدخل فيه الأحجار المدفونة، ويقع كثيرا في بلادنا أنه يشتري الأرض أو الدار، فيرى المشتري فيها بعد حفرها أحجار المرمر والكذان، والبلاط والحكم فيه إن كان مبنيا، فللمشتري وإن موضوعا لا على وجه البناء فللبائع وهي كثيرة الوقوع.(حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب البيوع، فصل فيما يدخل تحت البيع تبعا ومالايدخل،ج٤ ص ٥٤٧).

[5] القاعدة الثالثة: ما دخل في المبيع تبعا من غير ذكر ليس له حصة من الثمن إلا أنه إذا ذكر وصرح به وأدخل في المبيع كان له حصة من الثمن. (درر الحكام شرح مجلة الاحكام، كتاب البيوع، الباب الثاني، الفصل الرابع، رقم المادة: ٢٣١،ج١ص٢٠٩).

وكذا في مجمع الضمانات (باب في البيع،ص: ٢٢٩).

خرید وفروخت کے متفرق مسائل

مسئلہ : حرام چیز اگر ناپاک نہ ہوں تو ان کو فروخت کرنا جائز ہے جیسے چمڑا، ہڈی، دانت، بال، اور حرام جانوروں کو اگر شرعی طریقہ سے ذبح کر کے ان کا خون نکال دیا جائے تو ان کا گوشت فروخت کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح وہ مردار جانور جس میں بہنے والا خون نہ ہو، خنزیر اور اس کے تمام اجزاء کی خرید وفروخت ناجائز ہے کیونکہ وہ نجس العین ہے اس کے کسی جزء سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

مسئلہ : شہد کی مکھی کا حکم: شہد کی مکھی اور اس کے انڈے، جونک، کچھوا، سانڈا اور اسی قسم کے جانور کسی جائز موقع پر استعمال کی ضرورت سے ان کو فروخت کرنا جائز ہے۔[2]

مسئلہ : انسانی اعضاء کا حکم: انسان کی کسی جزء کو فروخت کرنا، یا اس کا استعمال کرنا حرام ہے کیونکہ انسان قابل احترام ہے، اس کو فروخت کرنا اور استعمال کرنا احترام کے خلاف ہے۔[3]

مسئلہ : آزاد انسان کو فروخت کرنا بھی حرام ہے۔[1]

---

[1] قال: (وكل إهاب دبغ فقد طهر) لقوله عليه الصلاة والسلام أيما إهاب دبغ فقد طهر. (و) إلا جلد. (الخنزير لنجاسة عينه) قال الله تعالى: {فإنه رجس}..وما طهر بالدباغ يطهر بالذكاة ; لأنها تزيل الرطوبات كالدباغ،(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الطهارة،ج١ ص ١٦)

وكذا في الهداية وفيه"وكذلك يطهر لحمه هو الصحيح وإن لم يكن مأكولا"(الهداية،كتاب الطهارة،ج١ ص ٢٣).

.واختلف الفقهاء الكرام في طهارة اللّحم بالدّباغ كما قد مرّ تفصيلُه اوّلَ الكتاب في مبحث الحلال والحرام، فليراجع.

[2] لم يجز أيضًا بيع (النحل) وهو دودة العسل هذا قولهما، وقال محمد: يجوز بيعه إذا كان محرزًا لأنه ينتفع به حقيقة وشرعًا مقدور التسليم .. والفتوى على قول محمد للحاجة... (وبياع دود القز) أي: الإبريسم (وبيضه) وهو البزر الذي يكون منه الدود وهذا قول محمد، أما في الدود فلكونه منتفعًا به. وأما في البيض فلمكان الضرورة وعليه الفتوى،(النهر الفائق، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ ص ٤٢٥).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٦ ص ٨٥).

[3] عرب اور ہندوستان کے بعض اہلِ علم حضرات نے کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی گنجائش دی ہیں لیکن راجح یہی ہے جو حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔

(وكل إهاب دبغ فقد طهر) .. (إلا جلد الآدمي لكرامته) فيحرم الانتفاع بشيء من أجزائه لما فيه من الإهانة. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الطهارة،ج١ ص ١٦).

وجلد الآدمي لحرمته صونا له لكرامته وإن حكم بطهارته به لا يجوز استعماله كسائر أجزاء الآدمي(مراقي الفلاح ،باب الانجاس، فصل يطهر جلد الميتة،ص: ٦٩).

مسئلہ : انگریزی ادویات کا حکم: جن اشیاء کے ناپاک ہونے پر کوئی دلیل موجود نہ ہو جیسے انگریزی دوائیاں، صرف شک وشبہ کی بنیاد پر ان کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، لہٰذا شرعاً ان کی خرید وفروخت اور استعمال جائز ہے، ان کی حرمت کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ اکثر انگریزی دوائیوں میں شراب ملی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ شراب تو وہی ہے جو پینے اور اس سے لذت وسرور حاصل کرنے کے لئے بنائی گئی ہو، نہ کہ وہ جو زہر کی طرح مہلک ہو، میری تحقیق کے مطابق جو تیز جوہر انگریزی دوا میں ملایا جاتا ہے، وہ اپنی اصطلاح میں اس کو شراب کہتے ہیں، وہ ہرگز یہ ممنوع شراب نہیں ہوسکتی، مجھ سے یہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ دوسری شرابوں کی طرح پینے کی چیز نہیں ہے اگر اس کو دوا سے الگ پیا جائے تو زہر کی طرح مہلک ہے، پس ایسی چیز خمر (شراب) کے حکم میں نہیں ہوسکتی۔[2]

رہی یہ بات کہ اس کے چند قطرے پانی میں ڈال کر نشہ پیدا ہوتا ہے تو پانی وغیرہ میں ملانے سے پہلے موجب حرمت نہیں جیسے ایسے شیروں کو جو ادنیٰ ترکیب سے شراب بن سکتے ہیں، نہ یہ ناپاک ہیں، نہ ہی ان کا استعمال حرام ہے۔

حرمت کے لئے شرعی دلیل کی ضرورت ہے

مسئلہ : ہر وہ چیز جس کے متعلق مشہور ہو کہ اس میں حرام اور ناپاک چیز ملی ہوئی ہے جیسا کہ بعض رنگ، دوائی اور چینی کے متعلق مشہور ہے، شرعاً ان کو حرام قرار دینے کے لئے قابل اطمینان معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق ضروری ہے، اور تحقیق بھی تفصیلی اور شہادت عینی ہونی چاہئے کہ واقعی اس میں فلان ناپاک چیز ملاتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے تب جا کر اس کو ناپاک حرام قرار دیں گے، ورنہ بہت سی چیزوں کو عوام ناجائز سمجھتے ہیں اور شرعاً جائز ہے، لہٰذا کسی چیز کے متعلق خود فیصلہ کرنے کے بجائے کسی ماہر عالم دین سے تحقیق کروالیا جائے اس کے بعد جو حکم ہوگا وہ قابل اعتبار ہے۔[3]

مسئلہ : وہ اشیاء جن میں عام طور پر ناپاک چیزیں ملائی جاتی ہیں، جیسے بسکٹ جن میں ٹاڑی کا خمیر ہوتا ہے،

---

[1] بيعُه باطل لِعدم الملك والمالية والتقوّم، وقدْ صرّح به الفقهاء أوّلَ البيع الفاسد.

[2] اليقين لا يزول بالشك (الأشباه والنظائر لابن نجيم ،الفن الاول،القاعدة الثالثة،ص:٤٧)

[3] انظر الحاشية المتقدمة.

ان کا استعمال غالب کے تابع ہے اگر اکثر ملائی جاتی ہے تو ان کو استعمال نہ کیا جائے، اگر کبھی ملاتے ہیں اور کبھی نہیں تو اگر ملانے کی تحقیق ہو جائے کہ اس میں ملائی ہے تو اس کو استعمال نہ کرے، بدون ثبوت کے استعمال ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔[1]

مسئلہ : ہر وہ چیز جس کو علیحدہ کر کے مستقل طور پر فروخت کرنا جائز نہیں، اس کو بیع میں مستثنی کرنا بھی جائز نہیں، جیسے گھوڑا فروخت کیا اس کے حمل کا استثناء کیا، یا درخت فروخت کیا اور آئندہ لگنے والے درختوں کا استثناء کیا۔[2]

مسئلہ : غلہ جب کیل یا وزن سے فروخت ہو تو ضروری ہے کہ خریدار یا اس کے وکیل کے سامنے وزن کر کے دیا جائے، بائع کے بیان پر اکتفاء جائز نہیں، اگر تخمینہ اور اشارے سے فروخت کرے مثلاً گندم کا یہ ڈھیر پچاس ہزار میں فروخت کیا تو اس میں وزن کی ضرورت نہیں۔[3]

بند ڈبوں کا حکم

مسئلہ : ایسے برتن یا بوریاں (یا ڈبے) جن کا وزن متعین اور معلوم ہے، ان میں دوبارہ وزن کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہر ظرف (برتن) اصطلاحی کیل ہے۔[4]

مسئلہ : ہزار من گندم کو دو لاکھ میں خریدا، اور فی بوری دو من گندم ہے تو پانچ سو بوریاں گن لینا کافی ہے،

---

[1] العبرة للغالب الشائع لا للنّادر. (مجلة الأحكام العدلية،المقالة الثانية في القواعد الكلية، رقم المادة ٤٢،ص ٢٠).

[2] قال: "ومن اشترى جارية إلا حملها فالبيع فاسد" والأصل أن ما لا يصح إفراده بالعقد لا يصح استثناؤه من العقد، والحمل من هذا القبيل،(الهداية ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ ص ٤٩).

وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد واحكامه،ج٢ ص ٢٤).

[3] قال محمد رحمه الله: وإذا اشترى الرجل طعاماً مكايلة، وقبضه، فإنه لا يأكله، ولا يبيعه، ولا ينتفع به حتى يكيله، وكذلك إذا كان البائع ابتاعه واكتاله من بائعه بحضرة المشتري لم يجز له أن يقتصر على ذلك الكيل ولا يبيع ولا يأكل حتى يكتاله ثانياً، (المحيط البرهاني،كتاب البيوع، الفصل السابع،ج٦ ص ٤١٧).

(قوله: بخلاف مجازفة) . أي لو اشتراه مجازفة له أن يتصرف فيه قبل الكيل والوزن؛ لأن كل المشار إليه له: أي الأصل والزيادة (رد المحتار،كتاب البيوع،فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض والزيادة،ج٥ص ١٥٠).

وراجع لمزيد التفصيل "بدائع الصنائع"(كتاب البيوع، حكم البيع، ج٥ص٢٤٤).

[4] یعنی ان جیسے ڈبوں اور تھیلوں میں مقررہ وزن کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ خود تھیلہ /ڈبہ ہی مقصود ہوتا ہے اس لئے دوبارہ وزن کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دوبارہ وزن تب ہی ضروری ہے جب اصل معاملہ وزن یا کیل کے اعتبار سے کیا گیا ہو۔

یوں سمجھا جائے گا کہ فی بوری کی قیمت /۴۰۰ روپے ہے، اگر بوریوں میں کمی ثابت ہو جائے تو جتنی کم نکلے اتنا بائع سے وصول کر سکتا ہے۔[1]

مسئلہ: زید نے بکر سے طے کر لیا کہ فلاں قسم کی چیز اس قیمت پر لیا کریں گے، اب جب تک کوئی نئی گفتگو نہ ہو وہی قیمت متعین رہے گی اسی کی ادائیگی واجب ہے، یہی حکم ان چیزوں کا ہے جن کی قیمت متعین ہے، ان میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔ الا ماشاءاللہ۔[2]

مسئلہ: زید نے بکر سے کوئی چیز اس شرط پر خریدی کہ اگر آپ کی قیمت مارکیٹ کی قیمت سے زیادہ ہوگی تو واپس کر دوں گا، یہ خیار شرط کے طور پر جائز نہیں، اگر محض ایک وعدہ ہے تو دیانۃً قابل وفاء ہے، اس کو عقد میں داخل کرنا چونکہ نزاع کا سبب ہے اس لئے اس سے عقد فاسد ہوگا۔[3]

مسئلہ: ایجاب و قبول کے وقت قبول میں آخری بات معتبر ہے، مثلاً زید چاقو خرید رہا ہے زید نے ایک روپیہ کا مانگا بائع آخر تک دو روپیہ کہتا رہا، تو قیمت اس کی دو روپے ہی طے ہوگی، اگر خریدار نے آخر میں ایک روپیہ کہا اور لے چلا اور بائع نے کوئی مزاحمت نہیں کی تو یہی ایک روپیہ قیمت قرار پائے گی۔[4]

---

[1] متفرع على المسئلة المتقدمة.

[2] وفي شرح الشافي لو باع بمثل ما باع فلان إن كان شيئا لا يتفاوت كالخبز واللحم يجوز. (الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الفصل الثامن في جهالة المبيع أو الثمن، ج٣ص ١٢٧).

وفي فتاوى قاضيخان: رجل اشترى شيئا بقيمته أو بحكمه أو بما يريد أو بما يرضى لا يجوز ..أو باع بثوب أو كر حنطة أو باع برأس ماله أو بما اشتراه فلان أو بمثل ما اشترى فلان أو بمثل ما يبيع الناس لا يجوز البيع إلا أن يكون شيئا لا يتفاوت ثمنه كالخبز واللحم(كتاب البيوع، الفصل الأول في فساد البيع بجهالة أحد البدلين ، ج٢ص ٦٩).

[3] وفي «مجموع النوازل» : رجل له على آخر دين فطالبه فجاء المطلوب بشعير قدرا معلوماً وقال للطالب: خذه بسعر البلد قال: إن كان سعر البلد معلوماً وهما يعلمان ذلك كان بيعاً تاماً، وإذا لم يكن سعر البلد معلوماً وهما يعلمان ذلك كان بيعاً تاماً، وإذا لم يكن سعر البلد معلوماً إلا أنهما لا يعلمان ذلك لا يكون بيعاً. (المحيط البرهاني ، كتاب البيوع، الفصل الاول، ج٦ص ٢٧٢). طالب مديونه فبعث إليه شعيرا قدرا معلوما وقال: خذه بسعر البلد والسعر لهما معلوم كان بيعا وإن لم يعلماه فلا. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ، كتاب البيوع، ج٤ ص ٥١٥).

[4] پہلی صورت میں زید کا ایجاب باطل سمجھا جائے گا اور بائع کا دو روپے کہنا نیا ایجاب ہو جائے گا اگر زید اس کو منظور کرے تو اس کو قبول کہا جائے گا، اسی طرح خریدار کا ایک روپیہ کہنا ایجاب تصور ہوگا اور بائع کا مزاحمت نہ کرنا عملاً قبول شمار ہوگا. (لأنّ البيعَ بالتعاطي يصح وإنْ كان مِن أحد الجانبين حسب القول المختار).

جنگلی جانوروں کے احکام

جنگلی جانوروں کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ وہ نہ ملک میں ہو نہ قبضہ میں، جیسے ایک پرندہ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ میں نے فروخت کردیا ہے، میں پکڑ کردوں گا یا تم خود ہی پکڑ لو، یہ بیع باطل ہے۔[1]

۲۔ مملوک ہے لیکن قبضہ میں نہیں ہے پس اگر آسانی کے ساتھ قبضہ میں لانا ممکن ہے یا عادۃً ثابت ہے تو بیع صحیح ہے جیسے پالتو کبوتر یا پالا ہوا ہرن وغیرہ، اگر پکڑنے کے لئے اسباب وتدابیر کی ضرورت ہو جیسے بڑے حوض میں چھوڑی ہوئی مچھلیاں، اڑنے والے کبوتر جو فی الحال گھر سے باہر نکلا ہوا ہو تو یہ بیع فاسد ہوگی۔[2]

مسئلہ: شکاری باز، کتا، چیتا چھوٹا ہوا، ان کو فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ سدھا ہوا ہونے کی وجہ سے عادۃً مالک کے پاس واپس آجاتے ہیں۔[3]

مسئلہ: چھوٹے حوض کی مچھلیاں چونکہ آسانی کے ساتھ پکڑی جاسکتی ہے اس لئے ان کو فروخت کرنا جائز ہے۔

۳۔ قبضہ میں ہے لیکن مملوک نہیں، جیسے کسی اور کا پالتو کبوتر پکڑ لیا تو یہ مال غیر کے حکم میں ہے۔[4]

۴۔ جو جنگلی جانور قبضہ میں بھی ہو اور مملوک بھی ہو تو دوسرے مالوں کی طرح ان کو فروخت کرنا بھی جائز ہے۔[5]

---

[1] لِعدم الملك وبيعُ الغير المملوك باطل كما مر.

[2] (و) فسد (بيع سمك لم يصد) لو بالعرض وإلا فباطل لعدم الملك صدر الشريعة (أو) (صيد ثم ألقي في مكان لا يؤخذ منه إلا بحيلة) للعجز عن التسليم (وإن أخذ بدونها صح)

(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، مطلب في البيع الفاسد،ج٥ ص ٦٠).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ٥٥).

[3] إذا كان الطير يطير في الهواء ولا يرجع لم يجز بيعه، وأما إذا كان له وكر عنده يطير منه في الهواء ثم يرجع إليه جاز بيعه والحمام إذا علم عودها وأمكن تسليمها جاز بيعها؛ لأنها مال مقدور التسليم. (درر الحكام، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ١٧٠).

البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٦ ص ٨٠).

[4] اور مال غیر کو اس کی اجازت کے بغیر بیچنا باطل ہے۔

[5] ويجوز بيع جميع الحيوانات سوى الخنزير وهو المختار كذا في جواهر الأخلاطي. (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع ، الباب التاسع،الفصل الرابع في بيع الحيوانات،ج٣ ص ١١٤).

ادھار اور نقد میں قیمت کا تفاوت کرنا

مسئلہ : بائع نے کہا کہ یہ کپڑا نقد خریدو گے تو دس روپے میں، ادھار ہو تو پندرہ میں، تو یہ معاملہ جائز ہے بشرطیکہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار کا معاملہ طے ہو جائے مبہم نہ رہے، بلکہ ایک بات کہہ دے یا ادھار لیا یا نقد لیا، اور اگر مبہم چھوڑ دیا کہ خریدار کو اختیار ہے (چاہے اس وقت دس میں لے یا آئندہ پندرہ میں) تو یہ بیع فاسد ہو گئی۔[1]

مسئلہ : اگر غلہ فروش غلہ کا ڈھیر اس طرح لیتے ہیں کہ روپے بائع کے حوالہ کر دیا اور قیمت متعین کر دی، وزن کر کے پورا غلہ قبضہ میں نہیں لیا، اب وزن کر کے فروخت کرتے گئے جتنا وزن ہو اسی قدر ادا کردہ قیمت میں سے وضع ہو گیا، اگر اس جگہ بائع بھی موجود ہے تو یہ وزن دونوں کی طرف سے ہو گا ورنہ بیع فاسد ہو گئی کیونکہ پہلی بار وزن نہیں ہوا۔[2]

مسئلہ : اگر یہ بات طے پائی کہ بازاری قیمت سے اس قدر زیادہ لیا جائے گا، تو یہ بیع فاسد ہے[3] ہاں اگر بائع اول یہاں موجود رہے اور ہر مرتبہ اپنی تقریر یا سکوت سے رضاء ظاہر کرتا جائے تو گویا یوں سمجھا جائے گا یہ یہ مال بائع اول ہی کا تھا اس نے ہر مرتبہ فروخت کرنے کی اجازت دی، تو یہ بیع صحیح ہو گی۔

مسئلہ : قصائی سے گوشت خریدا یہ متعین نہیں کیا کہ ران کا گوشت ہے یا پسلی وغیرہ کا، پھر قصائی (نے)[4] اسی مجلس میں ٹکڑا کاٹ کر مشتری کے حوالہ کیا اور مشتری نے سکوت اختیار کیا تو بیع صحیح ہو گئی، ورنہ جہالت مبیع کی وجہ سے بیع فاسد ہے۔[5]

وانظر ایضا المحیط البرهاني (کتاب البیوع، الفصل السادس، نوع آخر في بیع الحیوانات، ج ٦ ص ٣٤٦).

[1] کیونکہ جب کسی ایک شق پر اتفاق نہیں ہوا تو ثمن متعین نہیں ہوا جبکہ مجلس عقد میں ثمن متعین کرنا بیع صحیح ہونے کے لئے شرط ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ گزر چکا ہے۔

[2] اشتری شیئا مما یکال أو یوزن أو یعد فباعه قبل أن یکله أو یزنه أو یعده فالبیع فاسد فیما یکال أو یوزن(الجامع الصغیر، باب البیع فیما یکال أو یوزن ،ص: ٣٣٥).والتّفصیل فی الدر المختار وحاشیة ابن عابدین (کتاب البیوع، مطلب في تصرف البائع في المبیع قبل القبض، ج٥ص ١٤٩).

[3] بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بازاری قیمت کی جب تک تعیین نہ ہوئی تو اصل قیمت میں جہالت برقرار رہے گا جو کہ مفسدِ بیع ہے۔

[4] قوسین کے درمیان کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

[5] لأنّ بینَ قیمتهما تفاوت فلا بدّ مِن التعیین، وقد مرّ بیانُه.

مسئلہ : شیرینی اور وہ تمام چیزیں جو عادۃ یکسا سمجھتی جاتی ہیں، ان میں تعین جانب کی ضرورت نہیں ہے یا جن چیزوں میں عرفاً ایک جانب متعین ہے جیسے کپڑا تھان سے خریدنے میں اس کا ایک سرا متعین ہے اسی جانب سے دیا جاتا ہے دوسری جانب سے نہیں دیا جاتا، ان میں جانب متعین نہ کرنے سے فساد لازم نہیں آتا، البتہ متفاوت چیزوں میں جن تک جانب متعین نہ کر لیا جائے یا چھانٹ کر علیحدہ نہ کر لئے جائیں یا کسی اور طریقہ سے متعین نہ ہو جائے تو بیع فاسد ہو گی، مگر یہ کہ اسی مجلس میں عاقدین کی رضامندی سے متعین ہو جائے تو فساد رفع ہو کر بیع صحیح ہو جائے گی۔[1]

مسئلہ : بیع میں یہ شرط ٹھہرانا کہ قیمت نہیں دیں گے بلکہ وہ ہمارے پاس جو مال ہے اس میں سے کوئی مال اتنی قیمت کا لے لے، اب اس صورت میں چونکہ قیمت متعین نہیں ہوئی ہے کہ قیمت کے طور پر کونسا مال دیا جائے گا اس لئے یہ بیع فاسد ہے[2]، ہاں البتہ جو مال بطور قیمت کے دیا جائے گا وہ اور اس کی قیمت متعین کر دے تو جائز ہو گا، بیع صحیح ہو گی، یہ بھی جائز ہے کہ مشتری دو چار چیزوں میں سے ایک دو کے لینے کا اختیار حاصل کرے۔

مسئلہ : اس طرح یہ شرط رکھنا کہ ہم قیمت ابھی نہیں دیں گے بلکہ وہ ہمارا جو فلان مدیون ہے وہ فلان چیز بیچ کر آپ کو اس مال کی قیمت دیں گے، یا فلاں جگہ سے جب آمدنی حاصل ہو گی تب دیں گے، اس شرط سے بیع فاسد ہو گی، ہاں البتہ حوالہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[3]

ادھار خریدنے کی صورتیں

دکاندار سے ادھار مال خریدتے رہیں اور آخر میں حساب لگا کر قیمت ادا کرنے کو فقہاء نے استجرار

---

[1] مرّ تفصيلُه فيْ مبحث الشرائط وانظر الحاشية المتقدمة ايضا.

[2] لأنّ الثمنَ لم يتعينْ بعدُ.

[3] لجِهالة الاجل. قال المرغيناني رحمه الله: "والبيع إلى النيروز والمهرجان وصوم النصارى وفطر اليهود إذا لم يعرف المتبايعان ذلك فاسد لجهالة الأجل" وهي مفضية إلى المنازعة في البيع.. ولو كفل إلى هذه الأوقات جاز؛ لأن الجهالة اليسيرة متحملة في الكفالة وهذه الجهالة يسيرة مستدركة لاختلاف الصحابة رضي الله تعالى عنهم فيها ولأنه معلوم الأصل؛ ألا يرى أنها تحتمل الجهالة في أصل الدين بأن تكفل بما ذاب على فلان ففي الوصف أولى، بخلاف البيع(الهداية ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٣ ص ٥٠).وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ١٧٣).

کے نام سے ذکر کیا ہے، قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ بیع جائز نہ ہو لیکن فقہاء نے استحسانا اس بیع کے جواز پر زور دیا ہے۔

مگراس کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ایک مرتبہ قیمت طے کرلی پھر اسی قیمت پر ہمیشہ لیتا رہا۔

۲۔دوسرے یہ ہے کہ اس کی قیمت مشہور ہے متعین ہے، اس میں کسی خاص سبب سے کمی زیادتی نہیں ہوتی، جیسے ہمارے ہاں آٹا، دالیں، تیل، گھی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی قیمت سے دستیاب ہیں یا بعض ایسی چیزیں جن کا ریٹ سرکاری طور پر متعین ہے جیسے دوائیاں وغیرہ کہ قیمت ان پر لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

۳۔ مبیع مثلی چیزوں میں سے ہے۔

۴۔ مبیع غیر مثلی ہے یعنی قیمی ہے۔

ان میں پہلی اور دوسری صورت میں عقد بیع ہے تیسری صورت قرض اور چوتھی صورت فاسد ہے۔ [1]

بیع بالحصہ کے احکام

**مسئلہ: ** بیع بالحصہ ابتداءً باطل ہے انتہاءً جائز ہے، اس کی تفصیل یوں ہے کہ زید نے بکر سے دو چیزیں ایک قیمت میں خریدیں، جن میں ایک کی بیع شرعاً جائز ہے اور دوسری کی ناجائز ہے جیسے شربت اور شراب تو دونوں کی بیع ناجائز ہوئی، اگر دونوں مبیع کا فروخت کرنا شرعاً جائز ہو کوئی شرعی ممانعت نہ ہو لیکن کسی وجہ سے ایک چیز فی الحال فروخت نہیں ہو سکتی، جیسے اپنا مال اور دوسرے کا مال ملا کر فروخت کیا اور دونوں مال کی قیمت الگ الگ بیان کردی گئی تھی تو بائع کا مال اس کے لئے متعین کردہ قیمت کے ساتھ فروخت ہوا

---

[1] یہ علامہ شامی رحمہ اللہ کا موقف ہے وہ اس کو قرض قرار دیتے ہیں اور قرض کے لئے چونکہ مثلی ہونا ضروری ہے اس لئے اس تکییف کے مطابق مثلیات میں تو ایسا تعامل جائز ہے البتہ ذوات القیم اشیاء میں جائز نہیں ہے کیونکہ ذوات القیم کو قرض پر دینا قرض فاسد ہے اور قرض فاسد کی بنیاد پر قرض لینے والے کا تصرف کرنا درست نہیں، لیکن علامہ ابن نجیم اور ان کے بھائی عمر بن نجیم رحمہ اللہ کے مطابق یہ بیع بالتعاطی ہے لہٰذا مثلی اور غیر مثلی اشیاء کے حکم میں کوئی فرق نہیں، اس کی مزید تفصیل اور اس تکییف پر وارد ہونے والے اشکالات اور جوابات کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔(رد المحتار، کتاب البیوع، مطلب فی بیع الاستجرار، ج۴ص ۵۱۶۔ البحر الرائق، کتاب البیوع، ج۵ص ۵۷۹۔ النہر الفائق، کتاب البیوع، ج۳ص ۳۳۶)۔

دوسرے کا مال نہیں بکا، اب یہ تقسیم انتہاءً ہے کیونکہ ابتداءً دونوں کی بیع ہوگئی تھی مگر ایک چیز دوسرے کے ملک ہونے کی وجہ سے بعد میں واپس کی گئی، اور پہلی صورت میں تقسیم ابتداءً تھی کیونکہ شراب کی خرید وفروخت ممنوع ہونے کی وجہ سے اس میں ایجاب ہی غلط ہوا۔[1]

مسئلہ: جن چیزوں کی خرید وفروخت ممنوع ہے وہ ایسی چیزوں کے ساتھ مخلوط ہوں جن کی خرید وفروخت جائز ہے، تو اگر ممنوع اشیاء کی قیمت نہ لگائی جائے جائز اشیاء کی بیع صحیح ہوگی ورنہ نہیں، جیسے وہ برتن فروخت کیا جس میں شراب بھری ہوئی ہے یا وہ کپڑا جس میں نجاست لگی ہوئی ہے تو برتن اور کپڑے کو فروخت کرنا جائز ہے اور اگر شراب یا نجاست کی قیمت بھی لگائی جائے مثلاً یہ برتن شراب سمیت سو روپے میں ہے تو یہ بیع فاسد ہوگی۔[2]

مسئلہ: گاہک کو دو چیزیں دکھائیں ایک کی بیع جائز ہے اور دوسری کی ناجائز، اور کہا چاہو تو ایک لو یا دونوں، تو ایک جس کی بیع جائز ہے اگر اس کو لیا تو بیع صحیح ہوگی اور اگر دونوں کو خریدنا شرط ہو تو بیع فاسد ہوگی کیونکہ مبیع کی خریداری میں غیر مبیع کا خریدنا شرط قرار پائی ہے۔[3]

---

[1] (ومن جمع بين حر وعبد أو شاة ذكية وميتة بطل البيع فيهما) قال في الينابيع: هذا على وجهين. إن كان قد سمى لها ثمناً واحداً فالبيع باطل بالإجماع؛ وإن سمى لكل واحد منهما ثمناً على حدة فكذلك عند أبي حنيفة، وقالا: جاز البيع في العبد والذكية وبطل في الحر والميتة، قال في التصحيح: وعلى قوله اعتمد المحبوبي والنسفي والموصلي. (وإن جمع بين عبد ومدبر) أو مكاتب أو أم ولد (أو) جمع بين (عبده وعبد غيره صح العقد في العبد بحصته من الثمن) ، لأن المدبر محل للبيع عند البعض فيدخل في العقد ثم يخرج، فيكون البيع بالحصة في البقاء دون الابتداء،(اللباب في شرح الكتاب ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ٢٩).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد قبيل مطلب فيما إذا اشترى أحد الشريكين جميع الدار المشتركة،ج٥ ص ٥٧).

[2] ممنوع چیز کے قیمت لگانے کی صورت میں وہ بھی مبیع قرار پائے گی جبکہ مال متقوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیع جائز نہیں اور چونکہ دونوں اشیاء کی قیمت الگ الگ طور پر مقرر نہیں کی گئی اس لئے اس جہالت کی وجہ سے غیر ممنوع چیز کی بیع بھی ناجائز قرار پائے گی، ممنوع چیز کے قیمت نہ لگانے کی صورت میں چونکہ یہ خرابی نہیں ہے اس لئے جائز چیز کی حد تک بیع جائز ہو جائے گی۔

[3] أن الصفقة إذا اشتملت على الصحيح والفاسد يتعدى الفساد إلى الكل عنده، وعندهما لا يتعدى فهما سويا بين الفساد الطارئ والمقارن، وأبو حنيفة فرق بينهما.(ووجه) الفرق ما ذكرنا من قبل أن الفساد إذا كان مقارنا يصير قبول العقد في الفاسد شرط قبول العقد في الآخر، وهذا شرط فاسد، فيؤثر في الكل، ولم يوجد هذا المعنى في الطارئ فاقتصر الفساد فيه على قدر المفسد،(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط الصرف،ج٥ ص ٢١٧).

پکنے سے پہلے پھل فروخت کرنے کا حکم

مسئلہ: کچا پھل اور کچی کھیتی کو فروخت کرنے میں اختلاف ہے، اس کی چار صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ پھل ظاہر ہونے اور کھیتی بڑھنے سے پہلے فروخت کی گئی۔

۲۔ پھل ظاہر ہونے اور کھیتی بڑھنے کے بعد فروخت کی گئی۔

۳۔ پکنا شروع ہونے کے بعد فروخت کی گئی۔

۴۔ پک جانے کے بعد فروخت کی۔

پہلی صورت میں بیع بالاتفاق ناجائز ہے اور چوتھی صورت میں بالاجماع جائز ہے۔[1]

دوسری صورت میں اگر خرید کر کاٹ لیں تو جائز ہوگی، اگر یہ شرط رکھے کہ پھل پکنے تک درخت پر رہے گا (اس شرط میں مشتری کا فائدہ ہے اس لئے شرط فاسد ہے) اس سے بیع فاسد ہوگی۔[2]

اور تیسری صورت کہ پھل تو پورا نکل آیا کچھ خالی رہ گیا تھا تو یہ صورت اختلافی ہے، جمہور فساد بیع کے قائل ہیں جبکہ امام فضلی اور امام حلوائی رحمہما اللہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہیں، یہ امام محمد رحمہ اللہ سے استحساناً مروی ہے علامہ شامی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور فتاویٰ عالمگیری میں اسی پر فتویٰ نقل کیا ہے۔[3]

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، ج٦ ص ٩١).

[1] لا خلاف في عدم جواز بيع الثمار قبل أن تظهر.. ولا في الجواز بعد بدو الصلاح، (فتح القدير ، كتاب البيوع، ج٦ ص ٢٨٧)

[2] وإن شرط تركها على النخيل فسد البيع"؛ لأنه شرط لا يقتضيه العقد وهو شغل ملك الغير أو هو صفقة في صفقة وهو إعارة أو إجارة في بيع، وكذا بيع الزرع بشرط الترك لما قلنا، (الهداية ، كتاب البيوع، ج٣ ص ٢٧).
وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب البيوع، ج١ ص ١٨٩).

[3] حاصله أن لهذه المسألة ثلاث صور: أحدها إذا خرج الثمار كله فإنه يجوز بيعه بالاتفاق وحكمه ما مضى، وثانيها أن لا يخرج شيء منه فإنه لا يجوز بيعه اتفاقا، وثالثها أن يخرج بعضها دون بعض فإنه لا يجوز في ظاهر المذهب وقيل يجوز إذا كان الخارج أكثر ويجعل المعدوم تبعا للموجود استحسانا لتعامل الناس وللضرورة وكان شمس الأئمة الحلواني وأبو بكر بن الفضل يفتيان به. وقال شمس الأئمة السرخسي والأصح أنه لا يجوز. وفي البحر وهو ظاهر المذهب (مجمع الأنهر ، كتاب البيوع، ج٢ ص ١٩). ولو باع كل الثمار وقد ظهر البعض دون البعض فظاهر المذهب أنه لا يصح وكان شمس الأئمة الحلواني والفضلي يفتيان بالجواز في الثمار والباذنجان والبطيخ وغير ذلك ويجعلان الموجود أصلا في العقد والمعدوم تبعا استحسانا لتعامل الناس والأصح أنه يجوز كذا في المبسوط. (الفتاوى الهندية ، كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل الثاني في بيع الثمار وإنزال الكروم والأوراق والمبطخة، ج٣ ص ١٠٦). والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين وفيه: (قوله: لو الخارج أكثر) ذكر في البحر

اور ہدایہ و قاضی خان میں ہے کہ پھل یا کھیتی اپنی حد تک پہنچ گئے ہوں (اس سے زیادہ بڑھنے کی امید نہیں) تو امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک پکنے تک درختوں یا زمین پر چھوڑنے کی شرط جائز ہے کیونکہ قلیل معدوم کثیر موجود کے تابع ہے اور یہی حکم ہے گلاب کے پتوں کا اگرچہ وقتاً فوقتاً نکلا کرتے ہیں۔[1]

علامہ شامی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے زمانے میں اس کی سخت ضرورت ہے اور لوگوں کو اپنی عادت سے روکنا مشکل ہے۔[2] لیکن ہمارے زمانے میں جو لوگ کرتے ہیں کہ ابھی صرف پھول نکلا اور پھل بک گئے یا چھوٹے چھوٹے پھل اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا کہ ان کو درختوں پر چھوڑا جائے گا، ان کے عدم جواز میں کوئی شبہ نہیں۔[3]

حیلہ جواز

چھوٹے چھوٹے پھل خریدنے پر چھوڑنے کی شرط نہ لگائے لیکن بعد میں بائع سے اجازت لے لے[4]، یا درخت زمین کے ساتھ ٹھیکہ میں لے لے تو بلا تردد جائز ہے۔[5]

عن الفتح أن ما نقله شمس الأئمة عن الإمام الفضلي لم يقيده عنه بكون الموجود وقت العقد أكثر بل قال: عنه أجعل الموجود أصلا، وما يحدث بعد ذلك تبعا. (كتاب البيوع، ج٤ ص ٥٥٦).

١ "وإن شرط تركها على النخيل فسد البيع"؛ لأنه شرط لا يقتضيه العقد وهو شغل ملك الغير أو هو صفقة في صفقة وهو إعارة أو إجارة في بيع، وكذا بيع الزرع بشرط الترك لما قلنا، وكذا إذا تناهى عظمها عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله لما قلنا، واستحسنه محمد رحمه الله للعادة، بخلاف ما إذا لم يتناه عظمها(الهداية، كتاب البيوع، فصل ومن باع دارا دخل بناءها، ج٣ ص ٢٧). وكذا في تبيين الحقائق، كتاب البيوع، فصل يدخل البناء والمفاتيح في بيع الدار، ج٤ ص ١٢)

هذا: ولم اجده في فتاوى قاضي خان في مظان هذه المسئلة.

٢ رد المحتار (كتاب البيوع، ج٤ ص ٥٥٦).

٣ کیونکہ پہلی صورت میں بیع معدوم اور دوسری صورت میں شرط فاسد ہے۔

٤ ولو اشترى مطلقا وتركها على النخل من غير شرط الترك ولم يتناه عظمها فإن كان ذلك بإذن البائع جاز وطلب له الفضل. تحفة الفقهاء، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ ص ٥٦.

لو اشتراها مطلقا وتركها بإذن البائع طاب له الفضل. الهداية، كتاب البيوع، ج٣ ص ٢٧.

٥ یعنی مساقات پر لے لے، اجارہ پر لینا درست نہیں ہے کیونکہ اگر درخت اجارہ پر لے تو اجارۃ الاعیان ہے اور اگر پھل پکنے تک زمین کرایہ پر لے تو مدت مجہول ہے، پہلی صورت میں اجارہ باطلہ ہے اور دوسری صورت میں فاسدہ۔

والحيلة أن يأخذ الشجرة معاملة على أن له جزءا من ألف جزء أن يشتري أصول الرطبة كالباذنجان وأشجار البطيخ والخيار ليكون الحادث للمشتري (الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب البيوع، مطلب فى بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، ج٤ ص ٥٥٧) والحيلة في كون الحارث للمشتري أن يشتري أصول الباذنجان والبطيخ والرطبة ليكون الحادث على ملكه، وفي الزرع والحشيش يشتري الموجود ببعض الثمن ويستأجر الأرض مدة معلومة يعلم فيها الإدراك وانقضاء الغرض فيها بباقي الثمن، وفي ثمار الأشجار يشتري الموجود ويحل له البائع ما يوجد. النهر الفائق، كتاب البيوع، ج٣ ص ٣٥٩.

اور پھل پورے نکل آنے کے بعد فروخت کئے گئے پھر آپس کے اقرار سے یا بمقتضائے عرف پھل پکنے تک درخت پر چھوڑ دئے گئے تو اس بارے میں اختلاف اوپر مذکورہ ہوا مگر فتویٰ جواز پر ہے جیسا کہ استحسان ہے امام محمد رحمہ اللہ کا اور متاخرین نے وعدوں کو جائز رکھا ہے۔

مسئلہ : جس درخت پر پھل لگے ہوئے ہوں یا جس زمین پر کھیتی ہے یا عمارت ہے وہ درخت اور زمین فروخت کرکے یہ شرط رکھنا

کہ اتنی مدت تک زمین خالی نہ کرائے جائے گی، فساد عقد کا موجب ہے، ہاں اتنی مہلت ملے گی جس میں عرفاً زمین خالی کرانے کے اسباب اور بردباری کے اسباب اور حفاظت کی جگہ تک پہنچانے کے اسباب مہیا ہوں جیسا کہ روایت میں کہ حضرت جابر رضی اللہ نے حضور ﷺ کو راستے میں ایک اونٹ فروخت کیا اور یہ شرط رکھی کہ مدینہ منورہ میں سوار رہوں گا وہاں پہنچ کر حوالہ کروں گا، اور حضور ﷺ نے یہ شرط منظور فرمائی۔[1]

مسئلہ : باہمی رضامندی سے جب تک چاہیں، پھل کو درختوں پر کھیتی کو زمین رکھنے کا اختیار ہے مگر بوقت عقد چھوڑنے کی شرط نہ لگائے۔[2]

مسئلہ : زمین فروخت کرنے کے بعد اس میں لگے ہوئے درختوں کی جڑوں کا مالک مشتری ہے مگر یہ کہ اس شہر کا عرف اس کے خلاف ہو یا بائع مقام معین کرکے درختوں کا استثناء کرلے۔[3]

مسئلہ : اگر اس علاقے کے عرف میں درختوں کو اوپر کاٹ لینے کا ہو یا ایک گز تک کھود کر تنہ نکالنے کا ہو تو عرف کے مطابق ہی عمل کیا جائے گا، اطراف وجوانب سے جڑیں نہیں نکالیں جائیں گی مگر یہ (کہ) عقد کے وقت صراحت کے ساتھ طے ہو جائے کہ دائیں بائیں سے بھی جڑیں نکالی جائیں گی۔[4]

---

[1] مرّ تخريجه ضمن الشروط الفاسدة وسياتي ايضا.

[2] انظر الحواشي المتقدمة انفا.

[3] ومن باع أرضا دخل ما فيها من النخل والشجر وإن لم يسمه" لأنه متصل بها للقرار فأشبه البناء(الهداية ،كتاب البيوع، فصل ومن باع دارا دخل بناءها،ج٣ ص ٢٦).والتفصيل في المحيط البرهاني (كتاب البيع،الفصل الخامس فيما لا يدخل تحت البيع..وما يدخل،ج٦ ص٣١٤).

[4] إن اشتراها ولم يذكر شيئا فإن اشتراها بغير أرضها للقلع دخل فيها أصلها ويجبر المشتري على القلع وله أن يقلعها بأصلها لكن قلعا معتادا متعارفا وليس له أن يحفر الأرض إلى ما يتناهى إليه العروق؛ لأن المعروف بالعرف كالمشروط بالشرط إلا إذا

مسئلہ : جب جڑوں کے قریب ہو، کھودنے سے بائع کا نقصان ظاہر ہوتا ہو تو مشتری کو کھودنے سے روکا جائے گا جیسے کوئی دیوار یا کنواں۔[1]

مسئلہ : اگر درختوں کے کاٹنے کے مقدار کے متعلق کوئی عرف نہ ہو تو ضروری ہے کہ عقد کرتے وقت اس کو متعین کیا جائے کہ اس مقدار سے کاٹا جائے گا، اگر کاٹنے کی جگہ صراحت کے ساتھ متعین نہ کیا جائے تو بیع فاسد ہو گی۔[2]

حکومت کی طرف سے نرخ متعین کرنے کا حکم

مسئلہ : قاضی یا حاکم اشیاء کی نرخ متعین نہیں کریں گے، ہاں البتہ تاجروں کے غبن فاحش کی وجہ سے عام لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو اور حاکم مسلمانوں کی حقوق کی حفاظت نہ کر پاتا ہو تو ارکان سلطنت کے مشورے سے نرخ متعین کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[3]

مسئلہ : مبیع مکیلی یا موزونی ہو تو وزن کرنے کی اجرت بیع کی تکمیل شہادت کے بعد بائع کے ذمہ ہے، قیمت کی روپیہ کو گننے، شمار کرنے اور اسی طرح بیعانہ کی تحریر کرنے کی اجرت، اسی طرح اداء ثمن کی شہادت کی تکمیل یہ سب مشتری کے ذمہ ہے۔(مجلہ)[4]

شرط البائع القطع على وجه الأرض فلا يدخل فيه أصلها، أو لم يشترط لكن في القطع من أصلها ضرر بالبائع بأن كان بقرب حائطه أو على حافة نهره فيخاف الخلل على الحائط أو الشق في النهر فقطعها على وجه الأرض دون أصلها(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، بيان مايحصل به العلم بالمبيع والثمن،ج٥ ص ١٦٧).

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] کیونکہ اس صورت میں مبیع کی مقدار مجہول رہے گی جو کہ مفسد عقد ہے۔

[3] (ولا يسعر السلطان إلا أن يتعدى أرباب الطعام عن القيمة تعديا فاحشا) لقوله عليه الصلاة والسلام لا تسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق، ولأن الثمن حق البائع فكان إليه تقديره فلا ينبغي للإمام أن يتعرض لحقه إلا إذا كان أرباب الطعام يتحكمون على المسلمين، ويتعدون تعديا فاحشا، وعجز السلطان عن صيانة حقوق المسلمين إلا بالتسعير فلا بأس به بمشورة أهل الرأي والنظر(تبيين الحقائق ،كتاب الكراهية، فصل في البيع،ج٦ ص ٢٨).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الكراهية، فصل في البيع،ج ٨ ص٢٣٠).

[4] (المادة ٢٨٨): المصارف المتعلقة بالثمن تلزم المشتري مثلا أجرة عد النقود ووزنها وما أشبه ذلك تلزم المشتري وحده... (المادة ٢٨٩) : المصارف المتعلقة بتسلم المبيع تلزم البائع وحده مثلا أجرة الكيال للمكيلات والوزان للموزونات المبيعة تلزم البائع وحده (مجلة الأحكام العدلية ،البيوع،الباب الخامس، الفصل الرابع في مئونة التسليم ولوازم إتمامه،ص ٥٨).

والتفصيل في درر الحكام (البيوع،الباب الخامس، الفصل الرابع في مئونة التسليم ولوازم إتمامه،ج١ ص ٢٧١).

مسئلہ : کسی مستامن یا ذمی کا غلام مسلمان ہو جائے یا مسلمان کافر کی ملک میں آجائے تو حکومت کی طرف سے اس مستامن یا ذمی کو مجبور کیا جائے گا کہ مسلمان غلام کو فروخت کر دے، یہی حکم ہے قرآن کریم کا کہ اگر کافر کی ملک میں مسلمان آجائے تو اسے فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا (عالمگیری)[1]

مسئلہ : زعفران کے پتے یا ہر وہ پتّے جو پھل کی طرح کار آمد ہوں، پھل کے حکم میں ہے۔[2]

مسئلہ : مبیع پر قبضہ کے بعد مشتری کی ملک ثابت ہو جاتی ہے چاہے قیمت ادا کر دی ہو یا نہ کی ہو، پس اگر مبیع کو قبضہ میں لانے کے بعد مشتری کا انتقال ہو گیا اور صرف ایک ہی مکان چھوڑا جو ادھار خرید کر قبضہ میں لایا تھا، اب مکان کا مالک جس نے یہ مکان بیچا، وہ دوسرے قرض خواہوں کے برابر ہے، لہٰذا ترکہ کا یہ مکان فروخت کر کے جب قرض ادا کیا جائے گا تو اس بائع کو اپنے حصہ قرض کے مطابق مکان کی قیمت سے حصہ ملے گا۔[3]

مسئلہ : اگر خریدار قبضہ میں لانے سے پہلے ہی انتقال کر جائے تو اس مکان میں سب سے زیادہ حق بائع کا ہے جب تک وہ مکان کی قیمت وصول نہ کرے دوسرے قرض خواہوں کو اس سے حصہ نہیں مل سکتا۔[4]

---

[1] إذا اشترى الذمي عبدا مسلما جاز وأجبر على بيعه صغيرا كان البائع أو كبيرا . الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب التّاسع،ج٣ص ١١٥. الكافر إذا اشترى عبداً مسلماً فإنه يجبر على بيعه حتى لا يستخدمه قهراً من غير عوض يحصل للعبد فيكون في ذلك إخلالاً بالمسلم وليس للكافر استذلال المسلم فدل أن الاستخدام على سبيل القهر من غير عوض يحصل للخادم ذل. (المحيط البرهاني ،كتاب الرهن، الباب التاسع في اختلاف الراهن والمرتهن في الرهن،ج٧ ص ٤٥٢).

الحربي إذا خرج إلينا فاشترى عبدا مسلما ثبت الملك له فيه عندنا؛ لكنه يجبر على البيع(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، بيان الأحكام التي تختلف باختلاف الدارين ،ج٧ ص ١٣٠).

[2] وورق التوت والآس والزعفران والورد بمنزلة الثمار في كل ما ذكرنا من الأحكام.(تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، فصل يدخل البناء والمفاتيح في بيع الدار،ج٤ ص ١١).

وكذا في البناية شرح الهداية (كتاب البيوع،فصل في بيان ما يدخل تحت البيع من غير ذكره،ج٨ ص ٣٣).

[3] في الدر المختار: (اشترى شيئا وقبضه ومات مفلسا قبل نقد الثمن فالبائع أسوة للغرماءو) عند الشافعي رضي الله عنه هو أحق به كما (لو لم يقبضه) المشتري (فإن البائع أحق به) اتفاقا.

وفي حاشية ابن عابدين تحته:(قوله: فإن البائع أحق به) الظاهر أن المراد أنه أحق بحبسه عنده حتى يستوفي الثمن من مال الميت أو يبيعه القاضي ويدفع له الثمن، فإن وفى بجميع دين البائع فبها، وإن زاد دفع الزائد لباقي الغرماء، وإن نقص فهو أسوة للغرماء فيما بقي له، وليس المراد بكونه أحق به أنه يأخذه مطلقا، إذ لا وجه لذلك؛ لأن المشتري ملكه وانتقل بعد موته إلى ورثته وتعلق به حق غرمائه،(كتاب البيوع،مطلب لو اشترى شيئا ومات مفلسا قبل قبضه فالبائع أحق،ج٤ ص ٥٦٤).وكذا في مجمع الأنهر (كتاب البيوع، قبيل باب الخيارات،ج٢ ص ٢٣).

[4] انظر الحاشية المتقدمة.

پارسل کے احکام

جو مال ریل یا ڈاکخانہ کے ذریعے بھیجا جائے تو وہ روانہ کرتے ہی مشتری کے قبضہ میں داخل سمجھا جائے گا جس نے منگوایا ہے، اگر خریدار نے لکھا ہے کہ فلاں مال ریل یا ڈاک کے ذریعے روانہ کردو اور مالک نے اس کے مطابق روانہ کیا، اگر راستہ میں ضائع ہوگیا تو بائع ذمہ دار نہیں کیونکہ بائع نے مشتری کے وکیل (یعنی ریل یا ڈاک) کے حوالہ کردیا، اور اگر مشتری نے نہیں منگوایا بلکہ بائع نے خود بھیجا تو یہ پارسل کرنا مشتری کا قبضہ نہیں ہے اب اگر مشتری تک پہنچنے سے پہلے ضائع ہوگیا تو مشتری اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔[1]

مسئلہ: اگر پارسل کرنے والے نے حکم کے خلاف کیا تو ایسی صورت میں اگر نقصان ہوجائے تو ذمہ دار پارسل کرنے والا ہوگا اور جو زائد کرایہ ہے وہ بھی بھیجنے والے کے ذمے ہوگا۔

مسئلہ: ویلو یعنی طلب کردہ مال کی قیمت کا رسید روانہ کرنا نہ مبیع پر قبضہ ہے نہ ہی مرسل الیہ اس کا ذمہ دار ہے۔

مسئلہ: کسی مال کے متعلق اگر یہ خیال ہو کہ جس کے قبضہ میں یہ مال ہے، نہ وہ مال کا مالک ہے نہ ہی بیچنے کا مجاز ہے تو اس مال کو بیچنا جائز نہیں۔[2]

مسئلہ: مال پر قبضہ سے ملک اور اس کے استعمال کا حلال ہونا، اس وقت ہے جبکہ فروخت کرنے والا مال کا مالک ہو یا مالک کی طرف سے مجاز ہو، البتہ اگر خریدار کو مال کی حالت معلوم نہ ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا لیکن مال غنیمت میں کوئی شرط نہیں، یعنی جو مال غنیمت میں وہ حلال ہے اگرچہ مال کی حالت معلوم نہ ہو۔[3]

---

[1] نظیرُه ما في الهندية:" رجل اشترى عبدا ولم يقبضه فأمر البائع أن يهبه من فلان ففعل البائع ذلك ودفعه إلى الموهوب له جازت الهبة ويصير المشتري قابضا وكذا لو أمر البائع أن يؤاجر من فلان فعين أو لم يعين ففعل جاز وصار المستأجر قابضا للمشترى أولا ثم يصير قابضا لنفسه. الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب الرابع،ج٣ص ٢٠.

وإذا قبض الوكيل يبرأ المديون وصار المقبوض ملكا لصاحب الدين ويكون أمانة في يد الوكيل ويكون حكمه حكم المودع.(تحفة الفقهاء ،كتاب الوكالة،ج٣ص ٢٣٠).

[2] من ابتاع سرقة، وهو يعلم أنها سرقة فقد شرك في عارها وإثمها، ومن ابتاع خيانة وهو يعلم أنها خيانة فقد شرك في عارها وإثمها.(الترغيب والترهيب لقوام السنة،باب في الترهيب من الغش والغلول والخيانة،ج١ ص ١٨٧).

وكذا في جامع المسانيد والسنن (رقم الحديث:٥١٧٨).

[3] مرّ تخريجه في مبحث الحلال والحرام.

نفع حلال ہونے کی شرط

مسئلہ : جو مال ضمان میں داخل نہیں اس میں نفع بھی حلال نہیں۔[1]

مسئلہ : وکیل، سفیر، ملازم اور کارندے کو نفع لینے کا حق نہیں کیونکہ وکیل اور سفیر تو معبر ہے اور ملازم وکارندہ پر تعمیل حکم واجب ہے۔[2]

مسئلہ : مبیع پر مشتری کے قبضہ سے پہلے مبیع ہلاک ہو جائے تو عقد بیع فسخ ہو جائے گی، اگر بائع خود ہلاک کر دے تو قیمت مبیع اس کے ذمہ عائد ہو گی۔ (عقود الدریۃ)[3]

فائدہ: ایسی صورت میں اولی اور بہتر یہ ہے کہ مشتری کو اختیار دیا جائے کہ چاہے تو عقد فسخ کرے یا قیمت بائع سے وصول کرے کیونکہ بعض اوقات مبیع کی قیمت ثمن (یعنی عقد میں طے شدہ قیمت) سے کم ہوتی ہے، چونکہ مبیع کو بائع نے ہلاک کیا اس لئے نقصان کو ظالم کی طرف راجع کرنا چاہئے۔[4]

مسئلہ : درخت کو خرید کر کاٹ لیا گیا مگر جڑ باقی ہے عقد میں یہی طے پایا تھا کہ جڑ بھی مشتری کا مال ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد جڑ ہری ہوئی شاخیں پھوٹیں (یہ مال مشتری کا ہے) اب یہ جڑ اگر بائع کی رضا اور اجازت سے چھوڑی گئی تھی تو ٹھیک ہے ورنہ بائع کو اپنی زمین کا کرایہ طلب کرنے کا حق ہے۔[1]

---

[1] عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل بيع ما ليس عندك، ولا ربح ما لم يضمن (سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب النهي عن بيع ما ليس عندك، وعن ربح ما لم يضمن، رقم الحديث: ٢١٨٨).

وكذا في السنن الكبرى للبيهقي (باب النهي عن بيع وسلف، رقم الحديث: ١٠٩٢٢، ج٥ ص ٥٧٠).

[2] نفع لینے کی صورت میں تبرع برقرار نہیں رہتا اس لئے سفیر اور وکیل اجرت کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اور ملازم پر چونکہ پہلے سے یہ خدمت لازم ہے اس لئے اس پر مزید اجرت نہیں لے سکتا کیونکہ عمل واجب پر عوض لینا رشوت ہے۔

[3] (المادة ٢٩٣) المبيع إذا هلك في يد البائع قبل أن يقبضه المشتري يكون من مال البائع ولا شيء على المشتري. (مجلة الأحكام العدلية ،البيوع، الباب الخامس، الفصل الخامس: في بيان المواد المترتبة على هلاك المبيع،ص ٥٩)

كذا فى العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية (كتاب البيوع، ج١ ص ٢٤٤)

[4] مثلاً کسی کتاب کی عام بازاری قیمت ٥٠٠ روپے ہیں مگر خریدار کو ٥٥٠ میں ملی، اب اگر بائع کے ذمے صرف قیمت لازم کر دی جائے تو خریدار کا ٥٠ روپے نقصان ہے جبکہ ظلم وتعدی فروخت کنندہ کی طرف سے ہے تو نقصان بھی اس کے سر ہونا چاہے۔

مسئلہ : عادت یہ ہے کہ ردی چیزوں میں گھاتا یعنی مبیع کی جو مقدار متعین ہے اس سے زیادہ لیا جاتا ہے، اور عمدہ اموال میں دستور ہے قیمت کچھ کم ہی دی جاتی ہے، اگر یہ دونوں باتیں عقد میں مشروط ہوں یا عموماً معروف، اور اس کمی زیادتی کی مقدار عرف سے یا عاقدین کے اقرار سے معلوم ہو تو دستوری ثمن (قیمت) سے خارج ہے اور گھاتا وہ مبیع کا جزء قرار پائے گا، اور اگر یہ بات نہ مشروط ہو نہ معروف، یا نہ مقدار معلوم ہے نہ معروف، تو دینے والے کی خوشی ہے جبراً لینے کا حق نہیں ہے اور ایسے منازعت کا نہ اعتبار ہے نہ ہی فساد عقد کا موجب ہے۔[2]

مسئلہ : گز، بانٹ، پیمانے یا شمار سے زائد دینے کا جو عام رواج ہو جائے وہ زائد اصل کی طرح واجب الاداء ہے، مثلاً خربوزہ ایک پیٹی میں پانچ کلو کے بجائے چھ کلو وزن کرنے کا معمول ہے اور آم فی سینکڑہ چھبیس ۲۶ پنج (یعنی سو کے بجائے ایک سو پانچ گننے کا معمول ہے)۔

---

[1] بائع کی رضامندی کے بغیر چھوڑے رکھنا جائز نہیں ہے اور اس صورت میں پھوٹنے والی شاخوں کا استعمال بھی خریدار کے لئے حلال نہیں ہے بلکہ صدقہ کر دینا ضروری ہے، تاہم بائع کو اپنی زمین کا کرایہ طلب کرنے کا حق تبھی ہے جب کہ یہ زمین وقف ہو یا کسی یتیم کا ہو اور یا بائع نے اس کو کرایہ داری کے لئے تیار کر رکھا ہو۔ اہل علم اس پر غور فرمائیں۔

ولو اشتراها مطلقا وتركها بإذن البائع طاب له الفضل، وإن تركها بغير إذنه تصدق بما زاد في ذاته لحصوله بجهة محظورة (الهداية ،كتاب البيوع، فصل ومن باع دارا دخل بناءها،ج٣ ص ٢٧).

وكذا في تبيين الحقائق (كتاب البيوع،فصل يدخل البناء والمفاتيح في بيع الدار،ج٤ ص ١٢).

[2] (و) جاز (زيادته) أي البائع (في المبيع) لأنه تصرف في حقه وملكه (ويتعلق الاستحقاق) أي استحقاق البائع والمشتري (بالكل) أي كل الثمن والمبيع والزائد المزيد عليه فالزيادة والحط يلتحقان بأصل العقد؛(درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب البيوع، قبيل باب الربا،ج٢ ص ١٨٥).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، فصل في التصرف في المبيع والثمن قبل القبض ،ج٥ ص ١٥٤).

قال في إجارة الظهيرية: المعروف عرفا كالمشروط شرعا (انتهى) . وقالوا: في الإجارات لو دفع ثوبا إلى خياط؛ ليخيطه له أوإلى صباغ؛ ليصبغه له ولم يعين له أجرة، ثم اختلفا في الأجر فهل ينزل منزلة شرط الأجرة؟ فيه اختلاف وقال محمد رحمه الله: إن كان الصابغ معروفا بهذه الصنعة بالأجر، وقيام حاله بها كان القول قوله، وإلا فلا اعتبار للظاهر المعتاد.وقال الزيلعي؛ والفتوى على قول محمد رحمه الله (انتهى) . ولا خصوصية لصابغ بل كل صانع نصب نفسه للعمل بأجرة فإن السكوت كالاشتراط، ومن هذا القبيل نزول الخان ودخول الحمام والدلال كما في البزازية. ومن هذا القبيل المعد للاستغلال كما في الملتقط. ولذا قالوا: المعروف كالمشروط، فعلى المفتي به صارت عادته كالمشروط صريحا الأشباه والنظائر لابن نجيم،القاعدة السادسة،المبحث الثالث: العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرط،ص٨٤).

تواس معمول کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے کوئی اگر آم سو ہی گن کر دے ایک سو پانچ نہ دے تو مشتری کو واپس کرنے کا حق ہے۔[1]

مسئلہ : بعض چیزوں میں کچھ زیادہ تولنے کی عادت ہے مگر زیادتی متعین نہیں، جیسے گوشت ترکاریاں، اب یہ زیادتی مجہول ہے اس لئے بائع سے جبراً وصول نہیں کی جائے گی بلکہ بائع کو اختیار ہو گا دے یا نہ دے، یہ زیادہ دینا بمنزلہ وصف مرغوب فیہ ہے، اگر زیادہ نہ ملنے پر خریدار خوش نہ ہو تو وہ فسخ کر سکتا ہے۔[2]

مسئلہ : زید نے گز کے حساب سے پورے کپڑے خریدے آخر میں صرف کنارہ باقی بچ گیا تو یہ کنارہ زید کو بلا قیمت ملے گا کیونکہ عرف یہی ہے[3]، ہاں خریدار یہ چاہے کہ کنارہ کی طرف سے خریدوں، چاہے بائع کنارہ کی قیمت لگائے یا نہ لگائے تو بائع کو اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔[4]

مال کو روکنے کی صورت

مسئلہ : اگر بیع ادھار نہ ہو تو قیمت وصول ہونے تک بائع مبیع کو اپنے پاس روک سکتا ہے۔[5]

مسئلہ : جب خریدار نے مالک کی اجازت سے مال پر قبضہ کر لیا، اب قیمت کا مطالبہ کرنے کے لئے مال کو واپس نہیں لے سکتا (عالمگیری)[6]

مسئلہ : اگر مبیع غائب ہو گیا تو مشتری کو حق حاصل ہے کہ مبیع کے ملنے تک قیمت ادا نہ کرے گو عوض کے بغیر دینا تو کسی پر واجب نہیں ہے مگر وصولی میں بائع کا حق مقدم ہے یعنی بائع قیمت وصول کر کے پھر مال

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] کیونکہ جب زیادہ ملنے کا عام رواج ہے تو گویا خریدار نے خریدتے وقت زیادہ دینے کی شرط لگائی، لہذا زیادہ نہ ملنے کی صورت میں اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہو گا جیسا کہ پہلے حاشیہ میں تحریر کیا گیا۔

[3] والمعروف عرفا كالمشروط شرطا كما مر عن الاشباه.

[4] لانه لايجبر احد على بيع ماله بلا سبب مبرّر، ولابد في تعيين المبيع من تراضي العاقدين كما مر مرارا.

[5] ومنها أن للبائع حق حبس المبيع حتى يقبض الثمن إذا كان الثمن حالا (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم البيع، ج٥ ص ٢٣٧). وكذا في المحيط البرهاني (كتاب البيع، الفصل الثالث، ج ٦ ص ٢٨٢).

[6] إذا استوفى الثمن وسلم المبيع أو سلم بغير قبض الثمن أو قبض المشتري بإجازة البائع لفظا أو قبضه وهو يراه ولا ينهاه ليس له أن يسترده ليحبسه بالثمن (الفتاوى الهندية ، كتاب البيوع، الباب الرابع في حبس المبيع بالثمن ، الفصل الأول، ج٣ ص ١٥). (المادة ٢٨١) إذا سلم البائع المبيع قبل قبض الثمن فقد أسقط حق حبسه وفي هذه الصورة ليس للبائع أن يسترد المبيع من يد المشتري ويحبسه إلى أن يستوفي الثمن. (مجلة الأحكام العدلية ، الباب الخامس، الفصل الثاني: في المواد المتعلقة بحبس المبيع، ص ٥٧).

خریدار کے حوالہ کرے گا۔[1]

مبیع یا ثمن کی ادائیگی کے لئے جگہ کی تعیین

مسئلہ: اگر مبیع یا ثمن کی ادائیگی کے لئے عاقدین کسی جگہ کو متعین کریں تو دیکھا جائے گا کہ اگر یہ مبیع یا ثمن وزنی ہے اور اس کے لئے نقل وحمل کا خرچہ ہے تو جگہ متعین کرنا بلا اختلاف جائز ہے[2]، اگر ہلکی چیز ہے تو اس میں اختلاف ہے تاہم جواز اولیٰ ہے، کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے منافع اور مصالح متعلق ہیں، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ حقدار کو کسی خاص مقام پر قبضہ کرنے سے (ڈاکو، چور وغیرہ سے) خطرہ لاحق ہو، اختلاف کی بنیاد تو جگہ کی تعیین کا فائدہ نہ ہونے پر ہے، جب تعیین کا فائدہ معلوم ہو گیا تو اختلاف کی گنجائش نہیں رہی۔[3]

---

[1] وإن كان المبيع غائبا عن حضرتهما فللمشتري أن يمتنع عن التسليم حتى يحضر المبيع؛ لأن تقديم تسليم الثمن لتتحقق المساواة، وإذا كان المبيع غائبا لا تتحقق المساواة بالتقديم، بل يتقدم حق البائع، ويتأخر حق المشتري، حيث يكون الثمن بالقبض عينا مشارا إليه، والمبيع لا؛ ولأن من الجائز أن المبيع قد هلك، وسقط الثمن عن المشتري فلا يؤمر بالتسليم إلا بعد إحضار المبيع، سواء كان المبيع في ذلك المصر أو في موضع آخر بحيث تلحقه المؤنة بالإحضار،(بدائع الصنائع،كتاب البيوع، حكم البيع،ج٥ ص ٢٣٧).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع،الباب الرابع في حبس المبيع بالثمن ،الفصل الأول،ج٣ ص ١٥).

[2] وتعيين مكان الإيفاء لما لا حمل له ولا مؤنة لا يصح وإن كان شيئا له حمل ومؤنة يصح تعيين مكان الإيفاء ويجوز البيع أيضا (فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، فصل في الشروط المفسدة،ج٢ص ٧٨).

[3] لأن الشرط الذي ليس بمفيد لا يكون معتبرا والمالية فيما لا حمل له ولا مؤنه لا تختلف باختلاف الأمكنة إنما تختلف لعزة الوجود وكثرة الوجود فأما فيما له حمل ومؤنة تختلف ماليته باختلاف المكان (المبسوط للسرخسي ،كتاب البيوع، مبحث السلم،ج١٢ ص ١٢٨).

"وما لم يكن له حمل ومؤنة لا يحتاج فيه إلى بيان مكان الإيفاء بالإجماع" لأنه لا تختلف قيمته "ويوفيه في المكان الذي أسلم فيه" قال رضي الله عنه: وهذه رواية الجامع الصغير والبيوع. وذكر في الإجارات أنه يوفيه في أي مكان شاء، وهو الأصح لأن الأماكن كلها سواء، ولا وجوب في الحال. ولو عينا مكانا، قيل لا يتعين لأنه لا يفيد، وقيل يتعين لأنه يفيد سقوط خطر الطريق،(الهداية، كتاب البيوع، باب السلم،ج٣ص ٧٣).

(وما لا حمل له يوفيه حيث شاء) وهذا على إطلاقه قول أبي حنيفة سواء بينا مكان الإيفاء أو لم يبينا؛ لأن ماليته لا تختلف باختلاف الأماكن فلا يفيد تعيينه فيلغو وقيل: إن لم يبين فيه مكان الإيفاء يتعين موضع العقد عنده وهو الأظهر من قولهما؛ لأنه موضع الالتزام وهو رواية الجامع الصغير والبيوع، وإن بين يتعين ذلك؛ لأنه قد يفيد أمن خطر الطريق فيتعين(تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٤ص ١١٧).

مال کی قیمت دوسرے ملک کی کرنسی سے ادا کرنا

مسئلہ : زید نے ایک کتاب ہندوستان میں چار روپے میں فروخت کی، لیکن قیمت یہاں وصول نہیں کی اب مثلاً روم میں ملاقات ہوئی وہاں خریدار قیمت ادا کرنا چاہتا ہے، تو جہاں خریداری ہوئی تھی جس وقت ہوئی اسی کے لحاظ سے قیمت لازم ہوگی، ہندوستان میں اس وقت چار روپے (چاندی) کے تین ماشہ سونا ملتا تھا تو روم میں وہی تین ماشہ سونا یا اس کی قیمت دینا ہوگی (شامی) اور باہمی کچھ فیصلہ کر لینا بھی ان کے اختیار میں ہے۔[1]

مبیع میں خوبصورتی پیدا کر کے فروخت کرنا

مسئلہ : مبیع میں تصرف کر کے اس کے حسن میں عارضی طور پر اضافہ کرنا تاکہ خریدار موجودہ حسن کو دیکھ کر خریدے، اس کی تین صورتیں ہیں :

۱۔ معروف طریقہ : جیسے کپڑے دھو کر کلف دے کر اور زیور وغیرہ کو صاف چمکدار کر کے فروخت کرے۔

۲۔ ممتاز طریقہ یعنی بتکلف اور تصنع جو خریدار کے سمجھ میں آئے کہ یہ حسن عارضی ہے، یہ دونوں صورتیں چونکہ مروج ہیں اس لئے جائز ہے۔

۳۔ فریب : مثلاً ایک مکان کی قیمت دو ہزار ہے کاغذات اور حسابات تبدیل کر کے تین ہزار دکھائے گئے اور اسی اعتبار سے قیمت بڑھائی گئی، یا کپڑے پر ایسی آب وتاب وچمک ہو کہ دیکھنے میں ریشمی نظر آئے، یا برتن پر ایسا ملمع کریں کہ سنہرا نظر آئے، یہ سب دھوکہ ہے بعد میں معلوم ہونے پر خریدار کے لئے اس بیع کو فسخ

---

[1] أعلم أنه إذا اشترى بالدراهم التي غلب غشها أو بالفلوس ولم يسلمها للبائع ثم كسدت بطل البيع ..عنده وعندهما لا يبطل البيع؛ لأن المتعذر التسليم بعد الكساد، وذلك لا يوجب الفساد لاحتمال الزوال بالرواج لكن عند أبي يوسف تجب قيمته يوم البيع، وعند محمد يوم الكساد وهو آخر ما تعامل الناس بها وفي الذخيرة الفتوى على قول أبي يوسف، وفي المحيط والتتمة والحقائق وبقول محمد يفتى رفقا بالناس اهـ. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، مطلب مهم في أحكام النقود إذا كسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت،ج٤ ص ٥٣٣).

وكذا في تبيين الحقائق وحاشية الشلبي عليه (كتاب البيوع، باب الصرف،ج٤ ص ١٤٢).

کرنا جائز ہے۔[1]

مبیع کے مستحق نکل آنے کا حکم

مسئلہ: اگر مبیع پر خریدار کے قبضہ ہو جانے کے بعد کوئی مستحق نکل آئے اور عدالت کی طرف سے مستحق کے حق میں فیصلہ ہو جائے تو خریدار یا مستاجر مستحق کو نہیں روک سکتے بلکہ مال اس کے حوالہ کرنا پڑے گا، اگر اس میں کچھ تصرف نہیں کیا تو بائع سے قیمت واپس لے گا اگر کوئی تصرف کیا مثلاً زمین خرید کر مکان تعمیر کر لیا تو بائع اور مستاجر سے پورے نقصان کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، امام محمد رحمہ اللہ نے امام اعظم رحمہ اللہ سے اسی طرح نقل فرمایا ہے اور امام حسن بن زیاد کا بھی یہی قول ہے کہ خریدار لکڑی وغیرہ محفوظ رکھے پھر بائع پورا نقصان وصول کرے۔[2]

فائدہ: نقصان میں مزدوری کا بھی حساب ہو گا کیونکہ خریدار کو بائع کی طرف سے دھوکہ دیا گیا ہے۔[3]

---

[1] یہ خیار الغرور ہے جس میں بعض فقہاء کا موقف یہ ہے کہ غرور کی وجہ سے کسی کو اختیار حاصل نہیں ہو گا خواہ خود اپنی سادگی کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہو یا دوسرے فریق نے جھوٹ بول کر دھوکہ دیا ہو، بعض فقہاء کرام نے یہ فتویٰ دیا ہیں کہ دونوں صورتوں میں دھوکہ کھانے والے فریق کو فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ وغیرہ فقہاء کرام کی تحقیق یہ ہے کہ اگر فریق مخالف نے جھوٹ بول کر دھوکہ دیا اور غبن فاحش پر معاملہ کیا تو معلوم ہو جانے کے بعد اس کو عقد فسخ کرنا کا اختیار حاصل ہو گا ورنہ نہیں، علامہ شامی رحمہ اللہ کا اس پر ایک مستقل رسالہ بھی ہے جو ان کے مجموعہ رسائل میں درج ہے، یہی قول مفتیٰ بہ ہے، حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے ان فقہاء کرام کے قول کو اختیار فرمایا ہے جو مطلقاً خیار ملنے کے قائل ہیں لیکن راجح قول وہی ہے جو علامہ شامی رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا۔

ولو قال إن قيمته كذا وهو أكثر من قيمته والمشتري لا يعرف قيمة الأشياء واشتراه بناء على قول البائع فإنه يكون له الخيار لأنه يصير غارا أما إذا كان عالما بالقيمة واشتراه بأكثر من ذلك لغرض له في ذلك فلا بأس به وأصحابنا يفتون في المغبون أنه لا يرد ولكن هذا في مغبون لم يغر أما في مغبون غر فيكون له حق الرد استدلالا بمسألة المرابحة في النسيئة(تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع،باب الإقالة والمرابحة،ج٢ ص ١٠٨).

حيث كان ظاهر الرواية محمولا على هذا القول المفصل، يكون هو ظاهر الرواية إذ لم يذكروا أن ظاهر الرواية عدم الرد مطلقا، حتى ينافي التفصيل، فلذا جزم في التحفة بحمله على التفصيل، وحينئذ لم يبق لنا إلا قول واحد، هو المصرح بأنه ظاهر الرواية، وبأنه المذهب وبأنه المفتى به وبأنه الصحيح، فمن أفتى في زماننا بالرد مطلقا فقد أخطأ خطأ فاحشا لما علمت من أن التفصيل هو المصحح المفتى به، ولا سيما بعد التوفيق المذكور.رد المحتار،كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية،ج٥ ص ١٤٣.

[2] وفي المنية شرى دارا وبنى فيها فاستحقت رجع بالثمن وقيمة البناء مبنيا على البائع إذا سلم النقض إليه يوم تسليمه.الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب البيوع، باب الاستحقاق،ج٥ ص ٢٠٥.

[3] بظاہر یہ علامہ شامی رحمہ اللہ کی رائے ہے جو دیگر فقہاء کرام کی رائے کے خلاف ہے اور علامہ رافعی رحمہ اللہ نے بھی اس کو قبول نہیں کیا۔

مستحق: وہ شخص ہے جو دعویٰ کرے کہ اس مبیع کا مالک میں ہوں یا میں اس مبیع میں شریک ہوں، بائع اجنبی تھا یا ایک جزء میں شریک تھا۔

مسئلہ : مستحق مبیع یا اس کی قیمت قابض سے لے سکتا ہے، مثلاً زید نے عمر سے ایک گھوڑا خریدا پھر بکر نے دعویٰ کیا کہ یہ گھوڑا میرا ہے، اگر گھوڑا بعینہ موجود ہے تو زید سے لے لے، اگر اس میں نقص آگیا یا ہلاک ہو گیا تو اس کی قیمت زید سے لے، پھر زید نے مدعی بکر کو جو کچھ دید یا اس کی قیمت عمر سے وصول کرے، ہاں اگر زید نے قاضی کے فیصلہ کے بغیر ہی بکر کے دعویٰ کو تسلیم کر کے مال اس کے حوالہ کر یا تو عمر کو اختیار ہو گا چاہے زید کو قیمت واپس کرے یا نہ کرے۔[1]

التزامات (یعنی عہد وپیان) کا حکم

جو چیز ذمہ میں لازم کر لیا گیا ہو، اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ عقود: جو بطور انشاء ہو یعنی یہ چیز فروخت کردی، یہ مکان کرائے پر لیا، کسی کے ہاں ملازمت اختیار کی یا

رجل اشترى كرما فقبضه، وتصرف فيه ثلاث سنين، ثم استحقه رجل وبرهن وأخذه بقضاء القاضي، ثم طلب الغلة التي أتلفها المشتري هل يجوز رده أم لا؟ الجواب فيه يوضع من الغلة مقدار ما أنفق في عمارة الكرم من قطع الكرم وإصلاح السواقي وبنيان الحيطان ومرمته وما فضل من ذلك يأخذه المستحق من المشتري اه وبه أفتى في الحامدية.. قلت: وهذا مشكل لأنه مثل قيمة الجص والطين، فلا يرجع به على البائع ولا على المستحق.. لكن كان الأوفق الرجوع على البائع، لأنه غر المشتري في ضمن عقد البيع ولا صنع للمستحق في ذلك فليتأمل(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب الاستحقاق، ج٥ ص ٢٠٦)وفي تقريرات الرافعي عليه: لايظهر وجه للرجوع على البائع بالنفقة وان حصل منه تغرير، نعم لو احدث بناء يرجع بقيمته مبنيا(ص٥٧٥)

[1] لو برهن المستحق أن اللحم أو البر أو الثوب كان له يقضي على المشتري بالقيمة في القيمي وبالمثل في المثلي للمستحق ثم يرجع المشتري على بائعه بثمنه لأنه استحق الأصل.. الصحيح أن البياعات لا تنفسخ بالاستحقاق ما لم يرجع كل واحد على بائعه بالقضاء "ت" عن "ح" رحمه الله أنه لا ينفسخ ما لم يأخذ العين بقضاء إذ الأخذ بقضاء دليل الفسخ (جامع الفصولين،الفصل السادس عشر في الاستحقاق والغرور وما يتعلق به، ج١ ص ١٢٣).

ويثبت رجوع المشتري على بائعه بالثمن إذا كان الاستحقاق بالبينة) لما سيجيء أنها حجة متعدية (أما إذا كان) الاستحقاق بإقرار المشتري أو بنكوله أو بإقرار وكيل المشتري بالخصومة أو بنكوله فلا) رجوع لأنه حجة قاصرة(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب الاستحقاق، ج٥ ص ١٩٥).

کسی کو اپنے ہاں ملازم رکھا، ان تمام عقود کو پورا کرنا واجب ہے عہد کی خلاد ورزی کرنا سخت گناہ ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے[یا ایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود]اے ایمان والو: عقدوں کو پورا کرو۔[1]

عقود و معاملات کی صورتیں متعین اور محدود ہیں جیسا کہ کتاب میں مذکور ہوئی ہیں۔

مواعید: یعنی کسی سے وعدہ کیا جائے کہ میں فلاں کر دوں گا، فلان چیز آپ کو دوں گا، فلان وقت ملنے آؤں گا، ایسے وعدوں کو پوار کرنا بھی شرعاً ضروری ہے، وعدہ خلافی کرنے پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں حتیٰ کہ وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت قرار دی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا"**اذا وعد اخلف**"[2] منافق جب وعدہ کرتا ہے وعدہ خلافی کرتا ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے[**انہ کان صادق الوعد**]یعنی وعدہ کے ایفاء میں سچے تھے۔[3]

چونکہ وعدہ میں صرف خبر ہوتی ہے کہ ہم تیرے پاس آئیں گے یا فلان وقت آپ کو یہ چیز دیں گے وغیرہ، یہ قبول پر موقوف نہیں ہے، نہ جس سے وعدہ کیا گیا ہے اس کا کچھ نقصان، جس کا ضمان لینے کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کراسکے، اسی طرح قاضی کو ایفائے عہد پر مجبور کرنے کا حق نہیں، البتہ وعدہ کو پورا کرنا دیانۃً واجب ہے اور غداری کرنا، وعدہ خلافی کرنا نفاق کی علامت اور بڑا گناہ ہے۔

عقود و معاملات کے علاوہ بھی جو کچھ معاہدے ہوتے ہیں جس میں عوض اور بدل ہوتا ہے، ایجاب و قبول ہوتی ہے وہ بھی عہد میں داخل ہیں اس کو پورا کرنا بھی ضروری ہے، اگر کوئی فریق انکار کرے تو قاضی جبراً عہد پورا کرواسکتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے[ان العھد کان مسئولا][4] بلاشبہ عہد کے بارے میں بازپرس ہوگی، اور جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "المسلمون عند شروطھم"(رواہ البخاری)[5] مسلمان

---

[1] [المائدة : ١].

[2] عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من علامات المنافق ثلاثة: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا اؤتمن خان "(صحيح مسلم،كتاب الايمان، باب بيان خصال المنافق، رقم الحديث: ١٠٨).

وكذا في سنن ابي داود(كتاب السنة،باب الدليل على زيادة الإيمان ونقصانه،رقم الحديث: ٤٦٨٨).

[3] [مريم : ٥٤].

[4] [الإسراء : ٣٤].

[5] قال النبي صلى الله عليه وسلم:المسلمون عند شروطهم(صحيح البخاري، كتاب الاجارة، باب أجر السمسرة).

عہد وپیمان کے پابند ہوتے ہیں، اور ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ بعض صحابہ کرام اس شرط پر اونٹ دیتے کہ جو مال غنیمت حاصل ہو وہ آدھا آدھا تقسیم کریں گے، اور قاضی شریح رحمہ اللہ سے بخاری شریف میں روایت ہے کہ " من شرط علیٰ نفسه طائعا غير مكره فهو عليه[1]"یعنی جس شخص نے خوشی سے اپنے اوپر کسی کام کو لازم کرلیا تواس کو پورا کرنا اس پر لازم ہے "إنّ المواعيد بإكتساب صُور التّعليق تكون لازمة.(فتاوى بزازيه، كتاب الكفالة)[2]" یعنی وعدہ اگر شرط کی صورت میں ہو تواس کو پورا کرنا لازم ہے "المواعيدُ قد تكون لازمة لِحاجة النّاس(شامي)[3] وعدہ کی پابندی ضروری ہے کاروبار میں ضرورت کی وجہ سے (هكذا نقل الحموي رحمه الله عن التاتارخانيه والبحر الرائق والظهيرية)[4] وفي الأشباه قال: يلزم الوعدُ إذا كان مُعلّقا[5]"یعنی وعدہ کی پابندی ضروری ہے [6]مگر یہ کہ معلق ہو تو جس سے معلق کیاہے اس کے وجود سے وعدہ کی پابندی لازم ہو گی۔

جامع الصغیر میں امام محمد رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ اگر دائن مدیون سے کہے کہ آدھا قرض ادا کروگے تو بقیہ آدھا معاف ہے، اب آدھا ادا کردینے سے بقیہ ادا کرنے سے بری ہو جائے گا ورنہ نہیں۔[7]

وكذا في مصنف ابن ابي شيبة(باب من قال المسلمون عند شروطهم،رقم الحديث: ٢٢٠٢٢، ج٤ص٤٥٠)

[1] اخرجه البخاري في صحيحه :كتاب الشروط،باب ما يجوز من الاشتراط والثنيا في الإقرار، والشروط التي يتعارفها الناس بينهم،

[2] كذا في البحر الرائق عن الفتاوى البزازية، كتاب الطلاق، باب تفويض الطلاق،ج٣ص ٣٣٩. وفي مجلة الأحكام العدلية: (المادة ٨٤) المواعيد باكتساب صور التعاليق تكون لازمة. (ص٢٦).

[3] كذا في حاشية ابن عابدين على الدر المختار(كتاب البيوع، باب البيع الفاسد ،مطلب في البيع بشرط فاسد ،ج٥ ص ٨٤).

[4] كذا في غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر (كتاب الحظر والاباحة،ج٣ ص ٢٣٧).

[5] كذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم (كتاب الحظر والاباحة ،ص٢٤٧)

[6] کاتب کی غلطی ہے ورنہ اصل کتاب میں "لا یلزم" کا لفظ ہے یعنی وعدہ لازم نہیں ہوتا مگر یہ کہ معلق ہو۔

[7](محمد عن يعقوب عن أبي حنيفة رضي الله عنهم) في رجل له على آخر ألف درهم فقال له أد إلي غدا خمس مائة على أنك بريء من الباقي ففعل فهو بريء وإن لم يدفع إليه غدا خمس مائة عاد عليه الألف وهو قول محمد(الجامع الصغير ،كتاب الصلح،ص٤١٩).

ان تمام عبارتوں سے ثابت ہوا کہ معاہدات اور شرائط کی پابندی لازم ہے، لیکن:

خلاف شرع عہد کی پابندی لازم نہیں

کسی ایسے معاہدے کی پابندی لازم نہ ہوگی جو کسی گناہ کے کام پر مشتمل ہو جیسے زنا کی اجرت، قتل ناحق اور گانے کی اجرت، ظلم کرنے کا وعدہ، سود یا رشوت کی شرط یا کسی گناہ کے کام کرنے کی قسم کھانا (مثلاً خدا کی قسم والدین کی نافرمانی کروں گا وغیرہ)

من اشترط[1] شرطا ليس في كتاب الله فليس له، وإن شرط مائة مرة شرط الله أحق (البخاري) [2]یعنی جس نے کوئی ایسی شرط ٹھہرائی جو کتاب اللہ میں موجود نہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہیں) تو اس شرط کو پوری کرنا جائز نہیں اگرچہ سو مرتبہ شرط رکھے، اللہ تعالیٰ کی شرط کی پابندی زیادہ ضروری ہے۔

وہ عہد جو مجہول ہو

مسئلہ: یعنی جس کام کو کرنے کا وعدہ ہوا ہو وہ مجہول ہو متعین نہ ہو، اس کا پورا کرنا بھی لازم نہیں ہے کیونکہ غیر معلوم چیز کا واجب ہونا طاقت سے زائد ہے جس کا شریعت نے مکلف نہیں بنایا، الاشباہ میں ہے کہ مجہول چیز کا اقرار صحیح نہیں ہے۔[3]

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں " مَن شرط شرطا" کا لفظ ہے۔

[2] روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں: قام رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: ما بال أناس يشترطون شروطا ليست في كتاب الله، من اشترط شرطا ليس في كتاب الله فليس له، وإن شرط مائة مرة شرط الله أحق وأوثق(صحيح البخاري ،كتاب المكاتب، باب ما يجوز من شروط المكاتب، ومن اشترط شرطا ليس في كتاب الله،رقم الحديث: ٢٥٦١).

وكذافى صحيح مسلم ،كتاب العتق، باب انما الولاء لمن اعتق، رقم الحديث: ١٥٠٤.

[3] مجہول چیز کا اقرار تو صحیح ہے البتہ مجہول چیز واجب نہیں قرار دی جاسکتی جس کی وجہ خود مؤلف رحمہ اللہ نے بیان فرمائی کہ مجہول چیز کا واجب ہونا طاقت سے زائد ہے، اس لئے اگر کوئی مجہول چیز کا اقرار کرے تو اگر اس اقرار کا تعلق ایسے عقد کے ساتھ ہو جس میں جہالت مانع نہیں ہوتی تو اس کو وضاحت کرنے پر مجبور کیا جائے گا ورنہ نہیں۔

الإقرار بالمجهول صحيح إلا إذا قال علي عبد أو دار فإنه غير صحيح، كما في البزازية ثم قال: علي من شاة إلى بقرة لا يلزمه شيء سواء كان بعينه أو لا.(الأشباه والنظائر لابن نجيم ،كتاب الاقرار،ص ٢٢٠).

مسئلہ : وہ شرطیں عقود شرعیہ حقوق مسلمہ کے خلاف ہوں ان کو پوری کرنا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ عقود تو منصوص ہیں اور معاہدات سوائے بعض تمام اس عہد کے تحت داخل ہیں، پس یہ معاہدات معارض ومقابل نہیں ہو سکتے، عقود منصوص کے معارض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عقد بیع موضوع ہے مطلق ملک حاصل کرنے کے اور عوض حاصل کرنے کے لئے ،اوراس کے ساتھ کوئی شرط لگانا یہ اس پر زائد بات ہوگی، یا موضوع کے خلاف ہونا لازم آئے گا، لہٰذا وہ شرط قابل عمل نہیں ہو سکتا۔[1]

شرائط کی آٹھ قسمیں ہیں:

اول: مستقل شرط جن کا تعلق کسی عہد و شرط سے نہ ہو۔

دوم: کسی دوسری شرط و عقد کے ساتھ ہوں مگر اس عقد میں داخل نہ سمجھے جائیں، جیسے مشتری نے بائع سے کہا کہ تو اپنا مال فلان شہر میں لے کر چل، پسند آیا تو خرید لوں گا ورنہ آمد ورفت کا خرچہ میرے ذمہ ہوگا، یا بائع نے مشتری کو کسی جگہ سے بلایا تاکہ مبیع کو پسند کرے اور خریدار کے آمد ورفت کا خرچہ بائع نے اپنے ذمہ لیا، تو یہ شرط اگرچہ خرید وفروخت کے ضمن میں ہے مگر اس بیع وشراء کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

متقضائے عقد کے مناسب شرائط

سوم: وہ شرطیں جو مقتضاء عقد یا عقد کو پختہ کرنے سے متعلق ہوں۔[1]

المادة (١٥٧٩) كما يصح الإقرار بالمعلوم كذلك يصح الإقرار بالمجهول أيضا إلا أن مجهولية المقر به في العقود التي لا تصح مع الجهالة كالبيع والإجارة مانعة لصحة الإقرار فلذلك إذا قال أحد: لفلان عندي أمانة , أو غصبت مال فلان , أو سرقته يصح إقراره ويجبر على بيان وتعيين الأمانة المجهولة أو المال المسروق , أو المغصوب. أما لو قال: بعت لفلان شيئا أو استأجرت منه شيئا فلا يصح , ولا يجبر على بيان ما باعه أو استأجره. (مجلة الأحكام العدلية ،كتاب الاقرار،الباب الثاني في بيان وجوه صحة الإقرار وعدم صحته،ص٣٠٩)

[1] قال محمد رحمه الله في «الجامع الصغير» : وإذا سلم يريد به قطع الصلاة، وعليه سجود السهو فعليه أن يسجد السهو، وبطلت من القطع عندهم جميعاً، أما عند محمد رحمه الله؛ فلأن هذا لم يشرع محللاً للحال، فلا يصير محللاً لقصده؛ إذ ليس للعبد تغيير المشروع. (المحيط البرهاني ،كتاب الصلاة،الفصل السابع عشر في سجود السهو ،ج١ ص ٥١٣).

قال: "ومن باع لرجل ثوبا وضمن له الثمن أو مضارب ضمن ثمن متاع رب المال فالضمان باطل" لأن الكفالة التزام المطالبة وهي إليهما فيصير كل واحد منهما ضامنا لنفسه، ولأن المال أمانة في أيديهما والضمان تغيير لحكم الشرع فيرد عليه كاشتراطه على المودع والمستعير(الهداية ،كتاب الكفالة،فصل في الضمان،ج٣ ص ٩٥).

۱۔ مثلاً خریدار نے مالک سے اس بات پر کفیل لیا کہ اس مال میں نہ کسی کا حق ہے نہ اس میں کوئی عیب ہے نہ یہ مال میرے بیان کے خلاف ہے۔[2]

۲۔ بیع سلم میں رب السلم نے مسلم الیہ سے راس المال یا سلم کے ادا کرنے کا ضامن یا رہن لیا۔[3]

۳۔ بائع نے مشتری سے اداء ثمن اور اس کے استحقاق سے محفوظ ہونے کے متعلق ضامن لیا۔

۴۔ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک نے دوسرے سے گواہ و رسید اور عوض کو حوالہ کرنے کی شرط لے لی۔

۵۔ یہ شرط رکھی کہ فلاں وقت یا فلاں مقام میں مبیع کو یا ثمن کو حوالہ کیا جائے گا۔[4]

---

[1] مقتضائے عقد کے مطابق ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بات ایسی ہو کہ اگر عاقدین اس کی شرط نہ بھی لگائیں تب بھی وہ عقد کے نتیجہ میں خود بخود ثابت ہو جائے، اور عقد کے ملائم ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عقد کے تقاضا کو پختہ کرے۔

ومعنى كون الشرط يقتضيه العقد أن يجب بالعقد من غير شرط، ومعنى كونه ملائما أن يؤكد موجب العقد كذا في الذخيرة(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ ص ٩٢).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في البيع بشرط فاسد، ج٥ ص ٨٥).

[2] کفیل اور ضامن لینے کی صورت میں ضروری ہے کہ مجلس عقد میں وہ حاضر و متعین ہو اور کفالہ قبول کرے، ورنہ تو یہ شرط مفسد ہے۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: تحفۃ الفقہاء، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، ج۲ ص ۵۰۔ الدر المختار مع رد المحتار، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطلب البیع بشرط فاسد، ج۵ ص ۸۷)

[3] رہن کی شرط لگانے کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ مرہونہ چیز متعین ہو ورنہ تو یہ شرط مفسد عقد ہے۔(ملاحظہ فرمائیں مندرجہ بالا حاشیہ)

[4] اگر مبیع کوئی متعین چیز ہو بیع سلم نہ ہو تو اس میں اجل مقرر کرنے کی شرط لگانا درست نہیں ہے تاہم فروخت کنندہ کو ثمن کی وصولی تک کے لئے یہ اختیار حاصل ہے کہ مبیع خریدار کے حوالہ نہ کرے بلکہ اپنے پاس روکے رکھے، اور ثمن کی ادائیگی کے لئے مدت مقرر کرنا تو جائز ہے لیکن صرف یہ طے کرنا کہ "خریدار فلان شہر میں ثمن کی ادائیگی کرے گا" درست نہیں ہے کیونکہ اجل مجہول ہے جو کہ مفسد عقد ہے اس لئے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ادائیگی کی مدت بھی مقرر کرے کہ مثلاً خریدار پورے ایک مہینہ بعد کراچی میں ثمن کی ادائیگی کرے گا، اور اس شرط لگانے کے بعد بھی اگر ثمن پیسے وغیرہ کوئی ایسی چیز ہو جس میں نقل و حمل کا کوئی خاص بوجھ اور خرچہ نہ ہوتا ہو تو کراچی میں دینا کوئی ضروری نہیں ہو گا لیکن مؤلف رحمہ اللہ نے متعدد جگہوں میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ کراچی میں دینا ہی ضروری ہو گا۔

رجل اشترى شيئا على أن يوفيه الثمن في بلد كذا إن كان الثمن مؤجلا جاز وإذا حل الأجل إن كان الثمن شيئا له حمل ومؤنة كان عليه الإيفاء في المكان المشروط وفيما لا حمل له ولا مؤنة لصاحب الدين أن يطالبه في أي مكان شاء وإن لم يكن الثمن مؤجلا أو كان الأجل مجهولا يصح البيع كان له حمل ومؤنة أو لم يكن(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، باب السلم، ج٢ ص ٦٣).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، مطلب في الفرق بين الأثمان والمبيعات، ج٤ ص ٥٣١).

۶۔ یہ شرط رکھی کہ قیمت اتنی دنوں میں (مثلاً ایک ماہ کے بعد) دی جائے گی۔

۷۔ خیار تعیین۔

۸۔ خیار عیب۔

۹۔ خیار رؤیت۔

۱۰۔ خیار اجازت بیع فضولی میں۔

۱۱۔ یہ شرط رکھنا کہ بائع مبیع کے عیوب سے بری ہو گا۔

۱۲۔ یہ شرط کہ اتنے دنوں میں قیمت ادا نہ کی تو بیع ختم ہو جائے گی۔

۱۳۔ یہ شرط کہ مشتری خرید کردہ پھولوں کو اکھٹا توڑ لے گا یا جو درخت کے خریدار ہے اس کو کاٹ لے یا اپنا اسباب وغیرہ اٹھا کر لے جائے اور مکان کو فارغ کر دے۔

۱۴۔ یہ شرط کہ پختہ پھل کو مشتری اتنے دنوں تک کے لئے درخت پر چھوڑ دے گا۔

۱۵۔ یا اتنے دنوں میں اپنے اسباب وغیرہ علیحدہ کر کے مبیع فارغ کر دے گا تاکہ اس کے رکھنے، لے جانے یا فارغ کرنے کا مناسب سامان مہیا کر سکے۔

۱۶۔ شرط لگائی کہ اگر مبیع میں یہ صفت نہ ہو تو نہیں خریدوں گا۔

۱۷۔ شرط لگائی کہ جب تک قیمت وصول نہ ہو مال حوالہ نہیں کیا جائے گا۔

۱۸۔ شرط لگائی کہ مکان کا راستہ خریدار کا حق ہو گا۔

۱۹۔ وہ کام جو عرفاً بائع یا اجیر کے ذمے سمجھے جاتے ہیں اور شریعت نے اس سے منع نہ کیا ہو جیسے درزی کپڑا سی کر، یا درزی کپڑا دھو کر تہ کر کے، مٹھائی والا یا دکاندار پیک کر کے دے، اور اس جیسے معاملات جہاں جس بات کا رواج ہو اور ایسی ہی ہر وہ شرط جو عقد کے مناسب وملائم ہو، جائز ہے اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔

بیع میں غیر مناسب شرائط لگانے کا حکم

بیع میں ایسی لغو شرائط رکھنا کہ جس میں نہ بائع کا فائدہ ہو وہ مشتری کا نہ ہی مبیع کا (جبکہ مبیع آدمی ہو) بلکہ ایسی فضول بے فائدہ باتیں کی جائیں، مثلاً یہ کتاب میں نے فروخت کی اس شرط پر کہ خریدار اس کی

جلد بنوالے یا فروخت نہ کرے، یہ درخت فروخت کیا اس شرط پر کہ اسے نہ کاٹا جائے، یہ مکان فروخت کیا اس شرط پر کہ اسے کھودا نہ جائے یا ضرور اس کو کاٹا جائے اور کھودا جائے، ایسی شرطوں پر نہ عمل کرنا لازم ہے نہ یہ بیع میں مخل ہیں، اور اس سے بیع فاسد بھی نہیں ہونی چاہئے خریدار اس پر عمل کرے یا نہ کرے، البتہ ایسی شرط مان کر پھر اس پر عمل نہ کرنا مروت اور دیانت کے خلاف ہے۔[1]

فائدہ: جب بیع میں اتنی شرائط جائز ہیں تو حسب ضرورت اگر کوئی اور شرط کا بھی اعتبار کر لیا جائے تو غالباً کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔

جن شرائط سے بیع فاسد ہو جاتی ہے

چہارم: وہ شرطیں جس میں بائع، مشتری یا مبیع کا فائدہ ہو یہ فائدہ اصل اور بدل کا مستحق سمجھا جائے۔

۱۔ شرط کی کہ خریدار آگے اس مال کو کم قیمت پر فروخت نہ کرے، زید کے ہاتھ فروخت نہ کرے، فلان شہر میں فروخت نہ کرے تا کہ بائع کی تجارت اور معاہدات میں نقصان نہ آئے، یا شرط کہ مشتری بائع کو قرض دیا کرے، یا یہی مال یا کوئی اور چیز بائع کو کرایہ یا عاریت کے طور پر دے گا۔

۲۔ خریدار نے یہ شرط لگائی کہ بائع بقیہ مال کو بھی میرے ہی ہاتھ فروخت کرے کسی اور کے ہاتھ یا زید کے ہاتھ یا فلاں شہر میں فروخت نہ کرے، یا میری خرید سے کم قیمت پر یا فلاں مدت تک فروخت نہ کرے، یا مبیع کے علاوہ جو باغ ہے وہ مجھے کرایہ پر دے یا میری مہمانداری کرے یا مشتری نے اس شرط پر خریدا کہ قیمت فلاں شخص سے وصول کر لو اب وہ شخص قیمت دے یا نہ دے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں، یا بائع نے یہ شرط کر لی کہ مبیع فلاں شخص سے وصول کرنا تمہارے ذمہ ہے، یہ تمام شرطیں مقتضاء عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفسد ہیں، ان شرائط کے ہوتے ہوئے نہ بیع صحیح ہوتی ہے نہ ان شرائط پر عمل کرنا واجب ہے، ان جیسے فاسد شرائط کے ساتھ خرید و فروخت کرنے سے جناب نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے، حنفیہ

---

[1] (وكذا) يصح (بشرط لا يقتضيه العقد ولا نفع فيه لأحد) من المتعاقدين والمبيع المستحق للنفع بأن يكون آدميا (كشرط أن لا يبيع الدابة المبيعة) بأن قال بعت هذه الدابة منك على أن لا تبيعها أو تسيبها في المرعى لأن هذا الشرط لا يؤدي إلى النزاع ولا يحتمل الربا لعدم النفع الزائد فيصح العقد ويبطل الشرط وهو الظاهر من المذهب(مجمع الأنهر ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٢ ص ٦٢).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في البيع بشرط فاسد،ج٥ ص ٨٦).

کا استدلال اسی حدیث سے ہے۔[1]

فائدہ: البتہ ہمارے زمانے میں تجارت کی وسعت نے ان میں سے بعض شرائط پر عمل کرنے پر مجبور کیا ہے، جہاں مجبوری ہو وہ بطور وعدہ کے عمل ہونا چاہئے نفسِ بیع سے ان کو معلق نہیں کرنا چاہئے، مثلاً ایک کتاب چھاپی خریدار تمام نسخے نہیں لے سکتا کیونکہ ہوسکتا ہے کل کو دوبارہ چھاپ کر پہلے سے سستی قیمت پر فروخت کرے، ایسی ہی ایک چیز کلکتہ سے منگوائی جو رنگون میں کمیاب ہے مگر یہ خوف ہے کہ بائع براہ راست رنگون مال بھیجے اور کم قیمت پر فروخت کرے، اس لئے خریدار یکمشت نہیں خرید سکتا ہے اور تھوڑی تھوڑی خریدنے میں راستہ کا خرچہ زیادہ آنے کی وجہ سے قیمت اس قدر بڑھ جائے گی کہ رنگون میں کوئی نہیں خریدے گا، اب ایسی صورت میں اگر بائع سے وعدہ نہ لیا جائے تو کام نہیں چل سکتا۔

ایسے اکثر چیزوں کو آرڈر پر تیار کروانا اطمینان کے بغیر نہیں ہوسکتا، ایسی صورت میں بعض وعدیں ضروری ہیں ان کا ایفاء لازم ہے تاکہ تجارت کا دروازہ بند نہ ہوجائے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ان شرائط کے متعلق صراحت کردی جائے کہ یہ صرف وعدہ ہے بیع کے اندر شرائط نہیں ہیں۔

مبیع کا نفع مخصوص ہے غلام اور باندی میں اس لئے مبیع کے نفع متعلق تفصیل بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگئی۔[2]

بیع میں اجنبی کے متعلق شرائط

پنجم: بیع میں وہ شرائط جو عاقدین کے متعلق نہ ہوں بلکہ ان کے علاوہ کسی اجنبی کے متعلق ہوں مثلاً مکان فروخت کیا اس شرط پر کہ خریدار یہ مکان بعد میں بکر کو بطور عاریت دے گا، یا اسے کچھ قرض دیا کرے اس سے کچھ خریدے، بعض نے ایسی شرط کو مفسد بیع کہا ہے جیسا کہ در مختار میں مذکور ہے[1] اور بعض ایسی شرط کو

---

[1] وهو ما روي انه عليه الصلاة والسلام نهى عن بيع وشرط، انظر: نصب الراية، باب البيع الفاسد، الحديث الحادي عشر، ج٤ ص ١٧) و "البدر المنير" باب البيوع المنهي عنها، الحديث الثامن، ج٦ص٤٩٧).

[2] (قوله من أهل الاستحقاق) أي ممن يستحق حقا على الغير، وهو الآدمي (رد المحتار،باب البيع الفاسد، مطلب في البيع بشرط فاسد، ج٥ ص ٨٥).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ ص ٩٣).

لغو اور بیع کو صحیح سمجھتے ہیں، ہدایہ میں اسی طرح مذکور ہے، [2] یہی قول راجح ہے مگر ایسی شرطوں سے عرفاً یا قانوناً آپس میں منازعت اور دعویٰ کا استحقاق ثابت ہوا تو انہیں مفسد قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

مسئلہ: زید نے مشتری سے یہ شرط لگائی کہ یہ مکان جو خرید رہے ہو یہ بیٹے کو بطور عاریت دینا ہوگا، یا میرے بیٹے کو کچھ قرض دینا ہوگا، تو یہ شرط مفسدِ عقد ہے۔ (عالمگیری) [3]

بائع کی قدرت سے زائد شرط

ششم: وہ شرطیں جن کو پوری کرنے پر بائع کو قدرت نہیں، جیسے شرط کرلی کہ جب بچہ ہوگا بکری اتنا دودھ دے گی، یا جانور ایسا خوش آواز ہے یا یہ مرغ ایسا لڑتا ہے، چونکہ یہ امور بائع کے اختیار میں نہیں اس لئے بطور صفت کے بیان کرسکتا ہے شرط ٹھہرانا درست نہیں۔ [4]

عین گناہ کے کام کو شرط ٹھہرانا

ہفتم: لونڈی کو اس شرط پر فروخت کی کہ یہ خوب گانا گاتی ہے، یا یہ غلام چوری کرنے یا جعلسازی میں ماہر ہے یا دھوکہ باز ہے یا یہ باجہ خوب بجاتا ہے، یہ مرغ لڑتا ہے، یہ کنکوا ایسا اڑتا ہے، یہ کبوتر اڑنے میں مہارت رکھتا

---

[1] (فيصح) البيع (بشرط يقتضيه العقد) (كشرط الملك للمشتري) وشرط حبس المبيع لاستيفاء الثمن (أو لا يقتضيه ولا نفع فيه لأحد) ولو أجنبيا ابن ملك، فلو شرط أن يسكنها فلان أو أن يقرضه البائع أو المشتري كذا فالأظهر الفساد ذكره أخي زاده وظاهر البحر ترجيح الصحة.

وفي حاشية بن عابدين تحته: والحاصل أنهما قولان في المذهب (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب البيع الفاسد، مطلب في البيع بشرط فاسد، ج٥ ص ٨٦).

[2] ولو كان منفعة الشرط لغير العاقدين كالبيع على أن يقرض فلانا كذا ففيه اختلاف المشايخ. وقال محمد كل شيء يشترط على البائع يفسد به البيع إذا شرط على أجنبي فهو باطل، وكل شيء يشترط عليه لا يفسد به إذا شرط على أجنبي فهو جائز، ويخير المشتري كالبيع بمائة على أن يحط فلان الأجنبي عشرة جاز البيع، ويخير المشتري إن شاء أخذه بمائة وإن شاء ترك، (فتح القدير على الهداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٦ ص ٤٥٢).

ونوع: البيع جائز والشرط باطل، وهو كل شرط لا يقتضيه العقد، وفيه مضرة لأحدهما، أو ليس فيه منفعة ولا مضرة لأحد، أو فيه منفعة لغير المتعاقدين والمبيع كشرط أن لا يبيع المبيع ولا يهبه، ولا يلبس الثوب، ولا يركب الدابة، ولا يأكل الطعام، ولا يطأ الجارية، أو على أن يقرض أجنبيا دراهم، ونحو ذلك، فإنه يجوز البيع ويبطل الشرط (الاختيار لتعليل المختار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد واحكامه، ج٢ ص ٢٥).

[3] انظر الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسده، ج٣ ص ١٣٤).

[4] انظر الحاشية التالية.

ہے، یہ باتیں مبیع میں عیب بیان کرنے کے لئے تو جائز ہیں لیکن بیع کے لئے بطور شرط اوراوصاف کے بیان کرنا ناجائز ہیں۔[1]

ہشتم: وہ شرائط جو عقد کرتے وقت نہ رکھی جائیں بلکہ عقد سے پہلے بیان کر دیں، یا عقد مکمل ہونے کے بعد، ان کے متعلق صحیح قول یہ ہے کہ ان شرائط کا اعتبار نہیں ہے اور ان شرائط کی وجہ سے عقد بھی فاسد نہیں ہوگا، ہاں البتہ کوئی مضبوط قرینہ اس بات کا مل جائے کہ ان شرائط کا بیع کے ساتھ تعلق ہے تو پھر ان کا لحاظ ہوگا۔[2]

مسئلہ: زید نے عمر سے کہا کہ تم میرا مکان کرایہ پر لو، عمر نے جواب میں کہا کہ اگر تم میرا باغ خرید لو تو میں مکان کرایہ پر لوں گا،اب اگر زید باغ کر خریدتا ہے تو اس سے عمر کے لئے مکان کرایہ پر لینا لازم نہ ہوگا۔[3]

مسئلہ: زید نے عمر سے کہا کہ میں نے تجھے اپنا باغ عاریت پر دیا کہ اس کا پھل کھاؤ۔ عمر نے جواب میں کہا کہ میں نے قبول کیا،اس کے بعد کہا کہ میں نے تیرا مکان ایک ہزار روپے میں رہن رکھا، یہ دونوں عقد صحیح ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں، اگرچہ اس میں ایک طرح کی نفع خوری کا طریقہ ہے مگر نہ یہ عاریت لازم ہے نہ رہن لازم ہے، لہٰذا اداء قرض کے بغیر اس معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے۔

---

[1] ولو باع شاة على أنها تحلب كذا كذا فالبيع فاسد باتفاق الروايات وكذلك لو اشتراها على أنها تضع بعد شهر فالعقد فاسد... اشترى جارية على أنها تغني كذا كذا صوتا فإذا هي لا تغني جاز ولا خيار له قالوا وهذا إذا ذكر هذه الصفة على وجه التبري عن العيب وفي الفتاوى أن البيع بهذا الشرط فاسد على قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى وإحدى الروايتين عن محمد رحمه الله تعالى والمأخوذ به هو الأول وعلى هذا بيع الكبش النطاح والديك المقاتل إذا كان شرط ذلك على وجه التبري عنه يجوز أيضا كذا في الغياثية. (الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع،الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسده ،ج٣ ص ١٣٧).والتفصيل في بدائع الصنائع (كتاب البيوع، شرائط الصحة في البيوع، ج٥ص١٦٩).

[2] شرطا فاسداً قبل العقد ثم عقدا لم يبطل العقد ويبطل لو مقارناً(جامع الفصولين، الفصل الثامن عشر في بيع الوفاء وأحكامه ،ج١ ص ١٤٠).

في جامع الفصولين أيضا: لو شرطا شرطا فاسدا قبل العقد ثم عقدا لم يبطل العقد. اه قلت: وينبغي الفساد لو اتفقا على بناء العقد كما صرحوا به في بيع الهزل كما سيأتي آخر البيوع. وقد سئل الخير الرملي عن رجلين تواضعا على بيع الوفاء قبل عقده وعقد البيع خاليا عن الشرط. فأجاب بأنه صرح في الخلاصة والفيض والتتارخانية وغيرها بأنه يكون على ما تواضعا (رد المحتار، باب البيع الفاسد، مطلب في الشرط الفاسد إذا ذكر بعد العقد أو قبله،ج٥ ص ٨٤).

[3] هذالما استظهره المولف رحمه الله في المسئلة السابقة من ان للشرط السابق ارتباطا قويا بهذا.

مسئلہ: وہ وعدے جو عقد کے علاوہ ہوں اور عقد میں داخل نہ ہوں، تو ان کو مفسد بیع سمجھا جائے گا، لیکن اگر عقد کو ان پر معلق کیا تو وہ شرائط لازم ہو جائیں گے جیسا کہ شامی میں جامع الفصولین سے منقول ہے:

"وطلب[١] في الشرط الفاسد اذا ذكر بعد العقد او قبله"(رد المحتار، باب البيع الفاسد، ج٤ص٢٤٣)[٢]

مسئلہ: خوب یاد رہے کہ ایسی باتوں کے متعلق صراحت کر دی جائے کہ یہ عہد وعدہ عقد سے خارج ہے۔

عقود و شروط مرکب کرنے کی تین صورتیں

١۔ شرط اور عقد دونوں صحیح، جیسے نکاح۔

٢۔ شرط و عقد دونوں فاسد ہیں، بیع، کرایہ داری، مزارعت، بیع فضولی کی اجازت، دین سے بری کرنا، وکیل کو معزول کرنا، وقف کرنا، کسی معاملہ پر فریقین کا کسی تیسرے شخص کو حکم بنانا، تقسیم کرنا (کنزالدقائق)[3]

٣۔ شرط ساقط ہو جائے گی اور عقد باقی رہے گا جیسے غلام کو فروخت کرنے کے وقت بائع ولاء کی شرط اپنے لئے رکھے، حالانکہ ولاء (میراث) آزاد شدہ کے مرنے کے بعد آزاد کرنے والے کو ملتی ہے۔[4]

مثلاً زید نے بکر سے مال خریدا پھر آپس میں طے پایا کہ اس کی قیمت اس قدر ہے، یہ مال فلان شخص کو نہ بیچا جائے، یہ سب وعدے ہیں عقد بیع کے اندر داخل نہیں ہیں، لہٰذا وعدہ کی حیثیت سے اس کو پورا کرنا واجب، عقد بیع کے لحاظ سے واجب نہیں ہے جیسا کہ شامیہ میں ہے کہ لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وعدہ کو پورا کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے البتہ ایسے وعدے کو عقد کے اندر داخل کئے جائیں یا سمجھے تو عقد فاسد ہوگا۔[5]

---

[١] سهو من الكاتب والصحيح "مطلب في الشرط الفاسد".

[٢] مر تخريجه في حاشية الشرط الثامن انفا.

[٣] كنز الدقائق (كتاب البيوع، قبيل باب الصرف،ص ٤٤٣).

والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع،باب المتفرقات، ما يبطل بالشرط الفاسد ولا يصح تعليقه به،ج٥ ص ٢٤٠).

[٤] انظر الحاشية السابقة.

[٥] مر تخريجه مفصلا.

(جن شرائط کی پاسداری ضروری ہے)

وہ عہد و شرط جن کو ہر حال میں پورا کرنا لازم ہے، ان کی چار قسمیں ہیں:

اول: کسی کام پر عہد کرنا، ان کا ذکر بیوع اور اجازت میں گزر چکا ہے۔

دوم: فعل کے وجود پر عہد کرنا:

یعنی نفس فعل کا اعتبار نہ کیا جائے بلکہ مشروط ملحوظ ہو مثلاً استاد سے شرط رکھے کہ اگر یہ بچہ پڑھ لے تو سو روپے دیدیں گے ورنہ نہیں، اس کی دو قسمیں ہیں:

الف: وہ جن کو وجود میں لانا خاص اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہو جیسے بارش کا ہونا، ہوا کا چلنا، مرنا وغیرہ، ان میں فعل کے وجود کے ساتھ مشروط کرنا جائز نہیں کیونکہ ان کاموں کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اختیار میں رکھا ہی نہیں، فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ استاد سے یہ شرط رکھنا کہ بچہ میں مہارت پیدا ہونا چاہئے، یہ اجارہ فاسدہ ہے۔[1]

ب: وہ کام جن کا وجود عادۃً اچھی کوشش اور محنت و مشقت کامل کی طرف منسوب ہے، ان میں اجرت کو وجود فعل کے ساتھ مشروط کرنا جائز ہے جیسا کہ عالمگیری میں دلائل کے ساتھ موجود ہے کہ یہ کہا کہ مال بکنے سے پہلے اجرت نہیں ملے گی، پس اس صورت میں اجرت مشقت کے ساتھ معلق نہیں بلکہ کارکردگی اور نتیجہ ظاہر ہونے کے ساتھ معلق ہے، یہ فرق بہت ہی عمدہ ہے ورنہ بسا اوقات مفت اجرت دینی پڑتی ہے جس کی شریعت میں نظیر نہیں۔[2]

---

[1] في فتاوى الفضلي ولو استأجر المعلم على حفظ الصبيان أو تعليم الخط أو الهجاء جاز ولو شرط عليه أن يحذقه ذكر في الأصل أنه فاسد.(الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع في الإجارةج٤ ص ٤٤٨).

وإن سلم غلاما إلى معلم ليعلمه عملا وشرط عليه أن يحذقه فهذا فاسد؛ لأن التحذيق مجهول إذ ليس لذلك غاية معلومة وهذه جهالة تفضي إلى المنازعة بينهما، وكذلك لو شرط في ذلك أشهرا مسماة؛ لأنه يلتزم إيفاء ما لا يقدر عليه فالتحذيق ليس في وسع المعلم بل ذلك باعتبار شيء في خلقة المتعلم، ثم فيما سمي من المدة لا يدري أنه هل يقدر على أن يحذقه كما شرط أم لا والتزام تسليم ما لا يقدر عليه بعقد المعاوضة لا يجوز. (المبسوط للسرخسي،كتاب الاجارة،باب الإجارة الفاسدة،ج١٦ ص ٤١).

[2] دفع ثوبا إليه وقال بعه بعشرة فما زاد فهو بيني وبينك قال أبو يوسف رحمه الله تعالى إن باعه بعشرة أو لم يبعه فلا أجر له وإن تعب له في ذلك، ولو باعه باثني عشر أو أكثر فله أجر مثل عمله وعليه الفتوى هكذا في الغياثية...قال للدلال: اعرض

مسئلہ : مقدمہ میں وکیل کی اجرت کو کامیابی کے ساتھ مشروط کرنا، ڈاکٹر یا معالج کی اجرت کو شرط شفاء کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے۔[1]

مسئلہ : اگر دواء بھی معالج کے ذمہ ہو تب بھی جائز ہے جیسے درزی کو اس کے مشین اور دھاگہ سمیت اجرت لینا، یا رنگریز سے رنگ سمیت اجرت پر خدمت لینا، اس میں معقود علیہ آلہ ہے اگر دوا مریض کے ذمہ ہو تو صرف علاج خدمت ہے۔[2]

مسئلہ : کسی عمل کے پڑھنے والے، تعویذ لکھنے والے سے یہ شرط رکھنا کہ کام مکمل ہونے پر اتنی اجرت دی جائے گی، اس شرط کو پورا کرنا ایسا ہی لازم ہے جس طرح نذر پوری کرنا۔[3]

سوم: تجارتی معاہدہ کرنے کا حکم

یعنی فی الحال ایجاب وقبول نہیں ہوا صرف بیع کا وعدہ ہوا کہ خریدار نے اقرار کر لیا کہ میں آپ سے اتنی مقدار میں یہ چیز خریدوں گا اور بائع نے کہا آپ کو اتنی مقدار میں فروخت کروں گا، یہ حتمی بیع نہیں جس

ضيعتي وبعها على أنك إذا بعتها فلك من الأجر كذا فلم يقدر الدلال على إتمام الأمر ثم باعها دلال آخر قال أبو القاسم ولو عرضها الأول وصرف فيه روزجارا يعتد به فأجر مثله له واجب بقدر عنائه وعمله قال أبو الليث رحمه الله تعالى هذا هو القياس ولا يجب له استحسانا إذا تركه وبه نأخذ وهو موافق قول يعقوب رحمه الله تعالى وهو المختار(الفتاوى الهندية،كتاب الاجارة،لباب السادس عشر في مسائل الشيوع في الإجارة،ج٤ ص ٤٥١).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب الاجارة،الفصل الخامس عشر،ج٧ ص ٤٨٥).

وكذا في فتاوى قاضيخان (كتاب الاجارة،باب الإجارة الفاسدة،ج٢ص١٧١).

[1] قياسا على مسئلة السمسار المتقدمة، انظر استحسان المشائخ في الحاشية المتقدمة.

[2] في الدر المختار: وعليها غسل الصبي وثيابه وإصلاح طعامه ودهنه بفتح الدال: أي طليه بالدهن للعرف وهو معتبر فيما لا نص فيه، ولا يلزمها ثمن شيء من ذلك، وما ذكره محمد من أن الدهن والريحان عليها فعادة أهل الكوفة.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله فعادة أهل الكوفة) وقد قالوا في توابع العقود التي لا ذكر لها فيها: إنها تحمل على عادة كل بلد كالسلك على الخياط، والدقيق الذي يصلح الحائك به الثوب على رب الثوب، وإدخال الحنطة المنزل على المكاري، بخلاف الصعود بها إلى الغرفة أو السطح، والإكاف على رب الدابة، والحبال والجوالق على ما تعارفوه.(كتاب الاجارة،باب الاجارة الفاسدة،ج٦ ص ٥٤).

(المادة ٥٧٤) كل ما كان من توابع العمل , ولم يشترط على الأجير يعتبر فيه عرف البلدة وعادتها , كما أن العادة في كون الخيط على الخياط. (مجلة الأحكام العدلية ،الاجارة، الباب السادس،الفصل الرابع: في إجارة الآدمي،ص:١٠٦).

[3] کیونکہ یہ اجارہ ہے اور کام مکمل ہونے کے بعد مقررہ اجرت مستاجر کے ذمہ دین بن جائے گا جس کی ادائیگی نذر کی طرح بہر حال واجب ہے۔

کے لئے مبیع کا موجود ہونا، مقدار کا معلوم ہونا لازم ہو اور ایجاب و قبول حتمی طور پر ہو جائے، اسی طرح یہ محض ایک وعدہ بھی نہیں کہ بعد میں دونوں آزاد ہوں چاہے فروخت کرے نہ کرے، دوسرا خریدے یا نہ خریدے، بلکہ دونوں کے لئے اس قول و قرار کی پابندی لازمی ہے۔[1]

اس دور جدید میں ایسے معاہدوں کی پابندی کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ ذاتی کام ہو یا حکومت کا انتظام یا کوئی رفاہی کام، غرض یہ ہے کہ کوئی کام بھی ایسے معاہدوں کے بغیر انجام نہیں پا سکتا ہے مثلاً زید کو کسی محکمہ، کارخانہ یا فوج کے لئے ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جو عام لوگوں کے کار آمد نہیں اس لئے عام طور پر بازاروں میں نہیں ملتیں، اور کسی کی فرمائش اور اطمینان کے بغیر نہ کوئی تیار کرتا ہے نہ مہیا کرتا ہے، جیسے گوڈر (یعنی پھٹا پرانا کپڑا) یا ردی مال، ہڈیاں وغیرہ، بہت سی چیزیں جو بے موسم نہیں ملتیں یا موسم میں بھی ہر جگہ دستیاب نہیں ہے اگر دستیاب ہیں بھی تو مہنگی ہیں، اس لئے ایسے معاہدات کے بغیر نہ یہ چیزیں ہر جگہ ہر وقت دستیاب ہو سکتی ہیں نہ اتنی قیمت میں مل سکتی ہیں نہ ان کی فراہمی اور نگرانی آسان ہے۔

پس ایسی سخت ضرورتیں پوری کرنے کا راستہ یہی ہے کہ زید و بکر میں اس طرح معاہدہ ہو جائے کہ ہم نے اتنا مال، ان اوصاف کا حامل، قسطوں پر اور ان مقامات پر فروخت اور خریدنے کا معاہدہ کر لیا ہیں، اب اس میں تمام باتوں کی تصریح ہو جائے، مال کی مقدار، اوصاف، قیمت، قسطیں، اوقات، جگہ وغیرہ، پھر مناسب یہی ہے کہ معاہدہ نامہ کو لکھ لیا جائے جیسا کہ بیع سلم میں لکھ لینا مناسب ہے۔

بیع اور تجارتی معاہدہ میں فرق

بیع اور تجارتی معاہدہ میں فرق یہ ہے:

ا۔ بیع میں مال خریدار کی ملک میں آجاتا ہے، قبضہ ہو یا نہ ہو۔

---

[1] وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكرا الشرط على الوجه المعتاد جاز البيع ويلزمه الوفاء بالميعاد؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة قال عليه الصلاة والسلام العدة دين فيجعل هذا الميعاد لازما لحاجة الناس إليه. (تبيين الحقائق ،كتاب الاكراه،ج٥ص ١٨٤).

(المادة ٨٤) المواعيد باكتساب صور التعاليق تكون لازمة(مجلة الأحكام العدلية ،المقالة الثانية،ص٢٦).

وانظر درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ايضا (المقالة الثانية، المادة٨٤، ج١ص ٨٧).

۲۔ خریدار جب چاہے قبضہ کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کا حقدار ہے، بائع حاضر ہو یا غائب ہو، زندہ ہو یا مردہ، راضی ہو یا ناراض۔

۳۔ وہ تمام حقوق جو کسی وجہ سے بائع کے ذات یا مال پر عائد ہوں وہ مبیع سے متعلق نہیں ہوتے۔

۴۔ خریدار کی ذمہ داریوں کا اثر مبیع تک پہنچتا ہے، مبیع پر قبضہ ہوا ہو یا نہ ہو۔

۵۔ بائع کے لئے مبیع کو روکنا یا اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں۔

لیکن جہاں بیع کا صرف معاہدہ ہوا ہے بیع نہیں ہوئی، اس میں مبیع پر نہ خریدار کی ملک ثابت ہو گی، نہ خریدار کا نفع اٹھانا جائز ہے، نہ ہی قبضہ کا حق ہے، نہ یہ کہ بائع و مشتری کے ورثاء ایک دوسرے پر دعویٰ کر سکتے ہیں، نہ ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہے جو بائع کی ذات یا مال سے متعلق ہوں، البتہ بائع کو مجبور کیا جائے گا کہ معاہدہ کے مطابق وقت مقررہ پر شرائط کے مطابق اشیاء مہیا کرے، مبیع کو مہیا کرنے کے متعلق بائع کا نقصان اور عذر قابل قبول نہ ہو گا، اسی طرح خریدار اس مال کو لینے اور قیمت ادا کرنے پر مجبور ہو گا، اس کو اس مال کی ضرورت رہے یا نہ رہے، معاہدہ کے وقت خریدار کی طرف سے اس مال کے لینے پر جو رضامندی تھی اسی کی اس وقت بھی رضامندی سمجھی جائے گی پس وقوع بیع اور معاہدہ بیع کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا۔

مسئلہ: زید نے بکر سے کہا کہ روزانہ ایک مشکیزہ پانی دیا کرو اور ماہانہ /۱۵۰ روپے ایک مشکیزہ پانچ روپے کے حساب سے لیا کرو م بیع کا یہ معاہدہ صحیح ہے۔

مسئلہ: زید نے ایک فوجی افسر سے معاہدہ کیا کہ مثلاً روزانہ پانچ کلو پیاز اور پانچ کلو آلو تمہارے ہیڈ کوارٹر میں اس قیمت پر پہنچا دیا کروں گا، یہ معاہدہ بیع ہے۔[1]

استصناع (یعنی آرڈر پر مال تیار کرانے) کا حکم

چہارم: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چیز تیار ہونے کے بعد بنوانے والے کو اختیار ہے خریدے یا نہ خریدے، اسی طرح بنانے والے خریدار کو دکھلانے سے پہلے مختار ہے اس کے ہاتھ فروخت کرے یا نہ

---

[1] کیونکہ مستقبل کے الفاظ ہیں جو حتمی بیع کے لئے ایجاب و قبول نہیں بن سکتے۔

کرے، بلکہ اس کی جگہ دوسرا بنادے، مگر جب حکم کرنے والے نے دیکھ لیا اور پسند کر لیا تو اب اختیار ختم ہو گیا ہر حال میں اسی کو دینا ہو گا[1]، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جب معاہدہ طے پایا گیا، ایجاب و قبول ہو گیا، اب دونوں کا اختیار ختم ہو گیا نہ اب خریدار رجوع کر سکتا ہے نہ ہی بنانے والا، یہ بیع لازم ہو جاتی ہے، استصناع اسی فتویٰ پر عمل کر کے ہی حاصل ہو سکتا ہے، [2]اگر دونوں جانب اختیار باقی رہے تو ایسی تردد کی حالت میں حکم (آرڈر) کی تعمیل بہت مشکل ہے، رہاں خیارِ رؤیت کا مسئلہ وہ نمونہ دیکھنا اور اوصاف کو بیان کرنے سے ساقط ہو گیا ہے اور بنانے والے کا اختیار معاہدہ کی وجہ سے باطل ہو گیا۔

استصناع صحیح ہونے کی تین شرطیں

پہلی شرط: مال تیار کرنے کے اجزاء سب کاریگر کے ہوں، ورنہ اجارہ ہو جائے گا، اگر مال کاریگر کا اور کچھ خریدار کا ہو تو دیکھا جائے گا اگر خریدار کا مال زیادہ ہے تو اجارہ ہو گا اگر کاریگر کا زیادہ ہے تو استصناع ہے۔[3]

---

[1] (وأما) بعد الفراغ من العمل قبل أن يراه المستصنع، فكذلك، حتى كان للصانع أن يبيعه ممن شاء. كذا ذكر في الأصل؛ لأن العقد ما وقع على عين المعمول، بل على مثله في الذمة؛ لما ذكرنا أنه لو اشترى من مكان آخر، وسلم إليه؛ جاز..فأما إذا أحضر الصانع العين على الصفة المشروطة؛ فقد سقط خيار الصانع، وللمستصنع الخيار؛ لأن الصانع بائع ما لم يره؛ فلا خيار له.وأما المستصنع فمشتري ما لم يره؛ فكان له الخيار(بدائع الصنائع،كتاب الاستصناع، قبيل كتاب الشفعة،ج٥ ص ٣).وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (باب السلم،مطلب في الاستصناع،ج٥ ص ٢٢٥).

[2] في مجلة الاحكام العدلية: (المادة ٣٩٢) وإذا انعقد الاستصناع ; فليس لأحد العاقدين الرجوع وإذا لم يكن المصنوع على الأوصاف المطلوبة المبينة كان المستصنع مخيرا.

وفي درر الحكام تحته: قال أبو يوسف: ليس للمستصنع خيار الرؤية خلافا لبعض الفقهاء وبما أنه قد قبل في هذه المسألة قول أبي يوسف؛ فلا يكون الخيار الوارد هنا خيار رؤية. (البيوع، ،الباب السابع، الفصل الرابع،ج١ص٤٢٦).

[3] (والاستصناع) لغة طلب العمل، متعد إلى مفعولين وشرعا بيع ما يصنعه عينا فيطلب فيه من الصانع العمل والعين جميعا فلو كان العين من المستصنع كان إجارة لا استصناعا. مجمع الأنهر،كتاب البيوع، باب السلم،ج٢ص ١٠٦.

والاستصناع أن تكون العين والعمل من الصانع فأما إذا كانت العين من المستصنع لا من الصانع فإنه يكون إجارة ولا يكون استصناعا كذا في المحيط. الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة،الباب الحادي والثلاثون في الاستصناع،ج٤ص٥١٧.

ويشترط في الاستصناع أن يكون العمل والعين كلاهما من الصانع وعليه فلو كانت العين من المستصنع كان العقد إجارة آدمي. درر الحكام،رقم المادة ٣٨٩،ج١ص ٤٢٣.

(راجع المادة ٣) وقد صرح بذلك استطرادا في المادة (٤٢١) .

دوسری شرط: مدت مقرر نہ کی جائے صرف مہلت ہو، مدت مقرر ہونے کی صورت بیع سلم ہو جائے گی (اس میں سلم کی شرائط کا لحاظ کرنا ہوگا) لیکن مدت سے مراد مدت استحقاق ہے، مثلاً ایک صندوق بنوانا کہ دس دن میں تیار کردے گا، اب اگر مدت ہے تو دس دن سے پہلے مطالبہ نہیں کر سکتا، نہ اس کو قبضہ یا نفع اٹھانے کا حق ہے اگرچہ دس دن سے پہلے ہی صندوق تیار ہو جائے، اگر دس دن کی مہلت سے تو دس دن سے پہلے ہی مطالبہ کر سکتا ہے نفع بھی اٹھا سکتا ہے اور قبضہ کرنے کا بھی حق ہے، اور یہ مراد بھی نہیں کہ طویل مدت اس کے لئے نہیں ہو سکتی کیونکہ مدت ہونے کی صورت میں بہت سی چیزیں تیار نہیں ہو سکتیں، زیادہ تر ضرورتیں انہی چیزوں میں رہتی ہے جن کی تیاری میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔[1]

تیسری شرط: ایسی چیز بنوائی جائے جو مستعمل اور متعارف ہو، ایسی نہ ہو جو غیر مستعمل اور غیر متعارف ہو ورنہ عقد فاسد ہوگا، کیونکہ استصناع خلاف قیاس جائز ہے جو چیزیں خلاف قیاس جائز ہو وہ اپنی موضع ثبوت پر ہی مقید رہتی ہے اس پر قیاس کرکے دوسری جگہ حکم نہیں لگا سکتے۔[2]

"خریدار کا مال زیادہ ہو تو اجارہ ہوگا اگر کاریگر کا زیادہ ہو تو استصناع ہے" اس کے متعلق کوئی صریح جزئیہ نظر نہیں آیا، البتہ اصل قدیم نسخہ میں اس کے تحت حاشیہ لکھا ہے: "اس لئے کہ اکثر حکمِ کل میں ہے، ضرورتِ استصناع کبھی کبھی چاہتی ہے کہ بعض چیزیں آمر کی ہو تاکہ وضع مرغوب وطبع جدید حاصل ہو سکے اور اقتضائے ذاتی مخالف شرطِ صحت نہیں ہو سکتا جبکہ اجیر کو بعض چیزیں اپنی لگانا جائز ہیں، جیسے رنگ، تاگہ، تو آمر کو کیوں جائز نہ ہو گی"۔ ص ۱۱۲۔

[1] الدر المختار: (والاستصناع) هو طلب عمل الصنعة (بأجل) ذكر على سبيل الاستمهال لا الاستعجال فإنه لا يصير سلما (سلم) فتعتبر شرائطه.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: والمراد بالأجل ما تقدم وهو شهر فما فوقه قال المصنف: قيدنا الأجل بذلك لأنه إذا كان أقل من شهر كان استصناعا وإن جرى فيه تعامل، وإلا ففاسد إن ذكره على وجه الاستمهال وإن كان للاستعجال بأن قال على أن تفرغ منه غدا أو بعد غد كان صحيحا اهـ ومثله في البحر وغيره وسيذكره الشارح. (،باب السلم، مطلب في الاستصناع،ج٥ ص ٢٢٣).

وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، باب السلم،ج٦ ص ١٨٦).

[2] ثم إنما يجوز إذا جرى فيه تعامل وما لا تعامل فيه لا يجوز الاستصناع فيه ويكون سلما إذا اجتمعت فيه شرائطه.(تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، باب السلم،ج٤ ص ١٢٣).

(مادة ٤٦٩):إذا ضرب للاستصناع أجلاً أقل من شهر إن جرى فيه تعامل كان استصناعاً صحيحاً وإن لم يجر فيه تعامل إن ذكر الأجل على وجه الاستعجال كان استصناعاً صحيحاً أيضاً وإن ذكره على وجه الاستمهال فهو استصناع فاسد. (مرشد الحيران إلى معرفة أحوال الإنسان ،قبيل كتاب الإجارة،ص٧٥).

متعارف چیز ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ نئی بنوانے کی صورت میں کاریگر کا نقصان ہو سکتا ہے کیونکہ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک چیز تیار ہونے کے بعد خریدار کو نہ لینے کا اختیار ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جب استصناع سے بیع لازم ہو جاتی ہے تو اس شئ (چیز) کے متعارف ہونے کی شرط بے ضرورت ہے بلکہ استصناع سے مانع ہے کیونکہ عام طور وہی چیزیں بنوائی جاتی ہیں جو جدید قسم کی یا خاص وضع کی ہوتی ہیں، اگر ایسی چیزیں استصناع سے خارج ہو جائیں تو استصناع کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ کے لئے لکڑی کا منبر بنوایا حالانکہ اس سے پہلے نہ منبر متعارف تھا نہ مستعمل۔[1]

مسئلہ: مناسب یہ ہے کہ استصناع میں تمام شرائط لکھ لی جائیں اور ہر چیز کو نہایت ہی وضاحت کے ساتھ لکھا جائے تاکہ منازعت کا احتمال باقی نہ رہے۔

مسئلہ: کتابوں کو پریس سے چھپوانا، نئے آلات اپنی فرمائش اور پسند سے بنوانا، یہ سب استصناع میں داخل ہیں، مثلاً الماری بنوانا، شوکیس اور کوئی نئی ڈیزائن کی چیز بنوائی، یہ سب استصناع کی صورتیں ہیں جو اس زمانے میں عام اور بکثرت ہیں۔

شراکت داری کے احکام

بہت سے حقوق کا اس طرح مل جانا کہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکے، یہ شرکت ہے پھر اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی قسم۔اختلاط: دو الگ الگ حقوق باہم اس طرح مل جائیں کہ دونوں کی الگ الگ شناخت نہ ہو سکے نہ

[1] عن سهل رضي الله عنه: أن النبي صلى الله عليه وسلم أرسل إلى امرأة من المهاجرين، وكان لها غلام نجار، قال لها: مري عبدك فليعمل لنا أعواد المنبر، فأمرت عبدها، فذهب فقطع من الطرفاء، فصنع له منبرا، فلما قضاه، أرسلت إلى النبي صلى الله عليه وسلم إنه قد قضاه، قال صلى الله عليه وسلم: أرسلي به إلي، فجاءوا به، فاحتمله النبي صلى الله عليه وسلم، فوضعه حيث ترون(صحيح البخاري، كتاب الهبة، باب من استوهب من أصحابه شيئا، رقم الحديث:٢٥٦٩).
سنن الدارمي (باب ما أكرم النبي صلى الله عليه وسلم من حنين المنبر، رقم الحديث:٤٢،ج١ص ١٨٤).

علیحدگی، جیسے گندم گندم میں (یہ مثال ہے دو ہم جنس مالوں کی) دودھ یا چینی پانی میں تل، رائی، خشخاش، سر سوں میں خوب مل جائیں۔

مسئلہ : یہ ملاوٹ بلاارادہ ہوگئی ہو یا آپس کی رضامندی سے، دونوں صورتوں میں تقسیم یا مصالحت سے پہلے نہ اس کو فروخت کرنا جائز ہے نہ کوئی تصرف (کیونکہ دونوں حقوق جدا جدا ہے مگر کوئی شخص اپنا حق جدا کرنے پر قادر نہیں) ہاں البتہ شریک ہی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے۔ (شامی)[1]

مسئلہ : یہ ملاوٹ ایک نے قصداً دوسرے کی اجازت کے بغیر کر دی ہے تو ملاوٹ کرنے والا غاصب ہے، اس کی مثل یا قیمت ادا کرنا غاصب کے ذمہ واجب ہے، ادائیگی کے بعد مالک ہو جائے گا جب تک دوسرا معاف نہ کرے گناہ اس کے ذمہ رہے گا۔[2]

دوسری قسم۔ اتحاد: یعنی حقوق ایک دوسرے کے عین ہو جائیں، مثلاً ایک زمین ہے اس میں ایک چھوتائی زید کی، تین چوتھائی عمر کی، اب ہر ہر جزء میں دونوں شریک ہیں، اسی کو جزء شائع کہتے ہیں، ہر شریک اپنے حصے میں اس طرح تصرف کر سکتا ہے کہ نہ اصل ہلاک ہو نہ ہی اس کے منافع، مثلاً اس جزء کو فروخت یا ہبہ کرنا ناجائز ہے[3] (شامی)[4] اب مشتری یا موہوب اس کی جگہ شریک ہو جائے گا لیکن مشترکہ پھلوں کو کھالینا، لکڑی کو جلا ڈالنا، مکان میں رہنا، گھوڑے پر سوار ہونا، چونکہ یہ ایسے افعال ہیں جن میں اصل ہلاک ہوتا ہے یا

---

[1] الفرق أن الشركة إذا كانت بينهما من الابتداء، بأن اشتريا حنطة أو ورثاها. كانت كل حبة مشتركة بينهما فبيع كل منهما نصيبه شائعا جائز من الشريك والأجنبي، بخلاف ما إذا كانت بالخلط أو الاختلاط كان كل حبة مملوكة بجميع أجزائها ليس للآخر فيها شركة، فإذا باع نصيبه من غير الشريك لا يقدر على تسليمه إلا مخلوطا بنصيب الشريك فيتوقف على إذنه، بخلاف بيعه من الشريك للقدرة على التسليم والتسلم.اهـ. (رد المحتار على الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الشركة، ج٤ ص ٣٠٠).

وكذافي فتح القدير (كتاب الشركة، ج٦ ص ١٥٤).

[2] (قوله أو خلطها بماله بغير الإذن حتى لا تتميز ضمنها) لأنه صار مستهلكا لها وإذا ضمنها ملكها ولا تباح له قبل أداء الضمان ولا سبيل للمالك عليها عند أبي حنيفة(البحر الرائق ،كتاب الوديعة، ج٧ ص ٢٧٦)

وكذا درر الحكام (الكتاب السادس: الامانات، ج٢ص ٢٩٨).

[3] یہاں "ناجائز ہے" لکھنا کاتب کی غلطی ہے، اصل عبارت "جائز ہے" ہے۔

[4] (وكل) من شركاء الملك (أجنبي) في الامتناع عن تصرف مضر (في مال صاحبه) لعدم تضمنها الوكالة (فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا إذن(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الشركة، ج٤ ص ٣٠٠).

(المادة ١٠٧٥) كل واحد من الشركاء في شركة الملك أجنبي في حصة الآخر ولا يعتبر أحد وكيلا عن الآخر فلذلك لا يجوز تصرف أحدهما في حصة الآخر بدون إذنه.(مجلة الأحكام العدلية ،الشركات،ص ٢٠٦).

نفع، اس لئے یہ افعال جائز نہیں، البتہ آپس میں تقسیم کرلیں اس کے بعد استعمال کیاجائے، یااس طرح مصالحت کریں کہ مکان میں ایک ماہ زید رہے گاایک ماہ عمر[1]۔

شرکت مطلق کی دو قسمیں:

۱۔شرکت ملک: جیسے کئی افراد خریدنے کے ذریعے، یاہبہ ومیراث کے ذریعے کسی شئ کے مالک ہوجائیں۔

۲۔شرکت عقد: کہ ایجاب وقبول کے ذریعے اپنےاپنے مال یا حقوق کواکھٹا کرلیں، پھر شرکاء بھی دوقسم پر ہیں:

۱۔ہر شریک مالک ومتصرف ہویاصرف مالک یاصرف تصرف کرنے والاہو، گو باہمی مشورہ پر عمل درآمد رہے۔

۲۔ تمام شرکاءمالکانہ حیثیت سے توجداجداہوں لیکن سب ایک نظام قانونی کے تابع بن جائیں اور تمام انتظام ایک فرد یاایک کمیٹی کے ہاتھ میں دیدیاجائے اور شرکاء کواستحقاق اور نفع لینے کے سوا کسی قسم کی مداخلت کاحق نہ ہوگا۔

قسم اول کی کل چھ صورتیں بنتی ہیں:

۱۔دونوں کی طرف سے مال ہو۔

۲۔ایک کی طرف سے صرف مال، دوسرے کی طرف سے مال بھی اور عمل بھی،اسے شرکت مفاوضہ یا شرکت عنان کہتے ہیں۔

۳۔ایک کی طرف سے مال دوسرے کی طرف سے صرف محنت ہو، یہ شرکت مضاربت ہے۔

۴۔دونوں کی طرف سے صرف محنت ہومال کچھ نہیں، یہ شرکت صنائع ہے۔

۵۔دونوں کی طرف سے صرف وجاہت وتدبیر ہو، یہ شرکت وجوہ ہے۔

۶۔ایک کی طرف سے عمل دوسرے کی طرف سے مال وعمل دونوں ہوں یہ فاسد ہے۔[2]

وكذا في اللباب في شرح الكتاب (كتاب الشركة،ج٢ ص ١٢١).

[1] جس کو"مہایات"کہاجاتاہے۔

[2] فساد کی وجہ یہ ہے کہ یہ مضاربت کی صورت ہے جس میں ضروری ہے کہ مال عمل کرنے والے کے حوالہ کیاجائے، سرمایہ دار کاعامل کے ساتھ عمل میں شریک ہونے کی شرط لگانادرست نہیں۔

شرکت عقد کے اصول

شرکت عقد کے اصول جن کا ہر موقع پر لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اصول نمبر ا۔ شرکت کا سرمایہ ایسا مال ہو جن پر ملک آسکے، لہٰذا جنگل کی گھاس، دریا کے پانی، اور شکار وغیرہ میں شرکت جائز نہیں۔[1]

مسئلہ: مسلمانوں کو شراب اور خنزیر میں شرکت کرنا جائز نہیں۔[2]

مسئلہ: تصاویر سازی، گانے بجانے کی آلات، زناکاری، کھیل کھود کے سامان بنانے میں شرکت کا وہی حکم ہے جو ان کی خرید وفروخت کا ہے، ان میں جس مقدار میں مال ہے اس میں شرکت ہو گی جو کاریگری کی قیمت ہے اس میں شرکت نہیں ہو گی۔[3]

مسئلہ: خنزیر کی ہڈی یا بال سے کوئی چیز تیار کی گئی تو ہڈی میں شرکت باطل ہے۔[4]

"ولا بد أن يكون المال مسلما إلى المضارب ولا يد لرب المال فيه" لأن المال أمانة في يده فلا بد من التسليم إليه، وهذا بخلاف الشركة لأن المال في المضاربة من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر، فلا بد من أن يخلص المال للعامل ليتمكن من التصرف فيه. (الهداية ،كتاب المضاربة، ج٣ ص ٢٠١).

وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب المضاربة، ج٣ ص ٢٠). وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب المضاربة، ج٥ ص ٦٤٨).

[1] "ولا تجوز الشركة في الاحتطاب والاصطياد، وما اصطاده كل واحد منهما أو احتطبه فهو له دون صاحبه"، وعلى هذا الاشتراك في أخذ كل شيء مباح؛ لأن الشركة متضمنة معنى الوكالة، والتوكيل في أخذ المال المباح باطل لأن أمر الموكل به غير صحيح، والوكيل يملكه بدون أمره فلا يصلح نائبا عنه(الهداية ،كتاب الشركة، فصل: في الشركة الفاسدة، ج ٣ ص ١٣).وكذا في المحيط البرهاني (كتاب الشركة،الفصل السادس في الشركة بالأعمال، ج٦ ص ٤١).

[2] انظر الاختيار لتعليل المختار (كتاب الشركة، ج٣ ص ١٢). وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب الشركة، ج١ ص٢٨٦).

[3] قد مر تفصيله في مبحث البيوع فليراجع.

[4] حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے خنزیر کے ہڈی کا حکم بیان فرمایا لیکن بال کا حکم ذکر نہیں کیا جبکہ راجح قول کے مطابق چونکہ بال کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہے اس لئے اس میں بھی شرکت جائز نہیں۔

في الدر المختار: (وشعر الخنزير) لنجاسة عينه فيبطل بيعه ابن كمال (و) إن (جاز الانتفاع به) لضرورة الخرز؛ حتى لو لم يوجد بلا ثمن جاز الشراء للضرورة وكره البيع فلا يطيب ثمنه ويفسد الماء على الصحيح خلافا لمحمد.

وفي حاشية ابن عابدين تحته:(قوله وكره البيع) ؛ لأنه لا حاجة إليه للبائع زيلعي، وظاهره أن البيع صحيح. وفيه أن جواز إقدام المشتري على الشراء للضرورة لا يفيد صحة البيع، كما لو اضطر إلى دفع رشوة لإحياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض،

مسئلہ : ریشم کے کپڑے پر تصویر کھینچی تو نقس و نگار میں شرکت نہیں، ریشم کی نفس مالیت میں شرکت ہو گی۔[1]

اصول نمبر ۲: اموال میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ دونوں کے مالوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ ہر ہر جزء میں دونوں کی شرکت ہو، صرف خلط کافی نہیں، لہٰذا اگر دونوں شرکاء کا سرمایہ نقد ہو تو صرف ذمہ کر لینا کافی ہے (کہ میرے ذمہ دس ہزار ہے اور تمہارے ذمہ بھی دس ہزار ہے یا کم و زیادہ)۔[2]

اور اگر نقود کے علاوہ کوئی چیز ہو تو شرکت کے لئے ضروری ہے ان میں تبادلہ کیا جائے جیسے یہ کہے میں نے گندم کے اس ڈھیر کے آدھے حصے کو تمہارے ڈھیر کے آدھے حصے کے بدلے فروخت کیا یا اس کا ایک چوتھائی تمہارے تین چوتھائی کے بدلے فروخت کیا، اس کے بعد دونوں میں شرکت ہو گی، اگر تبادلہ نہیں کیا صرف یہ کہا کہ دس من میرے اور دس من تمہارے، تو صرف اختلاط ہو گیا، شرکت نہ ہو گی۔[3]

مسئلہ : شرکت کے لئے نقود میں ذمہ داری کافی ہے جبکہ دوسرے اموال میں صرف ذمہ میں لینا کافی نہیں بلکہ مال کو حاضر کرنا ضروری ہے۔

وكذا لو اضطر إلى شراء ماله من غاصب متغلب لا يفيد ذلك صحة البيع حتى لا يملك البائع الثمن فتأمل. (قوله فلا يطيب ثمنه) مقتضى ما بحثناه أنه لا يملكه (قوله على الصحيح) أي عند أبي يوسف؛ لأن حكم الضرورة لا يتعداها(كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٥ ص ٧١).

ولا يجوز بيع شعر الخنزير؛ لأن الخنزير عينه نجس بجميع أجزائه منع الشرع عن الانتفاع به إهانة لعينه واستقباحاً لذاته، وفي البيع إعزاز له إلا أن رخص للخراز الانتفاع به من حيث الخرز؛ لأجل الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع، وعن أبي يوسف أنه كره الانتفاع به للخرازين؛ لأنه نجس ولا ضرورة في الانتفاع به؛ لأن الخرز يحصل بغيره(المحيط البرهاني ، كتاب البيع،الفصل السادس فيما يجوز وما لا يجوز بيعه،ج٦ ص ٣٥٠).

[1] جاندار کی تصویر مراد ہے اور شرکت صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شرعاً نا قابل انتفاع ہونے کی وجہ سے تصویر کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

[2] (قوله: وشركة العقد أن يقول أحدهما شاركتك في كذا ويقبل الآخر) بيان للنوع الثاني ومقصوده بيان ركنها من الإيجاب والقبول الدالين عليها لا خصوص شاركتك؛ لأنها عقد من العقود فينعقد بما يدل عليه ولهذا لو دفع ألفا إلى رجل، وقال أخرج مثلها واشتر وما كان من ربح فهو بيننا وقبل الآخر وأخذها وفعل انعقدت الشركة(البحر الرائق ،كتاب الشركة، ج٥ ص ١٨١).وكذا في فتح القدير (كتاب الشركة،ج٦ ص ١٥٤).

[3] (وصحت بعرض) هو المتاع غير النقدين ويحرك قاموس (إن باع كل منهما نصف عرضه بنصف عرض الآخر ثم عقداها) مفاوضة أو عنانا، وهذه حيلة لصحتها بالعروض وهذا إن تساويا قيمة، وإن تفاوتا باع صاحب الأقل بقدر ما تثبت به الشركة (الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الشركة،ج٤ص ٣١٠)

وكذا في تبيين الحقائق (كتاب الشركة،ج٣ ص ٣١٧).

اصول نمبر۳: شرکاء میں عقد کی قابلیت ہونا بھی ضروری ہے اسی طرح ایک دوسرے کو وکیل بنانا بھی ضروری ہے، لہٰذا نابالغ، مجنون، عبد مجور (یعنی وہ غلام جس پر آقا کی طرف سے پابندی ہے، اسی طرح سفیہ کم عقل جو معاملات کو پوری طرح نہیں سمجھتا، جس پر حاکم کی طرف سے پابندی ہے)۔[1]

اصول نمبر۴: شرکاء کی تعداد محدود ہونا ضروری نہیں، دو ہوں یا ہزار یا دس ہزار۔

اصول نمبر۵: شرکاء مشترک مال کے بارے میں ایک دوسرے کے امین بھی ہیں، کفیل اور وکیل بھی۔ لیکن مشترک مال کے علاوہ جو ذاتی معاملات ہیں، مثلاً کوئی تاوان قرض وغیرہ دوسرے شرکاء سے متعلق نہ ہوگا، اور معاملہ شرکت کے تمام مطالبات اور حقوق ایک دوسرے کے متعلق رہیں گے، ایک نے جو معاملہ کیا اس کا دوسرا بھی ذمہ دار ہوگا۔[2]

اصول نمبر۶: نفع کا حق تین وجہوں سے ہوتا ہے:

ضمان: یعنی یہ طے پایا کہ جو کچھ نقصان ہوگا دونوں کے ذمہ برابر ہوگا، یا ایک کے ذمہ ایک تہائی دوسرے کے دو تہائی ہوگا، اس ذمہ داری سے نفع لینے کا حق دار ہوگیا۔

مال: جیسے مضاربت میں رب المال مال کی وجہ سے نفع کا حق دار ہے۔

عمل: جیسے مضارب عمل ومحنت کے ذریعے نفع کا حق دار ہے۔[3]

---

[1] (منها) أهلية الوكالة لأن الوكالة لازمة في الكل وهي أن يصير كل واحد منهما وكيل صاحبه في التصرف بالشراء والبيع وتقبل الأعمال(بدائع الصنائع ،كتاب الشركة، الشرائط العامة،ج٦ ص ٥٨).

وكذا في مجلة الأحكام العدلية ,الشركات،الفصل الثاني، رقم المادة (١٣٣٣)،ص٢٥٥).

[2] شرکت مفاوضہ میں تو ہر ایک شریک دوسرے کا وکیل وکفیل ہوتا ہے لیکن شرکت عنان میں اگر صراحۃً کفالہ کی تصریح نہ کی جائے تو صرف ایک دوسرے کے وکیل ہوں گے کفیل نہیں ہوں گے۔

ولا يكون في شركة العنان كل واحد منهما كفيلا عن صاحبه إذا لم يذكر الكفالة بخلاف المفاوضة. (فتاوى قاضيخان ،كتاب الشركة،فصل في شركة العنان،ج٣ ص ٣٨٧).

والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الشركة،مطلب في شركة العنان،ج٤ ص ٣١١).

[3] الأصل أن الربح إنما يستحق عندنا إما بالمال وإما بالعمل وإما بالضمان، أما ثبوت الاستحقاق بالمال فظاهر؛ لأن الربح نماء رأس المال فيكون لمالكه، ولهذا استحق رب المال الربح في المضاربة وأما بالعمل، فإن المضارب يستحق الربح بعمله فكذا الشريك. وأما بالضمان فإن المال إذا صار مضمونا على المضارب يستحق جميع الربح، ويكون ذلك بمقابلة الضمان خراجا بضمان بقول النبي عليه الصلاة والسلام الخراج بالضمان(بدائع الصنائع ، كتاب الشركة،ج٦ ص ٦٢).

اصول نمبر ۷: مقدار نفع کا تعین: مقدار نفع کی تعیین دو طرح سے ہوتی ہے:

۱۔ ضمان: جس نے جس قدر ذمہ داری اٹھائی اسی حساب سے نفع لینے کا حق دار ہو گا۔[1]

۲۔ آپس کا معاہدہ: جو شرط طے پایا جائے[2]۔ تعین کے بغیر نفسِ مال یا عمل کے ذریعے نفع کا حق دار نہیں ہو گا جیسے بضاعت یعنی زید نے بکر کو مال دیا کہ تجارت کر کے نفع خود لے یا قرض دیا، دونوں صورتوں میں زید نفع لینے کا حق دار نہ ہو گا۔

مسئلہ: ضمان کے خلاف کرنا جائز نہیں، یعنی مثال کے طور پر زید آدھا نقصان کا ضامن ہے اور اس کے لئے نفع متعین چوتھائی یا تہائی، یہ جائز نہیں۔[3]

مسئلہ: اگر ضمان کا ذکر نہ ہو تو شرح نفع جو بھی طے ہو جائے اسی کے بقدر ہو گا، مال کم ہو یا زیادہ۔

اصول نمبر ۸: نقصان کی مقدار مال کے اعتبار سے ہے یا ضمان کے اعتبار سے، نفع پر اس کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔[4]

مسئلہ: اگر ضمان کی مقدار متعین نہ ہو اور تجارت میں نقصان ہو گیا تو ایسی صورت میں نقصان کا تعین نفع

وكذا في البحر الرائق (كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، ج٥ ص ١٩٧).

[1] المادة (١٣٩٢) الشريكان يستحقان الأجرة بضمان العمل , فلذلك إذا لم يعمل أحدهما لمرضه أو لذهابه إلى محل أو لقعوده عن العمل وعمل شريكه فقط فيقسم الكسب والأجرة الحاصلة على الوجه الذي شرطاه أيضا. (مجلة الأحكام العدلية ،الشركات، الباب السادس ،ص٢٦٨).

وكذا فى حاشية الشلبي على تبيين الحقائق (كتاب الشركة، ج٣ ص ٣٢١).

[2] (و) تصح (مع التفاضل في رأس المال) بأن يكون لأحدهما ألف وللآخر ألفان مثلا (والربح) بأن يكون ثلثا الربح لأحدهما وثلثه للآخر..ولنا قوله عليه الصلاة والسلام الربح على ما شرطا والوضيعة على قدر المالين مطلقا بلا فصل. (مجمع الأنهر، كتاب الشركة، ج١ص ٧٢١).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الشركة، ج٤ص ٣١٣).

[3] بظاہر یہ شرکۃ الاعمال کے متعلق ہے جہاں ربح و خسارہ بقدرِ ضمان ہوتا ہے، شرکت کا عقد طے کرتے وقت ضمان کا جو کچھ تناسب باہمی طور پر طے پائے، اسی کے مطابق نفع و نقصان تقسیم ہو گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

[4] ولا خلاف أن اشتراط الوضيعة بخلاف مقدار رأس المال باطل، واشتراط الربح صحيح عندنا خلافا للشافعي(المبسوط للسرخسي ،كتاب الشركة، ج١١ص ١٥٦).

لا خلاف أن اشتراط الوضيعة بخلاف قدر رأس المال باطل، واشتراط الربح متفاوتا عندنا صحيح (فتح القدير ،كتاب الشركة، ج٦ص ١٥٥).

کی مقدار سے ہو گا۔[1]

مسئلہ: زید کا مال چوتھائی حصہ ہے یا تہائی حصہ، نفع برابر لیتا ہے تو یہ جائز ہے۔[2]

مسئلہ: مضارب میں کل نقصان رب المال (صاحب مال) پر ہو گا، مضارب کے ذمہ نقصان نہیں ہے کیونکہ نہ اس کا مال ہے نہ اس نے نقصان کی ذمہ داری قبول کی۔[3]

اصول نمبر۹: شریک شرکت کے کاموں کے لئے اجیر نہیں ہو سکتا، جو کچھ کام کرے گا وہ شرکت میں داخل ہے[4]، ہاں جانبین کی خوشی سے کچھ لیتا ہے تو وہ دوسری بات ہے۔[5]

اصول نمبر۱۰: تجارت کا سرمایہ تین ہیں:

۱۔ جو مال ملک میں موجود ہو[6]۔ ۲۔ ادھار مال لینا[7]۔ ۳۔ حقوق: جیسے دکان کا نام جس کی بنیاد پر دور دور سے معاملات طے ہو سکتے ہیں، یا وہ معاہدات جو معاملہ داروں سے کئے جائیں[8]، موہوم امید کا اعتبار نہیں، جیسے کرایہ کی دکان ہے اسی طرح ملازم وغیرہ، یہ دوسرے کے اختیار میں ہے۔

---

[1] شرکت الاموال میں نقصان بقدر سرمایہ ہو گا اور شرکت الاعمال میں بقدر ضمان، جبکہ شرکۃ الوجوہ میں لئے ہوئے مال میں اپنے حصہ کے بقدر ہر شریک ضامن ہو گا، لہذا راجح قول کے مطابق نقصان کا ضمان بقدر نفع نہیں ہو گا، صرف امام زفر رحمہ اللہ چونکہ نفع میں تفاوت رکھنے کے قائل ہے اس لئے ان کے موقف کے مطابق شاید یہ بات درست ہو سکے، لیکن فقہاء احناف کے نزدیک اس قول پر فتویٰ نہیں ہے۔

[2] وشركة العنان تصح مع التفاضل في المال، وتصح مع التفاضل في المال والتساوي في الربح إذا عملا أو شرطا زيادة الربح للعامل (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الشركه، ج٣ص ١٥).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الشركة،بعد مطلب في توقيت الشركة روايتانج٤ ص ٣١٢).

[3] لأن الخسران جزء هالك من المال فلا يجوز أن يلزم غير رب المال(مجمع الأنهر ،كتاب المضاربة، ج٢ص ٣٢٤).

وكذافي العناية شرح الهداية (كتاب المضاربة، ج٨ص ٤٥١).

[4] ومن استأجر رجلا لحمل طعام مشترك بينهما لا يجب الأجر لأن ما من جزء يحمله إلا وهو عامل لنفسه فيه فلا يتحقق تسليم المعقود عليه. (الهداية،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٣ص٢٤٠).

(ولا تجوز الشركة إذا شرط لأحد دراهم مسماة من الربح) قال ابن المنذر لا خلاف في هذا لأحد من أهل العلم. (فتح القدير ،كتاب الشركة، ج٦ ص ١٨٣).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج ٦ ص ٦٠).

[5] اجارہ میں بھی جانبین کی خوشی سے اجرت لی اور دی جاتی ہے، اس لئے جواز کی یہ صورت تبرع اور احسان پر محمول ہے، تاہم بہت سے متاخرین مفتیان کرام کے نزدیک شرکت اور اجارہ جمع ہو سکتے ہیں اور شریک کو اجیر رکھنا بھی جائز ہے، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (احسن الفتاویٰ، کتاب الاجارۃ، عنوان "شریک کو ملازم رکھنے کے بارے میں تحقیق انیق وتدقیق عمیق" ج ۷ ص ۳۲۱)

[6] شرکت الاموال کی صورت میں۔

[7] شرکت وجوہ کی صورت میں۔

[8] شرکت الاعمال کی صورت میں۔

حقوق تجارت کا حق دار

اصول نمبر ۱۱: اگر کوئی شریک کسی وجہ سے شرکت سے علیحدہ ہو جائے تو تجارت کے حقوق و مراعات سب شرکت پر رہنے والے کے ہوں گے۔

لہٰذا شرکت سے علیحدہ ہونے والا دکان یا اس کے نام اور فرمائش کا کوئی معاوضہ نہیں لے سکتا، فرمائش کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے اس مشترک دکان سے کچھ مال طلب کیا ابھی تک اس کے پاس مال بھیجا نہیں گیا تھا کہ ایک شریک علیحدہ ہو گیا تو اس کو کوئی معاوضہ نہیں ملے گا، یعنی اس فرمائش کے مال پر جو نفع ملے گا اس کا کوئی حصہ علیحدہ ہونے والے کو نہیں ملے گا۔[1]

اصول نمبر ۱۲: جو اموال موجود ہیں یا جو حقوق ثابت ہیں، تمام شرکاء مل کر ان کی تقسیم کرا سکتے ہیں۔

شرکت کو مکمل ختم کرنے کا حکم

اصول نمبر ۱۳: جب کوئی مشترکہ کاروبار ختم ہو جائے تو اس کے متعلق جن ذمہ داریوں کا وعدہ ہے وہ ختم ہو جائیں گے، البتہ وہ حقوق جو کسی صحیح مال کا عوض ہیں یا شرائط کے تحت اس تجارت پر ثابت ہو چکے ہیں، ان حقوق کی ادائیگی شرکاء کے ذمہ باقی رہے گی، مثلاً دکان پورے سال کے لئے تھی یا کسی سے خرید و فروخت ہونا طے ہوا تھا اس شرط پر کہ پورے سو درجن لوں گا، تو کاروبار ختم ہونے کی صورت میں ایسے حقوق کو ادا کر دینا تمام شرکاء کے ذمہ ہیں۔

اصول نمبر ۱۴: اگر کسی مشترکہ کاروبار سے بعض شرکاء علیحدہ ہو جائیں اور بعض بدستور مشترکہ کاروبار کو جاری رکھیں تو اس کاروبار کے تمام حقوق کے متعلق یوں سمجھا جائے گا کہ گویا کاروبار بدستور چل رہا ہے۔

اصول نمبر ۱۵: مشترکہ تجارت کے شرکاء میں کسی کے ذمہ اگر کوئی قرضہ وغیرہ ہو تو وہ تجارت کے متعلق نہ ہوگا، البتہ حق دار کو یہ حق ہوگا کہ وہ شریک مقروض کا مال جو تجارت میں لگا ہوا ہے، اس میں سے اپنا حق وصول کرے۔

اصول ۱۶: جب کوئی شریک علیحدہ ہونا چاہے تو ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جس سے تجارت باقی رکھنے والوں کا

---

[1] کیونکہ محض فرمائش سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کے مستقل عقد کے نتیجہ میں نفع حاصل ہوا اور اس عقد میں علیحدہ ہونے والا فریق شریک نہیں اس لئے اس کو نفع دینے کی بھی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

نقصان ہو جائے، مثلاً ایک لاکھ کا ایک معاہدہ خرید وفروخت ہو گیا تھا، اب آدھے روپے سے یا آدھے مال سے یہ معاہدہ پورا نہیں ہو سکتا ہے، اب اگر شریک نقد روپے تقسیم کر لے یا مال شرکت تقسیم کر لے تو یہ معاہدہ پورا نہیں ہو سکتا، اس لئے علیحدہ ہونے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے کہ جس سے کسی فریق کو زائد نقصان اٹھانا پڑے۔

جن باتوں سے شرکت فاسد یا باطل ہو جائے

۱۔ شرکت صحیح ہونے کے جو اصول ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنا۔[1]

۲۔ ایسے اموال میں شرکت کرنا جن میں ملک ثابت نہیں ہوتی۔[2]

۳۔ اگر عقد شرکت کرتے وقت یہ طے پایا کہ زید صرف حساب کرے گا اور عمر صرف فروخت کرے گا، اسی شرط کے ساتھ عقد کیا تو یہ عقد فاسد ہو گا، ہاں اگر عقد اس شرط کے ساتھ نہیں ہوا، صرف انتظامی طور پر بعد میں ایسا تقسیم کار عمل میں آیا اس میں اختیار ہے۔

اگر یہ طے پایا کہ روغن اور میدہ زید کا ہو گا اور چینی بکر کی، دونوں ملا کر حلوہ تیار کر کے فروخت کیا جائے تو یہ شرکت نہیں بلکہ ہر ایک کو اپنے مال کی قیمت مل جائے گی۔[3]

۴۔ کسی ایک شریک کے لئے نفع کی ایک مقدار متعین کر لینا، جیسے ایک شریک سو روپے زائد، یا دس روپے ماہوار لیا کرے گا، یا مشترک باغ میں سے ایک درخت کا پھل، یا مشترک مال میں سے فلان مال، عمر کا ہو گا،

---

[1] (لاشركة في الاحتطاب والاحتشاش والاصطياد وسائر المباحات) لأن الشركة تتضمن التوكيل وهو إثبات ولاية التصرف فيما هو ثابت للموكل وهذا المعنى لا يتصور هنا (الدرر شرح الغرر، كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة ،ج۲ ص ۳۲۳).
وكذا في تبيين الحقائق (كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة ،ج ۳، ص ۳۲۲).

[2] جیسے غیر متقوم اشیاء شراب وخنزیر وغیرہ، شرکت صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شرکت وکالت کو متضمن ہے اور مسلمان نہ خود ان اشیاء کا مالک بن سکتا ہے نہ ہی کسی کو مالک بنا سکتا ہے ملاحظہ فرمائیں سابقہ حاشیہ۔

[3] کیونکہ یہ شرکت بالعروض ہے جو کہ درست نہیں۔
لو دفع دابته لرجل ليؤجرها والأجر بينهما، فالشركة فاسدة والربح للمالك وللآخر أجر مثله، وكذلك السفينة والبيت، ولو لم يبع عليها البر فالربح لرب البر وللآخر أجر مثل الدابة، ولو لأحدهما بغل وللآخر بعير فالأجر بينهما على مثل أجر البغل والبعير (الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة ،ج ٤ ص۳۲٦).
تحفة الفقهاء (كتاب الشركة، باب الشركة الفاسدة، ج۳ ص ۱٦).

یہ شرطیں عقد کے لئے مفسد ہیں، کیونکہ ان کا حاصل نتیجہ سود نکلتا ہے،[1] مسلمان کو ایسے شخص کی شراکت داری سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے شرکت کے حلت و حرمت میں شکوک پیدا ہو جائے، ہاں البتہ اگروہ شریک اس بات کو قبول کرے کہ میں شریعت کے خلاف کوئی تصرف نہیں کروں گا، تو پھر ان کے ساتھ شرکت کرنے کی اجازت ہو گی۔

شرکتِ مفاوضہ کا بیان

شرکت مفاوضہ وہ شرکت ہے جس میں دونوں شریک مال، قرض اور حقوق تجارت تمام چیزوں میں مساوی، باہم ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوں۔[2]

شرکتِ عنان

ایک مخصوص تجارت میں دونوں کی شرکت ہو، مال اور حقوق میں برابری شرط نہ ہو اور مکمل وکالت و کفالت بھی نہ ہو۔

مسئلہ: ہر شریک دوسرے کا وکیل، کفیل اور امین ہوں گے لیکن صرف مشترکہ کام کی حد تک۔[3]

مسئلہ: نفع طے شدہ شرط کے مطابق ملے گا، سرمایہ کم ہو یا زیادہ۔[4]

---

[1] (وشرطها) أي شركة العقد..عدم ما يقطعها كشرط دراهم مسماة من الربح لأحدهما) لأنه قد لا يربح غير المسمى(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الشركة،مطلب شركة العقد ،ج٤ ص ٣٠٥).
وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الشركة،ج١ ص ٧١٦).

[2] وأما شركة المفاوضة فشرط صحتها أن تكون في جميع التجارات ولا يختص أحدهما بتجارة دون شريكه وأن يكون ما يلزم أحدهما من حقوق ما يتجران فيه لازما للآخر وما يجب لكل واحد منهما يجب للآخر ويكون كل واحد منهما فيما وجب لصاحبه بمنزلة الوكيل وفيما وجب عليه بمنزلة الكفيل عنه ويتساويان مع ذلك في رؤوس الأموال في قدرها وقيمتها ويتساويان في الربح(تحفة الفقهاء ،كتاب الشركة،ج٣ ص ٩).
وكذا في الهداية (كتاب الشركة،ج٣ص ٥).

[3] صورة هذه الشركة أن يشترك اثنان في نوع خاص من التجارات نحو البر والطعام أو يشتركان في عموم التجارة وموجب هذه الشركة ثبوت الوكالة لكل واحد منهما من صاحبه فيما يبيع ويشتري..و لا يكون في شركة العنان كل واحد منهما كفيلا عن صاحبه إذا لم يذكر الكفالة بخلاف المفاوضة(فتاوى قاضيخان، كتاب الشركة،فصل في شركة العنان، ج ٣ ص ٣٨٧).

[4] اشتركا فجاء أحدهما بألف والآخر بألفين على أن الربح والوضيعة نصفان فالعقد جائز والشرط في حق الوضيعة باطل، فإن عملا وربحا فالربح على ما شرطا، وإن خسرا فالخسران على قدر رأس مالهما. (الفتاوى الهندية، كتاب الشركة، الباب الثالث، الفصل الثاني في شرط الربح والوضيعة وهلاك المال،ج٢ ص ٣٢٠).

مسئلہ : نقصان ہمیشہ سرمایہ کے مطابق ہوگا اگرچہ شرح نفع مال کی مقدار سے زیادہ مقرر کرے۔[1]

مسئلہ : کسی شریک کو حق نہیں کہ جس مال میں شرکت کی، اس میں کوئی ذاتی معاملہ کرے یا کسی اور کا اس میں وکیل ہو۔[2]

مسئلہ : زید اور عمر مل کر مشترکہ طور پر کپڑے کی تجارت کرتے ہیں، تو ذاتی ضرورت کے علاوہ زید کو کپڑے کے خرید و فروخت کا حق نہ ہوگا یہ حق بھی ہوگا کہ کپڑے خریدنے یا فروخت کرنے میں کسی کا وکیل بنے، مگر جب زید کی اس شرکت کے علاوہ اور دکانیں بھی ہوں یا عمر کے علاوہ دوسروں کے ساتھ بھی شرکت ہو تو پھر زید کے ہر معاملہ قرینہ اور مقام لے لحاظ سے ہوگا، جس شریک کے دکان پر جو کام کرے گا وہ اسی دکان کی طرف منسوب ہوگا، اگر کوئی قرینہ معینہ نہ ملے تو یہ معاملہ اس کے ذات کے لئے خاص ہوگا، نفع یا نقصان۔

مسئلہ : جو معاملہ کسی خاص دکان کے نام سے کیا وہ اسی دکان سے متعلق ہے۔[3]

شرکتِ مضاربت کا بیان

مضاربت یہ ہے کہ ایک کا مال ہو اور دوسری کی طرف سے محنت، مضاربت میں مندرجہ ذیل باتیں لازم ہیں:

ا۔ مال مضارب کے حوالہ کرنا شرط ہے اور اس کو مکمل تصرف کی اجازت بھی ہو، البتہ رب المال نگرانی کر سکتا ہے اور مضارب کی اجازت سے کچھ کام بھی کر سکتا ہے۔[4]

(وإذا تساويا في المال وشرطا التفاوت في الربح والوضيعة، فالربح على ما شرطا والوضيعة على قدر المالين) قال صلى الله عليه وسلم الربح على ما شرطا والوضيعة على قدر المالين من غير فصل.(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الشركة، ج٣ ص ١٦).

[1] مرّ تخريجه وانظر الحاشية المتقدمة ايضا.

[2](ولو وكله بشراء شيء بعينه) بخلاف الوكيل بالنكاح إذا تزوجها لنفسه صح منية، والفرق في الواني (غير الموكل لا يشتريه لنفسه) ولا لموكل آخر بالأولى (عند غيبته حيث لم يكن مخالفا دفعا للغرر) (الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، ج٥ ص ٥١٧).

وكذا في الهداية في شرح بداية المبتدي (كتاب الوكالة، فصل في الشراء، ج٣ ص ١٤١).

[3] إنْ تعاقدا ذلك فلا إشكال فيه لأنّ الشركةَ تقبل التخصيصَ والتقييدَ.

[4] (ومنها) تسليم رأس المال إلى المضارب؛ لأنه أمانة فلا يصح إلا بالتسليم، وهو التخلية كالوديعة، ولا يصح مع بقاء يد الدافع على المال؛ لعدم التسليم مع بقاء يده، حتى لو شرط بقاء يد المالك على المال فسدت المضاربة، (بدائع الصنائع ،كتاب المضاربة، شرائط المضاربة، ج٦ ص ٨٤).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب المضاربة، ج٥ص٦٤٨).

۲۔ تمام باتوں کی صراحت ہونا ضروری ہے، کس چیز کی تجارت ہو گی؟ اور اس کی نوعیت کیا ہو گی؟ اور معاملہ آپس میں کیسا رہے گا یعنی نفع کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی؟[1]

۳۔ مضارب کو مکمل اختیار دیدینا بھی جائز ہے کہ جس مال کی چاہو جس شہر میں چاہو تجارت کرو۔[2]

۴۔ اگر کسی عقد کے وقت کسی بات کی صراحت نہ ہو تو تاجروں کے عرف پر عمل کرنا ہو گا۔[3]

۵۔ نفع کی مقدار بوقت عقد جو طے ہو جائے۔[4]

۶۔ اگر کچھ نقصان ہو جائے وہ مضارب کے ذمہ نہ ہو گا۔[5]

۷۔ جب تک حساب نہ ہو جائے یا مضاربت کا معاملہ ختم نہ ہو جائے، مضارب نفع کا مالک نہ ہو گا، لہٰذا اگر

---

[1] تقسیم نفع کے علاوہ دیگر امور کو صفائی معاملات اور لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لئے پہلے سے طے کرنا انتظامی طور پر تو ضروری ہے لیکن اگر کہیں عقد کے وقت ان امور کی تفصیلات بیان نہ کی جائیں تو بھی اس کی وجہ سے معاملہ فاسد ہو گا نہ ہی عاقدین گناہگار ہوں گے، اس کو فقہاء کرام "مضاربت مطلقہ" سے تعبیر فرماتے ہیں جس میں مضارب کو ہر قسم کاروبار کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

(الشرط) الخامس أن يكون نصيب كل منهما معلوما فكل شرط يؤدي إلى جهالة الربح فهي فاسدة وما لا فلا مثل أن يشترط أن تكون الوضيعة على المضارب أو عليها فهي صحيحة وهو باطل(البحر الرائق ،كتاب المضاربة، ج٧ ص ٢٦٤).

(وكون نصيب كل منهما معلوما) عند العقد. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب المضاربة، ج٥ص٦٤٨).

[2] المادة (١٤٠٦) المضاربة قسمان: أحدهما مضاربة مطلقة , والآخر مضاربة مقيدة. المادة (١٤٠٧) المضاربة المطلقة هي التي لم تتقيد بزمان أو مكان أو بنوع تجارة أو بتعيين بائع أو مشتر , وإذا تقيدت بأحد هذه فتكون مضاربة مقيدة. مثلا إذا قال: اعمل في الوقت الفلاني(مجلة الأحكام العدلية، كتاب الشركات، الباب التاسع، الفصل الاول، ص٢٧١).

وكذا في تحفة الفقهاء (كتاب المضاربة، ج٣ ص ٢٢).

[3] مضارب کو مال مضاربت کے متعلق کن کن تصرفات کا اختیار حاصل ہے؟ یہ اور اس قسم کے بعض دیگر مسائل کو حضرات فقہاء کرام نے تجار کے عرف ورواج پر موقوف رکھا، چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

وللمضارب أن يعمل ما هو من عادات التجارة وهو الاتضاع والإيداع واستئجار الأجراء لحفظ المال واستئجار الدواب للحمل واستئجار المكان والسفر (فتاوى قاضيخان ،كتاب المضاربة،فصل فيما يجوز للضارب على المضاربة وما ل يجوز، ج٣ ص ٨١).

وكذا في مجلة الأحكام العدلية (الباب السابع، الفصل الثالث، رقم المادة (١٤١٤)ص ٢٧٣)

[4] مرّ مِرارا.

[5] (وما هلك من مال المضاربة فمن الربح) ; لأنه تبع كالعفو في باب الزكاة (فإن زاد فمن رأس المال) ; لأن المضارب أمين فلا ضمان عليه (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب المضاربة، ج٣ ص ٢٤).

وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب المضاربة، باب المضاربة بلا اذن، ج٢ ص ٣١٦).

ایک چیز میں سو روپے کا فائدہ ہوا دوسری میں دو سو کا نقصان ہوا، تو اگر پہلی کا حساب ہو چکا تھا [1] تو دوسری کا نقصان پورا رب المال کے ذمہ ہو گا، اگر ابھی تک حساب نہیں ہوا تھا تو سو کا جو نفع ہوا تھا، اس کو منہا کر کے باقی سو روپے کا نقصان رب المال کے ذمہ ہو گا۔ [2]

۸۔ مضارب جب مال مضاربت پر قبضہ کرے تو اس کے بارے میں وہ امین ہو گا، تصرف میں وکیل ہو گا، نفع ہو تو اس میں شریک ہو گا، اور نقصان ہو تو بری ہو گا۔ اگر مضاربت فاسد ہو جائے تو اجیر (مزدوری کا مستحق) ہو گا، اگر شرط یا عرف کے خلاف کام کرے تو ضامن ہو گا۔ [3]

۹۔ تجارت کے سلسلہ میں وہ سفر جس میں رات گھر نہ لوٹ سکے، اس کا خرچہ تجارت کے ذمہ ہو گا یعنی کھانا پینا اور کرایہ وغیرہ تجارت سے نکالا جائے گا۔ [4]

۱۰۔ مزدوروں اور ملازموں کا خرچہ بھی تجارت کے ذمہ ہو گا، مگر جو کام مضارب اپنے ہاتھ سے انجام دے سکے اس کی کوئی اجرت نہیں۔ [5]

---

[1] یعنی حساب وکتاب کر کے پہلے معاملہ کو بے باک کر دیا، اس کے بعد از سرِ نو دوسرا عقد کیا۔

[2] ومنها أن قسمة الربح قبل قبض رأس المال لا تصح حتى أنهما لو اقتسما الربح ورأس المال في يد المضارب فهلك فما أخذ رب المال من الربح يكون محسوبا من رأس المال ويرجع على المضارب فيما قبضه حتى يتم رأس المال فإن فضل فهو ربح بينهما (تحفة الفقهاء ،كتاب المضاربة، الاحكام، ج٣ ص ٢٤).

فإن اقتسما الربح والمضاربة بحالها ثم هلك المال أو بعضه رجع في الربح حتى يستوفي رأس المال ; لأن الربح فضل على رأس المال، ولا يعرف الفضل إلا بعد سلامة رأس المال فلا يصح قسمته فينصرف الهلاك إليه لما بينا، ويبتدأ أولا برأس المال ثم بالنفقة ثم بالربح الأهم فالأهم، ولو فسخا المضاربة ثم اقتسما الربح ثم عقدا المضاربة فهلك رأس المال لم يترادا الربح ; لأن هذه المضاربة جديدة، والأولى قد انتهت فانتهى حكمها (الاختيار لتعليل المختار ،قبيل كتاب الوديعة، ج٣ ص ٢٤).

[3] والمضارب أمين، فإذا تصرف فوكيل فإن ربح فشريك، وإن خالف فغاصب، وإن شرط كل الربح له فمستقرض، وإن شرط لرب المال فمستبضع، وإن فسدت فأجير فله أجر مثله ربح أو لم يربح(ملتقى الأبحر مع مجمع الانهر، كتاب المضاربة، ج٢ص ٣٢١).وكذا في تبيين الحقائق (كتاب المضاربة، ج٥ ص ٥٣).

[4] ومنها أن المضارب ليس له أن ينفق من مال المضاربة ما دام في مصره وإذا سافر أنفق من مال المضاربة لنفقته وكسوته ومركوبه وعلف دوابه ونفقة أجيره ومؤونته وما لا بد في السفر منه عادة إلا مؤونة الحجامة والخضاب والنورة فهو من ماله(تحفة الفقهاء ،كتاب المضاربة، الاحكام، ج٣ ص ٢٣).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب المضاربة، الباب الثاني عشر في نفقة المضارب، ج٤ص ٣١٢).

[5] انظر الحاشية المتقدمة.

۱۱۔ رب المال کو کسی مال کے خرید وفروخت کی اجازت ہو گی، نہ ہی کسی معاملہ کا اختیار ہو گا، ہاں مضارب کے مشورے سے کوئی کام کر سکتا ہے۔

۱۲۔ مضاربت فاسدہ میں مضارب کو اجرت مثل ملے گی۔[1]

۱۳۔ مضاربت فاسدہ وہ مضاربت ہے جس میں ایسی شرطیں ہوں جو اصول تجارت کے خلاف ہے یا جن سے نزاع پیدا ہونے کا احتمال ہے۔[2]

شرکت صنائع کے احکام

ایک پیشہ کے کئی کاریگر مل کر اکھٹا کام کریں جیسے کئی درزی یا کئی بڑھی یا کئی رنگ کرنے والے یا اس طرح اور پیشہ والے مل جل کر کام کریں اس پر یہ امور ضروری ہے:

۱۔ ضمان تاوان اور مصارف کا برداشت کرنا شرط کے مطابق ہو گا۔[3]

۲۔ منافع ضمان اور مصارف کی مقدار کے مطابق ہو گا کام کے اندازے پر نہیں، اگر نقصان کا ضمان برابر ہے تو نفع بھی برابر تقسیم ہو گا اگرچہ کام میں کمی زیادتی ہو۔[4]

---

[1] لما انه اجير حين فسد المضاربة كما تقدم انفا عن الملتقى والتبيين.

[2] المادة (١٤١٢) إذا فقد شرط من الشروط المذكورة آنفا بأن لم تعين مثلا حصة العاقدين جزءا شائعا بل قطعت وعينت على أن يعطي أحدهما كذا درهما من الربح تفسد المضاربة. (مجلة الأحكام العدلية ،الشركات، الباب التاسع، الفصل الثاني،ص ٢٧٣).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب المضاربة، ج٢ص ٣٢٣).

[3] ولو شرطا لأحدهما فضلا فيما يحصل من الأجرة جاز إذا كانا شرطا التفاضل في ضمان ما يتقبلان به.(فتاوى قاضيخان ، كتاب الشركة، فصل في شركة الأعمال، ج٣ص ٣٩٤.

ولو شرطا لأحدهما فضلا فيما يحصل من الأجرة جاز إذا كانا شرطا التفاضل في ضمان ما يتقبلانه. (مجمع الضمانات ، مسائل الشركة، الفصل الرابع،ص:٣٠٢).

[4] إذا عمل أحدهما دون الآخر كانت الأجرة بينهما على ما شرطا أما استحقاق العامل فظاهر وأما الآخر فلأنه لزمه العمل بالتقبل فيكون ضامنا له فيستحقه بالضمان وهو لزوم العمل ولو شرطا العمل نصفين والمال أثلاثا جاز.(تبيين الحقائق ،كتاب الشركة، ج٣ص ٣٢١).

وكذلك إذا شرطا لأحدهما زيادة أجر أو شرطا العمل على قدر الأجر والوضيعة كذلك فهو جائز وإن كان عمل الذي شرط له الأجر القليل أكثر لأن الربح بقدر ضمان العمل لا بحقيقة العمل. (تحفة الفقهاء، كتاب الشركة، ج٣ ص ١٣).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الشركة، ج٥ص١٩٧).

۳۔جو شخص کام نہ کرے یا کام نہ کر سکے اس کو فارغ کر دیا جائے گا اس کو شریک رکھ کر نفع کم دینا جائز نہیں۔[1]

۴۔اگر یہ طے پائے کہ ہر شخص کو اپنے کام کی مقدار میں ہی نفع ملے گا یا نفع کے متعلق کچھ فیصلہ نہ ہوا دونوں صورتوں میں شرکت قائم نہ رہے گی۔

۵۔ہر شریک دوسرے کا وکیل ہے چاہے کوئی دوسرا ان سے تقاضہ کرے یا یہ خود کسی دوسرے سے حق کا مطالبہ کرے۔[2]

۶۔یہ بھی جائز ہے کہ مختلف پیشہ وروں کی جماعت باہم شرکت کرکے کام کریں مثلاً ایک بڑھی ہے ایک رنگریز ہے ایک ریگ مال لگانے والا ہے سب مل کر ایک کام کریں۔[3]

---

[1] شرکت کا اصل مفہوم یہی ہے کہ دونوں شریک مل کر مطلوبہ کام کریں، لیکن ایسا کرنا فقہائے احناف کے نزدیک ضروری نہیں، بلکہ شرکت کے عقد کرتے وقت اگر دونوں فریق گاہک سے آرڈر لینے اور مطلوبہ کام کرنے کا عہد والتزام کریں تو یہ کافی ہے عملی طور پر ہر فریق کا کام کرنا کوئی ضروری نہیں لہٰذا اگر ایک شریک سفر، بیماری وغیرہ کی وجہ سے شرکت کا متعلقہ کام نہ بھی کر سکے تو بھی شرکت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور حاصل ہونے والا نفع طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا اور عمل بالکل نہ کرنے والے یا کم عمل کرنے والے شریک کے لئے نفع کم مقرر کرنا بھی درست ہے، اس لئے حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی یہ بات بظاہر اس پر محمول ہے کہ عمل نہ کرنے یا نہ کر سکنے کی وجہ سے نفع کے مقرر کردہ تناسب سے کم نفع دیا جائے جبکہ اس پر دونوں فریق متفق نہ ہوں۔

(والشريكان في العمل إذا غاب أحدهما، أو مرض، أو لم يعمل، وعمل الآخر: فالربح بينهما على ما اشترطا)... والمعنى أن استحقاق الأجر بتقبل العمل دون مباشرته والتقبل كان منهما، وإن باشر العمل أحدهما. (المبسوط للسرخسي ،كتاب الشركة، ج١١ص١٥٧).

ويستوي أن تكون الشركة في نوع عمل فيعملان ذلك أو يعمل أحدهما عملا والآخر غير ذلك أو لم يعمل بعد أن ضمنا جميعا العملين جميعا لأن الإنسان قد يعمل بنفسه وأجيره

فإن عمل أحدهما دون الآخر والشركة عنان أو مفاوضة فالأجر بينهما إن شرطا العمل عليهما والتزما ذلك فيكون أحدهما معينا للآخر كالقصار إذا استعان برجل في القصارة. (تحفة الفقهاء،كتاب الشركة، ج٣ص ١٢).

قلت: وبه علم أن الشرط عدم نفي التقبل عن أحدهما لا التنصيص على تقبل كل منهما، ولا على عملهما.(حاشية ابن عابدين على الدر المختار ،كتاب الشركة، ج٤ص٣٢٢).

[2] وحكم هذه الشركة أن يصير كل واحد منهما وكيلا عن صاحبه بتقبل العمل والتوكيل بتقبل العمل جائز. (فتاوى قاضيخان ، كتاب الشركة، فصل في شركة الأعمال، ج٣ص ٣٩٤.

[3] ولا يشترط فيه اتحاد جنس العمل وإليه أشار في الكتاب بقوله أو خياط وصباغ. (تبيين الحقائق ،كتاب الشركة، ج٣ص٣٢١).

شرکت وجوہ کے احکام

یعنی چند افراد ایسے ہیں کہ ان کے پاس ذاتی سرمایہ نہیں وہ مشترکہ طور پر قرض لے کر مشترکہ کاروبار کریں۔

۱۔ نفع آپس میں بقدر ضمان تقسیم کریں گے۔[1]

۲۔ ضمان سے کم یا زیادہ نفع متعین کرنا جائز نہیں ہے۔[2]

۳۔ ہر شریک دوسرے کا وکیل ہے لینا ہو یا دینا ہو۔[3]

شراکتی جماعت یعنی کمپنی کے احکام

یعنی ایک جماعت کسی قانونی نظام کی ماتحتی میں کام کریں ہر شریک اپنے کو مالکانہ حیثیت سے علیحدہ تصور کریں اس میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ شرکاء کے مشورہ سے ایک فرد یا کئی افراد کو اس کمپنی کا منیجر مقرر کرنا جائز ہے تاکہ وہ شرکاء یا اجنبیوں سے کمپنی کے قوانین پر عمل کرائے۔

۲۔ ہر شریک کو حق ملک تو حاصل ہو گا لیکن تنہا تصرف کرنے کا حق نہ ہو گا۔[4]

(قوله: فالخياطان والصباغان يشتركان على أن يتقبلا الأعمال ويكون الكسب بينهما فيجوز ذلك) وسواء اتفقت أعمالهم، أو اختلفت فالشركة جائزة كالخياطين، والإسكافين، أو أحدهما خياط، والآخر إسكاف، أو صباغ. (الجوهرة النيرة ،كتاب الشركة، ج١ص٢٨٩).

[1] واستحقاق الربح في شركة الوجوه بالضمان على ما بيناه والضمان على قدر الملك في المشترى. (البحر الرائق ،كتاب الشركة، قبيل الشركة الفاسدة، ج٥ ص ١٩٧).

ثم كيفما شرطا وقوع الملك في المشترى بينهما إما نصفان أو كان لأحدهما أكثر فهو جائز ويقع الملك بينهما كذلك ويكون الربح على قدر ملكهما ولا يجوز أن يفضل أحدهما على ربح حصته شيئا لأن الربح يستحق في هذه الشركة بالضمان لا بالمال والعمل والضمان على قدر الحصة. (تحفة الفقهاء، كتاب الشركة، ج٣ص١١).

[2] واستحقاق الربح في شركة الوجوه بالضمان على ما بينا والضمان على قدر الملك في المشترى وكان الربح الزائد عليه ربح ما لم يضمن فلا يصح اشتراطه. (الهداية ،كتاب الشركة، ج٣ص ١٣).

إذ لو شرط زيادة الربح فإنه يشترط من غير عمل ومال وضمان وهذا لا يجوز. (تحفة الفقهاء، كتاب الشركة، ج٣ص١١).

[3] "وكل واحد منهما وكيل الآخر فيما يشتريه" لأن التصرف على الغير لا يجوز إلا بوكالة أو بولاية ولا ولاية فتتعين الوكالة "(الهداية ،كتاب الشركة، ج٣ص ١٢).

(وتتضمن) هذه الشركة عند الإطلاق (الوكالة) فقط (فيما يشتريانه) إذ لا يتمكن عليه إلا بالوكالة. (مجمع الأنهر ،كتاب الشركة، ج١ص٧٢٧).

[4] لأنّه أسقط حقّه في التصرّف بتقرير رجل منتظما.

۳۔تمام شرکاء مجموعی طور پر مالک اور متصرف ہیں چاہے ہیئت اجتماعی اتفاقی طور پر حاصل ہو یا کثریت کی رائے سے ہو۔

۴۔ایسی جماعت کے شرکاء کمپنی کے مزدور اور ملازم بن سکتے ہیں۔[1]

۵۔کوئی شریک اپنا حصہ لے کر علیحدہ نہیں ہو سکتا ہاں البتہ حصہ کسی کو ہبہ یا فروخت کر سکتا ہے۔[2]

۶۔اگر شرکاء کی تعداد محدود ہو یا مکمل ہو جائے اس کے بعد کوئی شریک اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو شرکاء شفیع کی طرح مقدم ہونگے (یعنی مشترک چیز میں سے کوئی اپنا حصہ کسی اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے تو اس کے لیے جائز ہے۔تاہم وہ اجنبی دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر عقد شرکت میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ جو علت حق شفعہ میں ہے،اس سے زیادہ یہاں ہے لہذا محدود شرکت میں شریک کو اپنا حصہ شرکاء ہی کے ہاتھ فروخت کرنا ہوگا)۔[3]

---

[1] ومن استأجر رجلا لحمل طعام مشترك بينهما لا يجب الأجر لأن ما من جزء يحمله إلا وهو عامل لنفسه فيه فلا يتحقق تسليم المعقود عليه.(الهداية ،كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة،ج٣ ص٢٤٠).

(ولو) استأجره (لحمل طعام) مشترك (بينهما فلا أجر له) ؛ لأنه لا يعمل شيئا لشريكه إلا ويقع بعضه لنفسه فلا يستحق الأجر. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة،ج٦ ص٦٠).

فقہائے حنفیہ کے نزدیک اجارہ اور شرکت جمع نہیں ہو سکتے جیسا کہ ان حوالہ جات میں ذکر ہے اس لئے خود کمپنی کے شرکاء میں سے کوئی اس کا مزدور و ملازم نہیں بن سکتا،تاہم بعض اہل علم نے عرف خاص کی وجہ سے اس کی گنجائش دی ہیں جس کی تفصیل احسن الفتاویٰ ج ۷ ص ۳۲۱ پر درج ہے،احتیاط اسی میں ہے کہ خود شریک کو اجیر نہ رکھا جائے اور جہاں اس کو اپنی خدمات وغیرہ کے بدلے کچھ معاوضہ دینا مقصود ہو تو بہتر یہ ہے کہ نفع میں اس کا تناسب بڑھایا جائے۔

[2] وإن وقتا لذلك وقتا بأن قال ما اشتريت اليوم فهو بيننا صح التوقيت فما اشتراه اليوم يكون بينهما وما اشتراه بعد اليوم يكون للمشتري خاصة.وكذا لو وقت المضاربة صح التوقيت لأن المضاربة والشركة توكيل والوكالة مما يتوقت. (فتاوى قاضيخان ،كتاب الشركة،ج٣ص٣٨٧).وإن وقتا، هل يتوقت بالوقت المذكور، روى بشر عن أبي يوسف عن أبي حنيفة رحمهما الله تعالى أنه يتوقت والطحاوي ضعف هذه الرواية وصححها غيره من المشايخ وهو الصحيح. (الفتاوى الهندية ،كتاب الشركة، الفصل الثاني في الألفاظ الّتي تصح الشركة بها والّتي لا تصح،ج٢ص ٣٠٢).

[3] اگر کہیں معلوم ہو جائے کہ شرکاء کمپنی کے سائے تلے کسی زمین کے مالک بنے ہیں اور کوئی ایک شریک اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو دیگر شرکاء کے لئے شفعہ ممکن ہے، لیکن ایسی صورت کے علاوہ اگر کوئی شریک اپنا حصہ (شئیرز) بیچنا چاہے تو دوسرے شریک کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ شفعہ خود خلاف قیاس ثابت ہے جو اپنے مورد پر منحصر رہتا ہے اس کو متعدی کرنا درست نہیں۔

إن الشفعة عندنا تختص بمعاوضة مال بمال لأنها ثبتت بخلاف القياس بالآثار في معاوضة مال بمال فيقتصر عليها. (فتح القدير ،كتاب الشفعة،باب ما تجب فيه الشفعة وما لا تجب،ج٩ص ٤٠٥).

۷۔ کمپنی کا کوئی ایک حصہ میراث یا مبیع وغیرہ کی وجہ سے کئی ٹکڑے بن جائیں تو شرکاء جماعت کمپنی کو مزید زحمت برداشت کرنا ہوگا خواہ سب شرکاء دستاویزات دے دیں یا ایک کو وکیل بنادیں ان کا مجموعہ ایک ذات شمار ہوگا۔

۸۔ مقررہ قانون کی پابندی سے کوئی آزاد نہیں ہوسکتا البتہ خلاف شرع قانون سازی کرنا گناہ ہے اور ایسی قوانین کی پابندی ناجائز ہے۔[1]

۹۔ جو قوانین صرف انتظامی بنیاد پر وضع کیے گئے ہوں اور مباحات سے متعلق ہوں اور شرعی قوانین سے متصادم نہ ہو ان پر عمل کرنا جائز ہے۔[2]

۱۰۔ اگر کمپنی کی طرف سے اعلان ہو کہ شرکاء ذاتی طور پر کمپنی کے قرض یا نقصان کے ذمہ دار نہیں تو یہ شرط معتبر ہے۔ جیسے عبد مأذون کے نقصان قرض کا ذمہ دار آقا ہوتا ہے ایسا ہی اس کا ذمہ دار مشترکہ سرمایہ ہی رہے گا۔[3]

شرکت ختم کرنے کی صورتیں

اول: دونوں فریق شرکت ختم کرنے پر راضی ہیں کام ختم ہو جانے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے۔[1]

لأنه حق ضعيف متزلزل لثبوته على خلاف القياس؛ إذ الأخذ بالشفعة تملك مال معصوم بغير إذن مالكه؛ لخوف ضرر يحتمل الوجود والعدم فلا يستقر إلا بالطلب على المواثبة. (بدائع الصنائع ،كتاب الشفعة، ما يتأكّد به الشفعة، ج٥ص ١٧).

[1] طاعة الإمام لازمة كذا طاعته؛ لأنها طاعة الإمام، إلا أن يأمرهم بمعصية فلا تجوز طاعتهم إياه فيها؛ لقوله عليه الصلاة والسلام لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.(بدائع الصنائع ، كتاب السّير، ما يجب على الغزاة، ج٧ص ٩٩).

إن طاعة الإمام في غير معصية واجبة فلو أمر بصوم وجب. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب القضاء،مطلب طاعة الإمام واجبة، ج٥ص ٤٢٢).

یہ تخریج اس تقدیر پر کی گئی کہ "قانون" سے ملکی قانون مراد ہے، اگر اس سے خود کمپنی کا قانون مراد ہے تو پھر اس کی پاسداری ضروری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شئیرز خریدنے میں کمپنی کے ساتھ معاہدہ ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت خطیر مالی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے ان جیسے معاہدات کی پاسداری ضروری ہونی چاہئے۔

[2] أيضا.

[3] عصرِ حاضر میں اکثر کمپنیاں اسی نظریہ کے تحت وجود میں آتی اور کام کرتی ہیں، جو کمپنی ایسی اعلان کرے اس کو لمیٹڈ کمپنی کہا جاتا ہے، اس کے شرعی حکم کے متعلق اہلِ علم کا اختلاف ہے، بعض اہلِ علم عبدِ ماذون، بیت المال وغیرہ مختلف فقہی نظاہر پر قیاس کرتے ہوئے اس کی اجازت دیتے ہیں، جبکہ بعض اہلِ علم کے نزدیک چونکہ میں اس میں شرکاء کے حقوق ودیون کا ضیاع ہو جاتا ہے اس لئے وہ اس کو جائز نہیں سمجھتے، حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے نزدیک پہلی بات راجح ہے اور معاصر اکثر علماء عرب کا بھی یہی موقف ہے جبکہ حضرت مولانا تھانوی صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب وغیرہ (رحمہم اللہ) کے نزدیک دوسرا قول راجح ہے، ملاحظہ فرمائیں: امداد الاحکام، ج۳ ص ۴۵۲۔

دوم : ایک فریق علیحدگی چاہے موت کی وجہ سے یا جنون کی وجہ سے یا حکومت کی طرف سے پابندی کی وجہ سے یا کسی مطالبہ میں مال دینا پڑا جس کی وجہ سے سرمایہ قائم نہیں رہ سکتا یا علیحدگی کی کوئی اور معقول وجہ سامنے پیش آئی ان تمام صورتوں میں مال تقسیم ہو جائے گا شرکت ختم ہو جائے گی اگرچہ میت کے ورثاء یا مجنون کا اولیاء شرکت کو باقی رکھنا چاہیں تب بھی وہ شرکت توڑنے والوں کے حکم میں ہیں۔ [2]

شرکت ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا جائے گا۔

۱۔ تمام قرضے ادا کر دیے جائیں گے۔

۲۔ ان معاہدوں کی بھی تکمیل کا انتظام ہو جو شراکت کے ذمے تھے۔ [3]

۳۔ وہ تمام حقوق جو اصل (۱۰) میں مذکور ہوئے ہیں وہ حقوق بھی قیمتی مال کی طرح تقسیم ہونگے۔

۴۔ اور جو قرضے دوسروں کے ذمے ہیں وہ جتنا جتنا وصول ہو جائے وہ حصہ نفع کے مطابق دونوں کو ملیں گے اور ہر شریک کو دوسرے کا وکیل سمجھا جائے گا تاکہ مقروض سے طلب کرتا ہے اور وصول کرتا رہے۔

۵۔ شرکت ختم کرنے کی قسم دوم میں مندرجہ ذیل باتوں کی رعایت لازم ہے۔

۱۔ شرکت کو ختم کرنے والا یا اس کا قائم مقام ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکے گا۔

مسئلہ : کمپنی کے سرمایہ میں دس ہزار نقد ہے اور ہزار من گندم جن کی قیمت ایک لاکھ ہے اور دس ہزار سے دوسرے مال موجود ہیں اور ایک لاکھ روپے لوگوں کے قرض ہیں اب کل دولاکھ بیس ہزار کا سرمایہ ہوا مگر زید سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگر ہزار من تیل لوگے تو بارہ سو میں دیا جائے گا پھر پانچ سو من لیا گیا اور پانچ سو من کی نسبت یہ طے ہوا کہ دوماہ بعد روپیہ دے کر لیا جائے گا اور عمرو سے معاہدہ ہوا تھا کہ چھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار من گندم اور ہزار من جو اس قیمت پر دیا جائے گا اب اگر کل مال تقسیم ہو جائے تو جو فریق کاروبار پر قائم ہے اس کے لیے آدھی رقم پر بقیہ مال حاصل کرنا مشکل ہے کیونکہ ان کے پاس آدھی رقم موجود ہے، اب تقسیم کی صورت میں جو اور گندم عمرو کے حوالہ کرنا مشکل ہے حالانکہ یہ دونوں ذمہ داریاں

---

[1] لأنّهما من العقود الغير اللّازمة فلهما أن يرفعا العقد متى شاءا أو أحدهما.

[2] كذا في الفتاوى الهندية (كتاب الشركة، الباب الخامس في الشركة الفاسدة، ج٢ص ٣٣٥). وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، ج١ص٧٢٨).

[3] قال النبي صلى الله عليه وسلم: «المسلمون عند شروطهم.(صحيح البخاري ،كتاب الإجارات، باب أجر السمسرة).

فریقین کی رضامندی سے مال مشترک پر عائد ہوتی تھیں۔

لہذا صرف وہ مال تقسیم ہوگا جو اس معاہدہ سے باہر ہے بقیہ مال کے بارے میں جو فریق شرکت پر قائم ہے ان سے ایک مناسب وعدہ لیا جائے گا کہ اس مدت میں اس معاہدہ سے سبکدوش [1] اور کوئی نفع ونقصان علیحدہ ہونے والے
سے متعلق نہ ہوگا۔

مسئلہ : اگر بعض معاہدہ ایسے ہیں جن کو کاروبار پر قائم رہنے والا فریق خسارہ کا موجب جانتا ہے یا ان کی تکمیل کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا تو قائم رہنے والا فریق اصالۃً یا وکالۃً ان کے اختتام تک بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

دوم کاروبار کے تمام حقوق معتبرہ جیسے دکان کے نام وغیرہ میں علیحدہ ہونے والے کو کوئی حق نہیں دیا جائے گا۔

مضارب کے فسخ میں حسب ذیل مراعات ہوں گی۔

۱۔ تمام ذمہ داریاں رب المال کی طرف منتقل ہو جائیں گی۔

۲۔ مضارب قرضوں کی وصولی کے لیے رب المال کو وکیل بنادے یا خود تیار رہے۔ [2]

۳۔ اگر مال موجود ہے تو اس کے فروخت ہونے تک مضاربت کو قائم رکھا جائے گا یا رب المال اسے راضی کرلے۔ [3]

۴۔ اگر تجارت میں نقصان نہ ہوا ہو تو حقوقِ معتبرہ میں مضارب کو بھی حصہ ملے گا، یہ فسخ شرکت جو جنون وغیرہ کی وجہ سے ہے اس کا اثر کمپنی کے افراد پر نہیں پڑ سکتا کیونکہ کسی حصہ دار کی موت جنون افلاس یا پابندی

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں عبارت یہی ہے، البتہ بظاہر عبارت یہ ہونی چاہیے "سبکدوش ہو جائے"۔

[2] وإذا انفسخت المضاربة ومال المضاربة ديون على الناس، وامتنع عن التقاضي والقبض، فإن كان في المال ربح أجبر على التقاضي والقبض، وإن لم يكن فيه ربح لم يجبر عليهما، وقيل له: أحل رب المال بالمال على الغرماء. بدائع الصنائع، كتاب المضاربة قُبيل كتاب الهبة، ج٦ص ١١٤.

وإذا افترقا وفي المال ديون وليس فيه ربح وكل رب المال على اقتضائها، وإن كان فيه ربح أجبر على اقتضائها. الاختيار لتعليل المختار ،قُبيل كتاب الوديعة، ج٣ص ٢٤.

[3] هذا إذا كان المال نقدا فأما إذا كان المال عروضا فإن بيع المضارب جائز حتى يصير نقدا فيؤدي رأس المال ولا ينعزل بالعزل صريحا. تحفة الفقهاء، كتاب المضاربة، ج٣ص٢٥.

وكذا في مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة: ١٤٢٤، ص: ٢٧٥.

سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔[1]

فسخِ شرکت میں مال کی ترتیب

۱۔ قرضوں کی ادائیگی اور معاہدات کی ایفاء کا انتظام پیشِ نظر رہے۔

۲۔ تمام حقوق معتبرہ اور قیمتی اموال کی قیمت لگالی جائے اور اختلاف کی صورت میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا شرعاً جائز ہے۔

۳۔ علیحدہ ہونے والے کو آئندہ کوئی حق نہ دیا جائے اگرچہ وہ ان معاہدات کی ایفاء کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا ہے۔

۴۔ قرضوں کی وصولی میں حسب دستور وکالت رہے گی جتنا قرض وصول ہو جائے اس کو حصہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

۵۔ اور ضرورت پڑنے کی صورت میں باب دیون کے قوانین واصول کے مطابق حوالہ وغیرہ بھی ہو سکتا ہے۔

مزارعت کا بیان

مزارعت کے مسائل کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ لگان: مالک سے یا جس کے قبضے میں زمین ہے اس سے ایک متعین عوض کے مقابلہ میں زمین لینا اس کے احکام اجارات سے متعلق ہیں۔[2]

---

[1] کمپنی کے دیگر افراد کا عقد برقرار رہے گا البتہ موت وجنون کی وجہ سے چونکہ مرنے والے اور مجنون کی شراکت ختم ہوگئی اس لئے ان کے لواحقین کے ساتھ نیا معاملہ کرنا ہوگا کہ ان کے حصہ کی رقم واپس کرے یا کاروبار جاری رکھا جائے۔

(وإذا مات أحد الشريكين أو ارتد ولحق بدار الحرب) وحكم بلحاقه: لأنه بمنزلة الموت (بطلت الشركة) لأنها تتضمن الوكالة، ولابد منها لتحقق الشركة، والوكالة تبطل بالموت وكذا بالالتحاق مرتداً. اللباب في شرح الكتاب ،كتاب الشركة،ج٢ص ١٣٠.(وتبطل الشركة) أي شركة العقد (بموت أحدهما)..(وبجنونه مطبقا). الدر المختار ،كتاب الشركة،فصل في الشركة الفاسدة،ج٤ص ٣٢٧.

[2] هي بيع منفعة معلومة بعوض معلوم دين أو عين.(ملتقى الأبحر ،كتاب الإجارة،ص: ٥١١).

۲۔بٹائی [1]: اور اسی کو ہی مزارعت کہنا چاہیے یعنی زمین سے جو پیداوار حاصل ہو اس کی ایک مقدار زمین دار کے لیے اور دوسری مقدار فصل کرنے والے کے لیے جناب نبی کریم ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ یہی معاملہ فرمایا تھا اس میں زمین محل ہے اور بیل اور ہل چلانے کے اوزار آلات ہیں اور بیج اور آب پاشی پر جو خرچہ آتا ہے وہ مصارف ہے اور عمل سے مراد نظم و نسق جو کچھ کام اپنے ہاتھ سے کرے یا دوسرے سے کرائے وہ عمل کے اندر داخل ہے تو ضروری ہے زمین کا مقابلہ عمل سے کرایا جائے ایک شخص کی زمین ہو دوسرے کا عمل، مصارف شرط کے مطابق یا تو مشترک ہوں گے یا خاص جس پر ڈالا جائے۔ [2]

مسئلہ: یہ صورت مزارعت میں جائز نہیں ہے کہ ایک کی طرف سے صرف بیج ہو باقی تمام چیزیں دوسرے کی ہو اور شرکت ہو جائے یا ایک کی طرف سے صرف بیل یا صرف دوسرے آلات کھیتی باڑی ہو یا صرف مصارف ہو بقیہ دوسرے کی طرف سے ہو اور شرکت قرار پائے یہ جائز نہیں بلکہ زمین ایک کی طرف سے عمل دوسرے کے ذمہ اور مصارف مشترک ہوں یا کسی ایک کے اوپر۔

مسئلہ: مزارع کے لیے جائز ہے کہ خود عمل کرے یا اپنی طرف سے کسی اور کو اس کا ذمہ دار بنائے۔ [3]

مسئلہ: اگر عقد مزارعت فاسد ہو جائے تو پیداوار صاحب زمین کی ہو گی اور عامل کو مصارف کی قیمت اور عمل کی اجرت ملے گی۔ [4]

أما إجارتهما بالدراهم والدنانير في الذمة أو معينة فلا يكون عقد مزارعة بل سمي إجارة. (تحفة الفقهاء ،كتاب المزارعة،ج٣ ص ٢٦٣).

[1] بٹائی: تقسیم۔پیداوار کی وہ تقسیم جو اجارہ دار اور مالک زمین میں قرار پائے۔غلہ تیار ہو کے بٹنے کا موسم۔کھیت کی پیداوار بانٹنے کی اجرت۔رسی بٹنے کی اجرت۔(فیروز اللغات،ص۱۸۰)۔

[2] وكل ما كان من باب النفقة على الزرع من السرقين وقلع الحشاوة ونحو ذلك فعليهما على قدر حقهما. (الفتاوى الهندية ،كتاب المزارعة، الباب الأوّل،ج٥ص ٢٣٧).

[3] إذا لم يُشترط عمله بنفسه بل أذن له صاحبُه صراحة أو دلالة. كذا في الفتاوى الهندية،كتاب المزارعة، الباب الخامس في دفع المزارع إلى غيره مزارعة،ج ٥ص ٢٥٠).

[4] مزارعت فاسدہ میں پیداوار صاحب زمین کی تب ہو گی جبکہ بذر (بیج) بھی اس کی طرف سے ہو، اگر بیج کاشتکار کی طرف سے ہو تو پیداوار بھی اسی کا ہو گا البتہ اس جیسی زمین استعمال کرنے کا کرایہ لازم ہو گا۔

الحكم في كل مزارعة فاسدة أن للعامل أجر مثل عمله إن عمل بنفسه، أو بأجرائه أو بغلمانه، أو بقوم استعان بهم بغير أجر، ويكون الخارج لصاحب البذر.(المبسوط للسرخسي، كتاب المزارعة، ج٢٣ ص ١٦).

۳: شرکت یعنی دو یا کئی آدمی مل کر کسی کی زمین لگان یا بٹائی پر لیں اس میں مضاربت یا شرکت۔

مسئلہ: نفع کا حساب عشر یا خراج کو مجموعہ سے نکالنے کے بعد کیا جائے گا۔[1]

مسئلہ: جب عقد مزارعت مکمل ہو گیا اور کام بھی کچھ شروع ہو گیا تو اب فریقین کی رضامندی کے بغیر کسی ایک فریق کو یک طرفہ ختم کرنے کی اجازت نہ ہو گی، خصوصاً جب کسی ایک کی حق تلفی ہوتی ہو۔[2]

مسئلہ: مالک زمین جو حقوق کاشتکار پر لازم کرے اگر ان میں شروط فاسدہ یا شروط مجہولہ نہ ہوں، تو وہ معتبر ہوں گے اور مجرد تحکم ظلم ہے اور تعامل سے استدلال کرنا کہ اس طرح خلاف شرع شرائط عائد کرنا بھی لوگوں میں تعامل چلا آرہا ہے یہ لغو اور غیر معتبر ہے اور وہ شرائط جو شریعت میں ممنوع ہوں تو جبراً لینا حرام، رضامندی سے رشوت ہے۔[1]

وإذا كان فاسدا لا يستحق البدل المسمى ولكن يجب أجر المثل بمقابلة منفعة الأرض أو منفعة العامل لأنه لم يرض ببذل المنفعة من غير عوض.. ويكون الخارج كله لصاحب البذر لأنه نماء ملكه. (تحفة الفقهاء ،كتاب المزارعة،ج٣ ص ٢٦٥).

(منها) : أن الخارج يكون كله لصاحب البذر سواء كان رب الأرض أو المزارع.(بدائع الصنائع ،كتاب المزارعة ، أحكام المزارعة الفاسدة، ج٦ص ١٨٣).

تكون جميع الحاصلات في المزارعة الفاسدة لصاحب البذر فإذا كان الآخر صاحب الأرض فيأخذ أجرة أرضه وإذا كان الزارع فيأخذ أجر المثل. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة:١٤٣٩،ص ٢٧٧).

[1] *عشر ہر فریق پر اپنے حصہ کے مطابق واجب ہوتا ہے کیونکہ فقہاء حنفیہ نزدیک خود "شرکت" پر زکوۃ لازم نہیں ہوتی بلکہ شرکاء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے بلکہ سوائم کے علاوہ شرکت کی صورتوں میں اکثر اہل علم کا یہی موقف ہے، البتہ اگر باہمی رضامندی سے معاہدہ طے ہو جائے کہ عشر و خراج کو منہا کرنے کے بعد نفع تقسیم کریں گے تو بھی جائز ہے اور کتاب کی عبارت کا یہی محمل ہے، نیز خراج سے مراد خراج مقاسمہ یعنی فیصدی خراج ہے ورنہ خراج موظف یعنی لم سم مقرر کی ہوئی خراج کو منہا کرنے کی شرط بھی مفسد عقد ہے۔*

ولو كانت الأرض عشرية فاشترطا رفع العشر إن كانت الأرض تشرب سحا، أو نصف العشر إن كانت تشرب بدلو والباقي بينهما نصفان فهذا جائز؛ لأن هذا الشرط لا يؤدي إلى قطع الشركة في الخارج. (المبسوط للسرخسي،كتاب المزارعة،باب اشتراط شيء بعينه من الريع لأحدهما، ج٢٣ص ٣٣).

وكذا في الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب المزارعة،ج٦ ص ٢٧٧).

وفي المزارعة على قولهما فالعشر عليهما بالحصة، وعلى قوله على رب الأرض لكن يجب في حصته في عينه، وفي حصة المزارع يكون دينا في ذمته. (البحر الرائق ،كتاب الزكاة، باب العشر، ج٢ص ٢٥٥).

[2] المزارعة لازمة من قبل من لا بذر من جهته حتى لا يملك الفسخ إلا بعذر غير لازمة من قبل من له البذر قبل إلقاء البذر في الأرض حتى يملك الفسخ من غير عذر، وبعد ما ألقى البذر في الأرض تصير لازمة من الجانبين. (حاشية الشلبي على تبيين الحقائق ،كتاب المزارعة، ج٥ص ٢٧٩).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب المزارعة، الباب الأول، ج٥ص ٢٣٧).

مسئلہ : جس تعامل کی بنیاد ظلم پر ہو وہ تعامل حجت نہیں ہو سکتا۔[2]

مسئلہ : زرلگان یعنی زمین کا کرایہ وقت مقررہ پر ادا کرنا واجب ہے کھیت بویا جائے یا نہ جائے پیداوار کم ہو یا زیادہ خام ہو یا پختہ در گزر کرنا کچھ مہلت دینا پر[3] مروت واحسان کی بنیاد پر ہوگا زمیندار پر ایسا کرنا واجب نہیں۔[4]

مسئلہ : بٹائی کا تخمینہ کرکے اس کی قیمت لگا کر روپیہ قائم کرلینا بطورِ صلح کے ہے، یہ حقیقت میں بیع نہیں۔[5]

مسئلہ : بٹائی میں جو تخمینہ کی جائے اس کو تسلیم کرنا لازم نہیں دونوں راضی ہو تو بہتر ہے۔[6]

کرایہ کی زمین کے عشر کا حکم

مسئلہ : جو زمین کسی سے کرایہ پر لی جائے اس میں سے پیداوار حاصل ہو تو اس کا عشر کاشتکار کے ذمے ہے اور خراج زمیندار کے ذمے ہے کیونکہ عشر پیداوار پر ہے وہ کاشتکار کا حق ہے اور خراج زمین پر ہے وہ اسی کی ملک ہے جو لگان کرایہ وصول کرتا ہے۔[1]

---

[1] والأصل فيه أن القيد إن كان مفيدا يثبت؛ لأن الأصل في الشروط اعتبارها ما أمكن، وإذا كان القيد مفيدا كان يمكن الاعتبار فيعتبر؛ لقول النبي عليه أفضل الصلاة والسلام المسلمون عند شروطهم. (بدائع الصنائع ،كتاب المضاربة، حكم المضاربة، ج٦ ص ٩٨).

[2] إنّ التعاملَ بِخلاف النصّ لا يُعتبر (المبسوط للسرخسي، كتاب الإستحسان، ج١٠ ص ١٤٦).

وكذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم (الفن الأول، القاعدة السادسة، ص: ٨٠).

[3] مطبوعہ نسخہ میں عبارت یہی ہے، سیاق وسباق کے لحاظ سے لفظ "پر" بے جوڑ ہے۔

[4] (أمّا حكم الإجارة) فهو ثبوت الملك في المنفعة للمستأجر، وثبوت الملك في الأجرة المسماة للآجر؛ لأنها عقد معاوضة.(بدائع الصنائع ،كتاب الإجارة، حكم الإجارة، ج٤ ص ٢٠١).

يجب بالاستيفاء للمنفعة أو بالتمكن وإن لم يستوف، وفي الهداية وإذا قبض المستأجر الدار فعليه الأجرة وإن لم يسكن.(البحر الرائق ،كتاب الإجارة، ج٨ ص ٦).

[5] "وكل شيء وقع عليه الصلح وهو مستحق بعقد المداينة لم يحمل على المعاوضة، وإنما يحمل على أنه استوفى بعض حقه وأسقط باقيه. الهداية، كتاب الصلح، باب الصلح في الدين، ج٣ ص ١٩٤.

والصلح عما استحق بعقد المداينة أخذ لبعض حقه وإسقاط للباقي وليس معاوضة. الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الصلح، ج٣ ص ٨.

[6] لأنّه صلح يتوقّف على رضا الفريقين.

دھوکہ دہی کے احکام

دھوکہ دہی کی دو قسمیں ہیں:

قسم اول: وہ دھوکہ ہے جو بیان یا تقریر کے ذریعے سے دیا جائے مثلاً کسی سے کہا کہ یہ خالص شہد ہے یا یہ نافہ مشک اصلی ہے اور بعد میں اس کے خلاف نکلا تو اس میں دیکھا جائے اگر مبیع بالکل نکما بیکار اور بدلا ہوا ہو تو بیع باطل ہے اور اگر کچھ خرابی ہو مکمل خراب نہ ہو تو خریدار کو خیار عیب حاصل ہوگا اور ایسی چیز سے مشتری کو جو نقصان ہو جائے وہ بائع کے ذمے ہوگا مثلاً عرق بادیان لیا اور دوا میں ملایا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی اور چیز کا عرق تھا جس سے اطباء کی رائے کے مطابق دواء کی تاثیر مکمل خراب ہوگئی تو عرق فروخت کرنے والے سے پوری دواء کی قیمت وصول کی جائے گی لیکن اس خراب دواء کے استعمال سے اگر کسی کو نقصان پہنچ گیا تو عرق فروخت کرنے والا ذمہ دار نہ ہوگا۔[2] (کیونکہ یہ نقصان صرف عرق سے نہیں ہوا بلکہ حکیم کی پوری ترکیب سے ہوا ہے ہاں اگر وہ عرق سخت مضر و نقصان دہ ہو تو حاکم وقت سیاسۃً اس کو کچھ سزا دے سکتا ہے)

---

[1] ولو استأجر أرضا عشرية وزرعها فالعشر على الأجر عند أبي حنيفة وعندهما على المستأجر لأن العشر يجب في الخارج وهو ملك المستأجر. (تحفة الفقهاء،كتاب الزكاة، باب العشر والخراج،ج١ص ٣٢٣).

والعشر على المؤجر كخراج موظف وقالا على المستأجر كمستعير مسلم: وفي الحاوي وبقولهما نأخذ. (الدر المختار،كتاب الزكاة، باب العشر،ج٢ص ٣٣٤).

[2] لو قال إن قيمته كذا وهو أكثر من قيمته والمشتري لا يعرف قيمة الأشياء واشتراه بناء على قول البائع فإنه يكون له الخيار لأنه يصير غارا أما إذا كان عالما بالقيمة واشتراه بأكثر من ذلك لغرض له في ذلك فلا بأس به وأصحابنا يفتون في المغبون أنه لا يرد ولكن هذا في مغبون لم يغر أما في مغبون غر فيكون له حق الرد.(تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب الإقالة والمرابحة،ج٢ص ١٠٨).

وقد قالوا في المغبون غبنا فاحشا له أن يرده على بائعه بحكم الغبن، وقال أبو علي النسفي فيه روايتان عن أصحابنا ويفتى برواية الرد رفقا بالناس وكان صدر الإسلام أبو اليسر يفتي بأن البائع إن قال للمشتري: قيمة متاعي كذا أو قال متاعي يساوي كذا فاشترى بناء على ذلك وظهر بخلافه له الرد بحكم أنه غره وإن لم يقل ذلك فليس له الرد، وقال بعضهم لا يرد به كيفما كان والصحيح أن يفتى بالرد إن غره وإلا فلا. (تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، قبيل فصل العقار،ج٤ص٧٩).

(ويفتى بالرد) رفقا بالناس وعليه أكثر روايات المضاربة وبه يفتى ثم رقم وقال (إن غره) أي غر المشتري البائع أو بالعكس أو غره الدلال فله الرد (وإلا لا) وبه أفتى صدر الإسلام وغيره. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية،ج٥ص ١٤٣).

فریب قسم دوم: وہ دھوکہ جو براہ راست نہ ہو بلکہ کسی قرینہ اور عنوان سے دھوکہ دیا جائے مثلاً گھی کا آٹھ کلو ڈبہ خریدار کو دکھایا اس نے کہا کہ یہ صحیح نہیں اس میں ملاوٹ ہے دکاندار نے جلدی سے دس کلو والا ڈبہ نکال کر کہا کہ یہ صحیح ہے یہ لے لیں یہ خالص ہے یا یہ کہ معاملہ کے وقت اپنی دیانت اور دوستی وغیرہ کے اظہار سے گاہک کو مطمئن کیا کہ میں آپ کو غلط چیز نہیں دوں گا اور بعد میں اس کے خلاف کیا اور غلط چیز دے دی یا کسی مال کو بازار میں اس طرح رکھنا کہ دیکھنے والے عیوب پر مطلع نہ ہو سکیں تو ان تمام صورتوں میں بائع ذمہ دار نہیں ہے البتہ خریدنے کے بعد بیع میں عیب نظر آئے تو عیب کا حکم مرتب ہوگا اس کو بھی دھوکہ کہا جائے گا۔[1]

اس بارے میں اصل وہ حدیث ہے جس کو امام مسلمؒ نے نقل فرمایا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک گندم فروخت کرنے والے کے گندم کے ڈھیر میں ہاتھ مار کر دیکھا تو اندر سے گیلا نکلا تو آپ ﷺ کے پوچھنے پر اس نے جواب دیا کہ بارش کے پانی سے ایسا ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو اوپر کیوں نہیں کر دیا تا کہ لوگ دیکھ لیتے "مَنْ غشّ فليْس مِنّي "جس نے دھوکہ دیا اس کا میری جماعت سے تعلق نہیں مطلب یہ ہے کہ مسلمان دھوکہ نہیں دیا کرتا۔[2]

جو دھوکہ عرف میں داخل ہو گیا اس کا حکم

لیکن ایسا دھوکہ جو عرف میں داخل ہو گیا ہو، یا اس کی ضرورت ہو، یا کسی چیز کی بناوٹ میں اس کی ضرورت ہو، یا کسی کو مزین کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہو، کوئی غرض صالح جو فریب کے بغیر انجام نہیں پا سکتی مثلاً شہر میں عرف ہے کہ دودھ میں پانی ملا کر فروخت کیا جائے یا تھوڑی ملاوٹ جس سے بچنا مشکل ہو جیسے گندم میں کچھ جو مل جائے یا زیورات وغیرہ کی بناوٹ میں کچھ ملاوٹ کرنی پڑتی ہے یا خوشنمائی کے لیے مال کو دکان میں سلیقے سے رکھنا جیسے کپڑے کے تھان سربتی وچکن وغیرہ جن کے اوپر کوئی خوشنما کاغذ رکھ دیا جائے کہ دیکھنے سے رغبت زیادہ ہو یا شیشہ کے اندر پھولوں کو اس طرح رکھنا کہ خوشنما معلوم ہوں ایسی تمام صورتوں میں فریب ثابت نہ ہوگا ہاں اگر جو عرف ہے اس سے زائد ہو یا عیب کو چھپانے کے لیے اور مغالطہ کے لیے ایسا کیا

[1] أُنظر التخريج السّابق.

[2] صحيح مسلم ، كتاب الإيمان،باب قول النبي صلى الله عليه وسلم:من غشنا فليس منا. رقم الحديث: ١٠٢.

ہو تو پھر دھوکہ وفریب کے تحت داخل ہو سکتی ہے۔[1]

مسئلہ: ہر وہ بات دھوکہ ہو سکتی ہے جو جانب مقابل نے مفہوم سمجھا ہے اس کے خلاف ہو تو اگرچہ ایسی مصنوعی دھوکوں کا حکم صرف گناہ ہے کوئی تاوان وغیرہ نہیں کیونکہ تاوان وغیرہ نہیں کیونکہ صراحت کے ساتھ دھوکہ والی کوئی بات نہیں ہو گی۔[2]

عرف (تعامل) کے احکام

ہر وہ بات جو عام اور شائع ہو جائے اور لوگوں میں اس کے مطابق معاملات جاری ہو جائے اس کے اثبات پر نہ کوئی نص مذکور ہو نہ اجماع منقول ہو۔

عرف کی چار قسمیں ہیں:

عرف عام: عام مسلمان سلفا خلفا یہ کام کرتے آئے اور اس پر رد اور انکار نہ پایا جائے یہ شرعا حجت ہے اور قیاس پر مقدم ہے یعنی اس کی وجہ سے قیاس ترک کیا جاتا ہے۔

عرف خاص: کسی خاص قوم یا شہر کا معمول ہو اس طرح کے دوسرے مسلمان نہ اس کے منکر ہو نہ پابند یہ بھی اپنے مقام میں جہاں اس کا معمول ہو حجت عمومی طور پر حجت نہیں باقی اس سے وہ معمولات خارج ہو گئے جو کسی ملک میں نوجوان آزاد منش خیالات کے رو سے داخل ہو جائے کیونکہ مسلمان خاص طور پر متقی لوگ ضرور اس آزاد خیالی پر نکیر فرماتے ہیں کم از کم خود متنفر ہوتے ہیں۔

عرف متعارض: ایک شہر کا عرف دوسرے شہر والوں کے خلاف ہو یہ عرف بھی اس طرح معتبر ہے کہ تعارض لازم نہ آئے مثلا لکھنو میں خربوزہ ایک پیٹی میں چھ کلو ہوتا ہے اور آم کی گنتی فی سینکڑ چھبیس پنج یعنی سو کے بجائے ایک سو پانچ گننے کا معمول ہے دوسرے شہر میں وہی وزن اور شمار معمول کے مطابق ہے کہ پیٹی میں پانچ ہی کلو یا آم سو کے سو ہی گنتے ہیں یا کچھ اور حساب ہے اب جہاں عقد بیع واقع ہوا ہے وہیں کا عرف دیکھا جائے گا اگر معاملہ عقد کسی تیسرے مقام پر ہو تو کسی فریق کو اپنے عرف سے فائدہ اٹھانے کا حق نہ ہو گا بلکہ جس

---

[1] دھوکہ کے ناجائز ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی کے بغیر اس کا مالک ہڑپ کر لیا جاتا ہے اور مندرجہ بالا صورتوں میں یہ بنیاد موجود نہیں اس لئے ناجائز بھی نہیں ہے گویا اصطلاح وتعامل کے لحاظ سے اس کو "دھوکہ" کہنا مجاز ہے، بخلاف ان کے علاوہ صورتوں کے کہ وہ حقیقی معنی میں دھوکہ دہی اور ناجائز ہے۔

[2] كما مرّ أنفا عن التحفة والتّبيين والدر.

کا عرف امر واقعی کے مطابق یا قریب ہو اسی کا اعتبار ہو گا اور اگر دونوں اصل کے مخالف ہو تو دونوں ساقط ہو جائیں گے۔

مسئلہ: زید کلکتہ میں ہے اور عمرو لکھنو میں اور زید نے عمرو سے کوئی چیز خریدی اور خط کے ذریعے ایجاب و قبول ہوا اب اگر دونوں جگہوں کے عرف باہم متحد ہو تو بہتر ہے کہ اسی کے مطابق عمل ہو ورنہ امر اصلی پر فیصلہ ہو گا کیونکہ عرف خاص نہ غیر پر حجت ہے نہ تعارض کے وقت اس کا اعتبار ہے عالمگیری میں ہے کہ شہر میں روئی کی ایک قیمت معروف ہے اور زید کو اس معروف قیمت سے زیادہ میں روئی دی گئی اگر اسی شہر کا رہنے والا ہے تو جتنا زیادہ لیا وہ واپس لے سکتا ہے اور اگر دوسری جگہ کا رہنے والا ہے جہاں قیمت معروف نہیں تو وہ کمی کا دعوی نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں کا عرف اس کے حق میں حجت نہ تھا[1]

عرف مردود (خلاف شرع عرف) **کا حکم**: وہ بات جو نص کے خلاف اور اجماع کی ضد واقع ہو جیسے سونا چاندی ادھار فروخت کرنا یا باہم کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا یا زبردستی قیمت میں کم کرانے کا دستور یہ سب باتیں ناجائز ہیں۔

مسئلہ: قیاس کو عرف پر ترجیح حاصل نہیں ہوتی مگر یہ کہ قیاس کی بناء علت منصوصہ پر ہو۔

مسئلہ: جب کہ نص یا قیاس مجتہد یا اجماع کسی عرف یا علت پر مبنی ہو اور وہ عرف یا علت بدل جائے تو دوسرا عرف جو پہلے عرف یا علت کے خلاف ہو یا سابقہ عرف و علت کی غرض کی معین ہو تو مردود نہ ہو گا بلکہ اس کے اعتماد و جواز کے لیے مقصد غرض کا حصول حاجت کا لحاظ عمدہ دلیل ہے۔

فائدہ: علامہ شامیؒ نے عرف کے قبول ورد کے متعلق در مختار کی عبارت کے ضمن میں جو مباحث ذکر فرمائے ہیں[2] ان سب کا خلاصہ ہم نے اپنی مذکورہ بالا تقریر میں ذکر کر دیا ہے۔

---

[1] ولو اتفق أهل بلد على سعر الخبز واللحم وشاع بينهم فدفع رجل إلى رجل منهم درهما ليعطيه فأعطاه أقل من ذلك والمشتري لا يعلم رجع عليه بالنقصان من الثمن، لأنه ما رضي إلا بسعر البلد. الاختيار لتعليل المختار،كتاب الكراهية،ج٤ ص ١٦١.

اتفق أهل البلدة على سعر الخبز واللحم وشاع على وجه لا يتفاوت فأعطى رجل ثمنا واشتراه وأعطاه أقل من المتعارف إن كان من أهل البلدة يرجع بالنقصان فيهما من الثمن، وإن كان من غير أهلها رجع في الخبز؛ لأن التسعير فيه متعارف فيلزم الكل لا في اللحم فلا يعم. (البحر الرائق ،كتاب البيع،ج٥ص ٣١١).

كذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الفصل الأول،ج٣ص١٠).

[2] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب البيوع،مطلب: في الاعتياض عن الوظائف والنزول عنها،ج٤ ص ٥١٨).

اجارات (کرایہ داری) کے احکام

اجارہ کی تعریف: نفع مقصود کو دوسرے نفع یا مال کے عوض بدلنا جیسے مکان کے کرایہ کا عوض خدمت کو ٹھہرانا یا روپیہ قرار دینا اجیر جو کام کرے موجر جو اپنا مال کرایہ پر دے یہ دونوں بائع کی طرح ہیں۔

مستاجر: وہ چیز جو کرایہ پر دی جائے یا لی جائے۔

معقودعلیہ: وہ منافع جس پر عقد اجارہ واقع ہو یہ مبیع کی طرح ہے۔

مستاجر: کرایہ یا اجرت پر لینے والا یہ خریدار کے حکم میں ہے۔

اجرت: کرایہ یا تنخواہ یا مزدوری یہ بیع میں قیمت کے حکم میں ہے۔

اجارہ کے تمام احکام بیع کی طرح ہیں لہذا اجارہ میں شرط ہے عاقدین میں اہلیت ہو ایجاب و قبول ربط کے قابل ہو مجلس عقد میں کرایہ کا تعیین ہو اور کرایہ پر لے جانے والی چیز معین ہو اس طرح انعقاد اور لزوم اور نفاذ کی تمام شرائط موجود ہوں[1] البتہ چند صورتوں میں بیع اور کرایہ داری میں فرق ہے۔

ا۔ مبیع ذات ہے جب کہ کرایہ میں معقود علیہ نفع ہے لہذا جائز ہے کرایہ میں من وجہ تحدید و تعیین پر اکتفاء کیا جائے۔

۲۔ بوقت عقد صرف محل وآلات نفع کا موجود ہونا اوران پر قدرت ہونا کافی ہے جیسے جانور گاڑی مکان آدمی اوران کی تندرستی توانائی وغیرہ۔[2]

۳۔ مبیع میں تابید (ہمیشہ کے لیے خریدار کے حوالہ کرنا) شرط ہے جب کہ اجارہ میں توقیت لازم ہے (بضرورت تابید ہو سکتی ہے) تاکہ ذات اور اوراس کا ثر مہمل نہ ہو جائے۔[1]

والتّفصيل في "نشر العرف في بناء بعض الأحكام على العرف" للعلامة محمد أمين الشّامي رحمه الله بتحقيق الشّيخ المفتي ثناء الله زيد مجدهم.

[1] إن الإجارة أحد نوعي البيع فيعتبر بالنوع الآخر وهو بيع العين. بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، ج٤ص١٨٧.

[2] لأن تسليم المعقود عليه واجب وذلك بالتمكين من الانتفاع، لأن تسليم عين المنفعة لا يتصور فيقام التمكين من الانتفاع مقامه، وذلك تسليم المحل إليه بحيث لا مانع من الانتفاع. (المحيط البرهاني، كتاب الإجارة، الفصل الثاني عشر، ج٧ ص٤٦٠).

تسليم المعقود عليه في الإجارة هو التمكين من الانتفاع به وذلك بتسليم المحل إليه بحيث لا مانع من الانتفاع به. (الفتاوى الهندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني عشر، ج٤ ص ٤٣٧).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الإجارة، ج٧ ص ٣٠٠).

۴۔ بیع سلم کے علاوہ مبیع کا موعود اور مؤجل ہونا (یعنی بیع حوالہ کرنے کے لیے مدت مقرر کرنا) جائز نہیں ہے اور اجارہ میں معقود علیہ ہمیشہ حادث ہوا کرتا ہے (یعنی اس کے لیے مدت مقرر ہوتی ہے)[2]

۵۔ مبیع میں عقد تمام ہو جانے کے بعد عیب لاحق ہوا تو اس کا اعتبار نہیں جب کہ اجارہ میں عیب لاحق کا اعتبار ہے کیونکہ عیب لاحق آئندہ کے اعتبار سے عیب سابق ہے۔[3]

مسئلہ۸ : ایک گاڑی کا کرایہ فی گھنٹہ آٹھ روپے ہے جب زید اس پر سوار ہوا تو اس کی رفتار میں کچھ نقصان تھا جس کا فی گھنٹہ چھ روپیہ تھا اور دو گھنٹے کے بعد اور عیب پیدا ہو گیا جس سے اس کی بازاری قیمت چار روپیہ رہ گئی اب کرایہ دار پہلے دو گھنٹے میں چار روپے کم کر کے بارہ روپے کرایہ ادا کرے گا اس کے بعد جتنی دیر رہے چار روپیہ فی گھنٹہ حساب کر کے کرایہ ادا کرے اگر ایسی گاڑی خریدی گئی ہو تو صرف پہلے عیب کا اعتبار ہو گا[4]

۶۔ مبیع مکمل طور پر مشتری کی ملک ہو جاتی ہے جب کہ کرایہ کی صورت میں منافع سب کا سب کرایہ دار کا مملوک نہیں ہوتا اور نہ ذات کا تعطل لازم آئے گا لہذا زمین کو کرایہ پر دینے کے بعد اگر اس زمین کی وجہ سے

---

[1] ومنها (أي من شرائط صحة البيع) أن لا يكون مؤقتا، فإن أقته لم يصح بخلاف الإجارة، فإن التأقيت شرطها. (البحر الرائق ،كتاب البيوع،ج٥ ص٢٨١). وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب البيوع، الباب الأول،ج٣ص ٣).

[2] (ومن باع عينا على أن لا يسلمها إلى شهر، أو إلى رأس الشهر فالبيع فاسد) ؛ لأنه لا فائدة للبائع في تأجيل المبيع، وفيه شرط نفي التسليم المستحق بالعقد. (الجوهرة النيرة ، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج١ص ٢٠٣).

(لا) يصح (البيع) بثمن مؤجل (إلى النيروز) أما تأجيل المبيع فمفسد ولو إلى أجل معلوم. (النهر الفائق،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج ٣ ص ٤٣٧).

ولنا أن العقد (أي الإجارة) ينعقد شيئا فشيئا على حسب حدوث المنافع على ما بينا.(الهداية ،كتاب الإجارة، باب الأجر متى يستحقّ،ج٣ ص٢٣١).

فعندنا ينعقد شيئا فشيئا على حسب حدوث المنفعة فلم تكن كل واحدة من المنفعتين معينة بل هي معدومة وقت العقد.(بدائع الصنائع ،كتاب الإجارة،ج٤ص ١٩٤).

[3] (وتفسخ بالعيب) أي تفسخ الإجارة بالعيب؛ لأن العقد يقتضي سلامة البدل عن العيب، فإذا لم يسلم فات رضاه فيفسخ كما في البيع والمعقود عليه في هذا الباب المنافع وهي تحدث ساعة فساعة.(تبيين الحقائق كتاب الإجارة،باب فسخ الإجارة،ج٥ص ١٤٣).

تفسخ بالقضاء أو الرضا (و) بخيار (عيب) حاصل قبل العقد أو بعده بعد القبض أو قبله (يفوت النفع به) .(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الإجارة،باب فسخ الإجارة ، ج٦ص ٧٧).

[4] لأنّه لا عِبرةَ بالعيب الحاصل بعد العقد في البيع بخلاف الإجارة فإنّ العين المأجورة لا يخرج عن ملك المؤجر وضمانه كما مرّ في الحاشية السّابقة.

حقِ شفعہ حاصل ہو وہ مالک زمین اس کا حق دار ہے اس کی مزید وضاحت زوائد میں آئے گی۔[1]

۷۔ جو مال فی الحال قابل انتفاع نہ ہو اس کو فروخت کرنا جائز ہے لیکن ایسے مال کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، جیسے جانور کا بہت چھوٹا بچہ یا ایسی زمین جس کے اطراف دوسرے کی ملک سے محدود اور راستہ بالکل بند ہو اور کرایہ دار کسی حق یا شرط سے اس زمین میں آ جا نہ سکے لہذا ایسی زمین فروخت تو ہو سکتی ہے کیونکہ بیع حصول ملک کے لیے کی گئی ہے اور اس میں ملک کا حاصل ہونا ممکن ہے لیکن کرایہ پر دینا صحیح نہیں کیونکہ کرایہ کا مقصد نفع حاصل کرنا ہے وہ یہاں ممکن نہیں ہاں اگر کسی اور طریقے سے فائدہ حاصل ہو سکے یا اس کے پڑوسی کرایہ پر لے کر فائدہ حاصل کر سکے تو پھر ایسی صورت میں کرایہ پر دینا بھی جائز ہوگا۔[2]

۸۔ خریدار کو حق حاصل ہے کہ مبیع کو تلف کردے[3] لیکن کرایہ دار کو عین شئ کو ہلاک کرنے کا حق نہیں لہذا کرایہ دار کے لیے ایسا استعمال ممنوع ہوگا جس سے شئ مستاجر کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو[4] جیسے چراگاہ کو گھاس چرانے کے لیے کرایہ پر دینا یا درخت کو پھل یا پھول حاصل کرنے کے لیے یا خشک لکڑی چننے کے لیے کرایہ پر دینا اپنا یا حوض کو پانی پینے کے لیے کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔

۹۔ بائع خریدار کو ناجائز تصرف سے نہیں روک سکتا جب کہ کرایہ دار کو روکا جائے گا کیونکہ نفع حادث ابھی تک کرایہ دار کی ملک میں داخل نہیں ہوا لہذا کرایہ دار کوئی حرام کام کرے تو مالک کے لیے اس پر خاموش رہنا جائز نہیں مثلاً مزدور سے کہا گیا کہ کرایہ کے مکان میں شراب بناؤ یا شراب فروخت کرو یا مکان

---

[1] آئندہ صفحات میں زوائد کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

[2] لأن كون المبيع مقدور الانتفاع ليس بشرط لجواز البيع فإن بيع المهر والجحش والأرض السبخة جائز وإن لم يكن منتفعا بها ولهذا يدخل الشرب والطريق في الإجارة من غير تسمية ولا يدخلان في البيع إلا بالتسمية؛ لأن كون المستأجر منتفعا به بنفسه شرط صحة الإجارة ولا يمكن الانتفاع بدون الشرب والطريق بخلاف البيع.(بدائع الصنائع،كتاب الإجارة، ج ٤ص١٨٧).

أما الإجارة فإنما المقصود منها الانتفاع، ولا يتحقق إلا بها(أي الطريق والمسيل والشرب) ولأن البيع شرع لتمليك العين لا المنفعة بدليل صحة شراء جحش ومهر صغير، وأرض سبخة، ولا تصح إجارتها.(البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب الحقوق، ج٦ص ١٤٩).

[3] یعنی قانوناً وہ خود مختار ہے جو چاہے کرے، ورنہ دیانۃً بلا فائدہ اپنے مال کو ضائع کرنا اسراف ہے جو کہ ناجائز اور ممنوع ہے۔

[4] لأنّ الإجارة غير مفيدة لتملّك العين المستأجرة وإنّما وضعت لتملّك المنفعة فقط بخلاف البيع، أمّا ما ذُكر من الأمثلة على ذلك فمتفرّعة على عدم جواز الإجارة على إستهلاك الأعيان وإن كان يمكن تطبيقه على هذا الأصل أيضا والمثال المناسب لهذا الأصل إجارة الدّابة والسيّارات وغيره من المنقولات.

میں شراب کی دکان لگاؤ اب مالک مکان کو روکنے کا حق ہے اور کرایہ دار ان کے حکم کی مخالفت کرنے کا مجاز نہیں۔[1]

۱۰۔ اجارے بعض وجوہات سے فسخ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ قبضہ اور تسلیم ایک ہی وقت میں ممکن نہیں اور بیع لازم فسخ نہیں ہو سکتی۔[2]

دوم: نابالغ یا وہ غلام جس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت نہیں، یا مکرہ مزدور ہو، یا مالک ہو تو اجرت لازم ہے اور مستاجر گناہ کار، ان کے علاوہ کوئی مستاجر ہو تو اجازت واختیار پر موقوف ہے۔[3]

سوم: بائع اپنا مال پھر خرید سکتا ہے موجر مستاجر اول یا ثانی سے اجرت پر نہیں لے سکتا ہے۔[4]

---

[1] اگر کرایہ داری معاہدہ میں کرایہ دار پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تو مالک نہی عن المنکر کی حد تک تو کرایہ دار کو ان جیسے منکرات سے روک سکتا ہے بلکہ اپنی استطاعت کے بقدر اس طرح روکنا ضروری ہے، تاہم اگر کرایہ دار اس کی بات نہ مانے تو یکطرفہ طور پر معاملہ فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

ولو أظهر المستأجر في الدار شيئا من أعمال الشر كشرب الخمر وأكل الربا أو الزنا أو اللواطة فانه يؤمر بالمعروف وليس للآجر ولا للجيران أن يخرجوه من الدار وكذا لو اتخذ داره مأوى اللصوص. (فتاوى قاضيخان ،كتاب الإجارة، فصل فيما تنتقض به الإجارة ، ج۲ص۱۹۲).

وفي الذخيرة لو أظهر المستأجر في الدار الشر والفتنة كشرب الخمر وأكل الربا والزنى واللواطة وإيذاء الجيران يؤمر بالمعروف وليس للمؤاجر ولا لجيرانه أن يخرجوه من الدار بذلك ولا يصير عذرا في فسخ الإجارة ولا خلاف فيه للأئمة الأربعة وفي الجواهر إن رأى السلطان بأن يخرجه فعل. (لسان الحكام ،الفصل الثامن عشر في الاجارةص:۳٦۸).

وكذا في حاشية ابن عابدين على الدر المختار (كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، ج٦ ص۸۱).

[2] یعنی اجارہ چونکہ شیئاً فشیئاً حسب حدوث المنفعۃ منعقد ہوتی ہے، اس لئے انعقاد کے بعد بھی کچھ اعذار و عیوب کی وجہ سے فسخ ہو سکتی ہے بخلاف بیع کے، کہ وہ دفعۃً ہی منعقد ہوتا ہے۔

[3] اس عبارت میں کچھ اغلاق ہے، اصل کتاب کی عبارت یہ ہے: "نابالغ یا عبدِ مجور یا مکرہ، اجیر یا موجِر ہو تو اجرت لازم اور مستاجِر عاصی ہے اور مستاجِر ہو تو اذن واختیار پر موقوف"۔ (ص۱۲٦)۔

پہلی صورت میں لزوم اجرت اس لئے ہے کہ عقدِ معاوضہ میں عمل پایا گیا تو اجرت بھی لازم ہے اور مستاجر کے عاصی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بلا وجہ مسلمان کو اپنی مرضی کے خلاف عقد پر مجبور کر کے اذیت کا سبب بنا، نابالغ وغیرہ کے مستاجر ہونے کی صورت میں چونکہ اجیر کی اجرت خود ان پر لازم ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ حجر کا کوئی سبب موجود نہ ہو بلکہ ماذون و خود مختار ہوں۔

[4] لأنّ البيع للتملّك وهو حاصل له قبل العقد فلا فائدة في إنشاء العقد خلا تفويت إستيفاء المستاجر. ففي المحيط البرهاني:" ذكر ابن سماعة في «نوادره» عن محمد أن الإجارة من المالك لا تجوز سواء كان المستأجر الأول آجر بنفسه أو آجر مستأجره. قال رحمه الله: وعليه عامة المشايخ. (كتاب الإجارات،الفصل السابع في إجارة المستأجر، ج۷ص ٤۳۳).

مسئلہ ۸ : زید نے عمرو کو اپنا مکان کرایہ پر دیا پھر عمرو سے کرایہ پر نہیں لے سکتا اور ایسے ہی عمرو نے بکر کو کرایہ پر دیا تو اس سے بھی کرایہ پر نہیں لینا چاہیے۔[1]

چہارم بائع کو حق ہے کہ پہلے قیمت وصول کرے اس کے بعد مبیع حوالہ کرے مزدور یا کرایہ دار کو اجرت یا کرایہ لینے کا اس وقت حق ہوتا ہے جب معقود علیہ حوالہ کرے۔[2]

اجارہ کے اقسام

معقود علیہ کے اعتبار سے اجارہ کی پندرہ قسمیں ہیں:

۱۔ معقود علیہ عمل محض ہو جیسے نوکری۔

۲۔ معقود علیہ نفع محض ہو جیسے جانور وغیرہ سواری کے لیے لباس کو پہننے کے لیے کرایہ پر لینا یا مکان کرایہ پر لیا

۳۔ عمل اصل ہو اور مال تابع ہو جیسے سلائی رنگائی جس میں دھاگہ درزی کا ہو اور رنگ رنگریز کا ہو۔

۴۔ منافع اصل ہو اور عمل تابع جیسے گاڑی گھوڑا کے ساتھ گھوڑے کی خدمت۔

۵۔ معقود علیہ اثر محض ہو جیسے دلالی (ایجنٹ) یہ مال بکنے پر موقوف ہے۔

پھر یہ پانچوں یا مباح ہیں یا معصیت یا اطاعت۔[3]

اور مال و مزدور کے اعتبار سے تین حال ہیں۔

اجیر مشترک: یعنی مزدور کسی ایک مخصوص مالک کا کام نہیں کرتا بلکہ متعدد مالکوں کا کام کرتا ہے اس کو اجیر مشترک کہتے ہیں جیسے رنگ ریز درزی دھوبی نائی خاکروب وغیرہ۔[1]

وروي عن محمد رحمه الله تعالى أن الإجارة من المالك لا تجوز مطلقا تخلل الثالث أو لا وبه قال عامة المشايخ وهو الصحيح وعليه الفتوى. (الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة، الباب السابع، ج٤ص ٤٢٥).

[1] انظر الحاشية السّابقة.

[2] (والأجرة تستحق باستيفاء المعقود عليه، أو باشتراط التعجيل أو بتعجيلها) لأن الأجرة لا تجب بنفس العقد. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الإجارة، فصل ما تستحق به الأجرة، ج٢ص ٥٥).

"الأجرة لا تجب بالعقد وتستحق بأحد معان ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل من غير شرط، أو باستيفاء المعقود عليه".(الهداية ،كتاب الإجارة،باب الأجر متى يستحق، ج٣ص٢٣١).

[3] لہٰذا مذکورہ پانچ قسموں کو ان تین میں ضرب دینے سے پندرہ (۱۵) قسمیں مکمل ہو جائیں گی۔

اجیر خاص: جو مزدور کل وقت یا بعض متعین وقت کسی ایک ہی مالک کے لیے کام کرتا ہے اگر یہ بطور لزوم ودوام (یعنی ہمیشہ) ہو اسکو ملازم یا اجیر خاص کہتے ہیں جیسے مزدور جو روزانہ کام کرتا ہے اب چاہیے معاہدہ یومیہ ہو یا ماہانہ یا سالانہ اسی طرح گاڑیاں چھوٹی بڑی جو کسی ایک کے لیے مخصوص ہو وہ اجیر خاص ہے اگر کسی کے لیے مخصوص نہ ہو جیسے ریل سرایہ وغیرہ وہ اجیر مشترک کے حکم میں ہے۔[2]

اجیر مشترک کے احکام

اجیر مشترک کا کوئی وقت اجرت پر لینے والے کے لیے محبوس یا مخصوص نہیں کہ اس وقت میں کسی دوسرے کا کام یا آرام جائز نہ ہو کیونکہ وہ کام پورا کرنے پر اجرت کا مستحق ہوتا ہے وقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں،[3] البتہ کام پورا کرنے کے لیے کے لیے کوئی وقت مقرر ہو گیا ہو تو وعدہ کے طور پر اسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

سوال ۸: اگر لوہار یار نگریز نے وعدہ کیا ہے کہ تمہارا کام شام تک کر دوں گا دوسروں کا کام نہیں کروں گا اگر وہ دوسرے کا کام کریں تو مجرم نہ ہو گا ہاں البتہ کام جو شام تک کرنے کا وعدہ کیا ہے اس کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔[4]

اگر یہ طے ہوا کہ جب تک تیرا کام مکمل نہ ہو کسی اور کا کام نہیں کروں گا اب وعدہ اور عہد کی وجہ سے دوسرے کا کام نہیں کر سکتا تاہم اگر دوسرے کا کام کیا تو وعدہ خلافی کا تو گناہ ہو گا لیکن اجرت حرام نہ ہو گی۔[1]

---

[1] (الأجير المشترك) وثانيهما الأجير الخاص وسيأتي بيانه الأول (من يعمل لا لواحد) كالخياط ونحوه (أو يعمل له) أي لواحد عملا (غير مؤقت) ، فإنه إذا استأجر رجلا وحده للخياطة أو الخبز في بيته غير مقيد بيوم أو يومين كان أجيرا مشتركا، وإن لم يعمل لغيره (أو مؤقتا بلا تخصيص).(الدرر شرح الغرر ،كتاب الإجارة، باب من الإجارة، ج٢ص٢٣٥).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الإجارة،باب ضمان الأجير،،ج٦ص ٦٤).

[2] الأجير (الخاص) ويسمى أجير واحد أيضا (هو من يعمل لواحد عملا مؤقتا بالتخصيص). (الدرر شرح الغرر ،كتاب الإجارة، باب من الإجارة، ج٢ص٢٣٦).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الإجارة،باب ضمان الأجير،،ج٦ص ٦٩).

[3] وحكمهما أن المشترك له أن يتقبل العمل من أشخاص؛ لأن المعقود عليه في حقه هو العمل أو أثره فكان له أن يتقبل من العامة؛ لأن منافعه لم تصر مستحقة لواحد فمن هذه الوجه سمي مشتركا. (تبيين الحقائق ،كتاب الإجارة،باب ضمان الأجير،،ج٥ص ١٣٤).

وكذا في الهداية (كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير،ج٣ص ٢٤٢).

[4] أيضا.

مسئلہ : اسی طرح وعدہ کرنا کہ تمہارا کام شام تک ختم کرنے دوسروں کے کام نہ کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، یہ جائز نہیں ہے بلکہ عمل ہو یا وقت ایک چیز کی ذمہ داری لے۔[2]

مسئلہ : اجیر مشترک کام کیے بغیر اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔[3]

مسئلہ : صاحبین رحمہم اللہ تعالی کے نزدیک نقصان کی صورت میں اجیر مشترک کو ضامن بنانا جائز ہے۔[4]

مسئلہ : جس طرح اجیر کی قسمیں خاص اور مشترک ایسی ہی کرایہ کی چیزیں بھی خاص اور مشترک ہوا کرتی ہے جیسے رفاہ عام کے کمرے جہاز ریل ٹرالر گاڑیاں وغیرہ اگر کسی ایک کے لیے مخصوص ہو جائیں (یعنی کل کرایہ پر لیا جائے) یا باہم بات طے ہو جائے کہ راستہ میں کسی کو نہیں بٹھانا ہے یا کوئی عرف جاری ہو جائے تو اس کی پابندی ضروری ہے ورنہ اجارہ دار (مالک) کو اختیار ہے جسے چاہے گاڑی میں بٹھادے یا ہوٹل میں جسے چاہے ٹھہرائے۔[5]

---

[1] أيضا.

[2] لأنّ إلتزام الضّمان على هذا الوجه يُفضي إلى المنازعة. كما في العبارات التالية.

والأصل عند أبي حنيفة: أنه إذا جمع بين الوقت والعمل في عقد الإجارة إنما يفسد العقد إذا ذكر كل واحد منهما على وجه يصلح معقوداً عليه حالة الانفراد الوقت والعمل، أما إذا ذكر العمل على وجه لا يجوز إفراد العقد عليه لا يفسد العقد. (المحيط البرهاني،كتاب الإجارات، الفصل السادس، ج٧ص ٤٢٧).

والتّفصيل في فتاوى قاضيخان، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، ج٢ص١٧٥).

[3] (ولا يستحق) الأجير المشترك (الأجر حتى يعمل كالصباغ، والقصار) ونحوهما. (مجمع الأنهر ،كتاب الإجارة، أحكام الأجير، ج٢ص ٣٩١).

ولا يستحق الأجر حتى يعمل كالقصّار والصبّاغ) يعني الأجير المشترك لا يستحق الأجرة إلا إذا عمل. (تبيين الحقائق ،كتاب الإجارة،باب ضمان الأجير،، ج٥ص ١٣٤).

[4](قوله: والمتاع أمانة في يده إن هلك لم يضمن شيئا عند أبي حنيفة وزفر. وقال أبو يوسف ومحمد هو مضمون) عليه بالقبض فيضمنه إذا تلف في يده إلا أن يكون تلفه من شيء غالب لا يستطاع الامتناع منه كالحريق الغالب.(الجوهرة النيرة ،كتاب الإجارة، ج١ص٢٦٤).

وقال أبو يوسف ومحمد: يضمن سواء هلك بفعله أو بغير فعله، إلا ما لا يمكن الاحتراز عنه كالموت والحريق والغرق الغالب، والعدو المكابر؛ لأنه يجب عليه حفظه عما يمكن التحرز عنه، فإذا تركه ضمن كما إذا هلك بفعله.(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الإجارة، فصل الأجراء، ج٢ص٥٤).

[5] إذا استأجر ثوبا للبس وأطلق جاز فيما ذكرنا" لإطلاق اللفظ وتفاوت الناس في اللبس "وإن قال: على أن يركبها فلان أو يلبس الثوب فلان فأركبها غيره أو ألبسه غيره فعطب كان ضامنا"؛ لأن الناس يتفاوتون في الركوب واللبس فصح التعيين، وليس

اگر کرایہ داروں کا آپس میں کوئی اختلاف ہو جائے تو فیصلہ موجر (مالک) کے ذمے ہے اور موجر شرط یا عرف کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہے اگر مالک اور کرایہ دار میں اختلاف ہو جائے تو اگر عقد کے شروع میں ہو تو عقد اجارہ کو فسخ کر دیا جائے گا اور اگر درمیان میں ہو تو کرایہ دار کو اختیار ہو گا کہ جتنا نفع اٹھایا ہے دے کر علیحدہ ہو جائے یا باقی مقدار کو کم کر لے۔[1]

مسئلہ: زید گاڑی پر سوار ہوا جو سواری اٹھاتی ہوئی جاتی ہے مثلاً بیل گاڑی رکشہ وغیرہ اور کرایہ دس روپے طے ہوا آدھا راستہ چل کر ڈرائیور (نے) دوسری سواری کو بٹھانا چاہا جس سے زید کو نفرت ہے یا کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے تو اب زید کو اختیار ہو گا،[2] یا اس سواری سے جو کرایہ وصول ہو گا وہ ڈرائیور کو دے دے اور اس کو بیٹھنے نہ دے، یا بقدرِ مسافت کرایہ دے دے، یا کل سے کم لے اور علیحدہ ہو جائے۔

مسئلہ: ڈرائیور ایسا بوجھ یا سواری کو گاڑی میں نہیں لے سکتا ہے جس سے پہلے سوار کو سخت نقصان پہنچے یا اس کے لیے عار کا سبب بنے۔

مسئلہ: سواری کا مالک بلاضرورت نہ سواری کو آہستہ چلا سکتا ہے نہ زیادہ تیز نہ خواہ مخواہ آرام کر سکتا ہے۔

له أن يتعداه، وكذلك كل ما يختلف باختلاف المستعمل لما ذكرنا. فأما العقار وما لا يختلف باختلاف المستعمل إذا شرط سكنى واحد فله أن يسكن غيره؛ لأن التقييد غير مفيد لعدم التفاوت الذي يضر بالبناء.(الهداية ،كتاب الإجارة،باب ما يجوز من الإجارة، ج٣ص ٢٣٤).

(المادة ٥٨٧) للمستأجر إيجار ما لم يتفاوت استعماله وانتفاعه باختلاف الناس لآجر. للمستأجر إيجار المأجور كالدور والأراضي ما لم يتفاوت استعماله باختلاف المستعملين الانتفاع به على أن تستوفى المنفعة التي يقتدر على استيفائها في مدة الإجارة..ولو شرط المؤجر أن يستعمله المستأجر بنفسه، وإن ليس له إيجاره من غيره. (درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ،كتاب الإجارة، رقم المادة:٥٨٧، ج١ص٦٧٣).

(قوله وفيما لا يختلف به بطل تقييده به كما لو شرط سكنى واحد له أن يسكن غيره) لأن التقييد غير مفيد لعدم التفاوت والذي يضر بالبناء كالحدادة والقصارة خارج على ما قدمناه فلا يملكه إلا بالتنصيص (البحر الرائق ،كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة، ج٧ ص ٣٠٨).

[1] (وإن اختلفا في الاشتراط فالقول للمؤجر) كما لو أنكر أصل العقد (وإن أقاما البينة فالبينة بينة المستأجر) لإثباتها الزيادة خلاصة. (الدر المختار ،كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة، ج٦ ص ٢٨).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة وما لا يجوز، ج٢ص٣٧٥).

[2] یہ اور اس کے بعد کے تین مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان امور کی وجہ سے کرایہ دار کے انتفاع میں خلل آتا ہے جس کی وجہ سے کرایہ دار کو اجارہ فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: جس مکان یا سواری میں چند لوگوں کی گنجائش ہو وہاں عورت کے بعد مرد اور مرد کے بعد عورت کو باہمی رضامندی کے بغیر بٹھانے کا حق نہیں کیونکہ ایسا کرنا عرفاً عار سمجھا جاتا ہے۔

اجیر خاص کے احکام

1-اجیر خاص جب خود کام کے لیے موجود ہو (یعنی ڈیوٹی پر حاضر ہو) چاہے کام کم ہو یا زیادہ پوری اجرت کا مستحق ہے مگر جس کام کے لیے اس کو مقرر کیا گیا ہے وہ کام خود نہ کرے تو اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔ (مجلہ)[1]

2۔اپنے آقا سے جو وقت کام کے لیے مقرر ہوا ہے اس وقت میں کسی دوسرے کا کام کرنا جائز نہیں (ہدایہ)[2] اگرچہ اجرت بہت زیادہ ملتی ہو۔ (عالمگیری)[3]

3۔اجیر خاص کے ہاتھ سے جو نقصان ہو جائے اس کا ضمان اجیر خاص پر نہیں ہے ہاں اگر خود تلف کردے تو اس کا ضمان لازم ہوگا۔[4]

---

[1] الأجير يستحق الأجرة إذا كان في مدة الإجارة حاضرا للعمل ولا يشرط عمله بالفعل ولكن ليس له أن يمتنع عن العمل وإذا امتنع لا يستحق الأجرة. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ٤٢٥ص:٨٢).

(والخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة أو لرعي الغنم) يعني الأجير الخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة عمل أو لم يعمل. (البحر الرائق،كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير،ج٨ص ٣٣).

[2] قال: "والأجير الخاص الذي يستحق الأجرة بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة أو لرعي الغنم" وإنما سمي أجير وحد؛ لأنه لا يمكنه أن يعمل لغيره؛ لأن منافعه في المدة صارت مستحقة له والأجر مقابل بالمنافع. (الهداية ،كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير،ج٣ص ٢٤٣).

[3] وليس للمؤاجر أن يفسخ الإجارة إذا وجد زيادة على الأجرة التي آجر بها، وإن كان أضعافا.(الفتاوى الهندية، كتاب الإجارة، الباب التاسع عشر،ج٤ص ٤٥٩).

والمؤاجر إذا وجد زيادة على الأجرة لا يكون ذلك عذراً له في فسخ الإجارة؛ لأنه لا يمكنه إنما المعقود عليه من غير ضرر يلزمه إنما يفوته نوع نفع طمعه غير أنه لا عبرة لفوات المنفعة على ما مرَّ. (المحيط البرهاني ،كتاب الإجارة، الفصل الثامن عشر،ج٧ص ٥٠١).

[4] (قوله: ولا ضمان على الأجير الخاص فيما تلف في يده) بأن سرق منه، أو غصب. (قوله: ولا ما تلف من عمله) بأن انكسر القدر من عمله.(الجوهرة النيرة ،كتاب الإجارة،ج١ص ٢٦٥).

ولا ضمان على الأجير الخاص ولا فيما تلف من عمله اتفاقا إذا لم يتعمد الفساد .. الأجير الخاص لا يضمن إلا بالتعدي.(مجمع الضمانات ص: ٢٨)

اجیر خاص کی قسمیں

صرف حاضری: اس میں خدمت کی شرط نہیں اور جو کچھ خدمت ہو جائے وہ تابع اور ضمنی چیز ہے مثلاً کسی سے کہا جائے کہ شام تک یہاں حاضر رہیں تو شام تک حاضر رہنے پر اجرت مل جائے گی اور کام مثل وصف مرغوب کے ہے۔[1]

خدمت: ان کو اجیر رکھنے کا مقصد خدمت مفوضہ کی بجاآوری ہوتی ہے حاضری مقصود نہیں بلکہ ضرورت کے وقت موجود رہے باقی کام پورا کرے جیسے ناظم (منیجر) یا قاصد یا وکیل وغیرہ۔

مسئلہ: اجیر خدمت کے لیے ایسی غیر حاضری یا بے خبری یا کسی کام میں اس طرح مشغولی جو عام طور پر بوقت ضرورت ادائے خدمت سے روک دے جائز نہیں البتہ طبعی ضروریات وغیرہ کی بجاآوری کی گنجائش ہو گی۔[2]

مسئلہ: یہ کسی اور کی نوکری نہیں کر سکتا کیونکہ وقت ان کے لیے مخصوص نہ ہونے کی وجہ سے پورا وقت آقا کے حق کے ساتھ مشغول ہے۔[3]

مسئلہ: اجیر خدمت کو دنوں کے اعتبار سے یا مہینوں کے اعتبار سے تنخواہ ملے گی نہ حاضری مشروط ہے نہ عمل کی مقدار کا حساب کیا جائے گا۔[4]

عمل بتعین وقت: جیسے کہا جائے کہ دوپہر کو پنکھا جھلا کرو یا سونے کے وقت پاؤں دبایا کرو غرضیکہ کاموں کے لیے وقت متعین ہو جائے۔

مسئلہ: انہیں ان وقتوں میں کسی اور طرف توجہ جائز نہیں جب تک اپنی خدمت سے فارغ نہ ہو جائیں۔

مسئلہ: **وقت بتعین عمل**: مثلاً صبح سے دوپہر تک کتابت کیا کرو یا پہرا دو یا دیوار بناؤ۔

مسئلہ: یہ تمام وقت آقا کے حق کی ادائیگی کے لیے متعین ہے وقت فارغ رہے یا مشغول رہے۔

مسئلہ: اجرت وقت کے اعتبار سے ملے گا کام کم ہو یا زیادہ مگر خود کام چوری کرے تو اجرت کے مستحق نہ

---

[1] قد مرّ أنّه يستحقّ الأجر بتسليم نفسه في المدّة.

[2] أيضا.

[3] قدْ مرّ أيضا.

[4] (وإن) (هلك في المدة نصف الغنم أو أكثر) من نصفه (فله الأجرة كاملة) ما دام يرعى منها شيئا، لما مر أن المعقود عليه تسليم نفسه جوهرة، وظاهر التعليل بقاء الأجرة لو هلك كلها وبه صرح في العمادية.(الدر المختار،كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، ج٦ص٧٠).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الإجارة، أحكام الأجير، ج٢ص٣٩٣).

ہو نگے۔[1]

وقت مع العمل: مثلاروزانہ چھ گھنٹے حاضر رہا کرو اس دوران جو کام پیش آئے انجام دو کوئی خاص کام متعین نہیں۔

مسئلہ: اس میں لازم ہے کہ عمل کی جنس معلوم ہو مثلا محرری خدمت گاری معلمی سپاہ گری وغیرہ پس وہ تمام کام جو اس منصب کے مناسب ہے سب انجام دینا ہوں گے منصب کے خلاف کوئی کام کرنا لازم نہیں مثلا معلم سے پہرہ داری یا محرر سے خدمت گاری ہاں البتہ خوشی سے کردے تو کوئی بات نہیں۔[2]

مسئلہ: وقت پورا ہونے کے بعد مزدوری روکھنا جائز نہیں اگرچہ کام باقی رہ جائے۔[3]

تعیین وقت مع تقدیر عمل: مثلاروزانہ چھ گھنٹے حاضر ہو کر اتنی مقدار میں کتابت کردیا کرو اس قدر دیوار بنادیا کرو یہ شرط فاسد ہے تنخواہ اگر وقت کے ساتھ مشروط ہو تو عمل تابع رہے گا اور اگر کام کے ساتھ مشروط ہو تو وقت تابع ہے پس اصل پر تنخواہ ہو اور تابع وصف مرغوب کی طرح ہو ورنہ اجارہ فاسد ہے۔[4]

---

[1] الأجير يستحق الأجرة إذا كان في مدة الإجارة حاضرا للعمل ولا يشرط عمله بالفعل ولكن ليس له أن يمتنع عن العمل وإذا امتنع لا يستحق الأجرة. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ٤٢٥ص:٨٢).

[2] إنه يلزم في إجارة الآدمي تعين العمل، ولكن لا يلزم في الإجارة الواردة على العمل بيان مدتها، أما في الإجارة التي تعقد على المدة فيلزم بيان العمل مع المدة. فإذا لم يبين العمل لا تصح الإجارة.(درر الحكام ،كتاب الإجارة،رقم المادة: ٥٦٢، ج١ص٦٤٧).

لا يجوز عقدها حتى يعلم البدل والمنفعة وبيان المنفعة بأحد ثلاث بيان الوقت وهو الأجل أو بيان العمل والمكان. (الفتاوى البزازية ،كتاب الإجارات، ج٦ص ٥).

[3] ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتعجيل أو باستيفاء المعقود عليه فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فإنه يملكها، كذا في شرح الطحاوي. الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة، الباب الثاني، ج٤ص٤١٣).

والأجرة تجب بالتمكين من استيفاء المنفعة حتى إن من استأجر داراً مدة معلومة وعطلها مع التمكن من الانتفاع يجب الأجر. (الفتاوى البزازية ،كتاب الإجارات، ج٦ص ٥).

[4] تعیینِ وقت مع تقدیر عمل کی صورت میں فساد اجارہ کا قول امام صاحب رحمہ اللہ کا ہے اور یہ بھی تب ہے کہ جس وقت اور عمل میں سے کسی ایک کے معقود علیہ ہونے کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو، اگر کوئی ایسا قرینہ پایا جائے تو اسی کے مطابق دونوں میں ایک کو اصل معقود علیہ قرار دیا جائے گا اور عقد بالاتفاق جائز قرار دیا جائے گا۔

دلالی کے احکام

دلالی جائز ہے اور اس کی اجرت لازم ہے (در مختار)[1] مگر اس کے لیے درج ذیل باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

ا۔ دلال ایک ہی جانب کے لیے کوشش کرے یہ دو رخی دلالی جو ہمارے زمانہ میں عام ہے کہ بائع کا خیال ہے کہ میرا خیر خواہ ہے اور مشتری کا خیال ہے کہ میرا ہی ایک فرد ہے ایسی دلالی دھوکہ اور ناجائز ہے۔[2]

والأصل عند أبي حنيفة: أنه إذا جمع بين الوقت والعمل في عقد الإجارة إنما يفسد العقد إذا ذكر كل واحد منهما على وجه يصلح معقوداً عليه حالة الانفراد الوقت والعمل، أما إذا ذكر العمل على وجه لا يجوز إفراد العقد عليه لا يفسد العقد. (المحيط البرهاني ،كتاب الإجارات، الفصل السادس، ج٧ص ٤٢٧).

في الدر المختار: (أو) استأجر (خبازا ليخبز له كذا) كقفيز دقيق (اليوم بدرهم) فسدت عند الإمام لجمعه بين العمل والوقت ولا ترجيح لأحدهما فيفضي للمنازعة، حتى لو قال في اليوم أو على أن تفرغ منه اليوم جازت إجماعا.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: وقال الصاحبان: هي صحيحة، ويقع العقد على العمل، وذكر الوقت للتعجيل تصحيحا للعقد عند تعذر الجمع بينهما فترتفع الجهالة، وظاهر كلام الزيلعي ترجيح قولهما وهذا إذا أخر الأجرة (كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، ج٦ص٥٩).

وراجع لتفصيل المقام شرح المجلّة للعلامة محمد خالد الأتاسي رحمه الله، ج٢ص٥٩٣).

[1] [تتمة] قال في التتارخانية: وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم. وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام وعنه قال: رأيت ابن شجاع يقاطع نساجا ينسج له ثيابا في كل سنة. (حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة،مطلب في أجرة الدلال ،ج٦ص ٦٣).

في الولوالجية أجرة السمسار والمنادي والحمامي وما أشبه ذلك مما لا تقدير فيه للوقت ولا مقدار لما يستحق بالعقد وللناس فيه حاجة جائزة وإن كان في الأصل فاسدا لحاجة الناس إلى ذلك (انتهى).(غمز عيون البصائر،كتاب الإجارات،ج٣ ص ١٣٠).

[2] یعنی دلال کا فریقین میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو دھوکہ دینا یا غلط بیانی سے کام لینا جائز نہیں، بلکہ پہلے سے پوری بات طے کر دینا ضروری ہے، اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ دلال کے لئے فریقین سے اجرت لینا جائز نہیں کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ اگر دلال باقاعدہ کسی ایک طرف سے عاقد نہ ہو بلکہ محض دونوں کے درمیان چل پھر کر دونوں کو عقد کرنے پر راضی کرے تو دونوں سے بھی اجرت لے لینا جائز ہے اور ایسی صورت میں یہ دونوں کا دلال سمجھا جائے گا، البتہ اجرت پہلے سے طے کرنا ضروری ہے چاہے لم سم ہو یا فیصدی لحاظ سے۔

الدلال إذا باع العين بنفسه بإذن مالكه ليس له أخذ الدالية من المشتري إذ هو العاقد حقيقة وتجب الدلالية على البائع إذ قبل بأمر البائع ولو سعى الدلال بينهما فباع المالك بنفسه يعتبر العرف فتجب الدلالية على البائع أو على المشتري أو عليهما بحسب العرف.(جامع الفصولين، الفصل الرابع والثلاثون، أحكام الدلال، ج٢ص١١٤).

وكذا فی مجمع الضمانات (باب مسائل الإجارة، القسم الثاني، ج١ص٥٤).

۲۔ کام شروع کرنے سے پہلے اجرت مقرر ہونی چاہیے ورنہ اجرت مثل پر فیصلہ ہو گا۔[1]

۳۔ دلال (ایجنٹ) مال فروخت کرنے سے پہلے اجرت کا مستحق نہیں ہوتا اگر چہ محنت شاقہ اٹھائے۔ (عالمگیری)[2]

۴۔ خریدار مال واپس کرے تو بائع دلال سے دلالی کی اجرت واپس لے سکتا ہے اگر بائع خود واپس لے تو دلالی کی اجرت کا واپس لینے کا حق باقی نہ رہا۔ (عقود الدریہ)[3]

۵۔ دلال سے مطالبہ کرنا جائز ہے۔ (ہدایۃ)[4]

---

[1] وشرط جوازه أن تكون العين المستأجرة معلومة والأجرة معلومة.(تحفة الفقهاء ،كتاب الإجارة، ج٢ص ٣٤٧).
ولا تصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة لما روينا، ولأن الجهالة في المعقود عليه وبدله تفضي إلى المنازعة.(الهداية كتاب الإجارات، ج٣ص ٢٣٠).

[2] قال الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالى لا شيء له لأن العادة فيما بين الناس أنهم لا يعطون الأجر إذا لم يتفق البيع وهو المختار. كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة، الباب السادس عشر، ج٤ص ٤٥١).
سُئل بعضهم عمن قال لدلال اعرض أرضي على البيع وبعها ولك أجر كذا فعرض ولم يتم البيع ثم إن دلالا آخر باعها فللدلال الأول أجر بقدر عمله وعنائه وهذا قياس والاستحسان لا أجر له إذ أجر المثل يعرف بالتجارة والتجار لا يعرفون لهذا الأمر أجرا وبه نأخذ وفي المحيط وعليه الفتوى.(تنقيح الفتاوى الحامدية ،كتاب البيوع، ج١ص٢٤٧).

[3] *بظاہر یہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ کا تسامح معلوم ہوتا ہے کیونکہ دلال کا کام مطلوبہ چیز کو فروخت کرنا ہے اس کی اجرت کا استحقاق بھی اسی کے ساتھ متعلق ہے، لہٰذا ایک مرتبہ فروخت کر دینے کے بعد اگر اصل بائع و مشتری عقد ختم بھی کریں تو بھی دلال کی اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے "عقود الدریہ" کا حوالہ دیا ہے اس سے بظاہر علامہ شامی رحمہ اللہ کی کتاب "العقود الدریۃ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ" مراد ہے، اس میں بھی یہی لکھا ہے، ملاحظہ فرمائیں:*
(سئل) في دلال سعى بين البائع والمشتري وباع البائع المبيع بنفسه والعرف أن الدلالة على البائع ثم إن المشتري رد المبيع على البائع قام البائع يطالب الدلال بالدلالة التي دفعها له فهل ليس له ذلك؟ (الجواب) : نعم ذكر في الصغرى دلال باع ثوبا وأخذ الدلالة ثم استحق المبيع أو رد بعيب بقضاء أو غيره لا تسترد الدلالة وإن انفسخ البيع؛ لأنه لم يظهر أن البيع لم يكن فلا يبطل عمله عمادية من أحكام الدلال. كتاب البيوع، ج١ص٢٤٧).
"ص": لو استحق المبيع أو رد بعيب بقضائ أو بغيره لا يسترد الدلالية ولو انفسخ البيع إذ لم يظهر أن البيع لم يكن فلا يبطل عمله. (جامع الفصولين، الفصل الرابع والثلاثون، أحكام الدلال، ج٢ص١١٤).
(المادة ٥٧٩) لو ظهر مستحق بعد أخذ الدلال أجرته وضبط المبيع أو رد بعيب لا تسترد أجرة الدلال. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة٥٧٩،ص: ١٠٧).

[4] وعلى هذا سائر الوكالات والبياع والسمسار يجبران على التقاضي لأنهما يعملان بأجر عادة. (الهداية،كتاب المضاربة، فصل في العزل والقسمة، ج٣ص ٢٠٧).

۶۔ دلالی کی اجرت کی نسبت بعض فقہاء عدم جواز کے قائل ہیں اور بعض جواز پر مصر بظاہر ممانعت کے لیے کوئی دلیل کامل نہیں۔ [1]

ملازمت کے احکام

ملازمت کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ ملازم صرف ایک ہی معین وقت کا پابند ہے باقی اختیار ہے جو چاہے کرے جیسے معلم (استاذ) وغیرہ یہ اپنے وقت معین میں اجیر خاص کی طرح ہیں، معاوضہ لے کر کام کرے تو کوئی ایسی نوکری کرنا یا اجرت پر کام کرنا یا بدون اجازت سفر کرنا جس سے ضرورت کے وقت کام میں حرج لازم آئے، جائز نہیں۔ [2]

مسئلہ: تنخواہ حاضری پر مرتب نہ ہو، ان کی چھٹیاں مالک کی رضامندی پر ہے چاہے رخصت دے چاہے کام لے اور ان کے لیے ایسی کوئی مشغولیت اختیار کرنا یا سفر پر جانا جس سے آقا کے کام میں حرج لازم آئے، جائز نہیں کیونکہ تمام وقت آقا کے حق کے ساتھ مشغول ہے۔

مسئلہ: ان دونوں قسموں کے ملازموں کو آقا کی تعظیم اور حق نمک کا لحاظ رکھنا اولی ہے ہر وقت خیر خواہی پر توجہ اور بد خواہی سے اجتناب کرنا لازم ہے۔

مسئلہ: زید بکر کا مزدور دیوار بنانے کے لیے مقرر ہوا ہے اچانک بکر کا گھوڑا یا کوئی اور جانور کھل گیا بھاگ رہا ہے اس کو پکڑنے کے لیے کوشش کرنا زید پر لازم نہیں البتہ دوسرے اور تیسرے قسم کے ملازم ہوں تو ان پر لازم ہوگا کہ ایسے موقع پر آقا کے ساتھ تعاون کریں۔

مسئلہ: اگر رات کو معلوم ہوا کہ آج آقا کے گھر میں فلاں طریقے سے چوری ہونے والی ہے تو ملازم قسم دوم اور سوم پر لازم ہے کہ چوری سے حفاظت اور آقا تک اطلاع پہنچانے کی مکمل کوشش کریں کیونکہ آقا نے

---

[1] جن حضرات فقہاء کرام نے اس کی ممنوع ہونے کا قول اختیار فرمایا، ان کی پیش نظر ایک تو یہ بات تھی کہ اگر دلال کو اجیر مشترک قرار دیکر خریدنے یا فروخت کرنے کو معقود علیہ بنایا جائے تو یہ ایسے افعال ہیں جن کے کرنے پر اجیر خود قادر نہیں اور دلال میں عموماً یہی صورت رائج ہے، دوسرا اشکال ان کا فیصدی لحاظ سے دلال کے لئے اجرت مقرر کرنے میں تھا کہ اجارہ میں لم سم اجرت مقرر کر دینی ضروری ہے فیصدی تعیین کافی نہیں، یہ دونوں اشکال اپنی جگہ درست اور اجارہ کے عام اصول کے مطابق ہیں لیکن متاخرین فقہاء کرام نے ان جیسے صورتوں کی کثرت اور لوگوں کی حاجت کی وجہ سے اس کی گنجائش دیدی۔

[2] لأنّه إمّا يؤدّي إلي فسخ العقد الّلازم وإمّا إلى التّقصير في تسليم العمل المعقود عليه ثمّ إلى الغشّ والتّلبيس فيه.

پورے وقت کی قیمت ادا کر دی ہے بخلاف پہلی قسم کے ملازم اور اجیر خاص کے ان کے ذمہ یہ تدبیر لازم نہ ہو گی۔

مسئلہ : جن کاموں کی صراحت کے ساتھ اجازت ہے یا ممانعت ہے ان کی پابندی کرنا لازم ہے بشرطیکہ وہ کام شریعت کے خلاف نہ ہو اور جن کاموں کے متعلق صراحۃ کوئی تذکرہ نہ ہو ان کے متعلق عرف پر عمل کیا جائے گا۔[1]

مسئلہ : موت پر بیعت کرنا جائز ہے جیسا کہ فوجی سپاہی حکومت سے عہد کرتے ہیں اور اس کے جواز کی دلیل بیعت رضوان ہے جس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے موت پر بیعت کی موت پر بیعت ہونے کا مقصد کمال ثابت قدمی اور اظہار شجاعت و جانثاری ہے اس سے خواہ مخواہ مر جانا لازم نہیں آتا کہ ایسا بیعت کرنے والا اس موقع پر ضرور مرے گا۔[2]

مسئلہ : فوجی نے عہد تو کیا موت آنے تک لڑوں گا پھر موت نظر آنے پر فرار ہو گیا تو اس کی اجرت ساقط نہ ہو گی کیونکہ ثابت قدم رہنا یا راہ فرار اختیار کرنا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے حالت اضطرار میں عقد کا اثر کمزور ہو جاتا ہے۔[3]

---

[1] (المادة ٦٠٣) حركة المستأجر على خلاف المعتاد تعد ويضمن الضرر والخسارة التي تتولد معها مثلا لو استعمل الثياب التي استكراها على خلاف عادة الناس وبليت يضمن.... (المادة ٦٠٨) تعدي الأجير هو أن يعمل عملا أو يتحرك حركة مخالفتين لأمر الآجر صراحة أو دلالة مثلا بعد قول المستأجر للراعي الذي هو أجير خاص ارع هذه الدواب في المحل الفلاني ولا تذهب بها إلى محل آخر فإن لم يرعها الراعي في ذلك المحل وذهب بها إلى محل آخر ورعاها يكون متعديا فإن عطبت الدواب عند رعيها هناك يلزم الضمان على الراعي. (مجلة الأحكام العدلية ،ص:١١٢).

[2] فالبيعة على أن لا نفر معناه الصبر حتى نظفر بعدونا أو نقتل وهو معنى البيعة على الموت أي نصبر وإن آل بنا ذلك إلى الموت لا أن الموت مقصود في نفسه وكذا البيعة على الجهاد أي والصبر فيه. (شرح النووي على مسلم ، كتاب الإمارة،باب استحباب مبايعة الإمام الجيش عند إرادة القتال).

وهذا النزاع من باب النزاع اللفظي. فمن أنكر البيعة على الموت، أراد أن الموت ليس مقصودا؛ فالبيعة وقعت على عدم الفرار، ومن أثبته لم ير بها إلا عدم الفرار، وإن أشرفوا على الموت، فلا نزاع بعد الإمعان. (فيض الباري،الجهاد والسير، باب البيعة فى الحرب أن لا يفروا ،ج٤ص ٢٠٨).

[3] اجیرِ خاص ہو یا اجیرِ مشترک، وہ تبھی اجرت کا مستحق ہو گا جب وقتِ مقررہ میں تسلیمِ نفس کرے یا متعلقہ کام سرانجام دے، اگر اجیرِ خاص تسلیمِ نفس نہ کرے اور اجیرِ مشترک اپنا مفوّضہ کام پورا نہ کرے تو اجرت کا مستحق نہیں ہو گا چاہے حالتِ اضطرار میں ہو یا حالتِ اختیار میں، البتہ

مسئلہ: ملازم ایسا مجبور نہیں کہ آقا جس کا چاہے ملازم کو اس کا تابعدار بنادے ہاں البتہ محکمہ جات اور دفاتر جہاں یہ ترتیب قائم ہے کہ اوپر کا ذمہ دار افسر وغیرہ کی تابعداری ماتحت والوں پر لازم ہو گی وہاں عذر قابل سماعت نہیں۔ [1]

کون سی ملازمت حلال ہے؟

پھر ملازمت کی چار قسمیں ہیں:

ا۔ کسی کی ذاتی خدمت کے لیے ملازمت جیسے اس کی خدمت گزاری یا باورچی گھر (یعنی اس کے لیے کھانا وغیرہ پکانے کے لیے) ایسی نوکری جائز ہے ملازم چاہے مسلمان ہو یا کافر متقی ہو یا فاسق وفاجر، [2] لیکن حرام کام کرنے کے لیے ملازمت کرنا جائز نہیں، نوکری کے عذر سے حرام کا ارتکاب کرنا یا مدد کرنا جائز نہیں۔

حالتِ اضطرار میں چونکہ مجبوری ہے اس لئے عقدِ اجارہ توڑنے اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کا گناہ شاید نہ ہو۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر اجارۃ الاعیان میں اضطراراً عینِ مستاجرہ کرایہ دار کے قبضہ سے مکمل طور پر نکل جائے تو باقی ماندہ مدت کے مطابق اجرت کا استحقاق باقی نہ رہے گا

أما إذا حدث مانع يمنع من الانتفاع بعد التسليم في المدة كما إذا غصبه غاصب أو حدث الإباق أو المرض المعجز عن الانتفاع أو انقطاع الماء في الرحا أو الشرب في الأرض فإنه تسقط الأجرة في المستقبل ما لم يسلم إليه ويلزمه أجر ما مضى لأن الأجر يجب شيئا فشيئا بمقابلة استيفاء المنافع. تحفة الفقهاء ،كتاب الإجارة، ج٢ص٣٥٠.

الغصب يسقط الأجرة عن المستأجر إلا إذا أمكن إخراج الغاصب بشفاعة أو بحماية كما في التتارخانية والقنية. الأشباه والنظائر لابن نجيم ،كتاب الإجارات،ص:٢٢٨.

[1] لأنّه يكونُ متعارفاً إذاً فيُجعلُ داخلا تحت العقد.

الدر المختار: (والثاني) وهو الأجير (الخاص) ويسمى أجير وحد (وهو من يعمل لواحد عملا مؤقتا بالتخصيص ويستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة أو) شهرا (لرعي الغنم) المسمى بأجر مسمى. وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله للخدمة) أي لخدمة المستأجر وزوجته وأولاده ووظيفته الخدمة المعتادة. (كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، ج٦ص٦٩).

[2] مسلمان کے لئے کسی کافر شخص/ادارے کی ملازمت کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ جس کام کے لئے کافر کی ملازمت اختیار کی جارہی ہے، اس میں ذلت نفس نہ ہو، اور شرعاً جائز ہو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہ ہو۔

المسلم إذا أجر نفسَه من كافر ليخدمه جاز ويكره قال الفضلي لا يجوز للخدمة وما فيه الإذلال بخلاف الزراعة والسقي. كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة، الباب الحادي عشر، ج٤ص٤٣٥).

قال في الخانية: أجر نفسه من نصراني إن استأجره لعمل غير الخدمة جاز وإن أجر نفسه للخدمة قال الشيخ الإمام أبو بكر محمد بن الفضل لا يجوز وذكر القدوري أنه يجوز (انتهى)

۲۔ایسی سرکاری ملازمت جن سے لوگوں پر ظلم کرنے کی نوبت نہ آتی ہو،وہ بھی جائز ہے، جیسے خزانچی، چپراسی، منشی، نقل نویس، دفتر کا چوکیدار، محکمہ ڈاک اور ریلوے کی ملازمت وغیرہ۔

۳۔ وہ ملازمت جس میں ایسے قانون کی اتّباع کرنا پڑتی ہے جس میں حرام وحلال دونوں ہوں جیسے ظلم وزیادتی کے سرکاری حکم نامے آگے پہنچانے والے، یا کچھ کچھ اس میں مدد کرنے والے۔

۴۔ وہ سرکاری ملازمت جس میں ایسے ظالمانہ یا مخلوط قانون کے حکم کرنے اور ان کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ہو جیسے عدالت کے حکّام (جج وغیرہ) اور ان کے معاونین۔

اب چوتھی قسم کے حکام ان تمام قوانین کے اجراء میں گنہگار ہوں گے جو ان سے براہِ راست صادر ہوں یا بواسطہ، اور ایسے ظالمانہ قوانین کے اجرا کی وجہ سے فاسق وفاجر اور گناہ کبیرہ کا[1] مرتکب قرار پائیں گے مگر نفسِ اجرت حرام نہیں ہوگی۔ اور قسمِ سوم والوں کی حالت مشکوک ہے اور کراہت سے خالی نہیں ہے [2]لیکن کسی کی نوکری حرام ہونے یا حلال یا مکروہ ہونے کا قطعی فیصلہ اس نوکری کا شرعی جائزہ لینے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے، عام حکم سے اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ناجائز ملازمت کی صورتیں

فاسق کی گواہی سے فیصلہ کرنے والا اور عادل گواہوں کی گواہی کو فضول بحث ومباحثہ کے ذریعے رد کرنے والا سود کی ڈگری دینے والا (یعنی حکم نامہ جاری کرنے والا) کسی کی جان یا مال کو ناحق مٹانے والا اور ناجائز طور پر جائیداد پر قبضہ کرنے والے یہ سارے کام حرام ہیں ایسے کاموں کے حکم دینے والوں کی ملازمتیں بھی ناجائز ہیں ان سب میں حکم جاری کرنے کی نوکری خصوصا فوجداری مقدمات میں پولیس کی نوکری، چنگی وصول کرنے کی نوکری اور سزا دینے کی نوکری زیادہ قابلِ افسوس ہے۔ [3]

وفي الذخيرة في الفصل السابع من الإجارة في الخدمة المسلم: إذا أجر نفسه من كافر للخدمة يجوز باتفاق الروايات لأنه وإن كان يستخدمه قهرا بعقد الإجارة إلا أنه يستوجب عليه عوضا من كل وجه على سبيل القهر فينتفي الذكر (انتهى) وينبغي اعتماد هذا كما لا يخفى.(غمز عيون البصائر ،كتاب الإجارات، ج٣ ص ١٢١).

[1] یہاں لفظِ "کے "ہوناچاہئے۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: تكملة عمدة الرّعاية على شرح الوقاية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، ج٣ص٣٠٢.

[3] هذه الصّور كلُّها من جنس الإجارة على المعاصي وقد مرّ من قبلُ فليراجعْ.

باغی حاکم کی فوجی نوکری کا حکم

ایسے باغی حاکم کی فوجی نوکری ہمیشہ حرام ہے جو امام عادل سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے یا کفار کی مدد سے مسلمانوں کی دھمکی دیتا ہے کیونکہ امن کی حالت میں تو اس کی فوج اللہ والوں کو ڈراتی ہے اور ان کو ان کے مبارک خیالات وعقائد سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے اور حالت جنگ میں تو علی الاعلان کلمہ کفر اور علم بغاوت بلند کرتے ہیں اسلام اور اہلِ اسلام سے کھلم کھلا دشمنی پر اتر آتے ہیں (العیاذ باللہ) مگر ایسی نوکریاں بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خدمات کی تاویل میں قابل اجرت ہیں اگرچہ گناہ سے خالی نہیں صاحبین رحمھم اللہ کے نزدیک نہ ایسی نوکری کا گناہ ساقط ہو گا نہ اجرت حلال ہو گی اور خاص اس کام کی اجرت بھی حرام ہے اللہ تعالی سے ڈرنے والوں ایسی نوکری سے اجتناب کرو۔[1]

ایامِ تعطیلات کی تنخواہ کا حکم

ا۔ تنخواہوں کی نوکری کا حساب انہی مہینوں سے ہو گا جو آپس میں طے پائے اگر معاہدہ کے وقت اس کا ذکر نہ ہوا اور عرف میں غالب بھی کوئی نہ ہو تو اسلامی مہینوں سے حساب ہو گا۔[2]

---

[1] ومن استأجر حمالا يحمل له الخمر فله الأجر في قول أبي حنيفة وعند أبي يوسف، ومحمد لا أجر له كذا ذكر في الأصل، وذكر في الجامع الصغير أنه يطيب له الأجر في قول أبي حنيفة، وعندهما يكره لهما أن هذه إجارة على المعصية؛ لأن حمل الخمر معصية لكونه إعانة على المعصية... ولأبي حنيفة إن نفس الحمل ليس بمعصية بدليل أن حملها للإراقة والتخليل مباح. (بدائع الصنائع ،كتاب الإجارة، شرائط الإجارة، ج٤ ص١٩٠).

إذا استأجر الرجل حمالاً ليحمل له خمراً، فله الأجر في قول أبي حنيفة، وقال أبو يوسف ومحمد: لا أجر له. فوجه قولهما: أن حمل الخمر معصية؛ لأن الخمر يحمل للشرب والشرب معصية، وقد لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم حامل الخمر والمحمول إليه، وذلك يدل على كون الحمل معصية، وأبو حنيفة رحمه الله يقول يحمل للإراقة وللتخليل كما يحمل للشرب، فلم يكن متعيناً للمعصية، فيجوز الاستئجار عليه. (المحيط البرهاني ،كتاب الإجارات، الفصل الخامس عشر، ج٧ص٤٨١).

[2] اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر عاقدین نے عقد کرتے وقت کچھ طے کیا کہ عقد کی ابتدا کب سے ہو گی؟ تب تو اسی کا اعتبار ہے اور اگر انہوں نے ایسا کچھ طے نہیں کیا تو عقد کے وقت سے ہی مدت شروع ہو جائے گی جیسا کہ بیع میں اگر متعاقدین کوئی مدت مقرر کریں تو وہی مدت معتبر ہو گی اور بیع اس تک مؤجل سمجھی جائے گی ورنہ تو عقد ہوتے ہی ثمن لازم ہو گا کیونکہ عقد اجارہ ہو یا بیع، دونوں عقود معاوضہ ہیں اور عقد معاوضہ کا یہی مقتضی ہے۔

(وابتداء المدة وقت العقد) يعني ابتداء مدة الإجارة من وقت العقد؛ لأن الأوقات كلها سواء في حكم الإجارة وفي مثله يتعين الزمان الذي يلي العقد.. هذا إذا كان العقد مطلقا من غير تعيين المدة، وإن بين المدة تعين ذلك وهو الظاهر. تبيين الحقائق ،كتاب الإجارة،باب الإجارة الفاسدة،ج٥ ص ١٢٣.

۲۔ عرف پر عمل در آمد نوکر رکھنے والے سے معاملہ طے کرنے سے زیادہ معتبر ہے۔[1]

۲۔ ایامِ تعطیلات کے بارے میں وہ عرف معتبر ہو گا جو متفقہ اور عقل وانصاف کے خلاف نہ ہو لہذا جو عرف تمام ملک میں یکساں نہ ہو یا جو عرف نقل وعقل کے خلاف ہو وہ معتبر نہ ہو گا۔[2]

۵۔ ایامِ تعطیل اور رخصت اگر مشروط اور معروف ہوں تو وہ ایامِ خدمت کے تابع ہیں ورنہ آقا کی طرف سے تبرع اور احسان ہے لہذا جب خدمت کے ایام پورے ہوں گے تو تعطیل بھی پوری ملے گی ورنہ حساب سے کم ہو جائے گی۔ (کیونکہ اگر تعطیلات کی تنخواہ انعام ہے تو وجوب نہ ہونا چاہیے اور اگر مستقل ہے تو عوض کے بغیر معوض نہیں مل سکتا جیسا کہ یہ نہیں ہو سکتا ایک ملازم ۲۶ دن غیر حاضر رہ کر ۴ دن کی چھٹیوں[3] کی تنخواہ لے لے) مثلاً ملازمت میں زید کی جمعہ کے دن رخصت ہوتی ہے غالباً اس کی خدمت کے ایام ۲۶ دن ہوئے اب اگر تیرہ دن حاضر رہا تو آدھی تنخواہ اس کو ملے گی اور ۲۶ دن کام کرے تو پوری تنخواہ ملے گی۔[4]

5۔ یومِ تعطیل کی تنخواہ کے مستحق ہونے کا سبب مجموعہ ایام خدمت ہے اور تنخواہ کا وجوب ادا اجزء متصل سے

ثم يعتبر ابتداء المدة مما سمى، وإن لم يسم فمن وقت العقد. اللباب في شرح الكتاب ،كتاب الإجارة، ج۲ص ۹۹.

وكذا في مجلة الأحكام العدلية (الباب الرابع في بيان المسائل التي تتعلق بمدة الإجارة،ص: ۹۲).

[1] بظاہر بات بر عکس ہے کیونکہ عرف کی تعیین میں نزاع ہو جانے کا امکان ہے جبکہ پوری طرح معاملہ طے کرنے میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے، اصل کتاب میں عبارت یہ ہے: عرف وعمل در آمد نوکر رکھنے والے کا نوکر سے زیادہ معتبر ہے"(ص ۱۳۲) بظاہر عبارت میں کچھ سقط ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] قد مرّ في مبحث العرف. فليراجع.

[3] مطبوعہ نسخہ میں عبارت یہ ہے لیکن بظاہر یہاں "چھٹیوں" کے بجائے "حاضری" کا لفظ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

[4] المسألة على وجهين: فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شيء، وإلا فينبغي أن يلحق ببطالة القاضي، وقد اختلفوا في أخذ القاضي ما رتب له من بيت المال في يوم بطالته.. وفي المنية: القاضي يستحق الكفاية من بيت المال في يوم البطالة في الأصح، واختاره في منظومة ابن وهبان، وقال: إنه الأظهر فينبغي أن يكون كذلك في المدارس؛ لأن يوم البطالة للاستراحة، وفي الحقيقة يكون للمطالعة والتحرير عند ذي الهمة. (الأشباه والنظائر، القاعدة السادسة: العادة محكمة،ص:۸۱).

وفي الدر المختار:هل يأخذ أيام البطالة كعيد ورمضان لم أره وينبغي إلحاقه ببطالة القاضي. واختلفوا فيها والأصح أنه يأخذ؛ لأنها للاستراحة أشباه.

وفي رد المحتار بعده: لو قال يعطى المدرس كل يوم كذا فينبغي أن يعطى ليوم البطالة المتعارفة بقرينة ما ذكره في مقابله من البناء على العرف، فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (كتاب الوقف،مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة،ج٤ ص ۳۷۲).

وابستگی ہے [1] مثلاجمعہ کے دن رخصت کا دن ہے جب ہفتہ سے جمعرات تک نوکری کی ہو تو جمعرات ختم ہوتے ہی جمعہ کے دن کی اجرت واجب ہوگی اور ایسی دوسری تعطیلات عیدین نصف شعبان وغیرہ اپنی مہینوں کی طرف منسوب ہے اور یوم سابق سے متعلق ہیں لہذا عیدالاضحی کی چھٹی نودن قبل کے مجموعہ سے اور عیدالفطر کی تعطیل رمضان کے آخری دن یا رؤیت ہلال سے متعلق ہے۔

ایام تعطیلات شمار کرنے کی آٹھ صورتیں

ا۔ابتداء میں حاضر تھا جیسے ہفتہ سے پیر تک۔

۲۔آخر میں حاضر رہا جیسے منگل سے جمعرات تک۔

۳۔درمیان ہفتہ غیر حاضر رہا پر منگل بدھ کام پر آیا اور جمعرات کو آیا ان تینوں صورتوں میں جمعہ کے پورے دن کی رخصت نہیں ملے گی بلکہ آدھے دن کی رخصت ملے گی۔

۴۔آخری دن یعنی جمعرات کے روز ملازمت ملی۔

۵۔پہلا دن نوکر تھا پھر برطرف ہوا آخری دن ملازمت پھر بحال ہو گئی ان دونوں صورتوں میں چھٹی پوری ملے گی کیونکہ وجوب ادا پایا گیا اس کے حق وجوب اسی دن سے متعلق تھا لیکن درمیان میں جو غیر حاضر رہا اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے کیونکہ اس کے حق میں وجوب ادا پورے مجموعہ سے متعلق ہو گا عقد کا اثر باقی رہنے کی وجہ سے لہذا اس کو جمعہ کی تنخواہ ایام حاضری کے بقدر ہی ملے گی۔ [2]

۶۔آخری دن یعنی جمعرات کی صبح کو ملازمت سے برطرف ہوا تو اس کو تعطیل یعنی جمعہ کے دن کی تنخواہ نہیں ملے گی کیونکہ اس کے حق میں وجوب ادا ثابت نہ ہوا اگر آخری دن غیر حاضر ہوتا تو جمعہ کے دن کو چھ حصے کر کے ایک حصہ کی تنخواہ کم ملتی۔

۷۔زید نے تین دن کی رخصت لی تو رخصت کے ایام کی تنخواہ ملے تو جمعہ کے دن کی بھی پوری تنخواہ ملے گی

---

[1] لأنّ التّعطيلات للإستراحة كما مرّ.

[2] یہ تب ہے کہ جب پہلے سے ایسا کوئی ضابطہ مقرر ہو جائے ورنہ عرف پر دار مدار ہو گا اور ہمارے زمانے میں عرف یہ ہے کہ کام کے دنوں میں غیر حاضری کی وجہ سے جمعہ یا اتوار کی چھٹی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے، نیز باقی صورتوں میں بھی یہ تفصیل پیش نظر رہے۔

اگر یہ رخصت بلا تنخواہ ہے تو جمعہ کے دن کی آدھی تنخواہ ملے گی۔[1]

۸۔اگر عید وغیرہ کی تعطیلات میں چھٹی کے متصل دن حاضر تھا اگر شروع میں مجموعہ سے کچھ کمی ہے مثلا ذی الحجہ کی پہلی سے چوتھی تک غیر حاضر رہا پھر پانچویں سے نویں تک حاضر رہا تو مناسب یہ ہے کہ عید کی چھٹی میں کمی نہ کی جائے کیونکہ ان تعطیلات میں آقا کی طرف سے انعام و تبرع ہونے کا شائبہ ہے اور ملازمت کی طرف سے استحقاق بدل و شرط ہے۔

(فائدہ) تنخواہ کا حساب ایام خدمت کے اعتبار سے ہوگا جو ایام تعطیلات کو وضع کر لینے کے بعد باقی رہیں گے مثلا زید کی ماہانہ تنخواہ چار ہزار ہے مہینہ ۲۹ کا ہوا اور جمعے چار آئے اس طرح خدمت کے ایام ۲۵ دن رہے یومیہ تنخواہ ۱۶۰ ایک سو ساٹھ روپے دی جائے گی اگر اسی صورت میں زید ۴ دن غیر حاضر رہا تو چھ سو چالیس روپے وضع کر لیے جائیں گے۔

عقدِ اجارہ کی شرائط

ملازمت کا معاملہ طے کرتے وقت امور ذیل کی صراحت ہونی چاہیے۔

۱۔اجرت نقدی یا مثلی کے لیے نوع وصف و مقدار بیان کرنا مثلا نقدی ہو تو اشارہ سے متعین کرنا کہ پانچ روپے چہرہ دار (یعنی چاندی کا چہرہ والا سکہ) یا یہ چاقو یا وہ صندوق دیں گے مثلی ہو تو مثلا دو من گندم فلاں قسم کی دیں گے۔[2]

۲۔عمل معقود علیہ اگر متعین چیز ہے مثلا یہ مکان یہ گھوڑا اس کو دکھا دینا اگر دیکھا ہوا ہو تو کسی نشان سے معین کر دینا شرط ہے اگر معین نہ ہو تو اوصاف کے ذریعے معین کرنا ضروری ہے جیسے ان اوصاف کا مکان اسی طرح کی گاڑی وغیرہ تاکہ بعد میں جھگڑے کا احتمال نہ رہے۔[1]

---

[1] راجع الحاشية السّابقة.

[2] وشرط جوازه أن تكون العين المستأجرة معلومة والأجرة معلومة والمدة معلومة بيوم أو شهر أو سنة لأنه عقد معاوضة كالبيع .. إلا أن المعقود عليه ههنا هو المنافع فلا بد من إعلامها بالمدة والعين والذي عقدت الإجارة على منافعه. (تحفة الفقهاء ،كتاب الإجارة، ج٢ص ٣٤٧).

وكذا في الهداية (كتاب الإجارات ،ج٣ص ٢٣٠).

۳۔ معقود علیہ کی جنس نوع اور وصف کی صراحت کر لینا جیسے عربی پڑھانے کا استاذ یا فارسی پڑھانے کا یا اردو کا یا فلاں محکمے کی محرری فلاں عدالت کی وکالت اگر مکان کرایہ پہ لیا ہے تو صراحت ہو وہ اس میں سکونت اختیار کرے گا یا کوئی فیکٹری وغیرہ لگائے گا اگر زمین کرایہ پر لیا ہے تو زراعت مقصود ہے یا کوئی اور کام اگر زراعت ہوگی تو کس چیز کی ہوگی گندم چاول بینگن وغیرہ گاڑی کرایہ کے لیے یا کوئی سامان لادنے کے لیے غرض یہ کہ وہ تمام باتیں صراحت کردینی چاہیے جن کے متعلق بعد میں جھگڑا پیش آنے کا احتمال ہو۔[2]

۴۔ مقدار یعنی وقت مقررہ مثلاً روزانہ چار گھنٹے کام لیا جائے گا یا مکان پر ایک سال تک قبضہ رہے گا یہ گاڑی پورا دن میرے استعمال میں رہے گی یا فلاں جگہ تک جانا ہوگا یہ کرتہ سی کر تیار کردو یہ دیوار پوری اٹھادو خلاصہ یہ کہ ایسی مکمل تصریح ہونی چاہیے کہ بعد میں نزاع کا احتمال نہ رہے[3]۔

نکتہ: جب معقود علیہ عرض حادث ہے (یعنی وقتاً فوقتاً وجود میں آنے والا) اور طریق استعمال مختلف تو ایسی صورت میں مکمل طور پر متعین کرنا اور اندازہ لگانا متعذر ہے اور وجود نفع اور طریق استعمال اور مقدار کا انحصار

---

[1] منها: بيان محل المنفعة حتى لو قال: أجرتك إحدى هاتين الدارين أو أحد هذين العبدين، أو قال: استأجرت أحد هذين الصانعين لم يصح العقد؛ لأن المعقود عليه مجهول لجهالة محله جهالة مفضية إلى المنازعة فتمنع صحة العقد. (بدائع الصنائع ،كتاب الإجارة، شرائط الصحة، ج٤ص١٨٠).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الإجارة، الباب الأول، ج٤ص ٤١١).

[2] ضابطہ یہ ہے کہ جہاں عین مستاجرہ کے منافع اور طریقہ استعمال میں معتدبہ تفاوت ہو کہ بعض صورتیں مضر ہو اور بعض مضر نہ ہوں، تو ایسی صورت میں منافع یا طریقہ استعمال کی وضاحت کردینا ضروری ہے تاکہ نزاع کی نوبت نہ آئے اور جہاں کہیں منافع میں اس قدر شدید تفاوت نہ ہو تو وہاں اس کو بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ مطلق عقد کافی ہے اور کرایہ دار کو عام عرف کے مطابق استعمال کرنے کا حق حاصل ہوگا۔وأما بيان ما يستأجر له في إجارة المنازل فليس بشرط حتى لو استأجر شيئا من ذلك ولم يسم ما يعمل فيه جاز، وأما في إجارة الأرض فلا بد من بيان ما يستأجر له وفي إجارة الدواب من بيان المدة أو المكان ومن بيان ما يستأجر له من الحمل والركوب. (كتاب الإجارة، الباب الأول، ج٤ص ٤١١).

والتفصيل في بدائع الصنائع (كتاب الإجارة، شرائط الصحة، ج٤ص١٨٢). ودرر الحكام شرح مجلة الأحكام، رقم المادة: ٤٥١، ج١ص٥٠٤).

[3] وشرط جوازه أن تكون العين المستأجرة معلومة والأجرة معلومة والمدة معلومة بيوم أو شهر أو سنة لأنه عقد معاوضة كالبيع .. إلا أن المعقود عليه ههنا هو المنافع فلا بد من إعلامها بالمدة والعين والذي عقدت الإجارة على منافعه. (تحفة الفقهاء ،كتاب الإجارة، ج٢ص ٣٤٧).قال شمس الأئمة السرخسي في مبسوطه لا بد من إعلام ما يرد عليه عقد الإجارة على وجه تنقطع به المنازعة ببيان المدة والمسافة والعمل ولا بد من إعلام البدل وكذا في سائر المعتبرات. (حاشية الشرنبلالي على الدرر والغرر ،كتاب الإجارة، ج٢ص٢٢٥).

کرنا کہ اس کے خلاف نہ ہونا ناممکن ہو ایسی صورت میں اس قدر وضاحت کافی ہے جو آسانی کے ساتھ ہو سکے اور عرفا نزاع سے بچا جا سکے۔[1]

سوال ۵ : بعض کام خصوصا ایسے ہیں جن میں تصریح غیر متعارف بلکہ سخت مضر ہے جیسے خدمت گاری سپاہی وغیرہ جن سے مختلف قسم کے کام مختلف طریقے سے لیے جاتے ہیں جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں ہے کہ استاذ رکھتے وقت طلباء کی تعداد بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

سوال ۵ : بعض اجرتیں بھی مزید صراحت کو قبول نہیں کرتی جیسا کہ بعام لباس وغیرہ گو اس کے جواز میں کلام ہے مگر ضرورت داعیہ اور عرف مستمرہ کی وجہ سے اس کے جواز میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا ایک مرتبہ اس کا اثر مسئلہ ظئر (دودھ پلائی کا مسئلہ) میں ظاہر ہو چکا ہے۔

اس کی چار صوتیں ہیں۔

الف: بتا دیا جائے کہ لباس اور کھانا جو دیا جائے گا وہ اس قیمت کا ہو گا۔

ب: یہ بتا دیا جائے کہ جو کھانا ہم کھائیں گے وہ تمہیں بھی دیا جائے گا۔

ج: یہ بتا دیا جائے کہ جو کھانا ہمارے دوسرے ملازم کھائیں گے وہ تمہیں بھی ملے گا۔

د: اس علاقہ میں یا اس قسم کے ملازم کو جو کھانا ملتا ہے وہ تمہیں بھی دیا جائے گا یہ سب صورتیں جائز ہے۔[3]

---

[1] قد مرّ أنفا فليراجع.

[2] وإذا استأجر المعلم بأجر معلوم ولم يبين عدد الصبيان يجوز. كذا في الملتقط. (الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة، الباب السادس، ج٤ص ٤٤٩).

استأجر المعلم بمعلوم يجوز وإن لم يبين عدد الصبيان.(الفتاوى البزازية ،كتاب الإجارة، الأعمال التي تصح...٦ / ٢٢)

[3] قدیم فقہاءِ کرام کے نزدیک مستاجر کے لئے اجیر کو کھانا کھلانا ضروری نہیں اور مسئلہ ظئر کے علاوہ اجارہ کے جن مسائل مستاجر پر اجیر کو کھانا کھلانے کی شرط لگائی جائے، فاسد ہے، البتہ مجلۃ الأحکام میں عرف کے مطابق اس بات کی گنجائش دی کہ جہاں اجیر کو کھانا کھلانے کا عرف ہو وہاں مستاجر پر عام متوسط کھانا کھلانا لازم ہو گا۔

وقال أبو حنيفة: كل إجارة فيها رزق الغلام أو علف الدابة فإنه فاسد لا يجوز؛ لأن هذا مجهول. إلا أنه كان يستحسن ذلك في باب واحد، في طعام الظئر فإنه كان أبو حنيفة يجيزه. وقال أبو يوسف ومحمد: الظئر وغيرها سواء، وهو فاسد. الأصل للشيباني، باب الإجارة الفاسدة، ج٤ص٢١.

وعلى هذا يخرج أيضا شرط تطيين الدار وإصلاح ميزابها وما وهى منها وإصلاح بئر الماء والبالوعة والمخرج وكري الأنهار وفي إجارة الأرض وطعام العبد وعلف الدابة في إجارة العبد، والدابة، ونحو ذلك؛ لأن ذلك كله شرط يخالف مقتضى العقد ولا يلائمه وفيه منفعة لأحد العاقدين. بدائع الصنائع ،كتاب الإجارة،مبحث الشرائط الفاسدة، ج٤ص١٩٥.

مسئلہ : جس عقد میں اجارہ، اجرت یا عمل یا نفع مکمل طور پر تعین کے ساتھ بیان نہ ہو سکے ایسا عقد اجارہ جائز ہے لازم نہیں، مثلاً ملازم نے ایک ماہ تک نوکری کی، اب آقا اس کی خدمت سے خوش نہیں ہے یا ملازم آقا کے کھانا یا برتاؤ پر راضی نہیں تو اجارہ فسخ کر دے ایک دوسرے پر کوئی الزام نہیں۔

مسئلہ : آقا کے لیے جائز نہیں کہ ملازم کی مقررہ تنخواہ میں کمی کرے یا خدمت و عمل میں شرط سے زیادہ کام لے اس طرح ملازم کے لیے جائز نہیں کہ آقا کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتے اس طرح ایک دوسرے کی تحقیر و توہین جائز نہیں اگر شکایت ہو تو جدائی اختیار کرنے کا دونوں کو حق ہے بشرطیکہ لزوم کی کوئی وجہ نہ ہو۔[1]

مسئلہ : ہر ایسا عقد جس میں حاضری کا حساب ہوتا ہو تو ملازمت کا وقت سے دیر کر کے آنا یا جلدی چلے جانا یا درمیان میں غیر حاضر ہونا یا کسی ایسے کام میں مشغول ہونا جس سے حاضری کا فائدہ ظاہر نہ ہو یہ سب کام ناجائز ہیں اور جتنی دیر غیر حاضر رہا اس وقت کی تنخواہ کاٹی جا سکتی ہے۔[2]

مسئلہ : ہر ایسا عقد اجارہ جس میں وقت و عمل دونوں مشروط ہوں مثلاً صبح سے دوپہر تک پہرہ داری کرنا ہے اس میں ملازم کے لیے بیکار بیٹھنے غفلت برتنے یا اس دوران کوئی اور کام کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔[3]

البتہ چند کام جائز ہیں۔

ا: حاجات ضروریہ پیشاب پاخانہ کھانہ پینا وغیرہ۔

۲: وہ سب کام جو عادت اور علاقہ کے عرف کے مطابق ہو اس کی بھی اجازت ہو گی جیسے استاذ مقررہ طلبہ کے علاوہ کچھ زائد طلبہ کا الگ پڑھا کر اجرت لے اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اشتراط العلف أو طعام الغلام على المستأجر غير جائز. الأشباه والنظائر، كتاب الإجارات، ج٤ص ٢٦٨.

لا يلزم المستأجر إطعام الأجير إلا أن يكون عرف البلدة كذلك. مجلة الأحكام العدلية رقم المادة ٥٧٦.ص:١٠٧.

[1] یعنی مقررہ مدت ختم ہونے کے بعد عقد ختم کریں دوبارہ برقرار رکھنا ضروری نہیں، یا اگر معاملہ میں کوئی خیار وغیرہ گنجائش رکھی گئی ہو یا کرایہ پر لی ہوئی چیز میں کوئی عیب یا دونوں فریق میں سے کسی کو کوئی معتد بہ عذر لاحق ہو جائے کیونکہ اجارہ عقد لازم ہے ان اعذار کے علاوہ کوئی فریق یکطرفہ طور پر فسخ نہیں کر سکتا۔

[2] مرّ تخريجه في حكم الأجير الخاص فليراجع.

[3] الأجير يستحق الأجرة إذا كان في مدة الإجارة حاضرا للعمل ولا يشرط عمله بالفعل ولكن ليس له أن يمتنع عن العمل وإذا امتنع لا يستحق الأجرة. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ٤٢٥ص:٨٢).

۳: جس کام کو کرنے کی آقا کی طرف سے صراحت کے ساتھ اجازت ہو۔

۴: وہ کام جن کے انجام دینے سے آقا کی خدمت میں نہ حرج لازم آئے نہ ہی خلل اور نہ ان سے ممانعت کی گئی ہو۔

۵: وہ کام جو ملازمت کے اوقات مقررہ کے درمیان انجام دیا جائے مثلا دوپہر کو چھٹی میں کوئی خارجی کام کرلے یہ سب جائز ہے۔[1]

مسئلہ: ملازم کے لیے ایسی چھٹی جس کا مقصد ایسی راحت حاصل کرنا ہے جس سے نفس کو استقامت درستی حواس اور اصلاح دماغ ہوتا ہو کہ صحیح کام کرنے کی قوت آجائے تو یہ چھٹی ملازم کے لیے ایسی کام سے مانع ہوگی جو اس غرض کے منافی ہو۔[2]

مسئلہ: ملازم کے لیے نماز پنجگانہ مع سنتوں کے نماز جمعہ عیدین اور ان کے مقدمات جیسے غسل اور استنجاء وضوء اور مسجد میں حاضری وغیرہ سارے کام کرنا ملازمت کے دوران ان کی اجازت ہے ان سے روکنا جائز نہیں ہے ان سے روکنے کے لیے شرط لگائے تو اس شرط کو ماننا جائز نہیں کیونکہ آقا کا ہر وہ حکم جو حکم الہی کے مقابل ہو اس کو ماننا جائز نہیں۔[3]

مسئلہ: نوافل دورانِ ملازمت آقا کی اجازت کے بغیر پڑھنا جائز نہیں۔[4]

مسئلہ: اگر جامع مسجد ملازمت کی جگہ سے دور ہے تو نہ آقا کو روکنے کا حق ہے نہ ملازم کے لیے جمعہ یا جماعت ترک کرنا جائز ہے ہاں آمد ورفت وشغل نماز کی مدت کی تنخواہ کاٹی جاسکتی ہے۔(عالمگیری)[1]

---

[1] قد مرّ تخريجه عن رد المحتار وغيره من المصادر فليراجع. ووجهه أنّ هذه الأمور مستثناة غير داخلة في العقد صراحةً أو دلالة.

[2] لعلّ وجهَه أنّ هذه الأعمالَ تُفضي إلى الخلل فيما التزمه المستأجر بعقد الإجارة وهو عقد لازم، فإمّا أن يفسخ الإجارة وإمّا أن يتقاصر في العمل، والله اعلم بالصواب.

[3] (قوله وليس للخاص أن يعمل لغيره) بل ولا أن يصلي النافلة. قال في التتارخانية: وفي فتاوى الفضلي وإذا استأجر رجلا يوما يعمل كذا فعليه أن يعمل ذلك العمل إلى تمام المدة ولا يشتغل بشيء آخر سوى المكتوبة وفي فتاوى سمرقند: وقد قال بعض مشايخنا له أن يؤدي السنة أيضا. واتفقوا أنه لا يؤدي نفلا وعليه الفتوى. (رد المحتار،كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، ج٦ص ٧٠).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الإجارة، الباب الثالث، ج٤ص٤١٧).

[4] راجع الحاشية السّالفة.

دورانِ ملازمت حقوق اللہ کا حکم

سوال ۸ : ملازم کے ذمے جو حقوق اللہ ہیں وہ کسی عقد سے نہ ساقط ہوں گے نہ متاخر جیسے نماز، اور حج فرض کی ادائیگی کے لیے سفر، مسلمانوں کے علاقہ پر کفار کی طرف سے حملہ کی صورت میں مسلمان مجاہدین کی مدد، یا کسی جلنے ڈوبنے والے کو بچانا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بشرطیکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اس کے سوا کوئی اور نہ ہو۔

البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی سے مستاجر کو کوئی ایسا ضرر نہ پہنچے جو ان حقوق کے برابر یا ان سے زیادہ ہو مثلاً جیسے زید سخت بیمار ہے صاحبِ فراش ہے کوئی اس کا مددگار یا خادم نہیں اب بکر جو اس کا ملازم ہے اس کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا یا اس کی عورتیں چھوٹے بچے یا اس کی ماں ان سب کی دیکھ بھال ملازم کے ذمے ہے وہ ملازم اب کوئی ایسا کام کرنا چاہے جو ان کے یا مال کے ضائع ہونے کا سبب ہو نہیں کر سکتا اللہ تعالیٰ مستغنی ہے بندہ محتاج ہے اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرمانے والے ہیں بندے حقوق وصول کرنے والے، اب دونوں حقوق میں تقابل ہو جائے تو حقوق العباد کی ادائیگی مقدم ہو گی، البتہ ملازم کوشش کرے کہ فرائض کو اس طرح ادا کرے کہ بندہ (آقا کی) حق تلفی نہ ہو تو یہی مناسب اولیٰ ہے۔[2]

حقوق العباد کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ جن کا اثر اخروی سزا کے سوا کچھ نہیں جیسے والدین کے حقوق۔

۲۔ وہ حقوق جو دنیا میں بھی معتبر ہے، جیسے شوہر کا حق، پہلا حق مستاجر کے حق کا معارض نہیں ہو سکتا اور دوسرے حقوق ابتداء عقد میں موثر ہو سکتا[3] ہے۔

---

[1] قال أبو علي الدقاق رحمه الله تعالى المستأجر لا يمنع الأجير في المصر من إتيان الجمعة فيسقط من الأجر بقدر اشتغاله بذلك إن كان بعيدا، وإن كان قريبا لم يحط عنه شيء من الأجر. (الفتاوى الهندية ،كتاب الإجارة، الباب الثالث، ج٤ص٤١٧).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب الإجارات، قبيل الفصل الرابع، ج٧ص٤١٠).

[2] حق العبد مقدم لحاجته. (الهداية ،كتاب البيوع، أحكام البيع الفاسد، ج٣ص ٥٢).

حق العبد مقدم لحاجته. (البحر الرائق ، كتاب البيوع، أحكام البيع الفاسد، ج٦ص١٠٣). وراجع عبارات المحيط والهندية في الحاشية السابقة أيضا.

[3] "ہو سکتے ہیں" لفظ زیادہ مناسب ہے۔

لہٰذا اگر باپ نے بیٹے کو نوکری سے منع کر دیا تو اس کی وجہ سے نفس عقد میں کوئی لغزش ثابت نہ ہوگی، اسی طرح اگر دورانِ ملازمت طلب فرمایا اس میں بھی ملازم نہ مستاجر کے حقوق میں خیانت کر سکتا ہے نہ تاخیر [1]۔ لیکن اگر شوہر بیوی کو ملازمت سے روک دے تو چونکہ شوہر کے حقوق مقدم ہیں اور اس کی نافرمانی حرام ہے اس لئے بیوی کے لئے نوکری جائز نہ ہوگی۔ [2]

مسئلہ: آقا نے ملازم کو جامع مسجد بھیجا کہ دیکھ لو نماز جمعہ تیار ہو تو میں بھی نماز کے لئے چلوں، ملازم آیا امام کو خطبہ یا نماز میں پایا اب اگر اتنا وقت ہے کہ آقا کو خبر دے کر آنے کے بعد ضرور نماز میں شریک ہو سکے گا تو آقا کو خبر کرنے کے بعد نماز میں شریک ہوگا کیونکہ حق اللہ میں دونوں مساوی ہیں پھر آقا کا حق مزید بھی ہے، اگر خبر کے لئے جانے کی صورت میں نماز جمعہ قضاء ہو جانے کا احتمال ہو تو حق حاضر مقدم ہے (یعنی ملازم نماز میں شریک ہو جائے) کیونکہ یہ نماز میں شریک ہو یا نہ ہو آقا کی نماز تو قضاء ہو گئی ہے اس لئے یہ اپنی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لے۔ [3]

---

[1] لأن ولاية الرجال على الصغار والصغائر تزول بالبلوغ كولاية المال ..فأما إذا بلغ عاقلا واجتمع رأيه واستغنى عن الأب وهو مأمون عليه؛ فلا حق للأب في إمساكه كما ليس له أن يمنعه من ماله فيخلي سبيله فيذهب حيث شاء(بدائع الصنائع ،كتاب الحضانة،وقت الحضانة،ج٤ ص ٤٣).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب النكاح، باب الحضانة،ج٣ ص ٥٦٨).

وكذا في المحيط البرهاني (كتاب النكاح،الفصل الرابع والعشرون ،ج٣ ص ١٧٨).

[2] وينبغي عدم تخصيص الغزل، بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب؛ لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه، وكذا من العمل تبرعا لأجنبي بالأولى.(البحر الرائق،باب النفقة،ج٤ ص ٢١٣).

إن كان لها زوج معروف فأجرت نفسها للظئارة بغير إذن الزوج فللزوج حق الفسخ سواء كان ممن يشينه أن تكون زوجته ظئرا أو لا وهو الصحيح،(الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب العاشر في إجارة الظئر،ج٤ ص ٤٣٣).

[3] للمستأجر أن يمنع الأجير عن حضور الجمعة وقال أبو علي الدقاق رحمه الله تعالى ليس له أن يمنع الأجير في المصر عن حضور الجمعة لكن يسقط عنه الأجر بقدر اشتغاله بذلك إن كان بعيدا وإن كان قريبا لا يحط عنه شيء من الأجر وإن كان بعيدا واشتغل قد ربع النهار حط عنه ربع الأجر(فتاوى قاضيخان ،كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة،ج١ص ٨٦).

إذا استأجر رجلا يوما يعمل كذا فعليه أن يعمل ذلك العمل إلى تمام المدة ولا يشتغل بشيء آخر سوى المكتوبة وفي فتاوى سمرقند: وقد قال بعض مشايخنا له أن يؤدي السنة أيضا. واتفقوا أنه لا يؤدي نفلا وعليه الفتوى. وفي غريب الرواية قال أبو علي الدقاق: لا يمنع في المصر من إتيان الجمعة،(حاشية ابن عابدين علي الدر المختار،كتاب الاجارة،باب ضمان الاجير،مطلب ليس للأجير الخاص أن يصلي النافلة،ج٦ص ٧٠).

ضمان (تاوان) کے احکام

مسئلہ: اجیر خاص ضامن نہیں ہوتا۔ [1]

مسئلہ: اجیر مشترک صاحبین کے نزدیک تلف شدہ چیزوں کا ضامن ہوگا۔ [2]

مسئلہ: مال کی خرابی کی وجہ سے کرایہ دار کو جو نقصانات اٹھانا پڑے، اس کا مالک ذمہ دار نہیں لہٰذا مالک پر ضمان نہیں آئے گا، مثلاً گھر یا دکان کی چھت ٹپکنے کی وجہ سے مال خراب ہوا، یا جان تلف ہوا، گاڑی خراب تھی ٹوٹ گئی۔ [3]

مسئلہ: ہر وہ استعمال جو عرف اور اجازت کے خلاف ہو اس سے مکان دکان گاڑی وغیرہ کو نقصان پہنچ جائے، اس کا کرایہ دار ضامن ہوگا، اجارہ مطلق ہو یا مقید۔

یعنی دہلی تک لے جانے کے لئے گاڑی لی، یا گندم لادنے کے لئے گاڑی کرایہ پر لی، دونوں صورتوں میں خلاف ورزی سے نقصان پہنچے تو وہ ضامن ہوگا، اگر عہد وعرف کے مطابق استعمال کیا پھر بھی نقصان پہنچ گیا تو اس کا کرایہ دار ضامن نہ ہوگا۔ [1]

---

[1] فأجير الوحد لا يكون ضامنا للعين التي تسلم إليه للعمل فيها كما إذا استأجر يوما أو شهرا قصارا أو خياطا ليعمل له لا غير حتى لو هلك في يده لا بصنعه لا يضمن بالإجماع

وكذلك لو تخرق بصنعه الذي هو من العمل المأذون فيه (تحفة الفقهاء ،كتاب الاجارة، الاجارة على الاعمال،ج٢ ص ٣٥٢).وكذلك في بدائع الصنائع (كتاب الاجارة، في حكم الإجارة، ج٤ص٢١١).

[2] اس میں کچھ تفصیل ہے وہ یہ ہے کہ یا تو یہ چیز اجیر کے عمل سے ہلاک ہوگی یا اس کے بغیر، اگر اس کے عمل کی وجہ سے ہلاک ہو جائے تو وہ اس کا ضامن ہوگا چاہے اس عمل میں تعدی ہو یا نہ ہو، اور اگر اس کے عمل دخل کے بغیر کسی آفت سے ہلاک ہو جائے تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں: یا تو اس سے بچنا ممکن ہوگا یا نہیں؟ اگر اس آفت سے بچنا ممکن نہ تھا اور اسی وجہ سے وہ چیز ہلاک ہو جائے تو بالاتفاق ضامن نہیں ہوگا اور اگر اس سے بچنا ممکن تھا تو اس میں امام صاحب اور حضرات صاحبین کا اختلاف ہے، امام صاحب کے نزدیک ضامن نہیں ہوگا جبکہ صاحبین کے نزدیک ایسی صورت میں بھی ضامن ہوگا، بعض متاخرین فقہاء کرام نے ایسی صورت میں نصف قیمت پر صلح کر لینے کا قول اختیار کیا جبکہ بعض نے اس میں یہ تفصیل کی کہ اگر اجیر دیانتدار آدمی ہو تو ضامن نہیں ہوگا اور بددیانت ہو تو ضامن ہوگا اور اگر مستور الحال ہو تو صلح کی صورت اختیار کرے، مجموعی طور پر ان سب اقوال پر فتویٰ دیا گیا ہے، علامہ قاضی خان رحمہ اللہ وغیرہ نے امام صاحب کے قول کو مفتی بہ قرار دیا جبکہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے تبیین الحقائق میں حضرات صاحبین کے قول پر عمل کرنے کو راجح قرار دیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الاجارۃ، باب ضمان الاجیر، ج٦ ص٦٥)۔

[3] کیونکہ اس صورت میں مالک نہ مباشر ہے نہ ہی مسبب متعدی، اس لئے اس پر ضمان کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔

مسئلہ : اگر بہت زیادہ خلاف ورزی نہیں کی بلکہ درمیانہ درجہ کی خلاف ورزی (کی) مثلاً دس میل کے لئے کرایہ پر لی، پندرہ میل چلی تو یہ زیادتی ہے اگر گیارہ بارہ میل چلی تو زیادتی کی مقدار ہی کا ضامن ہوگا، ۱۱ حصے کر کے ایک حصہ کا ضامن ہوگا۔[2]

مسئلہ : معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو جس صورت میں نقصان ہو تو اس سے کرایہ دار پر ضمان آئے گا ورنہ گناہگار ضرور ہوگا۔[3]

حد سے تجاوز کی صورتیں

مسئلہ : حد سے زیادتی کبھی منزل مقررہ سے دوری کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی زیادہ بوجھ لادنے سے اور کبھی راستہ خراب اختیار کرنے سے، مثلاً سواری کے جانور کو ایسے راستے پر لے جانا جس میں نہایت سردی ہو یا گرمی ہو، ایسا طریقہ اختیار کرنا جو عادت کے خلاف ہو اور ہلاکت کا باعث ہو جیسے روئی لادنے کے لئے کرایہ پر لیا اور لوہا لادا یا پتھر لادا۔[4]

---

[1] حركة المستأجر على خلاف المعتاد تعد ويضمن الضرر والخسارة التي تتولد معها مثلا لو استعمل الثياب التي استكراها على خلاف عادة الناس وبليت يضمن كذلك لو احترقت الدار المأجورة بظهور حريق فيها بسبب إشعال المستأجر النار أزيد من الناس يضمن. (مجلة الأحكام العدلية ،الاجارات، الباب الثامن،ص: ١١٢).

والأصل أن المستأجر إذا خالف إلى مثل المشروط أو أخف فلا شيء عليه لأن الرضا بأعلى الضررين رضا بالأدنى وبمثله دلالة، وإن خالف إلى ما فوقه في الضرر فعطبت الدابة فإن كان من خلاف جنس المشروط ضمن الدابة ولا أجر عليه، وإن كان من جنسه ضمن بقدر الزيادة وعليه الأجر لأنها هلكت بفعل مأذون وغير مأذون فقسم على قدرهما إلا إذا كان قدرا لا تطيقه الدابة فيضمن لكونه غير معتاد فلا يكون مأذونا فيه.(الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة،الباب السابع والعشرون الضمان بالخلاف والاستعمال والضياع والتلف،ج٤ص٤٩٠).

وكذا في تحفة الفقهاء (كتاب الاجارة باب الاجارة الفاسدة،ج٢ ص ٣٥٨).

[2] انظر الحاشية المتقدمة.

[3] گناہ کا تعلق عقد کے دوران کئے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی کے ساتھ ہے جبکہ ضمان کسی چیز کے خراب/ضائع کرنے کی وجہ سے لازم آتا ہے لہٰذا اگر خلاف ورزی کے باوجود چیز صحیح وسالم رہی تو ضامن تو نہیں ہوگا لیکن گناہ گار ہوگا، لقوله تعالى" اوفوا بالعقود" وقوله تعالى" ان العهد كان مسئولا" وقوله عليه الصلاة والسلام" المسلمون عند شروطهم".

[4] والحاصل ما مرّ عنِ التحفة والهندية والمجلة أنّ التعدّي إمّا أنْ يكون بِالاستعمال خلافَ المعاهدة وإمّا بالاستعمال خلافَ المعروف والمتعامَل.

جرمانے کی صورتیں

ا۔ بطور معاوضہ: یعنی جو وقت یا مال ملازم نے ضائع کردیا، اس کا عوض۔

مسئلہ: ملازم دیر سے حاضر ہو یا غیر حاضری کرے یا وقت مقررہ سے پہلے چلا جائے یا کام میں قصداً سستی کرے جس سے اس کی شرارت کا یقین ہو جائے تو حساب کرکے اجرت کم کر لینے کا اختیار ہے۔[1]

مسئلہ: ملازم نے عمداً مال ضائع کر دیا یا نقصان کر دیا یا چوکیدار چھوڑ کر کہیں چلا گیا، اب آقا کو حق ہے کہ اس کی اس حرکت کی وجہ سے جو نقصان ہو، اس کا تاوان اس سے وصول کرے۔[2]

مسئلہ: ایک ملازم دوسرے ملازموں کا نگران ہے، اس نگران کی سستی یا غیر حاضری سے دوسرے ملازمین بے کار ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں اگر نگران نے قصداً غفلت برتی جس کی وجہ سے نقصان پیش آیا، بعد میں کوئی عذر معقول بھی پیش نہ کر سکا، تو تمام ملازمین کی بے کاری سے جو نقصانات ہوئے ہیں، نگران ان سب کا ذمہ دار ہوگا اسی کو تمام نقصانات کا ضمان ادا کرنا ہوگا۔[3]

احتمالی نقصان کا ضمان

مسئلہ: احتمالی نفع نہ ملنے کا کوئی ضمان نہیں، مثلاً آقا کہے کہ اگر تم کام کرتے تو مجھے اس قدر فائدہ ہوتا، یا تمہاری غفلت سے یہ خسارہ ہوا، جب تک حقیقی نقصان نہ ہو محض احتمال کی بنیاد پر ضمان نہیں لیا جا سکتا ہے، ہاں البتہ اگر شرط طے پائی تھی پھر اس نے سستی کی تو حاکم سیاسۃً جرمانہ عائد کر سکتا ہے تا کہ نظام درہم برہم

---

[1] واجير الواحد لا يعمل.. لغيره عملا لان المدة خصت للمستاجر، ولو عمل للاخر عملا ينقص من اجرته بقدر ما عمل.(فتاوى النوازل، كتاب الاجارة، قبيل كتاب ادب القاضي، ص٣٨٢، مكتبه حقانية، بشاور).

وكذلك في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب ضمان الاجير، مبحث الاجير الخاص، ج٦ ص ٧٠).

[2] لضمان الأجير ثلاث قواعد، القاعدة الأولى: إذا تلف المستأجر فيه أو فقد بتعدي الأجير أي الأجير الخاص أو المشترك أو تقصيره في أمر المحافظة ضمن سواء أكانت الإجارة صحيحة أو فاسدة؛ لأن المستأجر فيه أمانة في يد الأجير ويكون مضمونا بالتعدي والتقصير(درر الحكام ،الاجارات، الباب الثامن، رقم المادة ٦٠٧، ج١ص ٧٠٣).

ولا ضمان على الأجير الخاص ولا فيما تلف من عمله اتفاقا إذا لم يتعمد الفساد ذكره في الإصلاح نقلا عن الخانية قال في الفصولين نقلا عن التجريد: الأجير الخاص لا يضمن إلا بالتعدي وعلى هذا تلميذ القصار وسائر الصناع وأجيرهم لم يضمنوا إلا بالتعدي(مجمع الضمانات،باب مسائل الاجارات، قبيل النوع الأول ضمان الراعي والبقار،ص: ٢٨).

[3] انظر الحاشية السابقة.

نہ ہو۔[1]

۲۔ حکم کی مخالفت کا جرمانہ:

اس کی بھی کئی صورتیں ہیں:

ا۔ صریح اور شدید مخالفت سے جو نقصان پہنچ جائے اور کسی بھی طرح سے آقا کی اجازت کے تحت نہ آسکے جیسے محرر سے کہا کہ تجارتی حساب بنادو، گلستان سعدی کی نقل کردو، اس نے گاؤں کا کاغذ تیار کیا، گلستان کی جگہ بستان لکھ دی، اب آقا کو حق حاصل ہوگا کہ بطور جرمانہ اس وقت کی تنخواہ اور سیاہی و کاغذ کی قیمت اس سے وصول کرے۔[2]

۲۔ مخالفت خفیف ومشتبہ: جس میں ملازم کے لئے عذر کی گنجائش ہو کہ اس کام کو اجازت کے اندر داخل سمجھا یا آقا کی مصلحت کے مطابق سمجھا تھا، جیسے استاد نے طلبہ کو چھٹی دیدی، جیسے سپروائزر نے بعض مزدوروں پر کام میں تخفیف کردی، اس پر زجر وتوبیخ ہوسکتی ہے کوئی جرمانہ عائد نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ: ملازم پر جرمانہ عائد ہونے کی صورت میں دیکھا جائے گا، اگر عمل ایسا ہو کہ اس کی اجرت عمل کے اجزء پر تقسیم نہیں ہوتی (جیسے تندور میں روٹی لگانا کہ نکالنے سے پہلے اس کا کوئی فائدہ نہیں) تو پوری اجرت ساقط ہوجائے گی[3] اور جس عمل کی اجرت اس کے اجزءپر منقسم ہوسکتی ہے (جیسے دیوار بنانا، آدھی چوتھائی سب کارآمد ہے) تو بقدر نقصان اجرت ساقط ہوگی باقی برقرار رہے گی[1]۔

---

[1] لا يجوز للمؤسسة حجز مبلغ هامش الجدية في حالة نكول العميل عن تنفيذ وعده الملزم، وينحصر حقها في اقتطاع مقدار الضرر الفعلي المتحقق نتيجة النكول، وهو الفرق بين تكلفة السلعة وثمن بيعها لغير الآمر بالشراء. ولا يشمل التعويض ما يسمى بالفرصة الضائعة. (كتاب المعايير ،المعيار الشرعي رقم (٨)" المرابحة للآمر بالشراء" ،ص:٦٤).

[2] إذا أرضعته بلبن الشاة فلم تأت بما دخل تحت العقد فلا تستحق الأجرة كالصباغ إذا صبغ الثوب لونا آخر غير ما وقع عليه العقد أنه لا يستحق الأجر(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، ركن الإجارة ومعناها،ج٤ ص ١٧٥).

[3] روى ابن سماعة عن محمد في رجل استأجر خبازا ليخبز له قفيزا من دقيق بدرهم، فخبز، فاحترق الخبز في التنور قبل أن يخرجه، أو ألزقه في التنور ثم أخذه ليخرجه فوقع من يده في التنور فاحترق، فلا أجرة له؛ لأنه هلك قبل تمام العمل؛ لأنه عمل الخبز لا يتم إلا بالإخراج من التنور، فلم يكن قبل الإخراج خبز فصار كهلاك اللبن قبل أن يتمه،(بدائع الصنائع ، كتاب الاجارة، حكم الاجارة،ج٤ص ٢٠٥).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة،ج٦ ص ١٥).

۳۔جبر و تحکم:

یعنی کوئی معتبر معاوضہ نہیں صرف آقا کے ساتھ گستاخی کی ان کو ناراض کیا، ایسی صورت میں عقد اجارہ کی بنیاد پر کوئی جرمانہ عائد نہیں کیا جاسکتا، البتہ شرط کی وجہ سے یا حاکم سیاسۃً کچھ کرنا چاہے تو کچھ ہو سکتا ہے، جہاں تک سیاسۃً جرمانہ عائد کرنے کا مسئلہ ہے یہ حاکم کی ذمہ داری ہے وہی کر سکتا ہے، مستاجر یا آقا کو اس کی اجازت نہیں ہے۔[2]

ہاں آقا کے لئے سیاسۃً جرمانہ عائد کرنے کی ایک صورت ہے کہ جرمانہ کو مشروط کرے آئندہ نوکری بر قرار رکھنے کے ساتھ، یعنی آئندہ نوکری بر قرار رکھنا ہو تو اس نقصان پر اتنا تاوان دینا ہو گا ورنہ نوکری ختم ہے۔[3]

مسئلہ: ملازم کی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے آقا کو اجازت ہے کہ ایسی خطاؤں پر کچھ تنبیہ کرے۔

---

[1] لو استأجر رجلا ليذهب إلى البصرة فيجيء بعياله فوجد بعضهم قد مات فجاء بمن بقي ذكر في الكتاب أن له الأجر بحساب ذلك ، قالوا هذا إذا كان عياله معلومين لأنه أوفى بعض المعقود عليه فيجيب الأجر بقدر ذلك(فتاوى قاضيخان ،كتاب الاجارة، فصل فيما يجب الأجر على المستأجر وفيما لا يجب، ج٢ص١٦٤).
وكذا في تبيين الحقائق (كتاب الاجارة، ج٥ص ١١٢).

[2] وعن أبي يوسف: يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال، وعندهما وباقي الأئمة الثلاثة لا يجوز. وما في الخلاصة سمعت من ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي ذلك، أو الوالي جاز، ومن جملة ذلك رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلك من المشايخ كقول أبي يوسف(فتح القدير ،كتاب الحدود، فصل في التعزير، ج٥ ص ٣٤٥).
وظاهره أن ذلك رواية ضعيفة عن أبي يوسف. قال في الشرنبلالية: ولا يفتى بهذا لما فيه من تسليط الظلمة على أخذ مال الناس فيأكلونه .. وأفاد في البزازية أن معنى التعزير بأخذ المال على القول به إمساك شيء من ماله عنه مدة لينزجر ثم يعيده الحاكم إليه، لا أن يأخذه الحاكم لنفسه أو لبيت المال كما يتوهمه الظلمة إذ لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. وفي المجتبى لم يذكر كيفية الأخذ وأرى أن يأخذها فيمسكها، فإن أيس من توبته يصرفها إلى ما يرى. وفي شرح الآثار: التعزير بالمال كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ. (حاشية ابن عابدين على الدر المختار، باب التعزير، مطلب في التعزير بأخذ المال، ج٤ص ٦١).

[3] یہ صورت بھی محل نظر ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر مدت اجارہ کے درمیان یہ رقم وصول کی جائے تو جائز نہیں کیونکہ عقد اجارہ عقد لازم ہے جو مقررہ شدہ مدت خود ہی لازم اور نافذ رہے گا اس کے بر قرار رکھنے کے لئے رقم کا لین دین بلا عوض ہے جو کہ رشوت کے ضمن میں داخل ہو سکتا ہے، اور اگر عقد اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد یہ رقم وصول کی جائے تو بھی جائز نہیں کیونکہ عقد کرنے کا عوض قرار پائے گا اور خود عقد کرنا کوئی ایسی حق ثابت نہیں ہے جس پر عوض لینا جائز ہو بلکہ محض حقِ مجرد ہے جس کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے، البتہ جواز کی یہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ سزا کے طور پر مال تو نہ لیا جائے البتہ آئندہ مہینہ کی تنخواہ کم مقرر کرے لیکن یہ صورت بھی تب ہی قابل عمل ہو سکتی ہے جبکہ اجارہ مشاہرۃ ہو۔ اہلِ علم اس پر غور فرمائیں۔

سوال۸ :ایسے مسائل میں زیادہ تنقیح و تفتیش کرنے کے بجائے، انتظامی امور اور عقد کی شرائط کا ہر حال میں لحاظ کیا جائے۔

گناہ کے کام کے لئے کسی کو اجرت پر لینا

اس کے تین درجے ہیں:

۱۔ معقود علیہ عین معصیت ہو، جیسے ناچ ،گانا بجانا، زنا، چوری، جعل سازی، چغل خوری، تعزیہ بنانا، بت سازی، تصویر سازی، شراب کشی، شرک کفر اور حرام کاموں کی ترویج اور بدعات فسق و فجور یہ اجارہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے، اس کی اجرت لازم نہیں اس سے احتراز کرنا واجب ہے، ان گناہوں کے کاموں کی انجام دہی سے جو اجرت یا نفع حاصل ہوا وہ ملک خبیث ہے، اگر مالک معلوم ہو تو اسی کو واپس کرنا یا بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا چاہئے۔[1]

۲۔ معقود علیہ کوئی اور مباح چیز ہو مگر اس کے ضمن میں گناہ اور فعل حرام کا ارتکاب پایا جائے، جیسے ایک شخص نے مطلق ملازمت اختیار کی لیکن آقا شراب فروخت کروائے، ناقوس بجوائے، بت خانہ بنوائے، تعزیہ اٹھوائے، یا مکان پر کرایہ لیا پھر اس میں زناکاری ہو، جوابازاری ہو یا رقص وغیرہ محفل منعقد کرے، یا فوجی سپاہی کو دشمن سے لڑنے کے لئے بھیجا اس میں خون ناحق بھی بہانا پڑے یا سپاہی سے ظلم کے قوانین نافذ کروایا، ان سب صورتوں میں فعل حرام ہے ان سے گناہ لازم ہوگا لیکن آقا کے ذمہ تنخواہ واجب ہوگی۔[2]

---

[1] والاجارة الفاسدة على احد عشر وجها، احدها الاجارة على المعاصي وهو ان يستأجر الرجل الرجل ليقتل رجلا او يضربه او يشتمه او يستأجر النائحه او المغنية لتنوح علي ميتة او لتغني له او يستأجر حمالا ليحمل له خمرا او غيره فان استأجرها على ان يطرح عنه ميتة أو يصب خمرا فهو جائز وله الاجرة ولا أجرة على المعاصي لا المسماة ولا المثل(النتف في الفتاوى ،كتاب الاجارة، الاجارة الفاسدة،ج٢ص ٥٧٤).

لا يجوز أخذ الأجرة على المعاصي (كالغناء، والنوح، والملاهي) ؛ لأن المعصية لا يتصور استحقاقها بالعقد فلا يجب عليه الأجر، وإن أعطاه الأجر وقبضه لا يحل له ويجب عليه رده على صاحبه. (مجمع الأنهر،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٢ص ٣٨٤).

[2] ولا بأس لمسلم أن يؤاجر داره من ذمي ليسكنها وإن شرب فيا الخمر أو عبد فيها لصليب أو أدخل فيها الخنازير فذلك لا يلحق المسلم كمن باع غلاما ممن يقصد به الفاحشة أو باع جارية ممن يأتيها في غير المأتى أو يستبرئها (فتاوى قاضيخان ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٢ ص ١٦٩).

۳۔ وہ اجارہ ایسے افعال ممنوعہ کی طرف منسوب ہو جیسے عقد ملازمت کے وقت ہی طے پایا کہ شراب فروخت کرنا ہوگا یا تعزیہ اٹھوائیں گے، بت خانہ کی خدمت کرنی ہوگی، یا عورت کو نوکر رکھا کہ خلوت میں پنکھا جھلے، پاؤں دابے[1]، اس میں امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک عقد کا اعتبار کرتے ہوئے اجرت ثابت ہوگی، صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک فعل کا اعتبار کرتے ہوئے یہ عقد حرام ہے اور اجرت بھی ساقط، مگر ایسے کاموں کو ترک کرنا بالاتفاق واجب ہے، خلاصہ یہ ہے امام صاحب نفس عقد پر نظر فرماتے ہیں، وہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اجرت کو عقد ہی سے معلق فرماتے ہیں اور صاحبین غرض اور انجام پر نظر فرماتے ہیں اگر وہ باطل ہو تو عقد کو باطل قرار دیتے ہیں۔[2]

مسئلہ : کوئی عضو کٹوانا حرام ہے اور کاٹنا گناہ ہے اور کاٹنے کی اجرت بھی حرام ہے، مگر بطور علاج ایسا کرنا ضروری ہو تو مجبوری کی وجہ سے سارے کام جائز اور اجرت بھی حلال ہوگی۔[3]

مسئلہ : داڑھی منڈانا حرام ہے اور صرف داڑھی منڈنے کی اجرت بھی حرام ہے۔[1]

والتفصيل فى حاشية المؤلف العلام رحمه الله المسماة ب"تكملة عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية" كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ص ٣٠٢).

[1] اس کے بجائے "دبائے" کا لفظ مناسب ہے۔

[2] إذا استأجر مسلماً ليحمل له خمراً ولم يقل ليشرب، أو قال ليشرب جازت الإجارة في قول أبي حنيفة خلافاً لهما، وكذلك إذا استأجر الذمي بيتاً من مسلم ليبيع فيه الخمر، جازت الإجارة في قول أبي حنيفة خلافاً لهما. (المحيط البرهاني ،كتاب الاجارات، الفصل الخامس عشر: في بيان ما يجوز من الإجارات، وما لا يجوز، ج٧ص ٤٨٢).

قال: (ومن حمل خمرا لذمي طاب له الأجر) وقالا: يكره لأنه أعانه على المعصية. وفي الحديث: «لعن الله في الخمر عشرا " وعد منهم " حاملها» وله أن المعصية شربها، وليس من ضرورات الحمل وهو فعل فاعل مختار، ومحمل الحديث الحمل لقصد المعصية حتى لو حملها يريقها أو ليخللها جاز، وعلى هذا الخلاف إذا آجر بيتا ليتخذه بيت نار أو بيعة أو كنيسة في السواد. لهما أنه أعانه على المعصية، وله أن العقد ورد على منفعة البيت حتى وجبت الأجرة بالتسليم وليس بمعصية، والمعصية فعل المستأجر وهو مختار،، في ذلك. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الكراهية، فصل في الاحتكار، ج٤ ص١٦٢)

والتفصيل فى حاشية المؤلف العلام رحمه الله المسماة ب"تكملة عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية" كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ص ٣٠٢).

[3] لا بأس بقطع العضو إن وقعت فيه الآكلة لئلا تسري كذا في السراجية. لا بأس بقطع اليد من الآكلة وشق البطن لما فيه كذا في الملتقط. (الفتاوى الهندية ،كتاب الكراهية، الباب الحادي والعشرون فيما يسع من جراحات بني آدم والحيوانات، ج٥ص ٣٦٠).

حرام لباس تیار کرنے کی اجرت

مسئلہ: اور سونے چاندی کے ایسے زیور جو صرف مرد استعمال کرتے ہوں، اسی طرح وہ ریشمی لباس جو مردوں کے علاوہ عورتیں استعمال نہیں کرتی ہیں، اگر ان کا عدم استعمال یقینی ہو تو ایسے زیور و لباس تیار کرنے کی اجرت لینا ناجائز ہے اس طرح ان کو فروخت کرنا بھی ناجائز ہے، جیسے ریشمی قباء۔[2]

اور اگر زیور کو دونوں استعمال کرتے ہوں لیکن جس لباس کو اکثر مرد استعمال کرتے ہیں جیسے سونے چاندی کے بٹن یا گھڑی وغیرہ، تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں جائز ہے کیونکہ فاعل مختار کا فعل درمیان میں ہے لہٰذا گناہ اسی کی طرف منسوب ہوگا اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک دونوں ناجائز ہے۔[3]

عقد حرام کی چار صورتیں

عقد اجارہ یا بیع کے حرام یا حلال ہونے کے اعتبار سے چار صورتیں ہیں:

---

[1] والاجارة الفاسدة على احد عشر وجها، احدها الاجارة على المعاصي وهو ان يستأجر الرجل الرجل ليقتل رجلا او يضربه او يشتمه او يستأجر النائحه او المغنية لتنوح علي ميتة او لتغني له او يستأجر حمالا ليحمل له خمرا او غيره فان استأجرها على ان يطرح عنه ميتة أو يصب خمرا فهو جائز وله الاجرة ولا أجرة على المعاصي لا المسماة ولا المثل(النتف في الفتاوى ،كتاب الاجارة، الاجارة الفاسدة، ج٢ص ٥٧٤).

لا يجوز أخذ الأجرة على المعاصي (كالغناء، والنوح، والملاهي) ؛ لأن المعصية لا يتصور استحقاقها بالعقد فلا يجب عليه الأجر، وإن أعطاه الأجر وقبضه لا يحل له ويجب عليه رده على صاحبه. (مجمع الأنهر،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٢ص ٣٨٤).

[2] کیونکہ بیع کی طرح اجارہ کے جواز وعدم جواز کا دارومدار بھی انتفاع ہے اگر کسی چیز کا کوئی جائز استعمال موجود ہو تو اس کے لئے اجارہ بھی جائز ہے ورنہ نہیں۔والحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع،(المحيط البرهاني ،كتاب البيع، الفصل السادس، ج٦ص ٣٤٧).

بيع كل شيء محرز يباح الانتفاع به جائز وبعبارة أوضح مدار جواز البيع على حل الانتفاع فلذلك يجوز بيع النحل الذي يأوي إلى خلاياه وإن لم يكن في خلاياه عسل وكذلك دود الحرير وبزره والكلب المعلم أو القابل للتعليم والهرة والطير والفيل والعقاب والباشق وكل حيوان يمكن الانتفاع به(درر الحكام ،قبل المادة رقم ٢١١، ج١ص ١٨٥).

[3] لهما أن هذه إجارة على المعصية؛ لأن حمل الخمر معصية لكونه إعانة على المعصية، وقد قال الله عز وجل {ولا تعاونوا على الإثم والعدوان} ولهذا لعن الله تعالى عشرة: منهم حاملها والمحمول إليه ولأبي حنيفة إن نفس الحمل ليس بمعصية بدليل أن حملها للإراقة والتخليل مباح وكذا ليس بسبب للمعصية وهو الشرب؛ لأن ذلك يحصل بفعل فاعل مختار وليس الحمل من ضرورات الشرب فكانت سببا محضا فلا حكم له (بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط الاجارة، ج٤ص١٩٠).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، ج٦ ص ٣٩٢).

۱۔ فعل اور اجرت دونوں حرام۔ جیسے زنا کا معاوضہ یا شراب کی قیمت۔ [1]

۲۔ فعل اور اجرت دونوں مباح۔ جیسے معماری یا زرگری یا مباح چیزوں کا فروخت کرنا۔ [2]

۳۔ فعل جائز اور اجرت ناجائز۔ جیسے نر جانور سے جفتی کروا کر اجرت حاصل کرنا، حدیث میں اس پر اجرت لینے سے ممانعت کی گئی ہے اور اگر اجرت کے بغیر ایسا کیا تو جائز ہے، اسی طرح شرط کے بغیر جفتی کروانے پر کچھ مل جائے تو وہ بھی جائز ہے (مشکوۃ) [3] اور اگر کتّا کسی کو مفت دیدیا تو فعل جائز ہے اگر فروخت کیا تو فعل جائز قیمت کو کھانا ناجائز ہے۔ [4]

۴۔ فعل ناجائز اور عمل جائز۔ جیسے کسی مسلمان غلام کو کافر کے ہاتھ فروخت کرنا، یہ فعل ناجائز ہے اس کی قیمت حلال ہے۔ [5]

---

[1] مرّ بیانه.

[2] ان جیسے مباح کاموں کے لئے عقد اجارہ کرنا ابو بکر اصم کے علاوہ پوری امت کے نزدیک جائز ہے۔ تفصل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (بدائع الصنائع، کتاب الاجارۃ، ج۴ص۱۷۳)۔

[3] وعن أنس: أن رجلا من كلاب سأل النبي صلى الله عليه وسلم عن عسب الفحل فنهاه فقال: يا رسول الله إنا نطرق الفحل فنكرم فرخص له في الكرامة.(مشكاة المصابيح، كتاب البيوع، باب المنهي عنها من البيوع، رقم الحديث: ٢٨٦٦).
ورواه الترمذي في سننه (ابواب البيوع، باب ماجاء في كراهية عسب الفحل، رقم الحديث: ١٢٧٤).

[4] چونکہ کتے کے ذریعے بعض جائز منافع حاصل کئے جاسکتے ہیں اس لئے حضرات فقہاءِ احناف کے نزدیک اس کو فروخت کرنا بھی جائز ہے اور اس کے ذریعے حاصل شدہ قیمت بھی حلال ہے، بعض فقہاء کرام نے جواز کے لئے اگرچہ "معلم" کی قید لگائی لیکن راجح یہی ہے کہ یہ کوئی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے اور "غیر معلم" کتے کو فروخت کرنا بھی شرعاً جائز ہے۔
ويجوز بيع الكلب والفهد والسباع، المعلم وغير المعلم في ذلك سواء وعن أبي يوسف أنه لا يجوز بيع الكلب العقور لأنه غير منتفع به. وقال الشافعي: لا يجوز بيع الكلب ،(الهداية كتاب البيوع، باب السلم،مسائل منثورة، ج٣ص٧٧).
ثم عندنا: لا فرق بين المعلم، وغير المعلم في رواية الأصل فيجوز بيعه كيف ما كان وروي عن أبي يوسف رحمه الله أنه لا يجوز بيع الكلب العقور(بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه، ج٥ص ١٤٣).
وبيع الكلب المعلم عندنا جائز وكذلك بيع السنور وسباع الوحش والطير جائز عندنا معلما كان أو لم يكن(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، فصل في البيع الباطل، ج٢ ص٦٧).

[5] إسلام البائع ليس بشرط لانعقاد البيع ولا لنفاذه ولا لصحته بالإجماع، فيجوز بيع الكافر وشراؤه، وقال الشافعي إسلام المشتري شرط جواز شراء الرقيق المسلم والمصحف، حتى لا يجوز ذلك من الكافر..ولنا عمومات البيع من غير فصل بين بيع العبد المسلم من المسلم، وبين بيعه من الكافر فهو على العموم(بدائع الصنائع، كتاب البيوع، شرائط ركن البيع، ج٥ص ١٣٥).منع الذمي من شرى المصحف، وأجبر على بيعه كما أجبر على بيع العبد المسلم. (شرح السير الكبير،باب الجهاد ما يسع منه وما لا يسع، ج١ص ٢٠٦).

رشوت کے احکام

رشوت بھی حرام اور باطل اجارہ کی ایک قسم ہے اور بکثرت پیش آتے رہتے ہیں، لوگ بے دھڑک رشوت دیتے اور لیتے رہتے ہیں ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے، فقہاء کرام سے اس کی زیادہ تفصیل مروی نہیں لہذا مقام کی مناسبت سے اس کا ذکر مناسب ہے۔

رشوت کی تعریف: رِشوت بکسر باء۔ وہ مال جو اپنے موافق فیصلہ کروانے کے لئے دیا جائے (شامی)[1] یا ناحق کام کروانے کے لئے دیا جائے (منتخب)[2]

رشوت کا حکم

رشوت قطعی طور پر حرام ہے اور ملک میں داخل نہیں ہوتی، اس کو لینے اور دینے والے دونوں گناہگار ہیں[3]، ان پر حدیث میں لعنت وارد ہوئی ہے۔[4] رشوت لینے والا خواہ حاکم ہو یا اس کا نائب، یا اس کا وہ ملازم ومشیر جو ایسے کاموں میں شریک ہو، یا ایسا ملازم جس کا دخل نہ ہو یا اجنبی، اور جس کام کے لئے مال دیا جائے خواہ قطعاً عینِ ظلم ہو، یا اتلاف حق ہو، یا ایسے ظلم کا احتمال ہو، یا ضمناً ظلم اور حق تلفی کا احتمال ہو، یا کوئی جائز اور مباح غرض ہو، یا اپنے ذاتی مال سے ظلم کا دفع کرنا مقصود ہو۔

ا۔ مال رشوت اس لئے دیا جائے تاکہ صریح ظلم اور حق تلفی کی جائے، ایسے احتمال پر دیا جائے تو لینے دینے والے دونوں ملعون ہوں گے اور رشوت میں ملا ہوا مال حرام ہے، جیسے کہے کہ زید کی جان یا آبرو

---

[1] كذا في حاشية ابن عابدين على الدر المختار (كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية ،ج٥ص ٣٦٢).

[2] منتخب کے نام سے متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، معلوم نہیں کہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے پیش نظر کونسی کتاب تھی؟ شاید "منتخب من صحاح الجوہری" مراد ہو جس میں رشوت کے مختلف استعمالات لکھے گئے ہیں، ملاحظہ ہو: مادۃ: رشأ، ص١٨٧٨۔

[3] ما يدفعه المتعاشقان رشوة يجب ردها ولا تملك اهـ. فهذا يفيد أن الآخذ لا يملكها وقد صرح به في هبة القنية قال وفي السير الكبير الرشوة لا تملك(البحر الرائق ،كتاب القضاء، مسئلة اخذ القضاء برشوة،ج٦ص ٢٨٦).

في القنية الرشوة يجب ردها ولا تملك وفيها دفع للقاضي أو لغيره سحتا لإصلاح المهم فأصلح ثم ندم يرد ما دفع إليه(الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية ،ج٥ص ٣٦٢).

[4] عن عبد الله بن عمرو، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لعنة الله على الراشي والمرتشي (شرح مشكل الآثار، باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من لعنه الرائش..رقم الحديث:٥٦٥٧,ج١٤ص ٣٣٤).

عن عبد الله بن عمرو، قال:لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي(مصنف ابن أبي شيبة ،كتاب البيوع والاقضية، باب في الوالي والقاضي يهدى إليه،ج٤ص ٤٤٥).

یامال کو ناحق نقصان پہنچادو یا اس کا مال مجھے دلوادو، یا یہ کہ قاضی سے کہے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں، مجھے جتوادو میں اتنی رشوت دوں گا، یا ایسے کام جو شرعاً اور قانوناً ممنوع ہیں ان کو میرے موافق کردو تاکہ مجھے مخالف فریق کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔[1]

ٹھیکہ دلوانے کے لئے رشوت لینا

۳۔ صرف ضمناً حق تلفی کا احتمال ہو جیسے حکومت کی طرف سے کچھ مال خریدنے کا اعلان ہوا، یا چند ملازمین بھرتی کرنے کا فیصلہ ہوا یا کسی چیز کا ٹھیکہ دینا منظور ہوا، یا چند مقدمات پیش ہوں گے یا حکومت کی طرف سے عوام میں کچھ تقسیم کیا جائے گا۔

اب زید نے سرکاری نمائندہ کو کچھ مال دیا تاکہ زید کا نام حکومت میں پہلے پیش ہو اور کام اسی کو مل جائے یا نمائندہ زید کی تعریف کرے اس کی صلاحیت و قابلیت کا اطمینان دلائے، اگر مال دینے والے اور اس کے لئے کوشش کرنے والا دونوں اجنبی ہیں سرکاری کارندہ نہیں ہیں، تو دونوں گناہ سے بری ہوں گے، کیونکہ ابھی تک کسی کا حق اس ٹھیکہ کے ساتھ متعلق نہیں ہے اور ہر شخص کو اپنے کامیابی کے لئے محنت اور مال خرچ کرنے کا اختیار ہے، البتہ اگر حاکم یا اس کا پیش کار یا مشیر رشوت کا مال لے کر کسی کو ٹھیکہ دلائے تو یہ مال ان کے حق میں رشوت خبیث ہے کیونکہ ان لوگوں نے اپنے واجب ادا کرنے میں خیانت کی اور اس خیانت کا عوض لیا، کیونکہ ہو سکتا ہے جن لوگوں کے نام کو پیچھا کردیا، انہیں میں سے کوئی اس سے زیادہ باصلاحیت اور اس سے حکومت کا فائدہ زیادہ ہو، حکومت کے ملازم و مشیر پر واجب تھا کہ اچھا مشورہ دیتا انہوں نے ایک شخص کو آگے کر کے اور بقیہ کو پیچھے کر کے واجب کا حق ادا نہ کیا بلکہ حق کو چھپایا ہے اور صرف ملازم اگرچہ ذمہ دار نہ تھا لیکن جب وہ کام میں شریک ہوا تو ملازمت کی حیثیت سے خیر خواہ سمجھا گیا حالانکہ ایسا نہ تھا اور حاکم مستقل نے دھوکہ سے مال لیا ہے۔[1]

---

[1] واذا تقلد القضاء بالرشوة لا يصير قاضيا وتكون الرشوة حراما على القاضي والأخذ * ثم الرشوة على وجوه أربعة منها ما هو حرام من الجانبين احدها هذه والثاني اذا دفع الرشوة الى القاضي ليقضي له وهذه الرشوة حرام من الجانبين(فتاوى قاضيخان، كتاب الدعوى والبينات،الباب الاول،ج٢ص ٢٠٠).

وكذا في البحر الرائق (كتاب القضاء، مسئلة اخذ القضاء برشوة،ج٦ص ٢٨٦).

۴۔ کسی مباح کام کے حصول کے لئے مال دیا جس کے ساتھ کسی کا حق متعلق نہیں جیسے ملازم رکھ لیں، مجھے ٹھیکہ دلوادیں، میرا کام جلدی کردیں، اس میں اگر غیر متعلقہ فرد سے یہ کام لیا گیا تو دینے اور لینے والے بری، اگر متعلقہ افراد ہیں تو عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔[2]

مسئلہ : قاضی اور حاکم پر واجب ہے کہ مقدمہ کی سماعت میں انصاف فراہم کرنے اور فریقین کو سہولت پہنچانے کی مکمل کوشش کریں، اسی طرح ان دونوں کے ماتحت ملازمین پر لازم ہے کہ فریقین کے ساتھ ہر طرح سے نرمی کا معاملہ کریں۔[3]

مسئلہ : ہر ملازم پر لازم ہے (کہ) آقا کی ضرورتوں کے انجام دینے میں کمال دیانت سے کام لے اور احتیاط اور مستعدی دکھائے۔

---

[1] عام کتابوں کے اندر اس صورت میں دینے کو جائز اور لینے کو ناجائز لکھا ہے لیکن وہ اسی صورت پر محمول ہے کہ حکومتی کارندہ یا متعلقہ شخص رشوت وصول کرے، اگر غیر متعلق فرد کچھ رقم لے کر یہ کام کرے تو وہ حرام نہیں ہے جیسا کہ حضرت مولف رحمہ اللہ نے بیان فرمایا، نیز یہ بھی تب ہے جبکہ پہلے رقم دی جائے اور پھر کام کروایا جائے، اگر کام کروانے کے بعد بلا شرط رقم دیدے تو راجح قول کے مطابق وہ حلال ہے۔

ومنها اذا دفع الرشوة ليستوي أمره عند السلطان حل له الدفع ولا يحل للآخذ أن يأخذ، وان أراد أن يحل للآخذ يستأجر الآخذ يوما الى الليل بما يريد أن يدفع اليه فانه تجوز هذه الإجارة ثم المستأجر ان شاء استعمله في هذا العمل وان شاء استعمله في غيره هذا اذا أعطى الرشوة أولا ليستوي أمره عند السلطان وان طلب منه أن يستوي أمره ولم يذكر له الرشوة ثم أعطاه بعد ما سوى اختلفوا فيه قال بعضهم لا يحل له أن يأخذه وقال بعضهم يحل وهو الصحيح لأنه بر ومجازاة الاحسان فيحل كما لو جمعوا للامام والمؤذن شيأ وأعطوه من غير شرط كان حسنا(فتاوى قاضيخان،كتاب الدعوى والبينات،الباب الاول،ج٢ص ٢٠٠).

كذا في البحر الرائق (كتاب القضاء، مسئلة اخذ القضاء برشوة،ج٦ص ٢٨٦).

[2] انظر الحاشية السابقة.

[3] الشهادة عند استجماع شرائطها مظهرة للحق، والقاضي مأمور بالقضاء بالحق، قال الله تبارك وتعالى {يا داود إنا جعلناك خليفة في الأرض فاحكم بين الناس بالحق}(بدائع الصنائع ،كتاب الشهادة،بيان حكم الشهادة،ج٦ص ٢٨٢).

وينبغي أن يعدل بين الخصمين في مجلسهما منه لا يقرب أحدهما دون الآخر.. وكذلك يعدل بينهما في النظر والمنطق(تحفة الفقهاء ،كتاب ادب القاضي،ج٣ص٣٧٢).

(ويسوي) وجوبا (بين الخصمين جلوسا وإقبالا وإشارة ونظرا ويمتنع من مسارة أحدهما والإشارة إليه(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب القضاء،ج٥ص ٣٧٥).

مسئلہ: عمر نے زید کو اس لئے ملازم رکھا تاکہ زید عمر کے تمام ملازمین کا ماہانہ حساب پیش کرے، اب زید کے لئے جائز نہیں کہ کسی ملازم سے رقم لے کر اس کا حساب جلدی بنائے یا ان کا حساب عمدہ کر کے پیش کرے۔[1]

مسئلہ: ملازم کسی کا کوئی خاص کام کر دے جس کو خاص طور پر کر دینا نہ اس کے ذمہ لازم ہے اور نہ ہی اس سے کسی کا حق تلف ہوتا ہے اور اس پر کچھ معاوضہ لے لے تو یہ معاوضہ حرام تو نہ ہوگا لیکن مکروہ ہوگا باقی دینے والے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے دوسرے کا نقصان دوسرے کی خیانت کئے بغیر محض اپنی راحت و فائدہ کے لئے مال خرچ کیا ہے جیسے ریل کا ٹکٹ لیتے وقت زحمت سے بچنے کے لئے کچھ زائد رقم خرچ کر کے لیا جاتا ہے۔[2]

مسئلہ: وہ لوگ جو آقا کے حاضر باش ملازم ہیں اور اپنے آقا سے دوسروں کا کام نکلوانے یا کوئی معاملہ کرا دینے کے لئے کچھ لیتے ہیں، اگر اس سے کسی کی حق تلفی اور آقا کا نقصان وخیانت نہ ہوتا ہو تب بھی ان کا کچھ لینا کراہت سے خالی نہیں لہٰذا ایسے معاملات میں کچھ لینا دینا نہیں چاہئے۔

طاعات پر اجرت لینے کا حکم

طاعات کے تین درجے ہیں: ا۔ طاعاتِ واجبہ: جیسے والدین کی خدمت کرنا، امام عادل کی اطاعت کرنا، نماز جنازہ پڑھنا، عورت کے لئے اپنے شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کرنا، ماں کا اپنے بچے کو دودھ پلانا، ان تمام صورتوں میں ثواب ثابت اور اجرت ساقط ہے اگر کچھ تبرعاً مل جائے وہ حلال طیب ہے۔[3]

---

[1] لو استأجرها للطبخ والخبز لم يجز ولا يجوز لها أخذ الأجرة على ذلك؛ لأنها لو أخذت لأخذت على عمل واجب عليها في الفتوى فكان في معنى الرشوة فلا يحل لها الأخذ (البحر الرائق ،كتاب النكاح، باب النفقة،ج٤ص ١٩٩).
وكذا في بدائع الصنائع (كتاب النفقة، نفقة الزوجات،بيان مقدار الواجب من النفقة،ج٤ص ٢٤).

[2] جب کام ملازم کے ذمہ شرعاً اور عقداً لازم نہیں اور اس سے کسی کی حق تلفی بھی نہیں ہوتی تو یہ ایک مباح کام ہوا جس کے بدلے معاوضہ لینے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں، یہاں جو اس کو مکروہ فرمایا گیا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دورانِ ملازمت یہ کام کیا گیا جبکہ ملازمت کا پورا دورانیہ مستاجر کے حق کے ساتھ مشغول ہے جس میں اس کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت کے بغیر ملازم کوئی غیر ضروری ذاتی کام نہیں کر سکتا۔

[3] ومنها أن لا يكون العمل المستأجر له فرضا ولا واجبا على الأجير قبل الإجارة فإن كان فرضا أو واجبا عليه قبل الإجارة لم تصح الإجارة؛ (بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط الاجارة،ج٤ص ١٩١).
وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الاجارة، الباب الاول،ج٤ص ٤١١).

مسئلہ : گواہ کے لئے گواہی دیناواجب ہے گواہی پر اجرت لیناجائز نہیں، ہاں البتہ بار بار عدالت میں حاضر ہونے سے وقت میں حرج ہوتاہو، اس طرح ضرورت سے زیادہ مسافت طے کرناپڑتاہو، توایسی صورت میں حرج وقت کی اجرت لے سکتاہے، خاص کر موجودہ عدالتوں میں توبہت وقت ضائع ہوتاہے۔[1]

۲۔ خیر محض : یعنی وہ کام جس کی اچھائی صرف اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ اسلام کے حکم سے اچھاہوا بلکہ اس میں مطلقاً خیر ہے جیسے مسجد تعمیر کرنا، لوگوں کو پانی پلانا، مسافروں کی خدمت کرنا، علوم دینیہ کی کتابوں کی کتابت کرنا، یہ بلااختلاف اچھاکام ہےاور جائزہےاوران پر اجرت لینابھی حلال ہے۔[2]

مسئلہ : قرآن کی کتابت پر اجرت لیناجائزہے۔[3]

مسئلہ : نکاح خوانی کی اجرت حلال ہے۔[4]

مسئلہ : تعویذ لے کر اجرت لیناجائزہے بشرطیکہ اس میں خلاف شرع کوئی بات نہ ہو(مثلاً شرکیہ یاموہم شرک الفاظ نہ ہو، اور تعویذ کو مؤثر بالذات نہ سمجھی جائے، ازابن شائق)[5]

۳۔ طاعات مختصہ باسلام : وہ طاعات جواسلام کے خاص ہوں، یعنی شریعت اسلام کے حکم کی وجہ سے وہ طاعت

---

[1] (سئل) فيما اذا طلبت الشهود للشهادة في مكان بعيد مسافة يومين واحتيج الى الركوب فادّى المدّعي للشاهدين اجرة دابتهما، هل تسقط شهادتها بذلك؟ (اجاب) لا تسقط شهادتهما بذلك كما جزم به في الملتقط.(الفتاوى الخيرية لنفع البرية على هامش تنقيح الفتاوى الحامدية، كتاب الشهادات ومطالبه، ج٢ص٤١).

[2] بخلاف بناء المسجد وأداء الزكاة وكتابة المصحف والفقه فإنه يقدر عليها الأجير، وكذا الأجير يكون للآمر لوقوع الفعل عنه نيابة ولهذا لا تشترط أهلية المأمور فيهما، بل أهلية الآمر حتى جاز أن يستأجر الكافر فيهما(البحر الرائق،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٨ص ٢٢). بخلاف بناء المساجد وأداء الزكاة وكتابة المصحف، والفقه وتعليم الكتابة، والنجوم، والطب، والتعبير، والعلوم الأدبية، فإن أخذ الأجرة في الجميع جائز بالاتفاق. (مجمع الأنهر ، كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج ٢ص٣٨٤).

[3] انظر الحاشية المتقدمة.

[4] كل نكاح باشره القاضي وقد وجب مباشرته عليه كنكاح الصغار والصغائر، فلا يحل له أخذ الأجرة عليه، وما لم يجب مباشرته عليه حل له أخذ الأجرة عليه،(المحيط البرهاني،كتاب القضاء، الفصل السابع عشر،ج٨ص ٦٢).
وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب ادب القاضي، الفصل الخامس عشر،ج٣ص٣٤٥).

[5] استأجره ليكتب له تعويذ السحر يصح إذا بين قدر الكاغد والخط كمن استأجره ليكتب له كتابا إلى حبيبه أو حبيبها جاز ويطيب له الأجر. كذا في القنية. (الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب السادس في مسائل الشيوع،ج٤ص ٤٥٠).
في الدر المختار: استأجره ليكتب له تعويذا لأجل السحر جاز إن بين قدر الكاغد والخط وكذا المكتوب. وفي حاشية ابن عابدين تحته:(قوله لأجل السحر) أي لأجل إبطاله وإلا فالسحر نفسه معصية بل كفر لا يصح الاستئجار عليه(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،مطلب في أجرة صك القاضي والمفتي،ج٦ص٩٣).

بنی ہو، ایسی طاعات پر اجرت لینا فی نفسہ ناجائز ہے لیکن متاخرین نے ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے (ہدایہ) اور شافعیہ نے مطلقاً جائز کہا ہے۔[1]

لیکن اصل بات وہی (ہے) جس کو علامہ شامی رحمہ اللہ نے بسط تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، اس کا خلاصہ مع دیگر تفصیلات تحریر کیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ ایسی طاعات دو قسم کی ہیں:

ا۔ وہ طاعات جو صرف ثواب آخرت کے لئے موضوع ہو اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہ ہو، جیسے تسبیح وتہلیل، تلاوت قرآن، نوافل وغیرہ، ان کاموں کے لئے کسی کو اجرت پر لینا ناجائز ہے اور اجرت حلال نہیں، کیونکہ ثواب کا دار مدار نیت اور خلوص وللہیت پر ہے اور یہاں ہمہ تن اجرت ہے، لہذا ایسی عبادت پر ثواب نہیں ملے گا، جب ثواب ہی نہ رہا تو نہ اجارہ صحیح ہے نہ اس کا کوئی فائدہ، کیسا ثواب اور کسی چیز کا اجارہ، اگر ثواب فرض کر لیا جائے تو اجرت مقرر ہو جائے گی پھر ثواب دینا محض عطیہ الٰہی ہے، بندہ کی ملک میں نہیں ہے لہذا بندہ اس کو فروخت کرنے پر قادر نہیں۔[2]

۲۔ وہ طاعات جن میں ثواب کے علاوہ فائدے بھی ہیں:

تو وہ جن میں ثواب کے علاوہ فائدہ بھی ہے، انہی فائدوں کو حاصل کرنے کی ضرورت سے ان پر اجرت لینا جائز ہے، جیسے تعلیم قرآن، مؤذنی، امامت، قضاء (یعنی شریعت کے مطابقہ فیصلہ کرنا) جن پر اشاعت وبقاء اسلام اور تقویت اسلام، اور مسلمانوں کی اصلاح اور نظم ونسق کا مدار ہے، ان پر اجرت لینا جائز ہے، اس اجرت کی جواز میں متاخرین نے زور دیا ہے۔[3]

---

[1] "ولا الاستئجار على الأذان والحج، وكذا الإمامة وتعليم القرآن والفقه" والأصل أن كل طاعة يختص بها المسلم لا يجوز الاستئجار عليه عندنا. وعند الشافعي رحمه الله يصح في كل ما لا يتعين على الأجير؛(الهداية ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٣ص ٢٣٨).

[2] كذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،مطلب في الاستئجار على الطاعات،ج ٦ص ٥٥)

[3] اس کے متعلق یہ بھی واضح رہے کہ ثواب کے علاوہ فوائد کی دو قسمیں ہیں، ایک تو دینی فوائد جس کی طرف حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے "اشاعت وبقاء اسلام، تقویت اسلام، مسلمانوں کی اصلاح" کہہ کر اشارہ فرمایا، اور ایک خالص دنیوی فوائد ہیں مثلاً علاج کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کر کے دم کرنا وغیرہ، دوسری صورت میں تو اجرت لینا بالکل جائز ہے جس کی بڑی دلیل بخاری شریف کی وہ روایت ہے جو حضرت

متاخرین کے دلائل

۱۔ کنزالعمال میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں لڑکوں کو پڑھانے والے تین معلموں کو پندرہ پندرہ درہم دیا کرتے تھے اور اس زمانہ کی پڑھائی غالباً قرآن یا اس کے مثل ہو گا۔[1]

۲۔ بخاری شریف کی روایت (ہے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت کہیں جا رہی تھی، راستہ میں ایک گاؤں میں پہنچے، ان سے کھانا طلب کیا انہوں نے انکار کر دیا، صحابہ کرام گاؤں سے نکل پڑے، تو اس گاؤں کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا تو گاؤں کے لوگ ان کے پاس دم کروانے کے لئے حاضر ہوئے تو صحابہ کرام نے شرط ٹھہرائی کہ اتنی بکریاں دینی ہوں گی، گاؤں والوں نے شرط منظور کر لیا، صحابہ نے سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ سردار ٹھیک ہو گیا، شرط کے مطابق بکریاں مل گئیں، واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسئلہ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا" **اضربوا لي سهما**"یعنی رقیہ کے ذریعہ جو مال حاصل ہوا ہے اس میں میرا حصہ بھی رکھو، اور فرمایا:" **إنّ أحقَّ ما اخذتمْ عليه الأجرَ كتابُ الله**"یعنی کتاب اللہ اجرت لینے کی

مؤلف رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کے بعد ذکر فرمائی ہے، جہاں تک پہلی قسم امور پر اجرت لینا کا مسئلہ ہے تو متاخرین نے اگرچہ اس کی اجازت دی ہے لیکن وہ اجازت کلی نہیں کہ ہر قسم طاعت پر اجرت لینے کو جائز کہا جائے بلکہ خاص جن امور کو ان حضرات نے مستثنی قرار دیا ہیں انہی پر اجرت لینا جائز ہے۔

فهذا مجموع ما أفتى به المتأخرون من مشايخنا وهم البلخيون على خلاف في بعضه مخالفين ما ذهب إليه الإمام وصاحباه، وقد اتفقت كلمتهم جميعا في الشروح والفتاوى على التعليل بالضرورة وهي خشية ضياع القرآن كما في الهداية..وقد اتفقت كلمتهم جميعا على التصريح بأصل المذهب من عدم الجواز، ثم استثنوا بعده ما علمته، فهذا دليل قاطع وبرهان ساطع على أن المفتى به ليس هو جواز الاستئجار على كل طاعة بل على ما ذكروه فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبيح الخروج عن أصل المذهب من طرو المنع، فإن مفاهيم الكتب حجة ولو مفهوم لقب على ما صرح به الأصوليون بل هو منطوق، فإن الاستثناء من أدوات العموم كما صرحوا به أيضا... وما استدل به بعض المحشين على الجواز بحديث البخاري في اللديغ فهو خطأ؛ لأن المتقدمين المانعين الاستئجار مطلقا جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن كما ذكره الطحاوي؛ لأنها ليست عبادة محضة بل من التداوي. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ، كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،مطلب في الاستئجار على الطاعات،ج ٦ص ٥٦).

[1] عن الوضين بن عطاء قال: ثلاثة كانوا بالمدينة يعلمون الصبيان، وكان عمر بن الخطاب يرزق كل واحد منهم خمسة عشر درهما كل شهر. (كنز العمال، الكتاب الخامس، قسم الافعال،رقم الحديث:٩١٧٨،ج٣ص ٩٢٤).

وكذا في السنن الكبرى للبيهقي (كتاب الاجارة، باب أخذ الأجرة على تعليم القرآن والرقية به، رقم الحديث: ١١٦٧٨،ج٦ص٢٠٦).

زیادہ مستحق ہے [1]،اور جن روایات میں اجرت لینے کی ممانعت ہے اس ممانعت سے مراد کمال تقویٰ ہے یا وہ منسوخ ہے۔

اس اجرت کے جائز ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اجرت نفس تعلیم وقضاء واذان کی نہیں ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے " **وَمَا أجريَ إلّا على ربّ العلمين** [2] "بلکہ یہ اجرت عوض ہے حبس وقت کا، اور مستاجر کی طرف سے شروط زائدہ اور تحمل و تحکم کا، مثلاً مولوی صاحب فلان جگہ پر جاکر اتنی دیر حاضر رہیں، اور فلان کتاب پڑھادیں، اس مسجد میں اذان دیں۔

مگر یہ بات اس وقت معتبر ہے کہ جب مستاجر کی طرف سے نفس عمل کے متعلق بحث نہ رہے کہ کیوں نہیں پڑھایا، اس قدر کیوں پڑھایا، یا وہ بات جس کو اجرت کا مدار ٹھہرائی، عقد کی بعض اہم بات ہو، ایسا نہ ہو کہ کسی غیر اہم، غیر مقصود اور غیر معتبر بات کو معقوعلیہ قرار دیدیں اور اگر ایسا نہ ہو تو اجرت کے جواز کا کمزور حیلہ ہے۔

اس اجرت کے جواز کی دوسری وجہ میری ذہن میں یہ آئی کہ تدبیر معاش مقدم اور قیام امر کا موجب ہے، بعض اللہ والے نہیں چاہتے کہ اپنے اوقات کو دوسرے کاموں میں مشغول کریں، اگرچہ وہ کام اجر کا موجب ہو تاہم وہ کام دنیوں زق زق بق بق سے خالی نہیں، لہٰذا ان کا شوق یہی ہے کہ تمام وقت اللہ تعالیٰ کی ذکر میں گذرے، چاہے وہ ذکر قرآن کریم کا درس ہو یا مسائل فقہ کا بیان یا حدیث کی یاد، یا فرض نمازوں کی ادائیگی مسجد کی خدمت اذان وغیرہ۔

پس وہ یہی ذریعہ معاش اختیار کرتے ہیں، اور اہل زمانہ شرط کئے بغیر کوئی خدمت نہیں کرتے جس سے گذر اوقات ہو سکے اور اس کے بغیر دل مطمئن بھی نہیں، نہ لوگوں سے مانگنا گوارہ ہے نہ مفت خوری پسند ہے تو ایسی صورت میں اجرت کی شرط کرنا ہی بہتر ہے " ولِكلّ إمرئ مانوىٰ "امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نزدیک یہ خدمت اجر وثواب کا موجب ہو۔

---

[1] صحيح البخاري (كتاب الطب،باب الشرط في الرقية بقطيع من الغنم، رقم الحديث: ٥٧٣٧).

وكذا في صحيح ابن حبان (كتاب الاجارة،ذكر الإخبار عن إباحة أخذ المرء الأجرة على كتاب الله، رقم الحديث: ٥١٤٦، ج١١ص٥٤٦).

[2] لعله من سهو الكاتب، والاية هكذا: {وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ} [الشعراء : ١٠٩].

تراویح میں اجرت لے کر قرآن سنانا

مسئلہ : تراویح میں اجرت لے کر قرآن سنانے میں نہ ثواب ہے نہ ہی اجرت لازم ہے، علماء نے اس اجرت کو حرام قرار دیا اور رد کرنا واجب ہے۔[1]

مسئلہ : تسبیح و تلاوت کے لئے کسی کو نوکر رکھنا ناجائز ہے اور فضول ہے، خود پڑھنے والے کو ثواب نہیں ملتا دوسرے کو کہاں سے دے گا جس کی وہ اجرت لے رہا ہے؟[2]

زائد منافع کا حکم

یہ ایک نیا مسئلہ ہے جس کا فقہاء نے صراحت کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا ہے مگر فقہ کے قواعد سے یہ مسائل آسانی کے ساتھ معلوم کئے جاسکتے ہیں، کسی کو یہ شکایت کرنے کا موقع نہیں مل سکتا ہے کہ فقہ کا دامن تنگ ہے بعض مسائل کا حل اس میں نہیں۔

واضح رہے کہ مبیع اور ثمن ذات ہے ان کا احاطہ اور تملیک بتمامہ آسان ہے اور معقود علیہ عوارض وصفات ہیں، نہ ان کا انحصار آسان ہے نہ مکمل طور پر مالک بنانا جائز ہے کیونکہ منافع کا مکمل مالک بنانے کی صورت میں مستاجر کی ذات کا معطل ہونا لازم آئے گا اور سلامتی ملک کا فائدہ باقی نہ رہے گا، اور جبکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی حالت میں متعدد افعال و عوارض کا ظہور ممکن ہوا تو جائز ہوا کہ مالک کرایہ دار دونوں اس کے فوائد میں شریک ہو جایا کریں۔

اس کے علیحدہ کرنے کا ایک ضابطہ موثرہ یہ ہے کہ جملہ فوائد کی تین قسمیں ہیں:

شکل نمبر ۱: وہ فوائد جو عقد اجارہ کے مقصود ہوں جیسے مکان کی سکونت، جانور کی سواری، مزدوری کی خدمت۔

شکل نمبر ۲: وہ فوائد جو مقتضائے ذات ہوں جیسے مکان کی وجہ سے حق شفعہ حاصل ہونا، مزدور سے عین

---

[1] قال تاج الشريعة في شرح الهداية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،مطلب في الاستئجار على الطاعات،ج ٦ ص٥٦).

ولاحظ للتفصيل رسالة الامام البركوي المسمّاة ب"انقاذ الهالكين عن اتخاذ القران حرفة" المطبوعة ضمن مجموع رسائله من دار الكتب العلمية، بيروت.

[2] لانه اجارة على الطاعة المحضة وراجع الحواشي المتقدمة.

مزدوری کے دوران اور کوئی کام مثلاً چوکیداری کا کام عوض دے کر حاصل کرے، یا زبانی خرید وفروخت کرے کوئی چیز دیکھ لے یا سن لے یا چکھ لے۔

شکل نمبر۳: وہ فائدہ جن کا وقوع اور حصول دوسرے کے ذریعہ سے ہو، مثلاً زید کسی کا ملازم ہے اور کپڑے کی تجارت کی غرض سے سمندری سفر کر رہا ہے، راستہ میں مچھلی پکڑی ہو یا مونگا پایا یا موتی نکالا، کسی سے ملاقات ہوگئی اس نے دعوت کر دی، یا ہدیہ دیا، کوئی اور معاملہ اس سے ہوا۔

شکل اول کے وہ تمام فوائد جو معقود علیہ کی جنس سے ہو تو مستاجر (یعنی مالک) کی ملک ہے۔[1]

مسئلہ : زید اجرت پر عمر کا کپڑا فروخت کرتا ہے مزدوری کے اوقات میں کپڑے کی تجارت نہیں کر سکتا ہے، عمر کے کپڑے کے علاوہ خود کوئی کپڑا خرید کر فروخت کرے، زید کے لئے جائز نہیں۔[2]

مسئلہ : زید کپڑا فروخت کرنے کے لئے عمر کے ہاں ملازم ہے، اب اس کو اجازت نہیں ہوگی کہ ذاتی طور پر یہ تجارت کرے کیونکہ ایسا کرے گا تو عمر کا نقصان ہوگا، یا زید عمر کے کاروبار کا منتظم (منیجر) ہے اور راز دار ہے، اس کے لئے جائز نہیں کہ کسی کو اس صنعت کی راز بتائے کیونکہ اس سے عمر کا نقصان ہوگا اور ایسے ہی کسی دوست یا عزیز کے لئے خرید نا بھی جائز ہوگا تا کہ ملازمت کی وجہ سے زید کی ذات معطل نہ ٹھہرے۔

شکل دوم (۲) کے تمام فوائد جو ذات مستاجر کے مقتضائے سے پیدا ہوں اور عقد اجارہ کے تحت داخل نہ ہوں، ملک اجیر ہے (مطلقاً ملک اجیر ہونا قابل غور ہے) جیسے مکان میں حق شفعہ یا کسی درخت کا اگنا وغیرہ۔

اور شکل سوم کے فوائد دو حال سے خالی نہیں، اگر جنس معقود علیہ سے ہے اور اجیر کی ذات کے واسطہ سے صادر ہوئے تو وہ مستاجر کا حق ہے اور اگر معقود علیہ کی جنس سے تو نہیں لیکن انہی کے ضمن اور

---

[1] (اصل حكم الاجارة)هو ثبوت الملك في المنفعة للمستأجر، وثبوت الملك في الأجرة المسماة للآجر؛ لأنها عقد معاوضة إذ هي بيع المنفعة، والبيع عقد معاوضة، فيقتضي ثبوت الملك في العوضين. (بدائع الصنائع كتاب الاجارة، حكم الاجارة، ج٤ ص ٢٠١).

وكذا في العناية شرح الهداية (كتاب الإجارات ،ج٩ص ٦٠).

[2] واجير الواحد لا يعمل.. لغيره عملا لان المدة خصت للمستاجر، ولو عمل للاخر عملا ينقص من اجرته بقدر ما عمل.(فتاوى النوازل، كتاب الاجارة، قبيل كتاب ادب القاضي، ص٣٨٢، مكتبه حقانية، بشاور).

وكذلك في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب ضمان الاجير، مبحث الاجير الخاص،ج٦ ص ٧٠).

سبب سے حاصل ہوئی تو غالب حالت کو دیکھا جائے گا، یہ جو کچھ ہوا ملک کی اثر ورسوخ کی بنیاد پر ہوا ہے تو دیانۃً مالک کا حق ہے قضاءً مملوک کا اور مملوک کے لئے حلال ہے اور اگر مملوک کی ذات کا اثر غالب ہے تو مستاجر کا اس سے کسی قسم کوئی تعلق نہیں۔

مسئلہ : زید کو ملازم رکھا گیا تاکہ آقا کے لئے جنگل سے شکار پکڑے یا سمندر سے موتی جواہر نکالے، تو جتنا بھی شکار مل جائے یا جتنی بھی موتی نکالے، سب آقا کا ہے، زید کا اس میں کوئی حق نہیں مثلاً زید سے کہا گیا تھا چار جنگلی کبوتر پکڑ کر لائے، یا دس موتی نکالیں یہ قید احترازی نہ تھی کہ اس سے زیادہ کا حکم ہی نہ ہو تو جو زائد ملے وہ بھی آقا ہی کا ہے اور اگر مقدار مقررہ سے زیادہ پکڑنے کی ممانعت تھی اب اگر قصداً مخالفت کی تو زید گناہگار ہوگا، جو زائد حاصل ہوا وہ زید اجیر ہی کی ملک ہوگی۔ [1]

مسئلہ : ملازم کو حکم دیا موتی نکالیں، اس میں سیپیاں بھی مل گئی، یا حکم دیا مچھلی پکڑے، اس کے پیٹ سے یا ویسے ہی مونگا نکل آیا، یہ سب مستاجر (آقا) کی ملک ہے، ہاں اس دوران جنگل سے جو پھل توڑے یا پھل کھائے یا لکڑی لے آیا، یا دریا کا پانی پیا یا سمندر سے کوئی بہتی ہوئی چیز اٹھالی، یہ سب چیزیں ملازم کی ہوں گے بشرطیکہ یہ مستاجر کی شرائط کے خلاف نہ ہو، اس کی وجہ سے آقا کے کام میں حرج واقع نہ ہو، اگر ایسا ہو تو ملازم گناہگار ہوگا۔ [2]

مسئلہ : زید نے گاڑی کرایہ پر لی راستہ میں کوئی اور سوار ہوگیا یا کسی نے کہا کہ میرا صندوق بھی اتنے کرایہ پر لے چلو تو یہ کرایہ دار کا حق ہے مگر جو اور فائدہ گاڑی بان نے حاصل کئے مثلاً راستہ میں کوئی چیز خریدی، یا کسی مقروض سے قرض وصول کیا یا کسی اور سے دوسرے وقت کے لئے کرایہ طے کیا، اگر اس سے مستاجر کا

---

[1] رجل استأجر أجيرا ليحتطب له إلى الليل بدرهم جاز وذا ليصطاد له إلى الليل أو ليسقي له جاز ويكون الحطب والصيد والماء للمستأجر ولو قال ليصطاد هذا الصيد أو ليحتطب هذا الحطب فهذه إجارة فاسدة والحطب والصيد للمستأجر وعليه للأجير أجر المثل ولو استعان من إنسان في الاحتطاب والاصطياد فإن الصيدَ والحطب يكون للعامل.(فتاوى قاضيخان ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٢ص ١٦٨).

استأجر رجلاً ليصيد له أو يحتطب له فإن كان وقّت لذلك وقتاً جاز، وإن لم يوقت ولكن عين الحطب، فالإجارة فاسدة وما اصطاد فهو للمستأجر وإن كان الحطب الذي عينه ملك المستأجر، فالإجارة جائزة. (المحيط البرهاني،كتاب الاجارة، الفصل الخامس عشر،ج٧ص ٤٨٥).

[2] لانه اجير خاص ووقته مشغول بخدمة المستاجر فلا يجوز له اية مخالفة وانظر الحاشية السابقة.

کوئی نقصان نہ ہو تو یہ سب کام اس کے لئے حلال ہیں۔[1]

مکان یا زمین سے فائدہ حاصل کرنے کے چار طریقے

زمین یا مکان سے فائدہ حاصل کرنے کی چار قسم ہوتی ہیں:

۱۔ جو فائدہ مستاجر کی محنت اور کوشش سے حاصل ہو اور عقد کی شرائط کے خلاف نہ ہو اور اس کے نقصانات بھی نہ ہوں، جیسے گھاس بوئی، شکار پھنسانے کی جگہ بنوائی یا کوئی اور چیز بنائی، یا برساتی پانی جمع کرنے کے لئے حوض بنایا، یہ سب کرایہ دار کی ملک ہیں۔[2]

۲۔ وہ فائدے جو کسب سے حاصل نہ ہوں اور چیز بذات خود مباح ہوں جیسے شکار، برسات کا پانی، برف، یا کسی نے مال تقسیم کئے اس طرح چھڑک دیا کہ کچھ اس کے گھر میں بھی گرا، یہ سب کرایہ دار کا حق ہے، کیونکہ اول تو وہ انسان ہے پھر اس مال کا مستحق ہے دوسرے عقد اجارہ کی وجہ سے قابض بھی ہے۔[3]

۳۔ وہ منافع باقی نہ رہ سکیں جیسے کسی باغ کی خوشبو، کسی چراغ کی روشنی، یہ کسی کی ملک نہیں، سب کے لئے حلال ہیں۔[4]

---

[1] (المادة ٤٢٦) من استحق منفعة معينة بعقد الإجارة له أن يستوفي عينها , أو مثلها , أو ما دونها ولكن ليس له أن يستوفي ما فوقها. (مجلة الأحكام العدلية الاجارة، الباب الاول،ص ٨٢).

(اصل حكم الاجارة)هو ثبوت الملك في المنفعة للمستأجر، وثبوت الملك في الأجرة المسماة للآجر؛ لأنها عقد معاوضة إذ هي بيع المنفعة، والبيع عقد معاوضة، فيقتضي ثبوت الملك في العوضين. (بدائع الصنائع كتاب الاجارة، حكم الاجارة،ج٤ ص ٢٠١).

[2] راجع الحاشية المتقدمة.

[3] (ولو وقع ما نثر من السكر والدراهم في حجر رجل، فأخذه غيره: حل) لأنه مباح، والمباح لمن سبق يده إليه. إلا أن يكون الأول قد تهيأ له، أو ضمه إلى نفسه، لأنه بذلك يملكه، فيحرم لغيره أن يأخذه. (منحة السلوك في شرح تحفة الملوك ،كتاب الكراهية،ص:٤٠٣).

والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، باب المتفرقات، بعد مطلب في النبهرجة والزيوف والستوقة،ج٥ ص٢٣٣).

[4] تفسير هذه الشركة في المياه التي تجري في الأودية، والأنهار العظام كجيحون وسيحون، وفرات، ودجلة، ونيل فإن الانتفاع بها بمنزلة الانتفاع بالشمس، والهواء ويستوي في ذلك المسلمون، وغيرهم، وليس لأحد أن يمنع أحدا من ذلك، وهو بمنزلة الانتفاع بالطرق العامة من حيث التطرق فيها. ومرادهم من لفظة الشركة بين الناس بيان أصل الإباحة، والمساواة بين الناس في الانتفاع لا أنه مملوك لهم فالماء في هذه الأودية ليس بملك لأحد. (المبسوط للسرخسي ،كتاب الشرب،ج٢٣ص١٦٤).

۴۔ وہ فائدے جو نہ محنت سے حاصل ہوں نہ مباح چیزوں سے ہوں، نہ عوارض وصفات سے ہیں، بلکہ ذات سے ہیں، جیسے بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ حکومت کی طرف فی مکان ہزار روپیہ دیا جائے تو یہ مالک کا حق ہے اور اگر یہ حکم ہو کہ فی آدمی ہزار روپے دئے جائیں تو یہ کرایہ دار کا حق ہو گا کیونکہ یہ مکان کو نہیں بلکہ آدمی کو دینا مقصود ہے۔[1]

فائدہ: وہ فوائد جو آدمی یا مکان میں طبعی اور فطری طور پر پڑ جائیں، جیسے کاریگر میں حذاقت اور کام سے تعارف ، کام کے متعلق وقعت اور اعتماد، یا مکان میں آبادی بڑھنے کی وجہ سے کرایہ میں اضافہ ہونا، یا کسی باغ یا سڑک کی وجہ سے دلچسپی بڑھ جانا، وغیرہ اس میں کرایہ دار کا کوئی حق نہیں۔[2]

اجارہ فسخ کرنے اعذار

عقد اجارہ میں بیع سے زیادہ فسخ کے احتمالات ہیں، ان اعذار کی کئی قسمیں ہیں:

اول بحکمِ عقد: عقد کے حکم کی وجہ سے فسخ کرنا، جیسے خیار شرط، خیار رؤیت، خیار عیب، معقود علیہ کے مستحق نکل آنا، یا عاقدین میں اہلیت کا نہ ہونا۔

مسئلہ: مکان کرایہ پر لیا اس شرط پر کہ گھر خواتین پسند کریں، یا نوکری اختیار کی اس شرط پر کہ اگر والدین اجازت دے دیں، پھر دیکھنے کے بعد خواتین کو مکان یا گاڑی پسند نہیں آئی یا والدین نے نوکری کی اجازت نہیں دی، یہ فسخ اجارہ کے عذر ہیں۔[3]

لأن الانتفاع بالمباح لا يجوز إلا إذا كان لا يضر بأحد كالانتفاع بالشمس والقمر والهواء.(تبيين الحقائق ،كتاب احياء الموات، مسائل الشرب، ج٦ص ٣٩).

[1] خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح ملنے والی اشیاء کی حیثیت شرعاً "ہبہ" ہے، دینے والے جس کو چاہے وہی اس کا مالک ہو گا۔

أما أصل الحكم فهو ثبوت الملك للموهوب له في الموهوب من غير عوض لأن الهبة تمليك العين من غير عوض فكان حكمها ملك الموهوب من غير عوض. (بدائع الصنائع ،كتاب الهبة، حكم الهبة، ج٦ص١٢٧).

وكذا في تحفة الفقهاء (كتاب الهبة، ج٣ ص١٦٦).

[2] لانها امور ترجع الى الذت المستاجرة فتصرف الى مالكها كما في مبحث" الفوائد الزائدة".

[3] تفسخ بالقضاء أو الرضا (بخيار شرط ورؤية) كالبيع(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة، ج٦ص ٧٦).

وكذا في الهداية (كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة، ج٣ص ٢٤٧).

مسئلہ : مبیع میں عیب کا ہونا قبضہ سے پہلے معتبر ہے قبضہ کے بعد عیب پیدا ہونے کا اعتبار نہیں، لیکن کرایہ کی صورت میں معقود علیہ میں جس وقت بھی عیب پیدا ہو جائے، اس کا اعتبار ہو گا کیونکہ منافع وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے ہیں، اور عیب کے پیدا ہونے سے پہلے حکم لگانا باطل ہے لیکن جو عیب عقد کے وقت قبول کر لیا گیا اس کی بناء پر کرایہ دار کو فسخ کا حق نہ ہو گا۔[1]

مسئلہ : اگر کرایہ کا جانور، یا مزدور کمزور ہو گیا یا سست ہو گیا، یا کرایہ کے مکان کی چھت ٹپکنے لگی، یا مکان گر پڑنے کا خوف ہے، یا گاڑی ٹوٹ جانے یا بند ہو جانے کا خوف ہے، یا رفتار بالکل کم ہو گئی، یا کرایہ کی زمین کا کچھ حصہ سیلاب میں ڈوب گیا، یا کرایہ دار مفلس ہو گیا جس سے نہ کرایہ وصول ہونے کی امید ہے اور نہ کوئی کفیل ہے، اب اختیار ہے چاہے عقد کو فسخ کردے، یا اسی حالت پر اکتفاء کرے، مگر ایسے کام لینے کا اختیار نہ ہو گا جس سے بیمار مزدور کو، اور ٹوٹی ہوئی گاڑی کو مزید نقصان پہنچ جائے۔[2]

دوم بحکم اضطرار: یعنی اجارہ فسخ کرنے کے عذر کی دوسری قسم اضطرار یعنی مجبوریاں پیش آنا ہیں، جیسے کرایہ کی چیز کا کوئی اور مستحق نکل آئے، یا عاقد نابالغ، مجنون، یا لگا ہوا غلام تھا جس پر آقا کی طرف سے پابندی لگی ہوتی ہے، یا ملازم سخت بیمار ہو گیا، یا گاڑی ٹوٹ گئی، کرایہ کا مکان کسی اور نے چھین لیا، یا کرایہ کی زمین پانی میں ڈوب گئی، کاتب اندھا ہو گیا، تصحیح کرنے والا بہرہ ہو گیا، درزی لولا ہو گیا یا اجارہ کا مقصد بالکل فوت ہو گیا،

---

[1] (و) بخيار (عيب) حاصل (قبل العقد أو بعده) أما جواز الرد بعيب حاصل قبل العقد فظاهر، وأما جوازه بما بعد العقد فلأن المعقود عليه هو المنافع، وإنما توجد شيئا فشيئا وكل ما كان كذلك فكل جزء منه بمنزلة الابتداء فكان العيب حاصلا قبل القبض.. (فلو لم يخل) أي العيب (به) أي بالنفع (أو انتفع) المستأجر (بالمخل) بالنفع واستوفى المنفعة وقد رضي بالعيب (أو أزاله) أي الإخلال (المؤجر سقط خياره) (درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،ج٢ص ٢٣٩).

(وتفسخ بالعيب) أي تفسخ الإجارة بالعيب؛ لأن العقد يقتضي سلامة البدل عن العيب، فإذا لم يسلم فات رضاه فيفسخ كما في البيع والمعقود عليه في هذا الباب المنافع وهي تحدث ساعة فساعة فما وجد من العيب يكون حادثا قبل القبض في حق ما بقي من المنافع فيوجب الخيار كما إذا حدث العيب بالمبيع قبل القبض، ثم إذا استوفى المستأجر المنفعة مع العيب فقد رضي بالعيب فيلزمه جميع البدل كما في البيع(تبيين الحقائق ،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،ج ٥ص ١٤٣).

[2] لأنّ هذه العوارض كلّها عيوب في المستاجَر بحيث ينقص الانتفاعُ به وحكمها ثبوتُ الخيار للمستاجِر كما مرّ، وراجع الحاشية المتقدمة. قال الامام السمرقندي رحمه الله:" فإن كان به عيب يضر بالانتفاع فالمستأجر بالخيار إن شاء فسخ الإجارة وإن شاء مضى عليها"(تحفة الفقهاء ،كتاب الاجارة،ج٢ص ٣٤٩)

شادی کا کھانا پکانے کے لئے باورچی بلایا، پھر دونوں خاندانوں میں لڑائی ہوگئی جس سے شادی نہ ہو سکی، ڈاکٹر کو بلایا اس کے آنے سے پہلے ہی بیمار تندرست ہوگیا، توان تمام صورتوں میں ضرورت کی وجہ سے اجارہ فسخ ہوگیا۔[1]

سوم: وہ اعذار جو نہ مقتضائے عقد ہوں نہ انسان کو مجبور کریں، مثلاً جانور یا گاڑی کرایہ پر لینے کے بعد سفر کا ارادہ ترک کردیا، اب سواری کو کیا کیا جائے، مکان کرایہ پر لینے کے بعد سفر کا پکا ارادہ کرلیا، اب مکان کو کیا کرے یہ بھی ایک طرح کے عذر ہیں، مگر واضح ہونا چاہئے کہ حقیقت میں عذر ہے بھی یا نہیں؟ یا عذر کو صرف اجارہ فسخ کرنے کا حیلہ بنایا ہے؟۔[2]

مسئلہ: جب اجارہ فسخ ہوجائے تو کرایہ دار کے ذمے اتنی اجرت واجب ہوتی جو جس وقت یا اتنا وقت بعض منافع کے حصول کے مقابل ہو۔[3]

---

[1] ومشايخنا رحمهم الله تعالى وفقوا فقالوا ان كانت الاجارة لغرض فلم يبق ذلك الغرض أو كان عذرا يمنعه من الجري على موجب العقد شرعا تنتقض الاجارة من غير نقض كما لو استأجر انسانا لقطعن يده عند وقوع الأكلة أو لقلع السن عند الوجع فبرأت الاكلة وزال الوجع تنتقض الاجارة لانه لا يمكنه الجري على موجب العقد شرعا(فتاوى قاضيخان ، كتاب الاجارة،فصل فيما تنتقض به الإجارة وما لا تنتقض به،ج٢ ص ١٩٢).

(سئل) في رحى ماء جارية في تواجر رجل من أصحابها فانقطع ماؤها في أثناء مدة الإجارة ويريد الرجل فسخ الإجارة بالوجه الشرعي فهل له ذلك؟

(الجواب) : نعم وتفسخ الإجارة أي للمستأجر ولاية الفسخ لا أنها تنفسخ لاحتمال الانتفاع بوجه آخر بخيار الشرط والرؤية وبعيب يفوت النفع به كخراب الدار وانقطاع ماء الرحى وانقطاع ماء الأرض؛ لأن كلا منها يفوت النفع فيثبت خيار الفسخ ولو انقطع ماء الرحى والبيت مما ينتفع به لغير الطحن فعليه من الأجرة حصته؛ لأنه بقي شيء من المعقود عليه فإذا استوفاه لزمته حصته زيلعي(العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية ،كتاب الاجارة،ج٢ص ١٠٠).

(باب فسخ الإجارة) (تفسخ) أي للمستأجر ولاية الفسخ(درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،ج٢ص ٢٣٩)

[2] كمن استأجر حانوتا ليتجر فأفلس، أو آجر شيئا، ثم لزمه دين ولا مال له سواه؛ وكذلك إن استأجر دابة للسفر فبدا له تفسخ الإجارة، وإن بدا للمكاري فليس بعذر. (الاختيار لتعليل المختار كتاب الاجارة، قبيل كتاب الرهن،ج٢ ص ٦٢).

[3] وتنعقد ساعة فساعة على حسب حدوث المنفعة، والدار أقيمت مقام المنفعة في حق إضافة العقد إليها ليرتبط الإيجاب بالقبول، ثم عمله يظهر في حق المنفعة ملكا واستحقاقا حال وجود المنفعة. (الهداية ،كتاب الاجارة،ج٣ ص ٢٣٠).

تجب حالا فحالا كلما مضى يوم يسلم أجرته وهو قول أبي يوسف ومحمد لأن الأجرة تملك على حسب ملك المنافع ساعة فساعة والاستيفاء على هذا الوجه متعذر فقدره باليوم (تحفة الفقهاء ،كتاب الاجارة،ج٢ص ٣٤٨).

فائدہ: عقد اجارہ نفع اور اجرت حاصل کرنے کے لئے موضوع ہے پھر جب حصول انتفاع ناقص یا متعذر ہو جائے تو عقد خود فسخ یا ترک کا مقتضی ہو گا، اب کسی جانب کے احتمالی نقصان کا اعتبار نہیں، کیونکہ متصور نقصان کی تلافی کا حکم مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔[1]

تنبیہ: ایجاب وقبول کے علاوہ جو حقوق عائد اور لازم ہوں، ان کی رعایت بھی ضروری ہے اس کی مزید تفصیل اجارہ مشروطہ کے تحت آرہی ہے۔

معقود علیہ کے ہلاک ہونے کا حکم

چہارم: اگر معقود علیہ ہلاک ہو جائے تو اصل حکم تو یہی ہے کہ عقد اجارہ فسخ ہو جائے گا البتہ حفاظت حقوق کی رعایت اور اجارات کی کثرت اور کثرت شروط کی وجہ سے اس کی کچھ تفصیل بیان کرنا ضروری ہے۔

۱۔ فوتِ محل: جیسے مزدور، مستاجر یا مکان سواری وغیرہ باقی نہ رہے، یا نفع حاصل کرنے کے قابل نہ رہے، تو ضرورت و مجبوری کی وجہ سے عقد اجارہ کے فسخ کا موجب ہے جیسے قبضہ سے پہلے مبیع کا ہلاک ہونا۔[2]

۲۔ فوتِ عاقد: اگر آقا فوت ہو جائے تو عقد کا ایفاء لازم ہے اور وجہ فسخ کرنا لازم نہیں[3]، اگر کرایہ دار ہے تو اس کے ورثاء کو اختیار ہو گا، فسخ کریں یا مدت تک مکمل کریں، ہاں البتہ اس معاہدے پر نظر کی جائے جس سے آقا یا مزدور کو اپنے کسی ثابت حق کی شکایت پیدا ہو سکے اور اس کی رعایت اس حد تک کی جائے جو اصول مسلمہ کے معارض نہ ہو، منہاج میں علماء شافعیہ سے یہی توجیہ منقول ہے۔[1]

---

[1] مرّ تخريجُه في الحواشي المتقدمة فليراجعْ.

[2] فأما هلاك المستأجر فإن كان شيئا بعينه يبطل وإن كان بغير عينه بأن وقعت الإجارة على دواب بغير عينها للحمل أو الركوب وسلم إليه الدواب فهلكت فعلى المؤاجر أن يأتي بغيرها ليحمل المتاع وليس له أن يفسخ.(تحفة الفقهاء ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٢ ص ٣٦١).

ومنها هلاك المستأجر، والمستأجر فيه لوقوع اليأس عن استيفاء المعقود عليه بعد هلاكه فلم يكن في بقاء العقد فائدة، حتى لو كان المستأجر عبدا أو ثوبا أو حليا أو ظرفا أو دابة معينة فهلك أو هلك الثوب المستأجر فيه للخياطة أو للقصارة؛ بطلت الإجارة لما قلنا.(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، ما ينتهي به عقد الاجارة، ج٤ ص ٢٢٣).

[3] مطبوعہ نسخہ میں عبارت یہی ہے البتہ مناسب عبارت یہ ہے "اور اس وجہ سے فسخ کرنا لازم نہیں" اصل نسخہ میں ہے "اگر موجر ہے تو عقد لازم اور وجہ انفساخ غیر ملزوم" ص۔

مسئلہ : زید کے دو نمائندے وکیل دو دکانوں پر ہیں، ایک بمبئی میں اور ایک کلکتہ میں، اس نے کئی مکان کرایہ پر لیا اور ان میں سامان بھی بھرا، اور بہت سے رئیسوں اور تاجروں سے بعض سامان تیار کرنے یا ان کے ہاتھ فروخت کرنے کا معاہدہ بھی کیا یا سامان تیار کروانے کا دوسروں سے معاہدہ لیا، اب زید کا انتقال ہو گیا، ایسی صورت میں اگر یہ وکلاء اچانک معزول ہو جائیں اور مکانات ان کے فیصلے سے نکل جائیں اور تمام ٹھیکے فسخ ہو جائیں تو صرف زید کے ورثاء ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کا نقصان ہو جائے گا جبکہ اسلام ایسے نقصان اور حرج میں نہیں ڈالتا، لہٰذا نقصان سے بچانے کے لئے لازم ہے کہ تمام کام اور معاہدے بدستور باقی اور ان کی تعمیل ضروری رہیں۔

ہاں البتہ ملازمین اور معاملہ کرنے والوں کو حق ہے کہ کسی مناسب مہلت اور عنوان سے علیحدگی کی درخواست دیں اور زید کے ورثاء کو ان کی جگہ دیگر انتظام کا موقع فراہم کریں، ان کو مالی اور انتظامی طور پر نقصان

---

[1] لا تنفسخ بموت العاقدين ومتولي الوقف ولو أكرى جمالا وهرب وتركها عند المكتري راجع القاضي ليمونها من مال الجمال فإن لم يجد له مالا اقترض عليه فإن وثق بالمكتري دفعه إليه وإلا جعله عند ثقة وله أن يبيع منها قدر النفقة ولو أذن للمكتري في الإنفاق من ماله ليرجع جاز في الأظهر (منهاج الطالبين وعمدة المفتين ،كتاب الاجارة، قبيل احياء الموات،ص: ١٦٣).

(ولا تنفسخ) الإجارة بنوعيها (بموت العاقدين) أو أحدهما للزومها كالبيع فتترك العين بعد موت المؤجر عند المستأجر أو وارثه ليستوفي منها المنفعة وفي الذمة ما التزمه دين عليه فإن كان في التركة وفاء استؤجر منها وإلا تخير الوارث فإن وفى استحق الأجرة وإلا فللمستأجر الفسخ(تحفة المحتاج في شرح المنهاج ،كتاب الاجارة،فصل فيما يقتضي انفساخ الإجارة،ج٦ص ١٨٧).

سئل) فيما إذا حكم قاض شافعي بعدم انفساخ الإجارة والمساقاة بموت المستأجر والمساقي في وجه الناظر في حادثة عدم انفساخهما بالموت حكما شرعيا موافقا .. فهل صح ذلك؟ (الجواب) : نعم. (تنقيح الفتاوى الحامدية ،كتاب الاجارة،ج٢ ص ١٣٠).

فقہاء احناف کے نزدیک متعاقدین میں سے کسی کے مرنے سے عقدِ اجارہ خود بخود ختم ہو جائے گا البتہ بعض مخصوص صورتوں میں ضرورۃ عقد کو برقرار رکھا جائے گا۔

"وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخت. الهداية،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،ج٣ص٢٤٧. وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب الإجارة،ج١ص ٢٧٣).

قوله: وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخ العقد

ولو مات أحد ممن وقع له عقد الإجارة قبل انقضاء المدة، وفي الأرض المستأجرة زرع لم يستحصد يترك ذلك في الأرض إلى أن يستحصد، ويكون على المستأجر أو على ورثته ما سمي من الأجر لأن في الحكم بالانفساخ وقلع الزرع ضررا بالمستأجر، وفي الإبقاء من غير عوض ضررا بالوارث، ويمكن توفير الحقين من غير ضرر بإبقاء الزرع إلى أن يستحصد بالأجر فيجب القول به،(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة،ماينتهي به عقد الاجارة ،ج٤ ص ٢٢٣).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،ج٦ ص ٨٥).

نہ پہنچائیں اور ایسے ہی ورثاء کو دوسرے معاہدہ داروں اور ملازمین سے آسان طریقے پر جدائی اختیار کرنے کا حق ہے کیونکہ وہ اطمینان اور رعایت یا خصوصیت جو زید کی طرف سے حاصل تھی، اب باقی نہیں رہی۔[1]

مسئلہ : زید کسی ملک کا سربراہ ہے اس نے دشمن کے مقابلے میں فوج بھیجا اور خود بھی لڑائی میں مارا گیا، تو اس کے ملازم فوج کو حق ہے کہ اپنے آپ کو معزول تصور کرتے ہوئے دشمن کے مقابلے سے ہٹ جائیں۔[2]

مسئلہ : آقا نے مزدور سے عہد کر لیا کہ ضرورت ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں اجرت دیدی جائے گی، یا ملازم نے آقا کی ترغیب وعدہ سے مزدوری چھوڑ دی، یا آقا کی طلب سے مشقت ونقصان اٹھایا اب کوئی عذر اس کے نقصان کو باطل نہیں کر سکتا ہے بلکہ مزدور کی اجرت ہر حال میں ادا کرنی ہو گی۔[3]

کام مکمل ہونے سے پہلے مدت اجارہ ختم ہو جائے

"سیر الکبیر"[4] میں مذکور ہے کہ کرایہ کی کشتی ابھی تک سمندر میں ہے یا منزل مقصود تک نہیں پہنچتی، یا زمین میں فصل تیار نہیں ہوئی، اور اجارہ کی مدت ختم ہو گئی، ایسی صورت میں اجارہ فسخ نہیں ہو سکتا، بلکہ کام مکمل ہونے یا کھیتی کٹنے تک نئی اجرت کے ساتھ کشتی اور زمین کرایہ دار کے قبضہ میں رہے گی، ایسے ہی آقا کی ضرورت کے وقت ملازم مزدور یا وکیل علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو ان کو مجبور کیا جائے گا کہ فی الحال

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] اجارہ کے عام اصول کے پیشِ نظر یہ حکم لکھا گیا کہ سربراہِ ملک مستاجر تھا جس کے انتقال کرنے سے حنفیہ کے نزدیک اجارہ فسخ ہو جاتا ہے، ورنہ اگر شرعی جہاد کے موقع پر ایسی صورت حال سامنے آجائے تو مسلمان فوج کے لئے راہِ فرار اختیار کرنا جائز نہیں، سوائے کچھ خاص صورتوں کے جس کی تفصیلات فقہی کتابوں کے "کتاب الجہاد" میں ذکر کی جاتی ہیں۔

[3] والأجير الخاص: الذي يستحق الأجرة بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة أو لرعي الغنم(مختصر القدوري ،كتاب الاجارة،،ص: ١٠٢.

وكذا في الجوهرة النيرة ،كتاب الاجارة، مبحث الاجير المشترك والاجير الخاص،ج١ ص ٢٦٥.

(والخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة، وإن لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة أو لرعي الغنم) أي الأجير الخاص يستحق الأجرة بتسليم نفسه للعمل عمل أو لم يعمل. تبيين الحقائق ،كتاب الاجارة، باب ضمان الاجير،ج٥ص ١٣٧.

[4] امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ہے، اصل نام "السّیر الکبیر" ہے۔

ملازمت برقرار رکھو۔[1]

ہاں البتہ مزدور نے بوقت عقد شرط رکھی کہ میں کسی ضرورت کے وقت کے پابند نہیں ہوں جب چاہوں علیحدہ ہو جاؤں گا، تو پھر وقت سے پہلے علیحدہ ہونا اس کے لئے جائز ہو گا۔

ضرورت کے وقت ملازمت چھوڑنا

مسئلہ : ایسے ملازم جن سے ہمہ وقت کام لینا مشروط ہو، اور ملازمت کی اصلی غرض مشروط کام کے علاوہ کچھ اور ہو، جیسے فوج ہے روزانہ جنگی مشق کرے، پہرہ دے، کچھ اور کام کرے مگر ان سے غرض اصلی قتال وغیرہ ہے تو ایسے نوکروں کے لئے جائز نہیں کہ جنگ کے وقت آنے پر عذر کرے، ہاں کوئی کام اس کی طاقت سے زیادہ یا منصب کے خلاف لیا جائے، تو وہ عذر کر سکتا ہے، اگر وہ ضرورت دائمی نظر آئے تو ملازم ایک مناسب مدت تک خدمت کر کے پہلے اطلاع کر کے جدا ہو سکتا ہے کیونکہ ملازم ہے غلام نہیں۔[2]

مسئلہ : جو اجارے محض پسند اطمینان اور حسن ظن کی بنیاد پر ہوتے ہیں، جیسے وکیل، طبیب، معلم وغیرہ،

---

[1] بيانه في استئجار السفينة مدة معلومة، إذا انتهت المدة أو مات صاحب السفينة والسفينة في لجة البحر. وكذلك استئجار الأوعية لحمل المائع فيها مدة معلومة إذا انتهت المدة وهم في المفازة. وكذلك إذا استأجر دابة لحمل أمتعة من موضع إلى موضع مدة معلومة فانتهت المدة وهم في المفازة، أو مات صاحب الدابة، فإنه يبتدأ بالعقد بعد انتهاء المدة، ويبقى بعد الموت في هذه المواضع بأجر المثل، وبالمسمى في حالة البقاء. وكان ذلك لأجل الحاجة(شرح السير الكبير ،باب ما يحمل عليه الفيء،ج١ ص ١٠٤٤).

ولو مات أحد ممن وقع له عقد الإجارة قبل انقضاء المدة، وفي الأرض المستأجرة زرع لم يستحصد يترك ذلك في الأرض إلى أن يستحصد، ويكون على المستأجر أو على ورثته ما سمي من الأجر لأن في الحكم بالانفساخ وقلع الزرع ضررا بالمستأجر، وفي الإبقاء من غير عوض ضررا بالوارث، ويمكن توفير الحقين من غير ضرر بإبقاء الزرع إلى أن يستحصد بالأجر فيجب القول به،(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة،ماينتهي به عقد الاجارة ،ج٤ ص ٢٢٣).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة،ج٦ ص ٨٥).

[2] وإن رأى الإمام أن يستأجر الحمولة من أصحابها بأجر معلوم فذلك صحيح.. ويستوي في ذلك إن رضي به أصحاب الحمولة أو أبوا إذا كان بهم غنى عن تلك الحمولة. لأنهم بهذا الإباء قصدوا التعنت.فإن في هذا الاستئجار منفعة لهم، من حيث إنه يحصل لهم الأجرة بمقابلة منفعة لا تبقى لهم بدون هذا الاستئجار، وفيه منفعة للغانمين أيضا. فكانوا متعنتين في الإباء، والقاضي لا يلتفت إلى إباء المتعنت. ولأن ابتداء الاستئجار وبقاء الإجارة عند تحقق الحاجة صحيح من غير الأمير، فمن الأمير أولى. (شرح السير الكبير ،باب ما يحمل عليه الفيء،ج١ ص ١٠٤٤). وانظر الحاشية المتقدمة ايضا.

ان کے ساتھ اجارہ فسخ کرنے کے لئے کسی معتبر عذر کی ضرورت نہیں [1]، البتہ جس قدر فائدہ اٹھایا ہے یا ملازم کا حرج کیا یا اس کا وقت ضائع کیا ہے، اس کا معاوضہ دینا لازم ہے۔ [2]

عقدِ اجارہ کے فاسد ہونے کی وجوہات

وہ تمام باتیں جن سے بیع فاسد ہو جاتی ہے ان سے اجارہ بھی فاسد ہو جاتا ہے، البتہ بعض باتیں جو اپنے موقع پر مذکور ہوں گے۔

۱۔ اجرت کا مبہم یا مجہول ہونا۔ [3]

۲۔ معقود علیہ کا مبہم یا مجہول ہونا۔ مثلاً گاڑی کرایہ پر لی لیکن کرایہ متعین نہیں کیا، یہ متعین نہیں کیا کہ کتنی دور جانا ہے اور کتنے وقت کے لئے جانا ہے۔ [4]

۳۔ غیر متقوم مال کو اجرت ٹھہرانا جیسے شراب یا خنزیر۔ [5]

۴۔ معقود علیہ کا استعمال جائز نہ ہو جیسے گناہوں کے کام کے لئے اجارہ پر لینا بعض باطل ہیں اور بعض فاسد۔ [6]

---

[1] لعلّه مبنيّ على خيارِ فوات الوصف المرغوب، واشتراطُ الوصف قدْيثبتُ بنصّ العاقد وقد يثبتُ دلالة.

[2] مرّتْ مِرارا.

[3] ولا تصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة لما روينا، ولأن الجهالة في المعقود عليه وبدله تفضي إلى المنازعة(الهداية ،كتاب الاجارات، ج٣ ص ٢٣٠).

فساد الإجارة ينشأ بعضه عن كون البدل مجهولا وبعضه عن فقدان باقي شرائط الصحة(مجلة الأحكام العدلية ،الباب الثاني، (المادة ٤٦٢)ص:٨٨).

[4] (ولا تصح) الإجارة (حتى تكون المنافع معلومة والأجرة) أيضاً (معلومة) لأن الجهالة في المعقود عليه وبدله تفضي إلى المنازعة، كجهالة الثمن والمثمن في البيع. (اللباب في شرح الكتاب ،كتاب الاجارة، ج٢ص ٨٨).

اعلم أن الإجارة تفسد بالشروط كما يفسد البيع، وكل جهالة تفسد البيع تفسد الإجارة من جهالة المعقود عليه أو الأجرة أو المدة لما عرف أن الجهالة مفضية إلى المنازعة. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الاجارة،فصل بيان ما يجب إذا فسدت الإجارة، ج٢ص ٥٧).

[5] الأجرة في الإجارات معتبرة بالثمن في البياعات لأن كل واحد من العقدين معاوضة المال بالمال فما يصلح ثمنا في البياعات يصلح أجرة في الإجارات وما لا فلا وهو أن تكون الأجرة مالا متقوما معلوما.(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط ما يقابل المعقود عليه، ج٤ص ١٩٣).

[6] وعلى هذا يخرج الاستئجار على المعاصي أنه لا يصح لأنه استئجار على منفعة غير مقدورة الاستيفاء شرعا كاستئجار الإنسان للعب واللهو، وكاستئجار المغنية، والنائحة للغناء. بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، ج٤ص ١٨٩.

وكذا في الفتاوى الهندية، كتاب الإجارة، الباب الاول، ج٤ص ٤١١.

۵۔ اجرت و معقود علیہ کا ہم جنس ہونا۔ جیسے سکہ سکہ کے عوض میں، سواری سواری کے عوض میں [1]، لیکن دو عقد مستقل ہوں تو جائز ہے۔ [2]

مسئلہ : زید نے عمر سے چھ سو روپے ماہوار مکان کرایہ پر لیا پھر اپنا مکان پانچ سو روپے ماہوار پر عمر کو دیا، یہ دو عقد علیحدہ علیحدہ ہیں، اس لئے دونوں جائز ہیں۔ [3]

بعض نفع کو اجرت قرار دینے کا حکم

۶۔ جس کام کے لئے مزدور رکھا، اس کے بعض منافع کو اجرت قرار دینا، جیسے یہ دس من گندم لکھنو سے کانپور لے جاؤ ایک من تمہارا ہوگا بطور اجرت کے، یا اس دھاگہ سے کپڑا بناؤ اس میں سے ایک دو گز کپڑا تمہاری اجرت ہوگی [4]۔

لیکن اگر معقود علیہ کو اجرت نہ ٹھہرائے بلکہ یوں کہے ایک من گندم اجرت ہوگی، یا مطلقاً کہا فلاں

---

[1] وإذا كانت الأجرة منفعة إن كانت من جنس المعقود عليه لا يجوز عندنا خلافاً للشافعي..وبيع المنفعة بمنفعة من جنسها بمنزلة بيع العين بجنسه نساء، لأن النساء من البدل ما لا يكون عيناً والمنفعة ليست بمعين، لأنها معدومة فكان نساء، والجنسية في المثمنين تحرم النساء.(المحيط البرهاني ،كتاب الاجارات، الفصل الاول، ج٧ص ٣٩٦).

ومنها أن لا تكون الأجرة منفعة هي من جنس المعقود عليه كإجارة السكنى بالسكنى، والخدمة بالخدمة، والركوب بالركوب والزراعة بالزراعة حتى لا يجوز شيء من ذلك عندنا.(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، مباحث الاجرة، ج٤ ص ١٩٤).

[2] کیونکہ اس کے ناجائز ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ ربا البیع ہے اور وہ تبھی ممکن ہے کہ جب اس کو ایک ہی عقد میں ایک دوسرے کا عوض بنایا جائے، دو مختلف عقود کی صورت میں چونکہ ربا البیع کا کوئی شائبہ نہیں ہے اس لئے جائز ہے۔

[3] انظر الحاشيتين السابقتين.

[4] وكذلك إن استأجر رجلا ليحمل له طعاما بقفيز منه وكذلك إن استأجر من رجل حمارا يحمل له طعاما بقفيز منه فالإجارة فاسدة.(الجامع الصغير مع شرحه النافع الكبير ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ص:٤٤٠).

قال: (ومن استأجر دابة ليحمل عليها طعاما بقفيز منه فهو فاسد) لأنه جعل الأجر بعض ما يخرج من عمله فصار كقفيز الطحان، وقدنهى النبي صلى الله عليه وسلم عن قفيز الطحان، وهو أن يستأجر ثورا أو رحى ليطحن له حنطة بقفيز منها. وينبني على هذا مسائل كثيرة تعرف بالتأمل: منها إذا دفعه إلى حائك غزلا لينسجه بالنصف.(الاختيار لتعليل المختار. كتاب الاجارة،فصل بيان ما يجب إذا فسدت الإجارة، ج٢ ص ٦٠).

(تفسد) أي الإجارة (إن دفع إلى آخر غزلا لينسجه بنصفه أو استأجر حمارا ليحمل زاده ببعضه) أي بعض الزاد (أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه) هذا الأخير يسمى قفيز الطحان وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عنه؛ لأنه جعل الأجر بعض ما يخرج من عمله.(درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب الاجارة، ما يفسد الاجارة، ج٢ ص ٢٣٣).

قسم کے دو گز کپڑا بطور اجرت ہوگا تو یہ عقد صحیح ہوگا۔[1]

دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں بعض معقود علیہ اجرت کے لئے متعین ہے لہٰذا مزدور مالک کے ساتھ شریک ہوگیا اور مالک نوکر کے بغیر اجرت کی ادائیگی سے قاصر ہے دوسری صورت میں اجرت متعین نہیں، جو گندم چاہے سے سکتا ہے، وہی دے یا کوئی دیدے تو یہ جائز ہے۔

۷۔ عمل کی مقدار اور وقت دونوں متعین کرنا، جیسے روزانہ دو گھنٹہ کام کرو اور اس قدر کام کرو، یہ شرط فاسد ہے، کیونکہ اگر کام پہلے ختم ہوگیا اور وقت باقی ہے تو اب کام لینے کا محل نہ رہا اور اگر کام پہلے پورا ہوگیا تو وقت کس لئے ہے؟ یا اگر یہ بات صرف انتظام یا اندازہ لگانے کے لئے ہو اور اجرت ان پر منقسم نہ ہو تو ایسی شرط میں کوئی مضائقہ نہیں۔[2]

نقد کی وجہ سے اجرت میں اضافہ کرنا

۸۔ یہ شرط رکھی کہ اگر کپڑا آج سی دو گے تو سو روپے سلائی ملے گی، ورنہ /۵۰ روپے دوں گا، امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یہ شرط مفسد ہے اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے، فتاویٰ عالمگیری میں اسی کو ترجیح دی

---

[1] والحيلة في ذلك لمن أراد الجواز أن يشترط صاحب الحنطة قفيزا من الدقيق الجيد ولم يقل من هذه الحنطة أو يشترط ربع هذه الحنطة من الدقيق الجيد لأن الدقيق إذا لم يكن مضافا إلى حنطة بعينها يجب في الذمة والأجر كما يجوز أن يكون مشارا إليه يجوز أن يكون دينا في الذمة ثم إذا جاز يجوز أن يعطيه ربع دقيق هذه الحنطة إن شاء. كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب الخامس عشر،الفصل الثالث في قفيز الطحان وما هو في معناه،ج٤ ص ٤٤٤).

والحيلة أن يفرز الأجر أولا أو يسمي قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين كتاب الاجارة، الاجارة الفاسدة،مطلب في الاستئجار على المعاصي،ج٦ ص ٥٧).

[2] ومن استأجر رجلا ليخبز له هذه العشرة المخاتيم من الدقيق اليوم بدرهم فهو فاسد، وهذا عند أبي حنيفة. وقال أبو يوسف ومحمد في الإجارات: هو جائز"(الهداية ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٣ ص ٢٤٠).

في الدر المختار: (أو) استأجر (خبازا ليخبز له كذا) كقفيز دقيق (اليوم بدرهم) فسدت عند الإمام لجمعه بين العمل والوقت ولا ترجيح لأحدهما فيفضي للمنازعة، حتى لو قال في اليوم أو على أن تفرغ منه اليوم جازت إجماعا.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: "وقال الصاحبان: هي صحيحة، ويقع العقد على العمل، وذكر الوقت للتعجيل تصحيحا للعقد عند تعذر الجمع بينهما فترتفع الجهالة.وظاهر كلام الزيلعي ترجيح قولهما وهذا إذا أخر الأجرة، أما إذا وسطها فالمعقود عليه المتقدم لتمام العقد بذكر الأجر ثم المتأخر إن كان وقتا فللتعجيل، وإن كان عملا فلبيان العمل في ذلك الوقت فلا يفسد كما نقله ابن الكمال عن الخانية"(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الاجارة، الاجارة الفاسدة،مطلب في الاستئجار على المعاصي،ج٦ ص ٥٨).

مگر بہتر یہ ہے کہ سلائی/۵۰ ہی ہو باقی نقد کام کرنے پر انعام ہو۔[1]

۹۔ مکان کی مرمت کو کرایہ دار کے ذمہ ڈالا جائے، اس سے عقد اجارہ فاسد ہو گا کیونکہ مرمت کا خرچہ مجہول ہونے کی وجہ سے کرایہ مجہول ہو گیا، صاحب مکان زیادہ مرمت کا مطالبہ کرے گا اور کرایہ دار کم کرنا چاہے گا، اس طرح نزاع پیدا ہو گا اور جو بات مفضی الی النزاع ہو وہ مفسد عقد ہوتا ہے۔[2]

۱۰۔ اگر یہ کہا کہ اس کپڑے سے "قبا" سی دو گے تو سو روپے اجرت ملے گی اور اگر کرتا سی دو گے تو پچاس روپے، تو دونوں معقود علیہ خیار تعین کی طرح ہے، اب درزی کو اختیار ہے جو سی کر دے وہی اجرت ملے گی۔[3]

---

[1] أعطى خياطا ثوبا فقال إن خطته اليوم فلك درهم وإن خطه غدا فلك نصف درهم فإن خاطه اليوم فله درهم وإن خاطه غدا فله أجر مثله لا ينقص من نصف درهم ولا يزاد على درهم وقال أبو يوسف ومحمد (رحمهما الله) الشرطان جائزان(الجامع الصغير مع شرحه النافع الكبير، كتاب الاجارة، الاجارة الفاسدة، ص ٤٤٣).

وانظر ايضا الفتاوى الهندية (كتاب الاجارة،الباب السادس في الإجارة على أحد الشرطين أو على الشرطين أو أكثر،ج ٤ص ٤٢٢).

قال الميداني رحمه الله: "قال في التصحيح: واعتمد قول الإمام في الخلافيات المذكورة المحبوبي والنسفي وصدر الشريعة وأبو الفضل."(اللباب في شرح الكتاب ،كتاب الاجارة،ج٢ ص ٩٨).

[2] ينبغي أنْ يُذكر بديلُ هذه المعاملة، وهو ما في عبارة المحيط التالية: كذا لو استأجر دارا أو حانوتا سنة بمائة درهم على أن يرمها المستأجر كان على المستأجر أجر المثل بالغا ما بلغ لأنه لما شرط المرمة على المستأجر صارت المرمة من الأجر فيصير الأجر مجهولا فأما إذا كان فاسد الإجارة بحكم شرط فاسد أو نحو ذلك كان له أجر المثل ولا يزاد على المسمى.(فتاوى قاضيخان،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٢ص ١٧١).

وإن شرط المرمة على المستأجر فسدت الإجارة؛ لأن قدر المرمة يصير أجرة وإنه مجهول، ولو شرط رب الحمام على المستأجر وعشرة دراهم كل شهر لمرمته مع الأجر كان جائزاً؛ لأن جميع الأجر معلوم وهذا هو الحيلة لجواز الإجارة متى أراد أن يجعل بعض المرمة أجراً حين قدر ما يحتاج إليه للمرمة في الإجارة، ثم يأمره بصرف ذلك إلى المرمة فيصير وكيلاً من جهته بالإنفاق عليه. هكذا ذكر في «الكتاب» : ولم نجد فيه خلافاً من مشايخنا من قال ما ذكر في «الكتاب» قول أبي يوسف ومحمد رحمهما الله، فأما على قول أبي حنيفة رحمه الله لا يجوز هذا التوكيل إذا لم يعين الآجر أو باعه الآلات... (المحيط البرهاني ،كتاب الاجارات،الفصل الثالث والعشرون: في استئجار الحمام والرحى،ج٧ص ٥٣١).

[3] وكذا لو قال للخياط إن خطت هذا الثوب فلك درهم وإن خطت هذا الثوب الآخر فلك نصف درهم أو قال إن خطت هذا الثوب روميا فلك درهم وإن خطته فارسيا فلك نصف درهم أو قال للصباغ إن صبغته بالعصفر فلك كذا وإن صبغته بالزعفران فلك كذا جاز جميع ذلك.(فتاوى قاضيخان،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٢ص ١٧٥).

۱۱۔ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو، مفسدِ عقد ہے جیسا کہ بیع میں ذکر ہوا۔[1]

۱۲۔ ہر وہ شرط جس میں آقا یا مزدور کا فائدہ ہو، مفسد عقد ہے، زید نے بکر سے ایک زمین کرایہ پر لی باغ لگانے کے لئے یا مکان بنانے کے لئے، اور زمین درست کرنے کے بعد بکر کو کرایہ پر دی، یہ اجارہ فاسد نہیں، جائز ہے (شامی)[2] اس وجہ سے نہیں کہ مالک کو کرایہ پر دینا جائز ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ یہ عمارت زید کی ملک ہے، صرف درختوں اور عمارت کو ایسی صورت میں کرایہ پر دینا نہ غیر ملک کے ساتھ مزاحمت ہے نہ مالک ملک کی غیر ملک کے ساتھ مشغولی ہے لہٰذا یہ اجارہ صحیح ہے۔

اجارہ کے بعض متفرق مسائل

۱۔اجارہ میں بھی بیع کی طرح خیار رؤیت، خیار شرط اور خیار عیب ہے۔(عالمگیری)[3]

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الاجارة،الباب السادس في الإجارة على أحد الشرطين أو على الشرطين أو أكثر، ج ٤ص ٤٢٢).

[1] تكون الإجارة فاسدة إذا ربطت بشرط فاسد لأن العقد والمنافع يصبحان مالا متقوما. فعليه لما كانت الإجارة كالبيع معاوضة مالية والبيع يفسد بأمثال هذا الشرط فتفسد الإجارة به أيضا.(درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ،رقم المادة: ٤٦٠،ج١ص ٥١٣).

الفساد قد يكون لجهالة قدر العمل بأن لا يعين محل العمل وقد يكون لجهالة قدر المنفعة بأن لا يبين المدة وقد يكون لجهالة البدل وقد يكون بشرط فاسد مخالف لمقتضى العقد. (الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الاول، ج٤ص ٤٣٩).

[2] نص محمد أن من استأجر أرضا فبنى فيها بناء ثم آجرها من صاحبها استوجب من الأجر حصة البناء.(حاشية ابن عابدين على الدر المختار ، كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،مطلب في إجارة البناء،ج٦ ص٤٨).

وعن محمد رحمه الله تعالى جوازه فإنه قال من استأجر أرضا فبنى فيها بناء ثم آجرها منه صاحبها استوجب من الأجر حصة البناء فلولا جواز إجارة البناء لما استحق الأجر وقاسه على الفسطاط قال الامام أبو علي رحمه الله وبه كان يفتي مشايخنا.(لسان الحكام، الفصل الثامن عشر في الاجارة،ص٣٦٦).

[3] استأجر على أنه بالخيار ثلاثة أيام يجوز وعلى أكثر على الخلاف..وخيار الرؤية ثابت للمستأجر... ويثبت خيار العيب في الإجارة كما في البيع إلا أن في الإجارة ينفرد المستأجر بالرد قبل القبض وبعد القبض وفي البيع ينفرد المشتري بالرد قبل القبض وبعد القبض يحتاج إلى القضاء أو الرضا. كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة،الباب الخامس في الخيار في الإجارة والشرط فيها، ج٤ ص ٤١٩).

(ويثبت فيها) أي في الإجارة (خيار الشرط) كما يثبت في البيع. (و) خيار (الرؤية) خلافا للشافعي فيهما.(و) خيار (العيب) سواء كان حاصلا قبل العقد أو بعده.(مجمع الأنهر ، كتاب الإجارة، ج٢ص ٣٦٩).

۲۔ کسی عمل یا کسی چیز سے نفع اٹھانے کو اجرت ٹھہرائی جائے تو بیع مقائضہ پر قیاس ہو گا۔ [1]

۳۔ کرایہ پر لی ہوئی چیز آگے کرایہ یا عاریت پر دینا درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے [2]:

الف۔ استعمال کا طریقہ شرط کے خلاف نہ ہو۔ [3]

ب۔ کرایہ دار معین نہ ہو مثلاً مالک نے شرط رکھی کہ تم ہی سواری کروگے، تو اب اس کے علاوہ کوئی اور سواری نہیں کر سکتا۔ [4]

ج۔ کرایہ پر لی ہوئی چیز کے مالک کو اجارہ پر نہ دیا ہو۔ [5]

۴۔ معقود علیہ حوالہ کرنے سے قبل یا مدت پوری ہونے سے پہلے اجرت واجب نہیں ہوتی، ہاں کرایہ دار کرایہ پہلے ہی ادا کر دے یا کرایہ پیشگی ادا کرنے کی شرط لگائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ [1]

---

[1] (قوله وما صح ثمنا صح أجرة) أي ما جاز أن يكون ثمنا في البيع جاز أن يكون أجرة في الإجارة لأن الأجرة ثمن المنفعة فتعتبر بثمن المبيع ومراده من الثمن ما كان بدلا عن شيء فدخل فيه الأعيان فإن العين تصلح بدلا في المقايضة فتصلح أجرة.(البحر الرائق ،كتاب الاجارة، ج٧ص ٢٩٨).

وكذا في الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب الاجارة، ج٦ص٤).

[2] قال محمد رحمه الله: وللمستأجر أن يؤاجر البيت المستأجر من غيره، فالأصل عندنا: أن المستأجر يملك الإجارة فيما لا يتفاوت الناس في الانتفاع به.(المحيط البرهاني ،كتاب الاجارة، الفصل السابع في إجارة المستأجر، ج ٧ص٤٢٩).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الاجارة، الباب السابع في إجارة المستأجر، ج٤ص٤٢٥).

[3] ينبغي اضافة ان الشرط قد يكون صريحا وقد يكون دلالة فاستعمال الشئي خلاف ماجرت العادة باستعماله تعد وان لم يشترط صراحة. كما في عبارة المجلة الثانية.

مخالفة المستأجر مأذونيته بالتجاوز إلى ما فوق المشروط توجب الضمان...تعدي الأجير هو أن يعمل عملا أو يتحرك حركة مخالفتين لأمر الآجر صراحة أو دلالة.(مجلة الأحكام العدلية ،كتاب الاجارة، الباب الثامن،رقم المادة ٦٠٥و٦٠٨. ص ١١٣).

[4] فإن قال على أن يركبها فلان فأركبها غيره فعطبت ضمن. كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب السادس والعشرون في استئجار الدواب للركوب، ج٤ص ٤٨٧).

[5] (للمستأجر أن يؤجر المؤجر) بعد قبضه قيل وقبله (من غير مؤجره، وأما من مؤجره فلا) يجوز وإن تخلل ثالث به يفتى للزوم تمليك المالك،(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،كتاب الاجارة، مسائل شتي،مطلب في إجارة المستأجر للمؤجر ولغيره، ج٦ص٩١).

قال الإمام الحلواني وروي عن محمد رحمه الله تعالى أن الإجارة من المالك لا تجوز مطلقا تخلل الثالث أو لا وبه قال عامة المشايخ وهو الصحيح وعليه الفتوى.(الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب السابع في إجارة المستأجر، ج٤ص٤٢٥).

۵۔ اگر اجرت پیشگی دیدی جائے تو دینے والے کو واپسی کا حق نہیں رہتا۔[2]

۶۔ پیشگی اجرت دیتے وقت اس بات کی ضمانت لینا کہ اگر کام نہ ہو سکے تو اجرت واپس دی جائے گی، جائز ہے۔[3]

۷۔ وہ مزدور جس کے عمل کا اثر مال میں رہتا ہے جیسے کپڑا رنگنے والا، وہ اجرت کی وصولی کے لئے کپڑا روک سکتا ہے، اور جس مزدور کے عمل کا اثر مال میں نہیں ہے جیسے معمار (مستری) بڑھئی، یا بنائی ہوئی دیوار، تراشی ہوئی لکڑی، ان کو اجرت کے وصولی تک نہیں روک سکتا۔ (ہدایہ)[4]

۸۔ اگر کام کروانے والا یہ شرط رکھے کہ یہی آدمی میرا کام کرے گا یا گاڑی مجھے پہنچائے گا، اس شرط کے بعد اس میں تبدیلی جائز نہیں، ورنہ اختیار ہے۔ (تنویر الابصار)[5]

۹۔ بیع کی طرح اجارہ میں بھی تفریق صفقہ ابتداءً ناجائز ہے اور بقاءً جائز ہے۔[6]

---

[1] (والأجرة تستحق باستيفاء المعقود عليه، أو باشتراط التعجيل أو بتعجيلها) لأن الأجرة لا تجب بنفس العقد.(الاختيار لتعليل المختار، كتاب الاجارة، فصل ما تستحق به الأجرة ، ج٢ص٥٥).

فالحاصل أن الأجرة لا تملك عندنا إلا بأحد معان ثلاثة: أحدها: شرط التعجيل في نفس العقد، والثاني: التعجيل من غير شرط: والثالث: استيفاء المعقود عليه.(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، حكم الاجارة، ج٤ص ٢٠٢).

[2] کیونکہ دیتے ہی وہ دینے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور موجر اس کا ملک بن جاتا ہے جیسا کہ پچھلے حاشیہ میں گزر چکا۔

[3] لانه مقتضى عقد المعاوضة كما لايخفى فلا يفسد العقد.

[4] "وكل صانع لعمله أثر في العين كالقصار والصباغ فله أن يحبس العين حتى يستوفي الأجر"؛ لأن المعقود عليه وصف قائم في الثوب فله حق الحبس؛ لاستيفاء البدل كما في المبيع ..."وكل صانع ليس لعمله أثر في العين فليس له أن يحبس العين للأجر كالحمال والملاح"؛ لأن المعقود عليه نفس العمل وهو غير قائم في العين فلا يتصور حبسه فليس له ولاية الحبس.(الهداية ،كتاب الاجارة، باب الأجر متى يستحق ،ج٣ص ٢٣٢).

كل عامل لعلمه أثر في العين له حق الحبس وأجمعوا على أنه إذا لم يكن لعمله أثر في العين نحو الغسل والحمل لا يملك الحبس. (الجامع الصغير مع شرحه النافع الكبير ،كتاب الاجارات، باب جناية المستاجر،ص:٤٤٨).

[5](وإذا شرط عمله بنفسه) بأن يقول له اعمل بنفسك أو بيدك (لا يستعمل غيره إلا الظئر فلها استعمال غيرها) بشرط وغيره خلاصة (وإن أطلق كان له) أي للأجير أن يستأجر غيره. (شرح تنوير الابصار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الاجارة، ج٦ص ١٨).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الاجارة،قبيل باب ما يجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، ج٧ ص ٣٠٣).

[6] في مجلة الأحكام العدلية: (المادة ٤٤٥) يشترط موافقة الإيجاب والقبول واتحاد مجلس العقد في الإجارة كما في البيوع.

مسئلہ نمبر: زید نے ایک مکان سال بھر کے لئے کرایہ پر لیا، تو سال کے درمیان زید کے لئے مکان چھوڑنا جائز نہیں، اس طرح اس کو نکال نہیں سکتا، البتہ اگر مکان گر گیا یا اس پر کسی نے زبردستی قبضہ کرلیا تو اب صفقہ متفرق ہوگا اور بقدرِ حصہ اجرت واجب ہوگی، لہٰذا اگر دس بیگہ ایک لاکھ میں اس نے کرایہ پر لیا اور پانچ بیگہ کسی وجہ سے اس کے قبضے میں نہ آسکے تو سالانہ پچاس ہزار روپے کی ادائیگی لازم ہوگی۔[1]

اجارہ میں تعاطی کا حکم

۱۰۔ بیع کی طرح کرایہ بھی تعاطی سے ہو سکتا ہے بشرطیکہ کرایہ معروف ہو اور چیز کرایہ پر دینے کے لئے تیار کرکے رکھے، مثلاً کشتی پر سوار ہو کر یا دوسرے پار چلے گئے تو جو کرایہ سب دیتے ہیں دیدئے، یا نائی سے بال بنوا کے متعین اجرت دیدی، اسی طرح ریلوے، بس وغیرہ کا کرایہ، بیرنگ محصولات اسی طور پر ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اجارہ میں تعاطی کے لئے دو شرطیں ہیں:

۱۔ مالک نے مال کرایہ پر دینے کے لئے تیار کرر کھا ہو۔[2]

۲۔ اس کا کرایہ معروف اور متعین ہو تا کہ آخر میں جھگڑا پیش نہ آئے۔[1]

وفي الدرر تحته: موافقة الإيجاب والقبول: يجب أن يكون القبول بما يوجبه الموجب في إيجابه عينا وليس للذي يقبل أن يغير المأجور، أو المدة، أو يفرق المنفعة، أو يبعضها، أو يبدلها بشيء ما. وإذا كان الإيجاب واحدا والمأجور متعددا؛ فلا يكون القابل مخيرا في تفريق الصفقة وإنما له أن يقبل به جميعا بما سمي من البدل.. (درر الحكام شرح مجلة الاحكام، كتاب الاجارة، الباب الثاني، الفصل الثاني، ج١ص ٤٩٧).

[1] مرّ تفصيلُه في أعذار فسخ عقد الإجارة.

[2] یہ شرط اس لئے ضروری ہے کہ تعاطی نام ہے مالک کے صریح اجازت کے بغیر چیز لے لینے کا، اور اگر کوئی کسی دوسری کی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال کر کے واپس کرے تو اس پر کوئی اجرت لازم نہیں ہوگی، کیونکہ یہ ابتداءً بھی اجارہ نہیں باقاعدہ ایجاب وقبول، معقود علیہ اور اجرت نہ ہونے کی وجہ سے، اور انتہاءً بھی جب اجرت واجب نہیں ہوئی تو اجارہ نہیں کہلایا جا سکتا، لیکن اگر کوئی چیز کرایہ پر دینے کے لئے ہی تیار رکھا جائے (یا یتیم کا مال ہو یا وقف کا مال ہو) تو اس کو بغیر اجازت استعمال کرنے سے بھی اجرت واجب ہوتی ہے جس کی وجہ سے انتہاءً یہ اجارہ بن جاتا ہے۔ في الدر المختار: (وضمن بزرع رطبة وأمر بالبر) ما نقص من الأرض؛ لأن الرطبة أضر من البر (ولا أجر) ؛ لأنه غاصب إلا فيما استثنى كما سيجيء.

وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله إلا فيما استثنى) قال في المنح قلت: ما ذكر هنا من عدم وجوب الأجر ووجوب ما نقص من الأرض مذهب المتقدمين من المشايخ. وأما مذهب المتأخرين فيجب أجر المثل على الغاصب لأرض الوقف واليتيم والمعد للاستغلال كالخان ونحوه.(كتاب الاجارة، باب مايجوز من الاجارة ومالا يجوز، ج٦ص ٤١).

مسئلہ : حکومت کی طرف سے جو کرایہ کا تعین ہوتا ہے کہ فی گھنٹہ اتنا کرایہ دینا ہوگا، یہ درست نہیں ہے کیونکہ عرفی تعین کا مطلب یہ ہے کہ سب کی رضامندی سے ہو جبکہ حکومت جبراً تعین کرتی ہے البتہ حکومت کا تعین مصلحت عامہ اور ملکی ضرورت کی بنیاد پر ہو اور شریعت کے خلاف اس میں کوئی بات نہ پائی جائے تو حکومتی تعیین میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔[2]

اگر کرایہ کے بارے میں باہم کوئی طے نہ ہوا ہو یا کچھ منازعت پیش آجائے تو دونوں وہاں کے عرف کے پابند ہوں گے اس طرح خوفناک امور سے بچنے پر قادر ہوں گے۔

مسئلہ : زید نے کانپور تک جانے کے لئے گاڑی کرایہ پر لی، اب ایسے راستہ سے کانپور جانا چاہتا ہے جس میں گاڑی ٹوٹنے یا الٹ جانے کا خطرہ ہے یا زیادہ چکر لگانا پڑے گا تو گاڑی والا انکار کر سکتا ہے، اگر دونوں راستے امن وسلامتی اور مسافت میں برابر ہو تو کرایہ دار کی بات پر عمل کرنا لازم ہے۔[3]

مسئلہ : زید نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ اندھیری رات میں فلان جنگل یا ویرانے سے گذرے جہاں خوف ہے جان کا خطرہ ہے ملازم کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔[4]

مسئلہ : محرر سے نگرانی کا کام بھی لینا، یا استاد سے وکالت کا کام اور طبیب سے دوا سازی کا کام بھی لینا رضامندی پر موقوف ہے، قبول کرے یا نہ کرے۔[5]

---

[1] ولا تصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة لما روينا، ولأن الجهالة في المعقود عليه وبدله تفضي إلى المنازعة(الهداية ،كتاب الاجارات، ج٣ ص ٢٣٠). (المادة ٤٦٢) فساد الإجارة ينشأ بعضه عن كون البدل مجهولا وبعضه عن فقدان باقي شرائط الصحة(مجلة الأحكام العدلية ،الباب الثاني،ص:٨٨).

[2] (ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس) لما بينا. قال: (إلا أن يتعدى أرباب الطعام تعديا فاحشا في القيمة فلا بأس بذلك بمشورة أهل الخبرة به) لأن فيه صيانة حقوق المسلمين عن الضياع.(الاختيار لتعليل المختار،كتاب الكراهية، فصل في الاحتكار، ج٤ ص ١٦١).

وكذا في الجوهرة النيرة (كتاب الحظر والاباحة، ج٢ص ٢٨٦).

[3] تفسخ بالعذر وهو عجز أحد العاقدين عن المضي في موجبه إلا بتحمل ضرر زائد لم يستحق به.(البحر الرائق،كتاب الاجارة، باب فسخ الاجارة، ج٨ص ٤٢).

العذر الذي تنفسخ به الاجارة من جانب المستاجر أن لا يمكنه المضي الا بضرر وذلك قد يكون لمعنى مباين عما استأجره وقد يكون لمعنى في المعقود عليه. (فتاوى قاضيخان ، كتاب الاجارة،فصل فيما تنتقض به الإجارة ، ج٢ص ١٩٢).

[4] انظر الحاشية المتقدمة.

[5] کیونکہ یہ امور عقد اجارہ کے تحت ان کے فرض منصبی میں داخل میں نہیں ہے، لہٰذا ان کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

مسئلہ : زمین میں ایسی چیز کی کھیتی کرنا جو زمین کے لئے نقصان دہ ہو، مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔[1]

۱۱۔ اجازتِ عامہ میں بھی اپنے جنس سے تجاوز نہیں ہو سکتی اسی طرح خلاف شرع امور کو بھی شامل نہ ہو گی۔[2]

مسئلہ : محرر سے معاہدہ ہوا کہ جو کام چاہیں گے لیں گے، اس میں کلماتِ کفر یا خلافِ شرع کوئی کام نہیں لے سکتے، اور نہ ہی محرّر سے خدمتگاری کا کام لیا جا سکتا ہے، اور جو کام عقلاً ممنوع ہو اور شرعاً ممنوع نہ ہو وہ آپس کی رضامندی سے لیا جا سکتا ہے، جیسے خوفناک راستے سے سفر، اور فوجی آدمی کا توپ اور تبر کے سامنے صبر کرنا۔[3]

۱۲۔ اگر مدت اجارہ ختم ہو جائے اور فریقین خاموشی کے ساتھ حسب سابق کام کرتے رہیں، تو حکماً دوسرا عقد شروع ہو جاتا ہے کیونکہ قبول کے بعد سکوت دلیل رضاء ہے۔(مجلہ)[4]

---

[1] وقال أبو حنيفة: له أن يَسكنها، وأن يُسكنها من شاء، وأن يضع فيهاما بدا له من الثياب والمتاع والحيوان، وأن يعمل فيها ما بدا له من الأعمال، ما خلا الرحى أن ينصب فيها أو الحداد والقصار، فإن هذا يضر بالبناء، فليس له أن يجعل فيها شيئاً من هذا، إلا برضى صاحب الدار، أو يشترط عليه في الإجارة. وهكذا قال أبو يوسف ومحمد. وقال أبو يوسف ومحمد: كل عمل يفسد البناء أو يوهنه فهو مثل الرحى والحداد والقصار. (الأصل للشيباني ،كتاب الاجارة،باب إجارة الدور والبيوت، ج٣ص ٤٦٢).

قال: (وإن استأجر أرضا للزراعة بين ما يزرع فيها، أو يقول على أن يزرعها ما شاء) لأن منافع الزراعة مختلفة وكذلك تضرر الأرض بالزراعة مختلف باختلاف المزروعات فيفضي إلى المنازعة، فإذا بين ما يزرع، أو قال على أن يزرعها ما شاء انقطعت المنازعة. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الاجارة، ج٢ص٥٢).

[2] إذا خالف الوكيل في الجنس , يعني لو قال الموكل: اشتر من الجنس الفلاني. واشترى الوكيل من غيره , لا يكون نافذا في حق الموكل وإن كانت فائدة الشيء الذي اشتراه أزيد يعني يبقى المال الذي اشتراه الوكيل له ولا يكون مشترى للموكل. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة ١٤٧٠،ص ٢٨٦).

وكذا في درر الحكام (كتاب الوكالة، الباب الثالث، الفصل الثاني، ج٣ص ٥٧٩).

[3] فإنّ المعاصي لا تدخلُ في العموم وهي غير صالحة لِورود العقدِ عليها، بخلافِ المباحات.

[4] لو استؤجر عقار شهرية كذا دراهم من دون بيان عدد الأشهر يصح العقد. لكن عند ختام الشهر الأول لكل من الآجر والمستأجر فسخ الإجارة في اليوم الأول وليلته من الشهر الثاني الذي يليه وأما بعد مضي اليوم الأول وليلته فليس لهما ذلك .(مجلة الأحكام العدلية ، رقم المادة ٤٩٤،ص ٩٣). استأجر من القيم دارا وسكن فيها ثم بقي ساكنا في السنة الثانية بغير عقد وأخذ القيم شيئا من الأجرة فإنه ينعقد به في كل السنة لا في حصة ما أخذ فقط.(حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الاجارة، ج٦ص ٦).

مسئلہ :ایک شخص ماہانہ ملازم ہے یا ایک مکان ماہانہ کرایہ پر ہے، مہینہ پورا ہونے کے بعد کرایہ دار مکان میں ٹھہرا رہا تو یہ حکماً عقد جدید ہے۔(ہدایہ)[1]

مسئلہ :مزدور سے کہا کہ یہ مٹی اٹھا کر وہ گڑھا بھر دو، فی ٹوکری دو روپے اجرت ہو گی، تو حکماً ہر ٹوکری پر عقد جدید ہوتا چلا جائے گا۔

۱۳۔اگر کرایہ پر لی ہوئی چیز غصب کر لی تو غاصب پر اجرت مثل لازم ہو گی،اگر کرایہ کی چیز نہ ہو تو صرف گناہ ہے اجرت لازم نہیں ہوتی۔(مجلہ)

ایک معمار کو پکڑ کر زبردستی شام تک اس سے دیوار بنوائی تو غاصب پر لازم ہے کہ شام کو اسے اجرت دیدے،اگر یہ شخص مزدوری پیشہ نہ ہوتا تو غاصب پر بجز گناہ کے مالی تاوان لازم نہ ہوتا۔[2]

مسئلہ :کرایہ کی زمین پر زید نے ایک ماہ تک زبردستی اپنا قبضہ جمار کھا تو اس پر کرایہ مثل لازم ہو گا۔[3]

مسئلہ :ایسے مکان پر زبردستی قبضہ جما کر رکھا ہے جو کرایہ کے لئے نہیں، تو مغصوب منہ کو کرایہ پر نہ دلایا جائے گا۔[4]

۱۴۔شریک اگر مشترکہ کام کرے تو ان کو اجرت نہیں دی جائے گی،تفصیلات باب شرکت میں ہے۔[5]

کرایہ دار پر شرط عائد کرنے کا حکم

۱۵۔اگر مالک نے یہ شرط عائد کی کہ اس گھوڑے پر صرف زید ہی سوار ہو گا،اور کوئی سوار نہیں ہو سکتا،اس

---

[1] وإن سكن ساعة من الشهر الثاني صح العقد فيه ولم يكن للمؤجر أن يخرجه إلى أن ينقضي، وكذلك كل شهر سكن في أوله ساعة"؛ لأنه تم العقد بتراضيهما بالسكنى في الشهر الثاني.(الهداية ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٣ص٢٣٧).
وانظر الحاشية السابقة ايضا.

[2] منافع الغصب لا تضمن إلا في ثلاث: مال اليتيم، ومال الوقف، والمعد للاستغلال منافع المعد للاستغلال مضمونة.(الأشباه والنظائر لابن نجيم ،كتاب الغصب،ص ٢٤٣).وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية (كتاب الوقف، الباب الثاني في احكام استحقاق اهل الوقف،ج١ص ١٧٦).

[3] انظر الحاشية المتقدمة.

[4] ايضا.

[5] لو كان طعاما بين رجلين استأجر أحدهما صاحبه ليحمله أو يطحنه لم يجز ذلك عندنا.(المبسوط للسرخسي ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج١٦ص ٣٥).
وإذا استأجر أحد الشريكين نصف دابة صاحبه أو نصف عبد صاحبه على أن يحمل نصيبه من الطعام المشترك إلى موضع كذا والطعام غير مقسوم فلا أجر له، وعلى هذا الإجارة على عمل في محل مشترك. (المحيط البرهاني،كتاب الاجارات،الفصل السابع عشر: الرَجل يستأجر فيما هو شريك فيه،ج٧ ص٤٩٥).

مکان میں صرف مرد ہی رہیں گے عورتیں نہیں رہ سکتی، یعنی طریقہ استعمال مخصوص کر دینا، اگر استعمال سے نفع و نقصان میں فرق پڑتا ہے تو شرط معتبر ہے ورنہ شرط لغو (مجلہ)۔ اگر کہا کہ اس بیل گاڑی پر گندم لادیں جو نہ لادیں، تو یہ شرط لغو اور بے کار ہے اور اگر یہ کہا کہ لوہا، پتھر، سیسا نہ لادیں تو یہ قید مفید اور عمل لازم ہے۔[1]

۱۶۔ عقد اجارہ کے باقی رہنے کے لئے شرط یہ ہے کہ مزدور یا کرایہ پر لی ہوئی چیز ابتدا سے انتہاء تک شرط کے مطابق حاصل کرنے کے قابل رہے، لہٰذا اگر مزدور بیمار ہو گیا یا جسم کو کسی چیز سے اس طرح تکلیف ہے کہ کام کرنے کے قابل نہ رہا، یا مکان ٹپکنے لگا، یا مکان کسی اور نے چھین لیا، اس کی اصلاح مالک کے ذمہ ہے، کام میں نقصان آنے کی صورت میں تو کرایہ دار کو اختیار ہو گا کہ اسی پر قناعت کرے یا چھوڑ دے، اور بالکل معدوم ہونے کی صورت میں اجارہ فسخ ہو جائے گا۔[2]

مسئلہ : ملازم کا علاج کروانا، کرایہ کی گاڑی یا مکان کی مرمت، کرایہ کی جانور کا خوراک مالک کے ذمہ ہوگا۔[3]

مسئلہ : کرایہ کے جانور کا دانہ گھاس اگر اجرت میں مشروط ہے تو مزدور کے کھانے کی طرح ہے جائز

---

[1] (المادة ٤٢٧) كل ما اختلف باختلاف المستعملين يعتبر فيه التقييد , مثلا: لو استكرى أحد لركوبه دابة ليس له أن يركبها غيره. (المادة ٤٢٨) كل ما لا يختلف باختلاف المستعملين فالتقييد فيه لغو , مثلا: لو استأجر أحد دارا على أن يسكنها له أن يسكن غيره فيها. (مجلة الأحكام العدلية ،كتاب الاجارات، قبيل الباب الثاني،ص ٨٢).

وإن قال: على أن يركبها فلان أو يلبس الثوب فلان فأركبها غيره أو ألبسه غيره فعطب كان ضامنا"؛ لأن الناس يتفاوتون في الركوب واللبس فصح التعيين، وليس له أن يتعداه، وكذلك كل ما يختلف باختلاف المستعمل لما ذكرنا. فأما العقار وما لا يختلف باختلاف المستعمل إذا شرط سكنى واحد فله أن يسكن غيره؛ لأن التقييد غير مفيد لعدم التفاوت الذي يضر بالبناء.(الهداية ،كتاب الاجارات، باب مايجوز من الاجارة وما يكون خلافا فيها،ج٣ص ٢٣٤).

[2] مر تفصيله في مبحث اعذار فسخ الاجارة، فليراجع.

[3] قال أبو حنيفة: كل إجارة فيها رزق الغلام أو علف الدابة فإنه فاسد لا يجوز؛ لأن هذا مجهول. إلا أنه كان يستحسن ذلك في باب واحد، في طعام الظئر فإنه كان أبو حنيفة يجيزه. وقال أبو يوسف ومحمد: الظئر وغيرها سواء، وهو فاسد. (الأصل للشيباني ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٤ص٢١).

وتطيين الدار وإصلاح ساريها وما وهي من ثيابها على رب الدار من المستأجر؛ لأن إصلاح الملك على المالك ولا أجر على ذلك. (المحيط البرهاني، كتاب الاجارات،الفصل السادس عشر: فيما يجبُ على المستأجر وفيما يجب على الأجير،ج٧ص ٤٩٣).واشتراط تطيين الدار ومرمتها أو غلق باب عليها، أو إدخال جذع في سقفها على المستأجر مفسد للإجارة؛ لأنه مجهول فقد شرط الأجر لنفسه على المستأجر.(المبسوط للسرخسي ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج١٦ص ٣٤).

ہے، مگر کرایہ کے مکان کی مرمت کرایہ دار پر نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے کرایہ کا ایک حصہ مجہول ہو جائے گا جو کہ جائز نہیں ہے۔[1]

کرایہ کا مقصد اغراض صحیحہ ہونا ضروری ہے

۱۷۔اجارہ اغراض صحیحہ اور استعمال شرعیہ کے لئے موضوع ہے لہٰذا گھوڑا، اونٹ، سپاہی، زیور، جہاز وغیرہ محض بیٹھنے یا زینت حاصل کرنے کے لئے کرایہ پر لینا جائز نہیں کیونکہ یہ اسراف میں داخل ہے جو شرعاً ممنوع اور فضول ہے۔[2]

مسئلہ: عورتوں کو زینت حاصل کرنے کے لئے زیور وغیرہ کرایہ پر لینا جائز ہے۔[1]

---

[1] يفسدها الشرط كاشتراط طعام العبد وعلف الدابة إلخ.في الظهيرية قال الفقيه أبو الليث في الدابة: نأخذ بقول المتقدمين أما في زماننا فالعبد يأكل من مال المستأجر عادة .ومثله في الخانية(غمز عيون البصائر،كتاب الاجارات،ج٣ص ١٢٤).

وأكله على المؤجر، فلو شرط على المستأجر كعلف الدابة فسد العقد كذا في كثير من الكتب، لكن قال الفقيه: في زماننا العبد يأكل من مال المستأجر حموي عن الظهيرية والخانية. (حاشية ابن عابدين على الدر المختار ،كتاب الاجارة،باب ضمان الأجير، ج٦ص ٦٩). علامہ حموی اور علامہ شامی رحمہ اللہ کی ان عبارات سے جواز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ قواعد کے خلاف ہے کیونکہ گھاس دانے اور کھانے کو اجرت قرار دینے کی صورت میں اجرت مجہول رہے گی جو فساد عقد کا موجب ہے،اس کا آسان اور جائز متبادل صورت وہی ہے جو امام محمد رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے کہ ان چیزوں کا اندازہ لگائے اور اسی مقدار سے زیادہ اجرت مقرر کریں پھر جانور کا مالک کرایہ دار کو اپنی طرف سے ان امور کے لئے وکیل بنائے۔

قلت: أرأيت إذا استأجر الرجل دابة بكذا وكذا درهماً إلى بغداد على أن علفها على المستأجر أيجوز ذلك؟ قال: لا. قلت: فكيف وجه الثقة في ذلك حتى يجوز ويصلح؟ قال: يسمي قدر علف الدابة، ويزيد ذلك في الأجر، ويوكله رب الدابة أن يعلفها بتلك الزيادة. قلت: وكذلك لو استأجر أجيراً يخدمه بكذا وكذا درهماً وطعامه لم يجز إلا على ما ذكرت لك في الباب الأول؟ قال: نعم؛ إلا في الظئر خاصة. (الأصل للشيباني ،كتاب الحيل، باب الوجه في الخدمة وفضول أجورهم، ج٩ص٤١٦).

وانظر الحاشية المتقدمة ايضا.

[2] ومنها أن تكون المنفعة مقصودة يعتاد استيفاؤها بعقد الإجارة ويجري بها التعامل بين الناس؛ لأنه عقد شرع بخلاف القياس لحاجة الناس ولا حاجة فيما لا تعامل فيه للناس فلا يجوز استئجار الأشجار لتجفيف الثياب عليها والاستظلال بها؛ لأن هذه منفعة غير مقصودة من الشجر.. وقال عمرو عن محمد في رجل استأجر دابة ليجنبها يتزين بها: فلا أجر عليه؛ لأن قود الدابة للتزين ليس بمنفعة مقصودة ولا يجوز استئجار الدراهم والدنانير ليزين الحانوت، (بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط الاجارة، ج٤ص ١٩٢).وكذا في البحر الرائق (كتاب الاجارة، ج٧ص ٢٩٨).

مسئلہ: درہم یا دینار بطور زینت دکان پر لٹکانے کے لئے کرایہ پر لینا جائز نہیں، تولنے کے لئے جائز ہے۔[2]

کلیہ: ایسی صورت میں جو عوض قرار دیا جائے وہ وعدہ لازم کے طور پر مل سکتا ہے، اجرت کے طور پر نہیں مل سکتا۔

۱۸۔ کرایہ پر لی ہوئی چیز مالک کے علاوہ کسی اور کو کرایہ پر دی جاسکتی ہے۔

۱۹۔ مالک نے جس چیز کو رہن یا عاریت پر دی یا کرایہ پر دی، اس کو دوبارہ خود کرایہ پر نہیں لے سکتا، نہ ان لوگوں سے جن کو دی نہ غیروں سے۔[3]

۲۰۔ مقائضہ کی صورت میں اس بات کالحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جنسیت متحدہ نہ ہو مثلاً مکان کرایہ پر دیا اس کے عوض میں اسی کرایہ دار سے دوسرا مکان کرایہ پر لیا، ہاں البتہ اگر نفع کے انواع مختلف ہوں تو جنسیت متحد نقصان دہ نہیں، جیسے زمین کھیت کے لئے کرایہ پر لی اور اپنی زمین اسی کو تجارت گاہ بنانے کے لئے دی، اس وقت سود کا شبہ نہ رہا، اس طرح اگر دونوں عقد علیحدہ ہوں تب بھی جائز ہے جیسے اپنا مکان زید کو پانچ سو ماہانہ کرایہ پر دیا اور اس کا مکان پانچ یا اس سے کم و زیادہ پر لیا۔[4]

---

[1] وإذا استأجرت المرأة حلياً معلوماً لتلبسه يوماً إلى الليل فهو جائز. (الأصل للشيباني ،كتاب الاجارة، باب اجارة الحلي، ج٣ ص٥٢١).

[2] مرّ تخريجه في ما قبل الحاشية المتقدمة.

[3] (للمستأجر أن يؤجر المؤجر) بعد قبضه قيل وقبله (من غير مؤجره، وأما من مؤجره فلا) يجوز وإن تخلل ثالث به يفتى للزوم تمليك المالك،(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،كتاب الاجارة، مسائل شتي،مطلب في إجارة المستأجر للمؤجر ولغيره، ج٦ص٩١).قال الإمام الحلواني وروي عن محمد رحمه الله تعالى أن الإجارة من المالك لا تجوز مطلقا تخلل الثالث أو لا وبه قال عامة المشايخ وهو الصحيح وعليه الفتوى.(الفتاوى الهندية ،كتاب الاجارة، الباب السابع في إجارة المستأجر، ج٤ص٤٢٥).

[4] وإذا كانت الأجرة منفعة إن كانت من جنس المعقود عليه لا يجوز عندنا خلافاً للشافعي..وبيع المنفعة بمنفعة من جنسها بمنزلة بيع العين بجنسه نساء، لأن النساء من البدل ما لا يكون عيناً والمنفعة ليست بمعين، لأنها معدومة فكان نساء، والجنسية في المثمنين تحرم النساء.(المحيط البرهاني ،كتاب الاجارات، الفصل الاول، ج٧ص ٣٩٦).

ومنها أن لا تكون الأجرة منفعة هي من جنس المعقود عليه كإجارة السكنى بالسكنى، والخدمة بالخدمة، والركوب بالركوب والزراعة بالزراعة حتى لا يجوز شيء من ذلك عندنا.(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، مباحث الاجرة، ج٤ ص ١٩٤).

۲۱۔ فضولی کا کرایہ پر دینا اس طرح صحیح ہے جس طرح فضولی کی بیع۔ [1]

۲۲۔ اجارہ میں سلم کی صورت نہیں، جو پیشگی دی، اجرت ہے۔

۲۳۔ مرد عورت کو اسی طرح عورت مرد کو ایسے کاموں کے لئے نوکر نہیں رکھ سکتے جو شرعاً ناجائز ہو جیسے تنہائی میں طلب کرنا، پاؤں دبوانا، بدن ملوانا وغیرہ۔ [2]

۲۴۔ عورتیں بناؤ سنگھار کے لئے کنگھی کرنے والی کو نوکر رکھ سکتی ہیں۔ [3]

کتاب تصنیف کروانے کا حکم

۲۵۔ زید نے عمر سے کوئی کتاب تصنیف کروائی، یہ اجارہ صحیح ہے کھانا پکوانا، علاج کروانا، وغیرہ اجارہ صحیح ہے۔ [4]

۲۶۔ پانی جب تک اپنے معدن میں ہو کسی کا مملوک نہیں، جیسے نہر، کنواں، تالاب کا پانی جبکہ چشموں سے نکلتا ہو، ایسی نہر، کنواں اور تالاب کا ٹھیکہ اس طرح جائز ہے کہ اس کا بعض حصہ کرایہ پر لیا جائے یا کرایہ پر دینے والا اس کے بھرنے اور جاری کرنے وغیرہ کا ذمہ دار ہو۔

مسئلہ : یہ بات کہ ہم اپنی نہر کا منہ تمہارے کھیت کی طرف کھول دیں گے یا کھولنے کی اجازت دیں گے،

---

[1] لا تنفذ إجارة الفضولي لعدم الملك، والولاية لكنه ينعقد موقوفا على إجازة المالك عندنا.(بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط الاجارة، ج٤ص ١٧٧).

وكذا في مجلة الأحكام العدلية (رقم المادة ٤٤٧ ،ص ٨٥).

[2] والاجارة الفاسدة على احد عشر وجها، احدها الاجارة على المعاصي وهو ان يستأجر الرجل الرجل ليقتل رجلا او يضربه او يشتمه او يستأجر النائحه او المغنية لتنوح علي ميتة او لتغني له.(النتف في الفتاوى ،كتاب الاجارة، الاجارة الفاسدة، ج٢ص ٥٧٤).

لا يجوز أخذ الأجرة على المعاصي (كالغناء، والنوح، والملاهي) ؛ لأن المعصية لا يتصور استحقاقها بالعقد فلا يجب عليه الأجر.(مجمع الأنهر،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ج٢ص ٣٨٤).

[3] استأجر مشاطة لتزين العروس لا يحل لها الأجر لعدم صحة الإجارة إلا على وجه الهدية والصواب أنه إن ذكر العمل والمدة يجوز.(الفتاوى البزازية ،كتاب الاجارة، نوع المتفرقات وفيه الإجارة على المعاصي، ج ٦ ص ١٧).

جاز إجارة الماشطة لتزين العروس إن ذكر العمل والمدة.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الاجارة، قبيل مطلب في استئجار الماء مع القناة، ج٦ص ٦٣).

[4] لانه منفعة مباحة مهما لم يقارن بامر غير مشروع.

اس کا معاوضہ لینا جائز ہے، ایسا ہی چراگاہ یا شکار گاہ یا تالاب وغیرہ اجارہ پر دینا، تاکہ اس سے گھاس حاصل کرے، مچھلیاں شکار کرے، زمین کے ساتھ کرایہ پر لے، جائز ہے، صرف گھاس، شکار اور مچھلیوں کا اجارہ صحیح نہیں اگرچہ وہ مملوک بھی ہو۔[1]

نفع محض کے لئے اجرت مقرر کرنا

۲۷: ایسے نفع حاصل کرنے کے لئے اجرت ٹھہرانا جس نفع کے حصول سے کرایہ پر لی ہوئی چیز پر کوئی اثر نہ پڑے، جائز نہیں۔ مثلاً زید نے عمر سے کہا تم اپنی باغ کا دروازہ کھول دیں تاکہ ہم پھول دیکھیں خوشبو سونگھیں، یا وہاں جو چراغ روشن ہے اس سے روشنی حاصل کریں، یا تاکہ ہوا آر پار ہو، یہ دروازہ کھول دینا اور روشندان کھول دینا یقیناً قابل عوض ہے مگر جو فائدے اس سے حاصل کئے جائیں گے وہ قابل عوض نہیں۔[2]

۲۸۔ زید نے بکر کو کسی کام کا ٹھیکہ دیا تو جس قدر کام ہوتا جائے اسی قدر اجرت دی جائے گی، مگر چونکہ معلوم نہیں کس قدر ضرورت ہو اس لئے یہ شرط ٹھہرانا کہ تم کو فلان وقت تک حاضر رہنا ضروری ہے اب کام ہو یا نہ ہو، حاضر رہنا بکر کے لئے ضروری ہے، گویا بکر نے یہ شرط رکھی کہ فلان وقت سے فلان وقت حرج نہ ہونے پائے گا۔[3]

---

[1] ولا يجوز إجارة النهر والبئر والقناة مع الماء ولا إجارة المراعي والآجام لأن هذه إجارة على استهلاك العين والإجارة لاستيفاء المنافع مع بقاء العين.(تحفة الفقهاء ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٢ص ٣٥٧).

الإجارة إذا وقعت على العين لا تصح، فلا تجوز على استئجار الآجام والحياض لصيد السمك أو رفع القصب وقطع الحطب أو لسقي أرضها أو لغنمه منها، وكذا إجارة المرعى. والحيلة في الكل أن يستأجر موضعا معلوما لعطن الماشية ويبيح الماء والمرعي.(رد المحتار، كتاب الاجارة،مطلب الإجارة إذا وقعت على العين لا تصح والحيلة فيه،ج ٦ ص٦٣).

[2] ومنها أن تكون المنفعة مقصودة يعتاد استيفاؤها بعقد الإجارة ويجري بها التعامل بين الناس؛ لأنه عقد شرع بخلاف القياس لحاجة الناس ولا حاجة فيما لا تعامل فيه للناس فلا يجوز استئجار الأشجار لتجفيف الثياب عليها والاستظلال بها؛ لأن هذه منفعة غير مقصودة من الشجر.. وقال عمرو عن محمد في رجل استأجر دابة ليجنبها يتزين بها: فلا أجر عليه؛ لأن قود الدابة للتزين ليس بمنفعة مقصودة ولا يجوز استئجار الدراهم والدنانير ليزين الحانوت، (بدائع الصنائع ،كتاب الاجارة، شرائط الاجارة،ج٤ص ١٩٢).وكذا في البحر الرائق (كتاب الاجارة،ج٧ص ٢٩٨).

[3] الأجير الخاص يستحق الأجرة بتسليم نفسه للعمل عمل أو لم يعمل.(تبيين الحقائق ،كتاب الاجارة، باب ضمان الاجير،ج٥ص ١٣٧).

(ويستحق) الأجير الخاص (الأجر بتسليم نفسه) أي الأجر (مدته) أي العقد سواء عمل أو لم يعمل مع التمكن بالإجماع (كمن استؤجر للخدمة) الغير المعينة (سنة).(مجمع الأنهر ،كتاب الاجارة، احكام الاجير وانواعه،ج٢ص ٣٩٣).

ٹھیکہ لینے کا حکم

۲۹۔زید نے ٹھیکہ لیا کہ اس پورے مکان میں جس قدر چھپر یا خس کی ٹٹیاں مطلوب ہوں، یا خس کی ٹٹیوں کو چھڑکنے کے لئے یا فلان کھیتی کو سیر اب کرنے کے لئے یا فلان جماعت کی ضروریات کے لئے جس قدر پانی کی ضرورت ہو گی، میں پورا کروں گا، یا سو آدمی کے لئے جس قدر کھانے کی ضرورت ہو گی وہ پورا کروں گا، یا فلان کتاب چھپنے کے لئے جس قدر کاغذ کی ضرورت ہو گی یا اس مکان کی تزیین کرنے کے لئے جس قدر فرش کی ضرورت ہو گی یا اس جلسہ کی روشنی میں جس قدر بجلی خرچ ہو گی، سب اپنی طرف سے خرچ کروں گا، پس جو چیزیں خرچ ہوں گی ان کی مقدار بیان سے یا عرف سے معلوم ہو جیسے اس قسم کا کھانا یا فلان قسم فلاں مقام کا فرش، اور معاوضہ بھی خرچ شدہ مال کے مطابق ہے جیسے فی چاندنی پانچ روپے یا ایک کلو دس روپے، تو یہ معاہدہ بیع ہے اس کا انعقاد روزانہ ہوا کرے گا[1]، اگر نمونہ متعین ہے تو اس میں خیار رؤیت بھی نہ رہے گا۔[2]

اور اگر نوع اور مقدار معلوم ہے مگر یہ ایک معین معاوضہ ہے جیسے ماہانہ ہزار روپے تو یہ اجارہ ہے اور معقود علیہ اثر ہے نہ وہ اشیاء یعنی مکان خس پوش ہو جانا، پاٹیوں کا تر ہو جانا، یا باغ کھیت کا سیر اب ہونا، یا کتاب کا چھپ جانا، آدمیوں کے پیٹ کا بھر جانا، روشنی کا ہونا۔

فقہ کی کتابوں میں اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں، جیسے یہ کپڑا زعفران سے رنگ دو، یہ کپڑا سرخ ریشم سے سی دو، یہ کتاب سنجرف سے لکھ دو، یہاں بھی مال ہے اس کی حد معلوم نہیں مگر اصل مقصود علیہ وہی اثر ہے یعنی رنگنا، سینا وغیرہ، یہ اموال معقود علیہ موقوف علیہ یا آلات یا توابع ہیں۔[3]

---

[1] لان البيع مبادلة المال بالمال وهو يصدق على هذه الصورة كما لايخفى.

[2] لو دخل في المبيع أشياء فإن كان لا تتفاوت آحاده كالمكيل والموزون وعلامته أن يعرض بالنموذج يكتفى برؤية بعضه لجريان العادة بالاكتفاء بالبعض في الجنس الواحد ولوقوع العلم به بالباقي.(تبيين الحقائق ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٤ص٢٦). يكتفي برؤية ما يدل على العلم بالمقصود فرؤية وجه الصبرة معرفة للبقية لكونه مكيلا يعرض بالنموذج وهو المكيلات والموزونات فيكتفي برؤية بعضه. (البحر الرائق ،كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، ج٦ص ٣١).

[3] وإذا دفع الرجل ثوبه إلى صباغ ليصبغه أحمر بأجر مسمى ووصف له الصبغ فهو جائز إذا صبغه على تلك الصفة.(الأصل للشيباني ،كتاب الاجارات، باب الاستصناع، ج٣ص ٤٤٠).

وكذا في الهداية (كتاب الاجارة،باب الإجارة على أحد الشرطين، ج ٣ص ٢٤٤).

اسی طرح پانی پینے یا حمام (بڑا غسل خانہ) میں نہانے کا عوض لینا بالاتفاق جائز ہے باوجودیکہ بعض آدمی پانی کم پیتا ہے اور کوئی زیادہ، غسل خانہ میں بعض پانی زیادہ گراتا ہے اور بعض کم، بعض جلدی فارغ ہو جاتا ہے اور بعض دیر سے، یہ اس لئے جائز ہے کہ ایسا جہل جس سے بچاؤ مشکل ہو اور لوگ عادۃ اس کے پرواہ نہ کرتے ہوں، معاف ہے (کلام طیبی از حاشیہ ترمذی شریف ص ۲۱۰)[1]

اسی بناء پر دایہ کو دودھ پلانے کے لئے اجرت پر لینا جائز ہے کیونکہ معقود علیہ پرورش یا خدمت ہے دودھ اس کا تابع اور موقوف علیہ ہے۔[2]

(وصح استئجار الظئر بأجرة معلومة) والقياس أن لا يصح؛ لأنها ترد على استهلاك العين وهو اللبن..وجه الاستحسان قوله تعالى {فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن} وعليه إجماع الأمة، وقد جرى التعامل به في الأعصار من غير نكير ولا نسلم أن العقد على استهلاك العين بل على المنفعة وهو حضانة الصبي وتلقيمه ثديها وخدمته وتربيته واللبن تابع وإنما لا يستحق الأجرة إذا أرضعته بلبن الشاة لأنها لم تأت بالواجب وهو الإرضاع وتلقيمه ثديها والعين قد تدخل تبعا للمنفعة كما إذا استأجر صباغا ليصبغ له الثوب فإنه يجوز ويدخل الصبغ فيه تبعا والعقد وارد على المنفعة وهو فعل الصباغة لا على استهلاك العين.(تبيين الحقائق ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج٥ص ١٢٧).

(ويجوز استئجار الظئر) وهي مرضعة (بأجر معلوم) ، والقياس أن لا يصح .. وجه الاستحسان قوله تعالى {فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن}وعليه انعقد الإجماع، وقد جرى به التعامل في الإعصار بلا نكير؛ لأنه عقد على منفعة هي تربية الصبي، واللبن تابع، وهو اختيار صاحب الذخيرة، والإيضاح وأقرب إلى الفقه كما في الهداية وهو الصحيح كما في الكافي(مجمع الأنهر ،كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،ج ٢ص ٣٨٦).

[1] وأجمعوا أيضًا علي جواز إجارة الدار والدابة والثوب، ونحو ذلك شهرًا مع أن الشهر قد يكون ثلاثين يومًا، وقد يكون تسعة وعشرين يوماً، وعلي جواز دخول الحمام بالأجرة مع اختلاف الناس في صب الماء وفي قدر مكثهم، وعلي جواز الشرب من السقاء بالعوض مع جهالة قدر المشروب واختلاف عادة الشاربين، وتحريره أن مدار البطلان بسبب الغرر بغير حاجة، وإن دعت حاجة إلي ارتكابه، ولا يمكن الاحتراز عنه إلا بمشقة، أو كان الغرر حقيراً جاز البيع. شرح المشكاة للطيبي ،كتاب البيوع،باب المنهي عنها من البيوع، ج٧ص٢١٤٨.

في الدر المختار: (وجاز إجارة الحمام) لأنه عليه الصلاة والسلام دخل حمام الجحفة وللعرف. وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله وللعرف) ؛ لأن الناس في سائر الأمصار يدفعون أجرة الحمام وإن لم يعلم مقدار ما يستعمل من الماء ولا مقدار القعود، فدل إجماعهم على جواز ذلك وإن كان القياس يأباه لوروده على إتلاف العين مع الجهالة إتقاني. (كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة،مطلب في حديث دخوله عليه الصلاة والسلام الحمام ،ج٦ص ٥١).

وكذا في درر الحكام شرح غرر الأحكام (كتاب الاجارة، ما يفسد الاجارة،ج٢ص ٢٣٢).

[2] (والظئر بأجر معين) والقياس أن لا تصح؛ لأنها ترد على استهلاك العين .. وجه الاستحسان قوله تعالى {فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن} ..ولا نسلم أن العقد ورد على استهلاك العين بل على المنفعة وهي حضانة الصبي وتلقيمه ثديها وتربيته وخدمته واللبن تابع. الدرر والغرر،باب الإجارة الفاسدة،ج٢ص ٢٣٢.

خلاصہ یہ کہ جب عین شئ معقود علیہ کا موقوف علیہ یا آلہ تابع ہو تو اس کا عقد اجارہ میں داخل ہو جانا مضر نہیں البتہ وصف عین شئ پر اجارہ نہیں ہو سکتا جیسے چرائی کا اجارہ جس میں گھاس عین معقود علیہ ہے اور یہ تقریر کہ اس میں بھی جانور کی پرورش مقصود ہے لہٰذا جائز ہونا چاہیئے، لیکن باطل ہے کیونکہ یہاں پرورش تو صرف گھاس سے ہوتی ہے اس میں گھاس کے فعل کا کوئی اثر نہیں البتہ چراگاہ کا مالک یہ کہے کہ میں تمہارے اتنے جانور اتنے روپے پر اپنی اس زمین میں چرایا کروں گا تو اس صورت میں معقود علیہ چرانا ہوگا اور گھاس آلہ ہے لہذا اجارہ صحیح ہے۔(عالمگیری)[1] یا زمین کو اجارہ پر لے اور گھاس وغیرہ بطور منافع تصرف کرے۔

مسئلہ نمبر: ایسے اجاروں پر جو مال لگایا جائے گا وہ عقد اجارہ مکمل ہو جانے یا فسخ ہو جانے کے بعد جس قدر مال باقی بچے وہ اجیر (یعنی مالک)[2] کی ملک ہے کیونکہ کرایہ داروں کا صرف انتفاع اور اثر سے تعلق تھا اصل چیز سے تعلق نہ تھا، لہٰذا جس کی ٹٹیاں، کھانا، سامان اور روشنی وغیرہ سے جو کچھ بچا ہوا ہو یا پرزے وغیرہ جس کسی آلہ میں لگائے تھے، سب کے سب مزدور یعنی ٹھیکہ لینے والے کا ہے۔[3]

مسئلہ: زید نے بکر کو ایک کتاب چھاپنے کے لئے ٹھیکہ پر دیا کچھ ضروری سامان اپنی طرف سے دئے اور طے پایا جو کاغذ اور روشنائی وغیرہ ضرورت ہوگی وہ بکر اپنے پاس سے خرچ کرے، بکر نے روشنائی اور کاغذ وغیرہ جو مطلوب تھا، اپنی طرف سے لگادئے پھر ٹھیکہ کا کام مکمل ہوا، اب سیاہی اور کاغذ وغیرہ جو کچھ باقی بچ گیا وہ بکر کے ہیں اور زید کے سامان میں سے جو کچھ بچ گیا وہ زید کے ہیں۔[4]

---

[1] وإذا استأجر الرجل راعياً ليرعى له غنماً بأجر معلوم فهو جائز. (الأصل للشيباني ،كتاب الاجارة، باب إجارة الراعي،ج٣ ص٥٠٨).

وإذا استأجر راعيا يرعى له غنما معلوما مدة معلومة فهو جائز؛ لأن المعقود عليه معلوم مقدور التسليم.(المبسوط للسرخسي ،كتاب الاجارة،باب إجارة الراعي،ج١٥ص ١٦٠).

وكذا الفتاوى الهندية (كتاب الاجارة، الفصل الاول،ج٤ص ٥٠٠).

"اس زمین میں" چرانے کی شرط لگانے کے متعلق تو فی الحال کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا، لیکن بظاہر قواعد کے لحاظ سے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔

[2] ٹھیکہ کے دوران استعمال ہونے والی اشیاء کا مالک مراد ہے۔

[3] لأنّ العقدَ كان إجارة فلا حقَّ للمُوجر في هذه الاشياء اللاّتي كانتْ مِلكا للاجير.

[4] لأنّ الأصلَ إبقاءُ ماكان على ماكان. وراجع الحاشية المتقدمة ايضا.

۳۰۔ زید نے بکر کو ایک زمین دی کہ اس پر باغ لگائے یا مکان بنائے، یا درست کر کے کار آمد کرے اور یہ طے پایا کہ اتنے دنوں کے لئے یا کبھی بکر سے واپس نہیں لی جائے گی، اگر یہ معاملہ اجرت کے بغیر ہے تو دیکھیں گے اگر موقت ہے تو عاریت ہے اور اگر ہمیشہ کے لئے ہے تو ہبہ ہے اور مالک کو شرط کی وجہ سے واپس لینے کا حق نہیں، اور اگر اجرت کے ساتھ ہو تو یہ اجارہ ہو گا مگر شرط کی وجہ سے اس اجارہ کو فسخ نہیں کیا جا سکتا، مگر ہر حال میں یہ حق بیع کے قابل ہے اور اس میں وراثت بھی جاری ہو گی، علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس کو بیوع کے شروع میں شد و مد کے ساتھ لکھا ہے۔[1]

****

[1] راجعْ حاشية ابن عابدين الشّامي تحت عبارة "الدر المختار":فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال وبلزوم خلو الحوانيت فليس لرب الحانوت إخراجه ولا إجارتها لغيره ولو وقفا انتهى ملخصا. (كتاب البيوع،ج٤ص ٥١٩).

بابِ دوم: عطیات کے بیان میں

جانی یا مالی عوض کے بغیر جو کچھ لیا یا دیا جائے وہ سب عطایا میں داخل ہیں، پھر عطیہ اگر تملیک عین کے لئے موضوع ہے تو ہبہ یا اس کے ملحقات ہیں اگر عطیہ تملیک منافع کے لئے موضوع ہے تو عاریت یا اس کے مثل ہے اگر عین کو روک کر صرف منافع کا مالک بنایا جائے تو وقف ہے۔

تملیکِ عین کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ مصارفِ واجبہ: جس کو بجالانا ضروری ہے اور ترک کرنا گناہ ہے۔

زکوۃ: زکوۃ ہر مسلم عاقل بالغ پر واجب ہے جو قضائے دین کے بعد ایک یا کئی نصاب کا مالک ہو۔

اموال زکوۃ: سونا چاندی، مال تجارت، نقد پیسے، وہ جانور جو سال کا اکثر حصہ چراگاہ میں چرتے ہیں۔

چاندی کا نصاب: ۳۶ تولہ ۵ ماشہ (ہے) سونے کا نصاب ۵ تولہ دو ماشہ (حاشیہ شرح وقایہ، ص ۲۸۵)[1]

تجارتی مالوں کی قیمت کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ موازنہ کریں گے اور جس کے مطابق نصاب پورا ہو جائے زکوۃ واجب ہو گی، جانوروں کی زکوۃ کے نصاب اس کے علاوہ ہیں۔

مقدارِ زکوۃ: نصابِ زکوۃ پر سال گذرنے کے بعد مال کا چالیسواں حصہ (یعنی ڈھائی فیصد) ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔[2]

---

[1] بست مثقال پنج توله ودو ونیم ماشه طلا باشد...مقدار ان سه وشش توله وپنچ ونیم ماشه است.(عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية،كتاب الزكوة، ج١ص٢٨٤،مير محمد كتب خانه).

یہ علامہ عبد الحئ لکھنوی رحمہ اللہ کی تحقیق ہے جبکہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا، اور چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی ہے، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: "اوزان شرعیہ" حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ۔ "مفتاح الاوزان" مفتی عبد الرحمن قاسمی صاحب۔

[2] وأما مقدار الواجب فيها فربع العشر وهو خمسة من مائتين.(بدائع الصنائع كتاب الزكوة،فصل مقدار الواجب في زكاة الفضة، ج٢ص ١٨).

زکوۃ کا مصرف: فقراء و مساکین (یعنی جو صاحب نصاب نہ ہو) بہتر یہی ہے کہ عزیز و اقارب میں سے جو محتاج ہوں ان کو دی جائے، اس کے بعد محلہ کے مساکین کو دیں، عزیز و اقارب اور محلہ کی مساکین کو چھوڑ کر اوروں کو دینا بہتر نہیں۔[1]

اس طرح ایک مسکین کو نصاب کے بقدر دینا بھی بہتر نہیں۔[2]

وہ افراد جن کو زکوۃ دینا جائز نہیں:

۱۔ سید کو زکوۃ دینا جائز نہیں ان کے ادب و احترام کی وجہ سے۔[3]

۲۔ غنی کو دینا بھی ضروری نہیں کیونکہ ان کو ضرورت نہیں۔[4]

۳۔ اپنے اصول (باپ دادا) فروع (بیٹا پوتا وغیرہ) کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔[5]

۴۔ غیر مسلم کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔[1]

---

[1] (و) كره (نقلها إلا إلى قرابة) بل في الظهيرية لا تقبل صدقة الرجل وقرابته محاويج حتى يبدأ بهم فيسد حاجتهم (أو أحوج) أو أصلح أو أورع أو أنفع للمسلمين (أو من دار الحرب إلى دار الإسلام أو إلى طالب علم) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل (أو إلى الزهاد أو كانت معجلة) قبل تمام الحول فلا يكره خلاصة. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ج٢ص ٣٥٣).

[2] ويكره نقل الزكاة من بلد إلى بلد آخر وإنما تفرق صدقة كل قوم فيهم إلا أن ينقلها الإنسان إلى قرابته أو إلى قوم هم أحوج من أهل بلده.(مختصر القدوري ،كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة اليه،ص:٦٠).

(وكره إعطاء فقير نصابا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفوع إليه (مديونا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لا يخص كلا) أو لا يفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره فتح. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ج٢ص ٣٥٣).

[3] والشرط الآخر أن لا يكون الفقير من بني هاشم ولا من مواليهم لقوله عليه السلام لا تحل الصدقة لمحمد ولا لآل محمد.(تحفة الفقهاء ،كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة،ج١ص ٣٠٢).

ولا تدفع إلى بني هاشم " لقوله عليه الصلاة والسلام " يا بني هاشم إن الله تعالى حرم عليكم غسالة الناس وأوساخهم وعوضكم منها بخمس الخمس " بخلاف التطوع .."وهم آل علي وآل عباس وآل جعفر وآل عقيل وآل الحارث بن عبد المطلب ومواليهم " (الهداية ،كتاب الزكاة،باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز،ج١ ص ١١٢).

[4] اما بيان من يجوز وضع الزكاة فيه فهو الذي استجمع شرائط منها الفقر فإنه لا يجوز صرف الزكاة إلى الأغنياء لقوله تعالى {إنما الصدقات للفقراء}.(تحفة الفقهاء ،كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة،ج١ص ٢٩٩).

[5] ولا يصح دفعها لكافر وغني..وأصل المزكي وفرعه.(حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ،كتاب الزكاة، باب المصرف،ص:٧٢٠).

قربانی کے احکام

جس پر صدقۃ الفطر واجب ہے اس پر قربانی بھی واجب ہے[2]، شہر میں نماز عید سے فراغت کے بعد، دیہات میں عید واجب نہیں اس لئے دیہات میں دسویں ذی الحجہ کو طلوع فجر کے بعد ہی قربانی کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

قربانی کے جانور: اونٹ۔ گائے۔ بھینس۔ میں ایک سے لے کر سات حصے تک قربانی کے ہو سکتے ہیں، جبکہ بکری، دنبہ وغیرہ میں ایک ہی آدمی کی طرف سے قربانی کی جائے گی۔

صدقۃ الفطر کے احکام

نصاب: سونا، چاندی، مال تجارت اور گھر میں روزمرہ استعمال کی چیزوں سے زائد سامان کی قیمت لگا کر اس میں نقدی جمع کیا جائے، ان پانچوں کا مجموعہ یا ان میں سے بعض ۸۷ء۴۷۹ گرام سونا یا ۵۱۲ء۳۵ گرام چاندی کے برابر ہو تو اس پر صدقۃ الفطر واجب ہے بشرطیکہ یہ نصاب ذاتی ضرورتوں اور قرضوں سے زائد ہو، اور ایسے شخص کے لئے دوسروں سے زکوۃ لینا حرام ہے۔[3]

فطرہ کی مقدار: گندم ہو تو آدھا صاع۔ جو، کھجور، کشمش ایک صاع یا ان کی قیمت فقیروں کو دی جائے، نماز عید الفطر کے لئے جانے سے پہلے دینا مستحب ہے، عید کے بعد دیا یا رمضان کا چاند نظر آنے کے بعد ادا کر دیا تب بھی جائز ہے۔[4]

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] قالوا إن الأضحية على الأغنياء الذين تجب عليهم صدقة الفطر لأجل غناهم.(شرح مختصر الطحاوي للجصاص ،كتاب الضحايا، ج٧ص٣٢٠).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ج١ ص ١٩١).

[3] والثاني الغنى الذي يتعلق به حرمان الصدقة ويتعلق به وجوب صدقة الفطر والأضحية دون وجوب الزكاة وهو أن يملك من الأموال الفاضلة عن حوائجه ما تبلغ قيمته مائتي درهم بأن كان له ثياب وفرش ودور وحوانيت ودواب زيادة على ما يحتاج إليه للابتذال}.(تحفة الفقهاء ،كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة، ج١ص٣٠١).

وكذا في الهداية (كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ج١ص ١١٣).

[4] فهذا كل ما روينا في هذا الباب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وعن أصحابه من بعده , وعن تابعيهم من بعدهم , كلها على أن صدقة الفطر من الحنطة نصف صاع , ومما سوى الحنطة صاع. وما علمنا أن أحدا من أصحاب رسول الله صلى الله

نذر و منت کے احکام

جو منت اللہ تعالیٰ کے لئے مانی جائے اس کو پورا کرنا واجب ہے بشرطیکہ اس کی جنس میں سے کوئی واجب ہو اور کسی گناہ کے کام کی منت نہ ہو۔[1]

مسئلہ: اللہ تعالیٰ کی سوا کسی غیر کی نذر ماننا کفر ہے، حرام ہے، چاہے غیر نبی ہو یا ولی، کوئی بھی ہو غیر اللہ کی نذر گناہ ہے۔[2]

کفارہ کے احکام

کفارہ جو کسی قصور کے ارتکاب کی وجہ سے لازم ہو جیسے مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے، پھر اس کو توڑ ڈالے، اسی طرح رمضان کے روزہ کو قصداً توڑ دیا یا ظہار وغیرہ کا کفارہ، یہ کفارہ بھی واجب الادا ہے ان کے مستحق مساکین ہیں مؤمن ہوں یا ذمی۔[3]

نفقات: اولاد، بیوی، والدین کے نفقات انسان پر بقدر استطاعت واجب ہے اور بہترین صدقات میں سے ہیں، تفصیلات فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔[4]

تبرعات کی پانچ قسمیں ہیں:

تبرعات سے مراد وہ عطیہ ہے جو لزوم اور وجوب کے بغیر محض احسان و مروت اور خیر خواہی کے بنیاد پر دیا جائے اس کی پانچ صورتیں ہیں:

عليه وسلم ولا من التابعين , روي عنه خلاف ذلك (شرح معاني الآثار ،كتاب الزكاة،باب مقدار صدقة الفطر،ج٢ص ٤٧).وكذا في الهداية في شرح بداية المبتدي (كتاب الزكاة،باب صدقة الفطر،ج١ص ١١٣).

[1] اس کے علاوہ بھی کچھ شرائط ہیں جن کے بغیر نذر لازم نہیں ہوتی، خلاصہ کے لئے مندرجہ ذیل عبارات ملاحظہ کی جائیں:

شرائطه أربعة: أن لا يكون معصية لذاته فخرج النذر بصوم يوم النحر لصحة النذر به لأنه لغيره، وأن يكون من جنسه واجب، وأن يكون ذلك الواجب عبادة مقصودة، وأن لا يكون واجبا عليه قبل النذر فلو نذر حجة الإسلام لم يلزمه شيء غيرها. (البحر الرائق ،كتاب الايمان، مسائل النذر،ج٤ص ٣٢١).

والتفصيل فى بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (كتاب النذر،ج٥ص٨٢).

[2] لأنّ النّذرَ عِبادة وعبادةُ غيرِ الله حرام وكفر.

[3] راجع لتفصيلها وانواعها واحكامها "بدائع الصنائع" (كتاب الكفارات،ج٥ص٩٥).

[4] راجع الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الطلاق، باب النفقة،ج ٣ ص٥٧١).

پہلی صورت: ہبہ محض:

یعنی بغیر عوض کے کسی چیز کا مالک بنادینا، اس کے لئے درج ذیل شرائط ہیں:

ا۔ ہبہ کرنے والا آزاد، مسلمان [1]، عاقل و بالغ ہو، لہٰذا غلام، مجنون اور نابالغ کا ہبہ صحیح نہیں۔ [2]

۲۔ موہوب (یعنی جس چیز کو ہبہ کیا جارہا ہے) بالفعل تملیک وقبضہ کے قابل ہو، لہٰذا شیٔ مرہون، مستعار، امانت وغیرہ غیر کے حق اس کے ساتھ متعلق ہونے کی وجہ سے یہ ہبہ کے قابل نہیں، درخت کی شاخیں، چھت کی کڑیاں غیر کے حق کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے فی الحال قبضہ کے قابل نہیں، مال مباح جیسے وحشی جانور، دریا کا پانی، جنگل کی گھاس چونکہ کسی کا مملوک نہیں اس لئے ان کی تملیک بھی نہیں ہوسکتی، مال معدوم پیٹ کا بچہ، یا پھل چونکہ نکلنے سے پہلے موجود ہی نہیں اس لئے مالک نہیں بنایا جاسکتا ہے اس طرح قبضہ بھی نہیں دلایا جاسکتا ہے۔ [3]

اگر یہ موانع مجلس ہی میں دور ہوجائیں اور قبضہ کرکے ہبہ کردے تو ہبہ صحیح ہے۔

۳۔ مال غیر متقوم نہ ہو جیسے شراب و خنزیر وغیرہ۔ [4]

۴۔ ہبہ مؤقت، موعود، معلق نہ ہو جیسے دوماہ کے لئے ہبہ کیا، دودن کے بعد قبضہ میں دیں گے، یا کام ہوجائے تو دیں گے۔ [5]

---

[1] "مسلمان" کی قید استطراداً ذکر ہوئی، ورنہ ہبہ صحیح ہونے کے لئے یہ کوئی ضروری شرط نہیں۔

[2] شرائط صحتها في الواهب العقل والبلوغ والملك) فلا تصح هبة صغير ورقيق، ولو مكاتبا. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الهبة، ج٥ص٦٨٧).يشترط أن يكون الواهب عاقلا بالغا بناء عليه لا تصح هبة الصغير والمجنون والمعتوه. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة: ٨٥٩ ،ص:١٦٥)

[3] شرائط صحتها (في الموهوب أن يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول) كما سيتضح. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين،باب الهبة، ج٥ص ٦٨٨). والهبة لا تصح الا بخمس شرائط: ان تكون معلومة، ان تكون محوزة، وان تكون مفروغة وان تكون مقبوضة عند الفقهاء.(النتف في الفتاوى ،كتاب الهبة،ص: ٥١٢)وكذا في المجلة.(كتاب الهبة، الباب الاول، الفصل الثاني في بيان شرائط الهبة،ص١٦٥).

[4] ومنها أن يكون مالا متقوما فلا تجوز هبة ما ليس بمال أصلا كالحر والميتة والدم وصيد الحرم والخنزير وغير ذلك ولا هبة ما ليس بمال مطلق كأم الولد والمدبر المطلق والمكاتب ولا هبة ما ليس بمال متقوم كالخمر.(الفتاوى الهندية ،كتاب الهبة، الفصل الاول، ج٤ص٣٧٤).

[5] أما ما يرجع إلى نفس الركن فهو أن لا يكون معلقا بما له خطر الوجود والعدم من دخول زيد وقدوم خالد ونحو ذلك، ولا مضافا إلى وقت بأن يقول: وهبت هذا الشيء منك غدا أو رأس شهر.(الفتاوى الهندية ،كتاب الهبة، الفصل الاول، ج٤ص٣٧٤).

۵۔ جس کو ہبہ کیا جائے وہ قبول بھی کرے۔[1]

۶۔ قبضہ مجلس ہی میں ہو جائے۔[2]

ہبہ کا حکم

۱۔ موہوب پر قبضہ کے بعد موہوب لہ مالک و متصرف ہو جاتا ہے۔[3]

۲۔ ہبہ کرنے والے کو واپس لینے کا حق ہوتا ہے لیکن واپس لینا مکروہ تحریمی ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: " العائدُ فی هبته کالکلبِ یعود في قیئه" ہبہ کر کے واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قئی کر کے واپس نگل جائے۔[4] ہاں البتہ بعض صورتوں میں واپس لینے کا حق نہیں ہوتا:

۱۔ اگر موہوب لہ ذو رحم محرم ہو، جیسا کہ بیٹا، بیٹی، بہن وغیرہ کو کوئی چیز ہبہ کی جائے۔[5]

---

[1] قال محمد رحمه الله في الأصل: لا تجوز الهبة إلا محوزة مقسومة مقبوضة... وإن قبضه بعد الافتراق عن المجلس لا يصح قبضه قياساً واستحساناً.(المحيط البرهاني ،كتاب الهبة،الفصل الثاني: فيما يجوز في الهبة وما لا يجوز،ج٦ص٢٣٨).

(و) تصح (بقبول) أي في حق الموهوب له(وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل.(الدر المختار ،كتاب الهبة،ج٥ ص٦٩٠)

وإذا قام من المجلس ثم قبض لا يصح لأن القبض في الهبة بمنزلة القبول في حق إثبات الحكم وذلك يصح في المجلس لا بعده كذلك هذا.(تحفة الفقهاء ،كتاب الهبة،ج٣ص ١٦٥)

[2] انظر الحاشية المتقدمة.

[3] حكم الهبة ثبوت الملك للموهوب له غير لازم حتى يصح الرجوع والفسخ.(تحفة الفقهاء ،كتاب الهبة،ج٣ص ١٦٦).

حكمها ثبوت الملك للموهوب له غير لازم حتى يصح الرجوع والفسخ وعدم صحة خيار الشرط فيها. (البحر الرائق ،كتاب الهبة،ج٧ص ٢٨٤).

[4] (ويكره) أي الرجوع تحريما؛ لأن الإمام الزاهدي قد وصف الرجوع بالقبح، وكذا الحدادي وكثير من الشارحين ولا يقال للمكروه تنزيها قبيح؛ لأنه من قبيل المباح أو قريب منه. (مجمع الأنهر ،كتاب الهبة، باب الرجوع عن الهبة،ج٢ص ٣٦٠).

ويكره الرجوع في الهبة وإن كان جائزا في الحكم إذا لم يكن عليه حق واجب لقوله صلى الله عليه السلام العائد في هبته كالعائد في قيئه ولأنه من باب الخساسة والدناءة وسوء الخلق ولهذا شبهه بأقبح أحوال الكلب.(لسان الحكام ،الفصل التاسع عشر في الهبة،ص:٣٧٣).

[5] (ويمنع منه) أي من الرجوع (حروف دمع خزقة).. وفي خزانة الفقه اثني عشر ينقطع به حق الرجوع إذا كان الموهوب له ذا رحم محرم منه أو كانت زوجته أو كان زوجها أو كان أجنبيا وعوضها، وقال: خذ هذا عوض هبتك أو بدلا عنها، أو جزاء عنها أو مكافأة عنها أو في مقابلها، أو مات أحدهما أو خرج عن ملكه أو زاد فيها زيادة متصلة بأن كان عبدا صغيرا فكبر، أو كان مهزولا فسمن.(مجمع الأنهر ،كتاب الهبة، باب الرجوع عن الهبة،ج٢ص ٣٦٠).

۲۔اگر ہبہ کرنے والا، یاموہوب لہ یادونوں کاانتقال ہوجائے۔[1]

۳۔ہبہ شدہ ہلاک ہوجائے یاغیر کے حق کے ساتھ مشغول ہوجائے، دونوں صورتوں میں ہبہ کرنے والا واپس نہیں لے سکتا۔[2]

مسئلہ : باپ نے کپڑے کے دو تھان ایک نابالغ بیٹے کے لئے ایک بالغ بیٹے کے لئے علیحدہ کئے تو علیحدہ کرتے ہی چھوٹے کے حصہ پر قبضہ ہوگیا گویا کہ باپ نے خود اس کی طرف سے ولی بن کر قبضہ کرلیا، اب واپس لینے کا حق باقی نہیں رہا، بالغ بیٹا جب تک خود قبضہ نہ کرے اس پر قبضہ نہ ہوگا، لہٰذا اس کے قبضہ سے پہلے واپس لینے کا حق باقی ہے۔[3]

مسئلہ : ایک تھان بھائی کو ہبہ کیا اور ایک بھاوج کو، بھائی والا واپس نہیں لے سکتا۔[4]

مسئلہ : زید نے عمر کو مکان ہبہ کیا، عمر نے اس پر قبضہ کرکے کچھ تصرف کرلیا مثلاً درخت لگایا یا کچھ بنایا، مرمت کی، اب واپس نہیں لیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ : اگر موہوب میں کمی واقع ہوئی یا ایسی زیادتی ہوئی جس سے اوروں کا حق متعلق نہ ہو تو واپس لینے کا حق باقی رہے گا، جیسے مکان گرگیا یا غلام نے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلی، درخت کا پھل پک گیا، لیکن جو نقصان ہوا اس کا ضمان موہوب لہ پر نہیں آئے گا۔[5]

(قوله ومنع الرجوع دمع خزقه) أي ومنع الرجوع في الموهوب الموانع السبعة. (البحر الرائق،كتاب الهبة، باب الرجوع عن الهبة،ج ٧ ص ٢٩١).

والتفصيل في الفتاوى الهندية (كتاب الهبة،الباب الخامس في الرجوع في الهبة،ج٤ص ٣٨٥).

[1] انظر الحاشية السابقة.

[2] ايضا.

[3] قال محمد رحمه الله في الأصل: كل شيء وهبه لابنه الصغير وأشهد عليه وذلك الشيء معلوم في نفسه فهو جائز، والقبض منه أن يعلم ما وهبه له وأشهد عليه، والإشهاد ليس بشرط لازم، فإن الهبة تتم بالإعلام.(المحيط البرهاني ،كتاب الهبة،الفصل السادس: في الهبة من الصغير،ج٦ ص٢٥٠).

(وهبة من له ولاية على الطفل في الجملة) وهو كل من يعوله فدخل الأخ والعم عند عدم الأب لو في عيالهم (تتم بالعقد) لو الموهوب معلوما وكان في يده أو يد مودعه.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب الهبة،ج٥ص٦٩٤).

[4] لأنّ الأخَ مِن ذوي الرحم المحرم وهذه القرابةُ مانعة مِن الرجوع كما مرّ في "دمع خزقة".

[5] لأنّه ما كان غاصبا بلْ قد ملك العينَ الموهوبَ بإذن الواهب وإعطاءه فلا وجهَ لتضمينه.

مسئلہ : موہوب لہ میں ایسی زیادتی جو آسانی کے ساتھ جدا ہو سکے، حق واپسی سے مانع نہیں ہے جیسے مکان میں چوڑیاں چڑھائیں یا کتاب کے لئے جزدان بنایا۔[1]

مسئلہ : ایسے طریقہ پر موہوبہ چیز کو واپس لینا جائز نہیں جس سے موہوب لہ کا نقصان ہو یا اس کو عار لاحق ہو جیسے کشتی ہبہ کیا وہ دریا میں چل رہی ہے، یا گھوڑا ہبہ کیا اس پر سوار ہو کر کہیں جا رہا ہے، یا کپڑا ہبہ کیا اس کو پہن کر کسی بازار یا محفل میں گیا، اب جب تک وہ کام ختم نہ ہو یا دوسری چیز اس کے قائم مقام نہ مل جائے، مالک (ہبہ کرنے والا) واپس نہیں لے سکتا۔[2]

مسئلہ : موہوب چیز کو خریدنے یا ہبہ کے طور پر لینے میں کوئی حرج نہیں۔[3]

مسئلہ : کوئی چیز ایسے اجنبی کو ہبہ کرنا جو اس پر پہلے سے قابض ہے، دوبارہ قبضہ کرنے کی ضرورت

---

[1] رجوع کرنے کی صورت میں اصل چیز ہی واپس لے گا، جو چیز موہوب لہ نے اپنی طرف سے لگائی تھی وہ نہیں لے سکتا، البتہ اگر موہوب لہ اپنی رضامندی سے وہ بھی دینا چاہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

أما الزيادة المنفصلة كالأرش والولد والعقر فلا تمنع الرجوع لأنه يمكن الفسخ في الأم والأصل دونها بخلاف زوائد المبيع لأن ثم يؤدي إلى الربا لأنها عقد معوضة بخلاف الهبة(تحفة الفقهاء كتاب الهبة، الرجوع في الهبة، ج٣ص ١٦٧).

واحترز بالمتصلة عن الزيادة المنفصلة وعن هذا قال (لا المنفصلة) كالولد والأرش والعقر، فإنه يرجع في الأصل دون الزيادة قيد بالزيادة؛ لأن النقصان كالحبل وقطع الثوب بفعل الموهوب أولا غير مانع.مجمع الأنهر كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة، ج٢ص ٣٦٠.

[2] لمْ أعثرْ على جزئية صريحة في هذه المسئلة، وكأنّ المؤلّفَ رحمه الله تعالى قاسَ الهبة على الإجارة إذا مضتِ مدّة الإجارة والعينُ مشغول للمستاجر بأمثال هذه المشاغل. ويختلج في القلب الفرقُ بين الهبة والإجارة حيث إنّ الرّجوع في الأوّل لا يصحّ إلاّ برضا الفريقين في الأوّل دون الثّاني فكأنّ الموهوبَ له أسقط حقّه حيث تراضى مع الواهب في الرّجوع ، أمّا المستأجر فلا حقَّ له في إمساك العين بعدَ مضيّ المدّة.والله تعالى أعلم بالصّواب. وليتأمّل.

[3] البتہ خود واہب کے خریدنے کو فقہاء کرام نے خلاف اولیٰ قرار دیا۔

روي أن عمر بن الخطاب حمل على فرس في سبيل الله ثم رأى ذلك الفرس يباع فأراد أن يشتريه فسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك فقال: لا تعد في صدقتك».

والشراء لا يكون رجوعا في الصدقة حكما، والمراد: لا يحل الرجوع بطريق الديانة والمروءة.(المبسوط للسرخسي كتاب الهبة،ج١٢ص ٥٤)

روي أن سيدنا عمر رضي الله عنه تصدق بفرس له على رجل ثم وجده يباع في السوق فأراد أن يشتريه فسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك فقال لا تعد في صدقتك وسيدنا عمر رضي الله عنه قصد الشراء لا العود في الصدقة لكن سماه عودا لتصوره بصورة العود، وهو نهي ندب؛ لأن الموهوب له يستحي فيسامحه في ثمنه فيصير كالراجع في بعضه والرجوع مكروه. (بدائع الصنائع كتاب الهبة، حكم الهبة،ج٦ص ١٣٢).

نہیں۔[1]

مسئلہ : شیرینی کا کھانا وغیرہ جو مجالس میں تقسیم کئے جاتے ہیں، مناسب یہ ہے کہ ان کو ہبہ کے تحت داخل کیا جائے تاکہ مالدار اور فقیر دونوں کو لینے میں عار نہ ہو اور قبضہ سے پہلے ملک میں داخل نہ ہو۔

ہبہ مشاع کا حکم

یعنی کوئی چیز مشترک طور پر ایک جماعت کو ہبہ کیا جائے جیسے کہا جائے کہ گندم کا یہ ڈھیر تم دو یا دس آدمی مل کر لے لو، اس کے درج ذیل شرائط ہیں:

۱۔ اگر موہوب لہ قابلِ تقسیم ہو تو مشترک چیز کو ہبہ کرنا بالاتفاق ناجائز ہے الاّ یہ کہ ہبہ کی مجلس ہی میں زبانی تقسیم کر دی جائے کہ آدھا تم لے لو، یا دو من تم لے لو، باقی بکر لے لے گا، یا عملی طور پر علیحدہ کر کے دیدے، اگر موہوب قابلِ تقسیم نہیں جیسے چکی، تلوار، بندوق، کتاب، سلا ہوا کپڑا، وغیرہ، تب مشترکہ طور پر ہبہ کرنا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ناجائز ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے۔[2]

---

[1] ولو وهب العارية أو الوديعة وكل أمانة في يد إنسان من صاحب اليد فإنه يجوز ويثبت الملك للموهوب له وينوب قبض الأمانة عن قبض الهبة وهذا استحسان ..وجه الاستحسان أن الهبة تبرع وقبض الأمانة ينوب عنه .. ولو كانت العين مضمونة في يد إنسان بالمثل أو بالقيمة كما في الغصب والمقبوض على سوم الشراء فوهبها من صاحب اليد تصح الهبة ويبرأ عن الضمان فيكون قبضا غير مضمون.(تحفة الفقهاء،كتاب الهبة، ج٣ص ١٦٥).

وإذا كانت العين في يد الموهوب له ملكها بالهبة وإن لم يجدد فيها قبضا"؛ لأن العين في قبضه والقبض هو الشرط.(الهداية ،كتاب الهبة، ج٣ص٢٢٤).

[2] عبارت میں کچھ تسامح ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ نا قابلِ تقسیم چیز اگر مشاع ہو تو بھی اس کو ہبہ کرنا درست اور نافذ ہے، اس میں امام صاحب اور حضرات صاحبین کا اتفاق ہے، البتہ قابلِ تقسیم چیز اگر مشاعاً ہبہ کیا جائے تو اس میں اختلاف ہے، امام صاحب کے نزدیک ایسا ہبہ فاسد ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک نفسِ شیوع مانع نہیں ہے، راجح قول امام صاحب رحمہ اللہ کا ہے۔

وهبة المشاع فيما لا يحتمل القسمة تجوز من الشريك ومن الأجنبي..هبة المشاع فيما يحتمل القسمة من رجلين أو من جماعة صحيحة عندهما وفاسدة عند الإمام، وليست بباطلة حتى تفيد الملك بالقبض. (الفتاوى الهندية ،كتاب الهبة،الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز، ج٤ص٣٧٨).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الهبة، ج٢ص٣٥٦).

قال في التصحيح: وقد اتفقوا على ترجيح دليل الإمام، واختار قوله أبو الفضل الموصلي وبرهان الأئمة والمحبوبي وأبو البركات النسفي اه.(اللباب في شرح الكتاب،

۲۔ یہ اعلان ہو جائے کہ جس کو جو ملے لے جائے، جیسے نکاح کے موقع پر شیرینی یا نقدی وغیرہ جسے ہمارے عرف میں (لٹا دینا) کہتے ہیں، یہ جائز ہے پس جس کو جو مل جائے وہ اسی کا مال ہو جائے گا۔[1]

ہبہ بالعوض:

موہوب لہ کی طرف سے بھی کوئی خدمت یا مال ہبہ کے عوض میں واہب کو دیدیا جائے، یہ صورت ابتداءً ہبہ ہے اور انتہاءً بیع ہے لہذا دونوں طرف سے عوضین پر قبضہ لازم ہے اور واپس لینے کا حق باقی نہیں رہتا ہے اور کسی بدل کا مستحق نکل آنے کی صورت میں رجوع کرنے کا حق حاصل ہے (عالمگیری)[2]

ہدیہ: یعنی محبت و مراسم یا احسان کے بدلے میں یا حقوق کی رعایت کے طور پر دیا یا لیا جائے جیسے مشائخ واساتذہ کرام کے لئے نذر، اسی طرح علماء ومراء وغیرہ کو جو ہدیہ پیش کیا جاتا ہے، ان کو واپس لینا نہ منقول ہے نہ معمول ،اس کی مختلف صورتیں ہیں:

۱۔ انعامات: جو امراء وسلاطین کی طرف سے رعایا وملازمین کو عطا ہوتے ہیں۔

۲۔ وہ تبرکات جو علماء ومشائخ اپنے خدام کو عنایت فرماتے ہیں۔

۳۔ مراعات جو احباب واقارب میں باہمی جاری ہیں۔

۴۔ رسومات میں جو شادی بیاہ کے موقع پر ہند میں مروج ہیں جیسے سلام کرائی، یا شربت پلائی، منہ دکھائی وغیرہ۔

۵۔ وہ کشادہ دلی جو کھانے پینے یا معمولی چیزوں میں باہم ہوا کرتے ہیں، ایک دوسرے کو زبانی اجازت نہ بھی دے تب بھی حکماً اجازت ہوتی ہے جیسے ایک دوست نے دوسرے کے رومال سے منہ صاف کر لیا، یا آئینہ، سرمہ وغیرہ استعمال کر لیا، یہ سب جائز ہے انتفاع حلال ہے اور ملک صحیح ہے بشرطیکہ صراحت کے ساتھ منع

كتاب الهبة، ج٢ص١٧٤).

[1] ألقى شيئا وقال من أخذه فهو له فلمن سمعه أو بلغه ذلك القول أن يأخذه.(رد المحتار،كتاب اللقطة، مطلب ألقى شيئا وقال من أخذه فهو له،ج ٤ص ٢٨٥).

وكذا في شرح السير الكبير (باب ما يجوز من النفل بعد إصابة الغنيمة ومن يجوز ذلك منه ،ج١ص ٧٩٩).

[2] الفتاوى الهندية (كتاب الهبة، الباب السابع في حكم العوض في الهبة،ج٤ص٣٩٥).

(وإذا وقعت الهبة بشرط العوض المعين فهي هبة ابتداء فيشترط التقابض في العوضين) (ويبطل) العوض (بالشيوع) فيما يقسم بيع انتهاء فترد بالعيب وخيار الرؤية. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة،ج٥ص ٧٠٥).

نہ کرر کھاہو یادوسروں کے استعمال کے خوف سے چھپا کرنہ رکھاہو۔[1]

صدقہ کے احکام

صدقہ بھی ہبہ کی طرح ہے،البتہ اس میں اصل نیت ثواب حاصل کرنے اور محتاج کے اعانت کرنے کی ہوتی ہے،اس کے لئے درج ذیل شرائط ہیں:

ا۔قبضہ شرط ہے۔[2]

۲۔صدقہ کو واپس لینے کا حق نہیں اگرچہ مالدار آدمی کو ہی مل جائے کیونکہ صدقہ کرنے والا ثواب تو لے چکا ہے، صدقہ اولاً اللہ رب العزت کے قبضہ میں جاتا ہے پھر فقیر نیابۃً قبضہ کرتا ہے (لہذا فتاویٰ عالمگیری میں) بعض اکابر سے منقول ہے صدقہ کرنے کے بعد اگر فقیر قبول نہ کرے تب بھی مناسب یہ ہے کہ صدقہ کرنے والا اس کو استعمال نہ کرے بلکہ کسی دوسرے فقیر کو دیدے۔[3]

۳۔صدقہ حاصل کرنے والا کسی دوسرے کو ہبہ کردے،اب یہ دوسرے کے حق میں صدقہ نہیں رہا،

---

[1] أخذ أحد الشريكين حمار صاحبه الخاص، وطحن به فمات لم يضمن للإذن دلالة قال عرف بجوابه هذا أنه لا يضمن فيما يوجد الإذن دلالة، وإن لم يوجد صريحا كما لو فعل بحمار ولده أو بالعكس، أو أحد الزوجين أو أرسل جارية زوجته في حاجته فأبقت. (حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الغصب،مطلب فيما يجوز من التصرف بمال الغير بدون إذن صريح، ج٦ص ٢٠٠).

والإذن إما أن يكون صراحة ..وإما أن يكون دلالة .. فالإذن صراحة هو كالذي يحصل في توكيل إنسان آخر.. أما الإذن دلالة فهو كذبح الراعي شاة مشرفة على الهلاك فالراعي وإن لم يكن مأذونا صراحة فقد اعتبر استحسانا مأذونا. (درر الحكام ، رقم المادة ٩٦، ج١ص٩٧).

[2] انظر الحاشية التالية.

[3] والصدقة كالهبة لا تصح إلا بالقبض" لأنه تبرع كالهبة "فلا تجوز في مشاع يحتمل القسمة" لما بينا في الهبة "ولا رجوع في الصدقة"؛ لأن المقصود هو الثواب وقد حصل. (الهداية، كتاب الهبة،فصل في الصدقة، ج٣ص ٢٢٨).

(والصدقة كالهبة) في جميع أحكامها لأنه تبرع (إلا أنه لا رجوع فيها) لأن المقصود منها الثواب وقد حصل.(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الهبة،قبيل كتاب العارية، ج٣ص ٥٤).

الهبة لا تصح إلا بقبول بالقول واستحسن في صحة الصدقة من غير قبول بالقول لجريان العادة في كافة الأعصار بالتصدق على الفقراء من غير إظهارهم القبول بالقول، كذا في القنية. (الفتاوى الهندية ،كتاب الهبة، الباب الثاني عشر في الصدقة، ج٤ص٤٠٦)

رجل أخرج كسرة إلى مسكين فلم يجده قال الحسن البصري رحمه الله تعالى يضعها حتى يجيء آخر فإن أكلها أطعم مثلها، وعن إبراهيم النخعي رحمه الله تعالى مثل هذا.(فتاوى قاضيخان ،كتاب الهبة، فصل في الصدقة، ج٣ص ١٥٨).

جیسا کہ جناب نبی کریم ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا" لک صدقة ولنا هدية" اے بریرہ: یہ گوشت تیرے حق میں صدقہ ہے (کیونکہ) ان پر صدقہ کیا گیا تھا) اور میرے حق میں ہدیہ ہے (کیونکہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور ﷺ کو بطور ہدیہ نذر کیا تھا)[1]

مسئلہ: زید کچھ مال صدقہ کا لایا اور بیوی کو دیا، وہ استعمال کر سکتی ہے اگرچہ وہ سیدہ یا مالدار ہو کیونکہ زید اس کا مالک ہو گیا، اب بیوی کے حق میں وہ صدقہ نہیں رہا۔[2]

مسئلہ: بنو ہاشم کے لئے صدقہ کا مال حلال نہیں۔[3]

مسئلہ: اپنے اہل وعیال اور خود اپنی ذات پر خرچ کرنا بہترین صدقہ ہے۔[4]

---

[1] عن قتادة، سمع أنس بن مالك، قال: أهدت بريرة إلى النبي صلى الله عليه وسلم لحما تصدق به عليها، فقال: «هو لها صدقة ولنا هدية.(صحيح مسلم ،كتاب الزكاة،باب إباحة الهدية للنبي صلى الله عليه وسلم ولبني هاشم،رقم الحديث:١٠٧٤).من الأصول المقررة أن تبدل الملك قائم مقام تبدل الذات أخذا من قوله صلى الله عليه وسلم لبريرة هي لك صدقة ولنا هدية. (درر الحكام شرح غرر الأحكام ،كتاب الماذون، باب موت المكاتب وعجزه،ج٢ص ٣٢).

تبدل الملك كتبدل العين فصار كعين أخرى.(تبيين الحقائق ،كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة،ج٥ ص ١٠٠).

[2] لأنّ تبدّلَ الملك بمنزلة تبدّل العين كما تقدّم.

[3] علامہ ابن الہمام وغیرہ بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک صدقہ مطلقاً بنو ہاشم کے لئے حلال نہیں چاہے صدقہ واجبہ ہو یا نفل، لیکن جمہور فقہاء کرام کے نزدیک صدقہ نافلہ ان کے لئے حلال ہے ہاں البتہ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ اس سے مستثنی ہے کہ نفلی صدقہ بھی ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔وكذلك الحكم فيما سوى الزكاة من الصدقات الواجبات كصدقة الفطر والكفارات والعشور والنذور وغير ذلك، لأنها في معنى الزكاة، فإنه يطهر نفسه بأداء الواجب وإسقاط الفرض،فيتدنس المؤدى كالماء المستعمل، بخلاف صدقة التطوع حيث تحل للهاشمي لأنها لا تدنس كالوضوء للتبرد. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الزكاة، مصارف الزكاة،ج١ص ١٢١).هذا في الواجبات كالزكاة والنذر والعشر والكفارة أما التطوع والوقف فيجوز الصرف إليهم؛ لأن المؤدي في الواجب يطهر نفسه بإسقاط الفرض فيتدنس المؤدى كالماء المستعمل، وفي النفل تبرع بما ليس عليه فلا يتدنس به المؤدى كمن تبرد بالماء اهـ. (البحر الرائق ،كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة،ج٢ص ٢٦٥).

[4] عن زينب امرأة عبد الله، قالت: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم: أيجزئ عني من الصدقة النفقة على زوجي، وأيتام في حجري؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لها أجران: أجر الصدقة، وأجر القرابة.(سنن ابن ماجه ،كتاب الزكاة، باب الصدقة على ذي قرابة،رقم الحديث: ١٨٣٤).

وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى هؤلاء لقوله عليه السلام نفقة الرجل على نفسه صدقة وعلى عياله صدقة وكل معروف صدقة.(تحفة الفقهاء ،كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة،ج١ص ٣٠٤).

(بھیک مانگنا) سوال کر کے کھانے کا حکم

سوال کرنا فی نفسہ حرام ہے اور سوال کر کے جمع کردہ مال مال خبیث ہے، [1] جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: " مَن سألَ النّاسَ اموالهم مكثرا فإنّما يَسئل جمرا فليقل أو لِيستكثرْ " یعنی جو مال جمع کر کے رکھنے کے لئے دوسروں سے مانگا جائے وہ آگ کی چنگاری ہے، زیادہ کرے یا کم۔ مگر ضرورت کے وقت سوال کرنا جائز ہے لیکن ہر حال میں سوال کو ترک کرنا ہی اولیٰ اور بہتر ہے، قناعت اختیار کیا جائے۔ [2]

ا۔ وہ شخص جو کمائی سے عاجز ہو اور ایک دن کی قوت (کھانے کی چیز) اس کے پاس نہ ہو وہ سیری شکم کی مقدار مانگ سکتا ہے۔ [3]

۲۔ مدیون (مقروض) اداء قرض کی مقدار مانگ سکتا ہے۔

مسئلہ: سوال کرنا اگرچہ ممنوع ہے تاہم سائل کو ڈانٹنا، اس کے ساتھ بدکلامی کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے، البتہ زجر و توبیخ بد خلقی اور بخل کی وجہ سے نہ ہو بلکہ نہی عن المنکر اور مخلوق کی ایذاء دور کرنے یا کسی مصلحت صحیحہ سے ہو تو جائز ہے جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ [4]

مسئلہ: عالمگیری باب الہبۃ کے آخر میں ہے کہ سائل کو جامع مسجد میں دینا اچھا نہیں (کیونکہ مانگنے والوں کی کثرت سے نمازیوں کو تکلیف ہوگی) [5]

---

[1] ما جمع السائل من المال فهو خبيث كذا في الينابيع.(الفتاوى الهندية ،كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب،ج٥ص ٣٤٩).وفي التتارخانية وما جمع السائل من المال فهو خبيث.(رد المحتار، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع،ج٦ص ٣٨٥).

[2] عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:من سأل الناس أموالهم تكثرا، فإنما يسأل جمرا فليستقل أو ليستكثر. صحيح مسلم كتاب الزكاة،باب كراهة المسألة للناس،رقم الحديث: ١٠٤١.

[3] قال عامة العلماء إذا ملك قوت يومه وما يستر به عورته فلا يحل له السؤال فأما إذا لم يكن فلا بأس به.(تحفة الفقهاء،كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة،ج١ص ٣٠٢).

فإن لم يكن له قوت يومه ولا ما يستر به عورته يحل له أن يسأل؛ لأن الحال حال الضرورة وقد قال الله تعالى: {ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة}(بدائع الصنائع ،كتاب الزكاة، شراط الزكاة،ج٢ص ٤٩).

[4] ثم النهي على النهر على ما قالوا إذا لم يلح في السؤال فإن ألح ولم ينفع الرد اللين فلا بأس بالزجر.روح المعاني،سورة الضحى، ج١٥ ص ٣٨٣.

[5] قالوا: لا ينبغي أن يتصدق على السائل في المسجد الجامع؛ لأن ذلك إعانة على أذى الناس، وعن خلف بن أيوب رحمه الله تعالى قال: لو كنت قاضيا لم أقبل شهادة من تصدق على سائل المسجد، وعن أبي بكر بن إسماعيل الزاهد رحمه الله تعالى قال: هذا فلس واحد يحتاج إلى سبعين فلسا لتكون تلك السبعون كفارة عن الفلس الواحد ولكن يتصدق قبل أن يدخل المسجد أو بعدما خرج منه، (الفتاوى الهندية ،كتاب الهبة، الباب الثاني عشر في الصدقة،ج٤ص٤٠٨).

وضاحت: ہر درخواست سوال نہیں ورنہ لوگوں کے کام رک جائیں گے، بلکہ سوال وہی ہے جو کمال عجز وابتذال وخساست پر عادۃ وارادۃ مبنی ہو، درج ذیل باتیں ناجائز سوال میں داخل نہیں: [1]

۱۔ کمال بے تکلفی میں۔

۲۔ بحق قرابت ودوستی وہمسائیگی وشاگردی واستاذی وغیرہ۔

۳۔ اتفاقیہ کسی مصیبت میں کسی عالی ہمت سے مدد طلب کرنا۔

۴۔ بے وقعت چیزوں کو طلب کرنا جیسے حقہ، پان، تمباکو، پانی وغیرہ طلب کرنا۔

۵۔ کوئی چیز عاریت کے طور پر مانگنا۔

۶۔ قرض مانگنا۔

۷۔ کسی خدمت یا کام کا سوال کرنا۔

۸۔ باہم رشتہ دار یا دوستوں سے بے تکلفی کے تقاضے سے کوئی چیز مانگ لینا، یہ سوال شرعاً ممنوع نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض خدمات واشیاء اپنے مخصوص صحابہ کرام سے طلب فرمائی تھی۔

قسم دوم: عاریت کے احکام

عاریت کا معنی یہ ہے کہ اپنے مال کا نفع کسی کے لئے بلا عوض حلال کر دینا، جمہور علماء کے نزدیک مستعیر صرف نفع کا مالک ہوتا ہے لہٰذا دوسرے کو عاریت پر نہیں دے سکتا ہے۔ [2]

وكذا في فتاوى قاضيخان (كتاب الزكاة،فصل في الصدقة ٣ / ١٥٨).

[1] ان تمام صورتوں کے جواز کے متعلق تو صریح جزئیات نہیں مل سکے تاہم سوال کے ناجائز ہونے کی علت تذلیل نفس ہے، اس کے پیش نظر یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

قال: (ومن كان له قوت يومه لا يحل له السؤال) لقوله عليه الصلاة والسلام : من سأل الناس وهو غني عما يسأل جاء يوم القيامة ومسألته خدوش أو خموش أو كدوح في وجهه ولأنه أذل نفسه من غير ضرورة وأنه حرام. قال عليه الصلاة والسلام:لا يحل للمسلم أن يذل نفسه.(الاختيار لتعليل المختار، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، ج٤ص ١٧٦).

قوله: (ومن له قوت يوم: لا يحل له السؤال) لأنه يستذل نفسه بلا ضرورة. وإنه حرام، لقوله عليه السلام: "حرام على المؤمن أن يذل نفسه"(منحة السلوك في شرح تحفة الملوك كتاب الكسب والادب،ص:٤٧٥).

[2] یہ تفصیل تب ہے جبکہ عاریت مقید ہو یعنی مثلاً دیتے وقت مالک خود استعمال کرنے کی قید لگائے، اگر ایسی کوئی قید نہیں لگائی گئی تو دوسروں کو دینا درست ہے اور جو کوئی پہلے استعمال کرے گا وہی متعین ہو جائے گا، اس کے بعد دوسروں کو دینا درست نہیں ہوگا، نیز استعمال کرنے میں اس چیز طریقہ استعمال کی رعایت رکھنی ضروری ہے، خلافِ ضابطہ استعمال کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر: احتیاط یہ ہے کہ عاریت کی چیز ایسی ہو کہ استعمال کرنے کا اثر اس پر دوسرے طور پر پڑتا ہے، مثلاً ناشائستہ آدمی کو عباء استعمال کرنے دیا جائے تو وہ جلدی خراب اور میلا کر دے گا، شائستہ آدمی ہے تو خراب نہیں کرے گا جلدی میلا بھی نہیں ہو گا، یا مالک خود مستعیر کے علاوہ اور کو دینا پسند نہیں کرتا ہے تو ایسی صورت میں کسی اور کو نہ دیا جائے ورنہ اختیار ہے۔

اجازت کی قسمیں:

مس ئ لہ : اجازت کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ اجازتِ مطلق: یعنی مال دیدیا، وقت اور طریقہ استعمال کے بارے میں کچھ نہیں کہا، تو ایسا استعمال جس سے نقصان ہو یا عرف کے خلاف ہو، جائز نہیں ہو گا، اور جب تک مالک واپسی کا مطالبہ نہ کرے اس کا استعمال جائز رہے گا۔

اجازت مؤقت: جیسے یہ مکان دو ماہ کے لئے عاریت پر دیا، اب دو ماہ سے زیادہ استعمال کرنا جائز نہیں، اگر مالک کے قبضہ میں نہ بھی دے سکے تب بھی استعمال نہ کرے۔

۳۔ اذنِ معین: مثلاً یہ چادر صرف اوڑھی جائے، بچھائی نہ جائے تو اجازت کی مخالفت نہ کرے۔[1]

استعمال کی تین قسمیں:

۱۔ عرف کے مطابق استعمال ہے یہ ہمیشہ ثابت ہے مگر یہ کہ عرف کی مخالفت کر دی جائے تو اجازت ختم ہو جائے گی۔[1]

أما إذا بين أنه يستعمل بنفسه فهذا على وجهين إن كان مما يتفاوت الناس في استعماله كالركوب واللبس فإنه يختص به ولا يجوز له أن يركب غيره وأن يلبس غيره

وإن كان شيئا لا يتفاوت كسكنى الدار فله أن يعير غيره.(تحفة الفقهاء ،كتاب العارية، ج٣ص ١٧٨).

(وله أن يعير ما اختلف استعماله أولا إن لم يعين) المعير (منتفعا و) يعير (ما لا يختلف إن عين) وإن اختلف لا للتفاوت... (فمن استعار دابة أو استأجرها مطلقا) بلا تقييد (يحمل) ما شاء (ويعير له) للحمل (ويركب) عملا بالإطلاق (وأيا فعل) أولا (تعين) مرادا (وضمن بغيره) إن عطبت حتى لو ألبس أو أركب غيره لم يركب بنفسه بعده هو الصحيح كافي. (وإن أطلق المعير أو المؤجر (الانتفاع في الوقت والنوع انتفع ما شاء أي وقت شاء) لما مر (وإن قيده) بوقت أو نوع أو بهما (ضمن بالخلاف إلى شر فقط) لا إلى مثل أو خير.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،كتاب العارية، ج٥ص ٦٨٠).

وكذا في الاختيار لتعليل المختار (كتاب العارية، ج٣ص٥٦). وكذا في الدرر والغرر (كتاب العارية، ج٢ص ٢٤٣).

[1] ايضا.

۲۔نقصان دہ استعمال: یہ ہمیشہ ممنوع ہے مگر یہ کہ صراحت کے ساتھ اس استعمال کی اجازت دی جائے۔
۳۔اجازت کے مطابق یہ بلاتردد جائز ہے۔

عاریت کا حکم

مسئلہ: عاریت لینے والا شئ مستعار کے منافع کا اجازت کے بقدر مجاز اور مالک ہو جاتا ہے۔[2]

مسئلہ: شئ مستعار امانت ہے جب تک جائز استعمال سے تجاوز نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی ضمان نہیں ہے۔[3]

مسئلہ: مالک ہر وقت اپنی چیز واپس مانگ سکتا ہے اگرچہ اجازت کی مدت باقی بھی ہو۔[4]

مسئلہ: اگر عاریت کی مدت نہ گذری اور شئ مستعار کسی ضرورت سے متعلق ہو جیسے کشتی سمندر کے درمیان میں، یا گاڑی راستہ میں، یا لباس پہنے ہوئے کسی محفل یا بازار میں ہے، اگر ان حالات میں مالک واپسی کا مطالبہ کرے تو مالک پر یہ عہد کی پابندی لازم ہے (یہ نہ کہا جائے کہ محض وعدہ تو لازم نہیں ہوتا، کیونکہ شئ موعود پر قبضہ ہو چکا ہے لٰہذا بدون ضرر کے واپس لینا جائز ہے لیکن ضرر کے ساتھ ناجائز ہے اس میں دھوکہ وفریب لازم آتا ہے، اس کو فارغ کرنے کے لئے مناسب طریقہ پر عجلت سے کام لے، کیونکہ حدیث میں ہے "لاضِرار في الإسلام" ہاں البتہ اگر وقت گذر چکا ہے مالک کی طرف سے واپسی کا مطالبہ ہے اور چیز ابھی تک مشغول ہے تو ایسی صورت میں اجرت مثل کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے (شامی کتاب

---

[1] وأما المستعير إذا تعدى ثم أزال التعدي لا يبرأ من الضمان إلا بالرد إلى المالك. الجوهرة النيرة ،كتاب الوديعة، ج١ص ٣٤٨.
(بخلاف المستعير والمستأجر) للعين إذا تعديا، ثم أزالاه يزول الضمان؛ لأن قبضهما كان لأنفسهما لاستيفائهما المنافع عنها فبإزالة التعدي عن العين لم يوجد الرد إلى صاحبها (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة، ج٢ص ٣٤٢).

[2] قد مرّ تفصيله.

[3] لو هلكت بلا تعدفلا ضمان. (ملتقى الأبحر، كتاب العارية، ص ٤٨١).
والعارية أمانة إن هلكت من غير تعد لم يضمنها. (الفتاوى الهندية ،كتاب العارية، الباب الاول، ج٤ص٣٦٣).

[4] في الدر المختار: (و) لعدم لزومها (يرجع المعير متى شاء) ولو موقتة أو فيه ضرر فتبطل، وتبقى العين بأجر المثل. وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله: ولو مؤقتة) ولكن يكره قبل تمام الوقت؛ لأن فيه خلف الوعد ابن كمال. أقول: من هنا تعلم أن خلف الوعد مكروه لا حرام، وفي الذخيرة: يكره تنزيها؛ لأنه خلف الوعد ويستحب الوفاء بالعهد..(قوله: فتبطل) أي بالرجوع (قوله: فله أجر المثل) أي للمعير، (كتاب العارية، ج٥ص ٦٧٨).
والتفصيل في فتاوى قاضيخان (كتاب العارية، فصل فيما يضمن المستعير، ج٣ص ٢٣٣). والنتف في الفتاوى (كتاب العارية، ج٢ص ٥٨٣).

الاجارہ)[1]

مسئلہ : زید نے عمر سے ایک کشتی عاریت پر لی پھر اس پر خود سوار ہوا یا سامان لادا، آدھے راستے میں عمر نے واپس مانگا، تو اگر عاریت کی مدت ختم ہو چکی ہو تو اجرت مثل کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے، اور اگر مدت پوری نہیں ہوئی تو بلا اجرت کشتی کو اپنے پاس روک سکتا ہے، ہاں البتہ اگر زید کشتی کو زیادہ دیر اپنے پاس رکھنے کا حیلہ کر رہا ہو تو پھر یا تو اجرت لینے پر راضی ہو یا پھر حاکم کے سامنے زید کی شرارت ثابت کر کے کشتی خالی کروالے، کرایہ پر دیجانے والی چیزوں میں بھی اگر کرایہ دار شرارت کرے تو یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔[2]

مسئلہ : عاریت پر لینے والا اگر اجازت یا عرف کی خلاف ورزی کرے یا مدت مقررہ سے زیادہ اپنے استعمال میں رکھے یا واپسی کا مطالبہ کرتے وقت غیر ضروری حیلہ بہانہ کرے تو ضامن ہو جائے گا۔[3]

مسئلہ : کمالِ بے تکلفی میں جو ایک دوسرے کی چیز استعمال ہوا کرتی ہے جن کی اجازت ذہن میں منقش ہوا کرتی ہے، ان کا استعمال حکمی اجازت کے بناء پر جائز ہے۔[4]

---

[1] انظر الحاشية المتقدمة.

[2] ايضا.

[3] إذا حصل من المستعير تعد أو تقصير بحق العارية ثم هلكت أو نقصت قيمتها فبأي سبب كان الهلاك أو النقص يلزم المستعير الضمان. مثلا إذا ذهب المستعير بالدابة المعارة إلى محل مسافته يومان في يوم واحد فتلفت تلك الدابة أو هزلت أو نقصت قيمتها لزم الضمان وكذا لو استعار دابة ليذهب بها إلى محل معين فتجاوز بها ذلك المحل..متى طلب المعير العارية لزم المستعير ردها إليه فورا وإذا أوقفها وأخرها بلا عذر فتلفت العارية أو نقصت قيمتها ضمن. (مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة: ٨١٤و ٨٢٥،ص١٥٦).

وكذا في مجمع الضمانات،(باب مسائل العارية، ج١ص٥٦).

[4] أخذ أحد الشريكين حمار صاحبه الخاص، وطحن به فمات لم يضمن للإذن دلالة قال عرف بجوابه هذا أنه لا يضمن فيما يوجد الإذن دلالة، وإن لم يوجد صريحا كما لو فعل بحمار ولده أو بالعكس، أو أحد الزوجين أو أرسل جارية زوجته في حاجته فأبقت. (حاشية ابن عابدين على الدر المختار،كتاب الغصب،مطلب فيما يجوز من التصرف بمال الغير بدون إذن صريح، ج٦ص ٢٠٠).

والإذن إما أن يكون صراحة ..وإما أن يكون دلالة .. فالإذن صراحة هو كالذي يحصل في توكيل إنسان آخر.. أما الإذن دلالة فهو كذبح الراعي شاة مشرفة على الهلاك فالراعي وإن لم يكن مأذونا صراحة فقد اعتبر استحسانا مأذونا. (درر الحكام ، رقم المادة ٩٦، ج١ص٩٧).

مسئلہ :قرآن مجید عاریت پر لیا، اس میں کتابت کی کچھ غلطی نظر آئے تو مناسب خط کے ساتھ اس کی تصحیح جائز ہے۔ (شامی)[1]

مسئلہ : شئ مستعار سے اس کو ہلاک کئے بغیر نفع حاصل کرنا ناممکن ہو تو اس کو ہبہ کہا جائے گا عاریت نہیں۔[2]

مسئلہ :غلہ، سونا، چاندی کے روپیہ وغیرہ عاریت پر لینا جائز نہیں، کیونکہ ہلاک عین کے بغیر ان سے انتفاع ممکن نہیں، اگر ہلاک عین کے بغیر انتفاع ممکن ہو تو پھر عاریت جائز ہو گی جیسے زیورات۔[3]

قسم سوم دیون کی تفصیلات

منافع کا مالک بنانا اصل کے مثل واپس کرنے کی شرط کے ساتھ، اسی کو دین کہتے ہیں۔

دیون: وہ مالی حقوق ہیں جو تعلق عین کے بغیر ذمہ پر ثابت ہوں، یعنی کوئی عین شئ نہیں بلکہ ایک مقدار سے اس کی ادائیگی ذمہ میں واجب ہے چاہے کوئی وہ شئ ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔[4]

فقہاء نے اس کی کئی قسمیں بیان کی ہیں:[1]

---

[1] استعار كتابا فوجد به خطأ أصلحه إن علم رضا صاحبه. قلت: ولا يأثم بتركه إلا في القرآن لأن إصلاحه واجب بخط مناسب. (حاشية ابن عابدين ،كتاب العارية قبيل كتاب الهبة، ج٥ص ٦٨٦).

[2] اس میں کچھ تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر مالک نے دیتے وقت استعمال کی کوئی ایسی نوعیت طے ہوئی ہے جس میں شئ مستعار ہلاک نہیں ہوتا تب تو یہ عاریت ہی ہے، اگر ایسی کوئی نوعیت طے نہیں ہوئی تو پھر دیکھا جائے گا اگر معاملہ یوں قرار پایا تھا کہ مستعیر واپس نہیں کرے گا تو یہ ہبہ ہے ورنہ تو قرض ہے۔

(وعارية الثمنين والمكيل والموزون والمعدود قرض) لأن الإعارة إذن في الانتفاع به ولا يتأتى الانتفاع بهذه الأشياء إلا باستهلاك عينها ولا يملك الاستهلاك إلا إذا ملكها فاقتضت تمليك عينها ضرورة، وذلك بالهبة أو بالقرض والقرض أدناهما ضررا.(تبيين الحقائق ،كتاب العارية، ج٥ص ٨٧).

(عارية الثمنين والمكيل والموزون والمعدود والمتقارب) عند الإطلاق (قرض) ضرورة استهلاك عينها (فيضمن) المستعير (بهلاكها قبل الانتفاع) لأنه قرض حتى لو استعارها ليعير الميزان أو يزين الدكان كان عارية.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب العارية، ج٥ص ٦٨١).

[3] ناجائز ہونے کا مطلب یہی ہے کہ یہ عاریت نہیں بلکہ قرض یا ہبہ ہو گی جیسا کہ پہلے حاشیہ میں تحریر کیا جا چکا۔

[4] (المادة ١٥٨) الدين ما يثبت في الذمة كمقدار من الدراهم في ذمة رجل ومقدار منها ليس بحاضر والمقدار المعين من الدراهم أو من صبرة الحنطة الحاضرتين قبل الإفراز فكلها من قبيل الدين. (مجلة الأحكام العدلية ،ص ٣٣)

خون بہا، ارش، ضمان متلفات،(یعنی چیزیں تلف کردی، ان کا ضمان)تاوان، نفقات، مہر، بدل خلع، عقر(یعنی کسی اجنبی عورت کواپنی بیوی یالونڈی سمجھ کروطی کی جائے بعد میں شبہ کی وجہ سے حد لازم نہ آئے،اس مرد پر لازم ہے کہ اس کو عوض ادا کرے)، مال صلح، ثمن مبیع،اجرت کرایہ،زکوۃ، نذر، قربانی، فطرہ، کفارہ، قرض، ضمانت کفالت، حوالہ، نوائب(یعنی وہ مال جو مسلمانوں پر کوئی ناگمانی مصیبت نازل ہونے کی وجہ سے حاکم مسلم مسلمانوں پر لازم کرے بشرطیکہ بیت المال خالی ہو مثلاً کہیں سیلاب آیا، یا اچانک دشمن نے سرحد پر حملہ کردیا،وغیرہ)اس مقام پر صرف دین اور قرض کا فرق بیان ہوگا۔[1]

قرض کا حکم

قرض ابتدامیں مثل صوری یا معنوی واپس لینے کے ارادے کسی کو عین شئ کا مالک بنانا ہےاور ایک تبرع واحسان ہےاور انتہاءً معاوضہ ہے۔

مسئلہ : قرض مثلی چیزوں میں ہو سکتا ہے قیمی اشیاء کو قرض دینا جائز نہیں ہے کیونکہ ان میں مماثلت نہیں

ہے جیسے ظروف، برتن،زیور، جواہر (مگر جو موتی وزناً بکتے ہیں یا کوئی اور جوہر جو وزناً بکے،اس سے مستثنیٰ ہے)جانور اور تمام مصنوعات جو ہم مثل نہیں ہیں۔[2]

مسئلہ : ایسے پیمانہ سے قرض دیناجو معروف نہ ہو، جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں جہالت اور اضاعت مال کا خطرہ ہے۔

مسئلہ : ہر وہ مال جس میں نفع مشروط ہو ربوٰا ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے" كلُّ قرض جرّ نفعا فهو رِبوا"یعنی ہر وہ قرض جس میں نفع لیا جائے، سود ہے۔[1]

---

[1] یہ قسمیں درحقیقت وجوب دین کے اسباب ہیں، حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے کافی تتبع اور استقراء کے بعد تقریباً ۱۲۲سباب ذکر فرمائے ہیں۔

[2] (وصح) القرض (في مثلي) هو كل ما يضمن بالمثل عند الاستهلاك (لا في غيره) من القيميات كحيوان وحطب وعقار وكل متفاوت لتعذر رد المثل. (الدر المختار ، باب المرابحة والتولية، فصل في القرض، ج٥ص١٦١).

ويجوز القرض فيما هو من ذوات الأمثال كالمكيل، والموزون والعددي المتقارب كالبيض، والجوز لأن القرض مضمون بالمثل، ولا يجوز في غير المثلي لأنه لا يجب دينا في الذمة.(البحر الرائق باب المرابحة، تتمه،ج٦ص ١٣٣).

مسئلہ: اسی بناء پر قرض میں مدت لازم کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مدت متعین کرنے سے فساد لازم نہیں آتا، مدت بحیثیت شرط کے لازم ہو جاتی ہے بحیثیت قرض لازم نہیں ہوتی، اگر قرض خواہ مدت ختم ہونے سے پہلے مطالبہ کرے تو اسے اس مطالبہ کا حق حاصل ہے، مدیون کو چاہئے کہ اس کے مطالبہ پر ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے۔[2]

مسئلہ: قرض دینے والا مدیون کو قرض دینے سے پہلے مدیون سے نفع اٹھائے تو اگر یہ نفع قرض دینے کے ساتھ مشروط تھا، تو اس کے حرام ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے اور اگر بدون نفع و شرط کے نفع اٹھایا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے، امام محمد رحمہ اللہ جواز کے قائل ہے اور ایک گروہ منع کی طرف مائل ہے، مگر بات یہ ہے کہ اگر مدیون کو نفع پہنچانا اس لالچ پر ہو کہ بعد میں قرض ملے گا یا قرض میں مہلت ملے گی یا تسامح سے کام لیا جائے گا تو نا جائز ہے اور اگر بحسب مروت و شکر واحسان، یا قدیم وجدید مراسم محبت کی وجہ سے ہے تو قاعدہ کے مطابق جائز ہوگا لیکن حضرات سلف نے اس سے بھی احتراز فرمایا ہے، ان کا احتراز فرمانا شبہ حرمت اور کامل تقویٰ کی بنیاد پر ہے اور احادیث اسی پر محمول ہیں، کیونکہ غیر مشروط احسان یا محسن کے شکریہ سے روکنا خلافِ اصل ہے۔[3]

---

[1] عن عمارة الهمداني قال: سمعت عليا يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «كل قرض جر منفعة فهو ربا (مسند الحارث، كتاب البيوع، باب في القرض يجر المنفعة، رقم الحديث: ٤٣٧).

ورواه البيهقي موقوفا على سيدنا فضالة بن عبيد رضي الله تعالى عنه. (السنن الكبرى للبيهقي ،كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، ج٥ ص ٥٧٣).

[2] والأجل في القرض باطل شرط في الأصل أو طرأ عليه.(تحفة الفقهاء ،كتاب الصرف، فصل القرض، ج٣ص ٣٥).

وكذا في البحر الرائق (باب المرابحة والتولية، فصل التصرف في المبيع والثمن، ج٦ص ١٣٢).

[3] هذا إذا كانت الزيادة مشروطة في القرض، فأما إذا كانت غير مشروطة فيه ولكن المستقرض أعطاه أجودهما؛ فلا بأس بذلك؛ لأن الربا اسم لزيادة مشروطة في العقد، ولم توجد، بل هذا من باب حسن القضاء، وأنه أمر مندوب إليه قال النبي عليه السلام: خيار الناس أحسنهم قضاء (بدائع الصنائع ،كتاب القرض، ج٧ص ٣٩٥).

وذكر محمد رحمه الله في كتاب الصرف: أن السلف كانوا يكرهون ذلك، إلا أن الخصاف لم يذكر الكراهة، إنما قال: ما أحب له ذلك، فهو قريب من الكراهة، ولكنه دون الكراهة، ومحمد رحمه الله لم يرَ بذلك بأساً..قال شيخ الإسلام: ما نقل عن السلف فذاك محمول على ما إذا كانت المنفعة .. مشروط في الاستقراض، وذلك مكروه بلا خلاف، وما ذكر محمد رحمه الله محمول على ما إذا لم تكن المنفعة وهي الإهداء مشروطة في القرض، وذلك لا يكره بلا خلاف.(المحيط البرهاني ،كتاب الكراهية والاستحسان، الفصل التاسع والعشرون، ج٥ص٣٩٥).

وكذا في الفتاوى الهندية (الباب التاسع عشر في القرض والاستقراض والاستصناع، ج٣ص ٢٠٣).

مسئلہ: قرض دیتے وقت یہ شرط لگانا کہ ہمارا قرض فلاں شہر میں ادا کرنا ہوگا اگر اس شرط کو لازم قرار دیا جائے تو ناجائز ہے۔[1]

مسئلہ: اگر واپسی کے وقت بدون شرط کے کچھ زیادہ دیدیا جائے تو اچھی بات ہے یہ زیادتی حلال ہے اور حضور ﷺ سے ثابت ہے اور قرض کے مطالبہ میں نرمی کرنا بھی مستحب ہے۔[2]

مسئلہ: قرض فاسد کو بعینہ واپس کرنا واجب ہے۔[3]

مسئلہ: اگر قرض خواہ کو مقروض کا کوئی مال مل جائے تو اس کو لے لینے کا حق نہیں ہے، ہاں جس جنس کا قرض دیا تھا اسی جنس کا مل جائے جیسے روپیہ دیا روپیہ مل جائے، یا چاندی دیا تھا چاندی مل جائے تو لے سکتا ہے[4] اور اگر ابھی تک قرض کی مدت باقی ہو تب بھی لے سکتا ہے مدت کا باقی ہونا مانع نہیں ہے۔[5]

---

[1] ولو أقرضه بالكوفة على أن يوفيه بالبصرة لا يجوز.(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب التاسع عشر في القرض والاستقراض، ج٣ ص ٢٠٤)

وكذلك السَّفَاتِج، يقرض الرجل الرجل ألف درهم على أن يكتب له بها سُفْتَجَة إلى بلد كذا وكذا، فهذا مكروه، والدراهم عليه حالّة، يأخذه بها إن شاء. (الأصل للشيباني ،كتاب الصرف، باب القرض والصرف في ذلك، ج٣ص ٢٦).

ويكره السفتجة إلا أن يستقرض مطلقا فيوفي بعد ذلك في بلد آخر من غير شرط.(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، باب الصرف، ج٢ ص ١٢٥).

[2] مر تخريجه في الحاشية التي مرت قبل المتقدمة.

[3] ثم في كل موضع لا يجوز القرض لم يجز الانتفاع به لعدم الحل ويجوز بيعه لثبوت الملك كبيع فاسد إذ المقبوض بقرض فاسد كمقبوض ببيع فاسد سواء.(جامع الفصولين، الفصل الثلاثون في التصرفات الفاسدة، ج٢ص ٤٢).

واعلم أن المقبوض بقرض فاسد كمقبوض ببيع فاسد سواء فيحرم الانتفاع به لا بيعه لثبوت الملك.(الدر المختار،فصل في القرض، ج٥ ص١٦١).

[4] بلکہ متاخرین فقہاء کرام نے خلاف جنس سے قرض وصول کرنے کی بھی اجازت دی ہیں، تاہم یہ ضروری ہے کہ اصل حق کے بقدر ہی وصول کیا جائے اس سے زائد لینا ہرگز جائز نہیں۔

من له الحق إذا ظفر بجنس حقه؛ يباح له أخذه، وإذا أخذه يصير مستوفيا حقه.(بدائع الصنائع ،كتاب السرقة، ج٧ص ٧١).

قالوا: إن رب الدين إذا ظفر بجنس حقه له أن يأخذه، وإن لم يعلم به المديون.(رد المحتار،كتاب القضاء، فصل في الحبس، ج٥ص ٣٨٠).

وفيه:قال الحموي في شرح الكنز...إن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس كان في زمانهم لمطاوعتهم في الحقوق، والفتوى اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أي مال كان لا سيما في ديارنا لمداومتهم العقوق.(كتاب الحجر، ج٦ص ١٥١).

[5] لِعدم لزوم الأجل في القرض على ما مرّ انفا.

دین کے احکام

دین: جو کسی چیز کے عوض میں لازم ہو جیسے اجرت، کرایہ، ثمن وغیرہ۔

مسئلہ: اس میں مدت لازم ہے مدت ختم ہونے سے پہلے دائن کو مطالبہ کرنے کا حق نہیں، اور مدیون جب چاہے دے سکتا ہے، مگر یہ کہ دائن کو کوئی قوی عذر لاحق ہو جیسے خطرہ یا دشمنی کا خوف۔[1]

مسئلہ: جب مدیون مر جائے تو دائن کو حق ہے کہ پورا قرضہ اکھٹا وصول کرے، مدت باقی ہو یا تمام ہو گئی ہو۔[2]

فائدہ: ہمارے زمانے میں اس قاعدہ پر (کہ مدیون کے مرتے ہی فوراً تمام قرضہ ادا کرنا ہو گا) عمل کرنے سے کارخانے تباہ اور معاملات درہم برہم ہو جائیں گے، لہذا اگر مدیون کا ترکہ تقسیم ہو رہا ہو تو دائن کا حق مقدم ہو گا اور اگر کوئی مستقل منتظم کارخانہ کے لئے وجود میں آجائے اور ظاہر حال بھی قابل اطمینان ہو تو ورثاء کو حق مدت سے محروم کرنا انہیں خالص نقصان پہنچانا ہے۔[3]

---

[1] كل دين أجله صاحبه فإنه يلزمه تأجيله.(الأشباه والنظائر لابن نجيم،الفن الثاني، كتاب المداينات،ص: ٢٢٦).

إن التأجيل يكون تارة مطلقا كقول الدائن لمدينه: قد أجلت ما لي في ذمتك من الدين إلى سنة فهذا التأجيل صحيح في غير القرض والأجل لازم في حق الدائن.(درر الحكام ،رقم المادة:٢٤٨،ج١ص ٢٣٠).

[2] ويبطل الأجل بموت المديون لا الدائن. (الدر المختار ،كتاب البيوع،ج٤ص ٥٣٢).

كما أنه بوفاة المدين كالمشتري مثلا يبطل الأجل والثمن يستوفى حالا من تركة المشتري. (درر الحكام ،رقم المادة:٢٤٨،ج١ص ٢٣٠).

[3] فقہاء احناف، موالک، شوافع وغیرہ کے نزدیک مدیون کے مرتے ہی تمام قرضوں میں اجل ختم ہو جائے گا، ماقبل حاشیہ میں فقہاء احناف کی عبارات بھی درج کی گئیں ہے، البتہ حنابلہ کے نزدیک اس میں دو قول ہے ایک قول جمہور کے موافق ہے اور دوسرے قول کے مطابق محض موت کی وجہ سے اجل باطل نہیں ہو گی بلکہ پہلے کی طرح برقرار رہے گی، حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی تحقیق بھی ان ہی فقہاء کرام کی تحقیق کے مطابق ہے۔

فأما إن مات وعليه ديون مؤجلة، فهل تحل بالموت؟ فيه روايتان؛ إحداهما، لا تحل إذا وثق الورثة،وهو قول ابن سيرين وعبد الله بن الحسن، وإسحاق، وأبي عبيد. وقال طاوس، وأبو بكر بن محمد، والزهري، وسعد بن إبراهيم: الدين إلى أجله. وحكي ذلك عن الحسن. والرواية الأخرى، أنه يحل بالموت. وبه قال الشعبي، والنخعي، وسوار، ومالك، والثوري، والشافعي، وأصحاب الرأي. المغني لابن قدامة، كتاب المفلس،ج٤ص٣٢٧.

دین اور قرض کے مشترک احکام

مسئلہ: قبضہ سے پہلے دین کا کسی اور کو مالک بنانا یا تقسیم کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ: زید نے عمر سے کچھ خریدا اور یہ شرط طے پائی کہ ثمن بکر سے وصول کرنا ہوگا جو میرا مقروض ہے یہ حوالہ بھی صحیح نہیں ہے اور بیع بھی جائز نہیں ہے (کیونکہ اس میں مشتری بالکل بری ہو جاتا ہے اور بائع دین کا مالک ہوتا ہے) ہاں اس طرح حوالہ کرنا کہ تم اس سے لے لو، اگر وہ نہ دے تو ہم دیں گے تو یہ جائز ہوگا۔[1]

مسئلہ: دائن اپنا دین نہ کسی کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے نہ کسی کو عوض میں دے سکتا ہے۔[2]

مسئلہ: زید و عمر دونوں کے مشترکہ قرض مختلف لوگوں کے ذمہ ہیں اب دونوں باہم فیصلہ کریں کہ بعض لوگوں سے قرضہ تم وصول کروگے وہ تمہارا ہے، بعض سے میں وصول کروں گا وہ میرا ہے، یہ تقسیم کو قبول کرنا لازم نہیں اور ایک کے قرض سے دوسرے کا حق ساقط نہ ہوگا بلکہ جتنا وصول ہوگا اس میں دوسرے کا بھی آدھا حق ہوگا، ہاں دونوں اس پر راضی ہیں جس کو جتنا وصول ہو جائے وہ لے لے، تو صحیح ہے۔[3]

البتہ کوئی مجبوری کی حالت پیش آئی جیسے زید اور عمر دونوں کے مشترکہ قرض مختلف شہروں میں رہنے والے لوگوں کے پاس ہیں، اب زید نے عرب جانے کا ارادہ کیا اور وہاں کا قرض اپنے ذمہ لے لیا اور عمر کو یہاں قرض دیدیا، یا یہ صورت پیش آئی کہ ایک کو دوسرے پر اطمینان نہ رہا یا راستہ پر امن نہیں یا کوئی اور

---

[1] بيع الدين قبل قبضه فاسد كالمسلم فيه ورأس المال ولو بعد الإقالة وبيع شيء بالدين الذي على فلان بخلاف ما إذا كان على البائع.(الفتاوى الهندية ،كتاب البيوع، الباب الاول، ج٣ ص ٣).
وكذا في البحر الرائق (كتاب البيوع، ج٥ص ٢٨٢).
وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية (كتاب القسمة، ج٢ ص ١٧٩).

[2] أيضا.

[3] كل دين وجب للاثنين على واحد بسبب واحد حقيقة وحكما كان الدين مشتركا بينهما، فإذا قبض شيئا منه كان للآخر أن يشاركه في المقبوض. (الفتاوى الهندية، كتاب الشركة، الباب السادس، ج٢ ص ٣٣٦).
رجلان لهما دين مشترك على رجل فأخذ أحدهما حصته من المديون كان لشريكه أن يشاركه فيما قبض.(مجمع الضمانات ،باب في مسائل الشركة، الفصل الاول، ج١ ص٢٨٦).

ضرورت تقسیم کی پیش آگئی تو ایسی صورت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول قابلِ عمل ہے جیسا بخاری شریف میں "کتاب الحوالۃ" کے شروع میں ہے کہ آپ میراث کی تقسیم میں دین کو تقسیم فرمادیتے تھے کیونکہ ان کو غیر منقسم چھوڑدینے میں حرج عظیم ہے۔[1]

مسئلہ : مدیون کو دین کامالک بنانا جائز ہے۔[2]

مسئلہ : زید نے اپنے مقروض عمر سے کچھ سامان خریدااور ثمن کو دین کے عوض میں کٹوادیایادین ہزاراور ثمن پانچ سو، پھر کہاکہ وہ ہزار پانچ سو کے عوض ہوگیایہ بھی جائز ہے۔[3]

مسئلہ : زید کے ذمہ عمر کی ایک من کھجور ہے جو ہندوستان میں ادا کرنالازم تھاپھر دونوں عرب چلے گئے، وہاں عمر نے کھجور کامطالبہ کیا،زید عرب کی قیمت کے اعتبار سے ادا کرے گا چاہے قیمت زیادہ ہو یاکم۔(شامی)[1]

---

[1] قال ابن عباس:يتخارج الشريكان، وأهل الميراث، فيأخذ هذا عينا وهذا دينا، فإن توي لأحدهما لم يرجع على صاحبه.(صحيح البخاري،كتاب الحوالات،باب الحوالة).

وكذا في مصنف ابن أبي شيبة (كتاب البيوع،رقم الحديث: ٢٣٣٧٣،ج٥ ص ٢٦).

واختلف العلماء فيه، فقال الحسن البصري: إذا اقتسم الشريكان الغرماء فأخذ هذا بعضهم وهذا بعضهم، فتوى نصيب أحدهما وخرج نصيب آخر، قال: إذا أبرأه منه فهو جائز، وقال النخعي: ليس بشيء وما توى أو خرج فهو بينهما نصفان، وهو قول مالك والشافعي والكوفيين. (عمدة القاري ،كتاب الصلح، باب الصلح بين الغرماء وأصحاب الميراث،ج ١٣ص ٢٨٨).

[2] ولو باع هذا الدين ممن عليه الدين جاز بأن اشترى منه شيئا بعينه بدينه الذي له في ذمته. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط الصحة،ج٥ ص ١٨٢).

هبة الدين ممن عليه الدين جائزة قياسا واستحسانا. (الفتاوى الهندية ،كتاب الهبة، الباب الرابع في هبة الدين ممن عليه الدين ج٤ص ٣٨٤).

[3] قال: ومن كان له على آخر عشرة دراهم فباعه الذي عليه العشرة دينارا بعشرة دراهم ودفع الدينار وتقاصا العشرة بالعشرة فهو جائز.(الهداية، كتاب الصرف،ج٣ ص ٨٣).

وإذا اشترى من آخر ألف درهم بمائة دينار ونقد مشتري الدراهم الدينار ولم ينقد بائع الدراهِمِ الدراهمَ وقد كان لبائع الدراهم على مشتري الدراهم ألف درهم دين قبل عقد الصرف، فقال بائع الدراهم لمشتري الدراهم: اجعل الألف التي وجب لك علي بعقد الصرف بالألف التي لي عليك ورضي به المشتري جاز، وهذا استحسان. (المحيط البرهاني ،كتاب البيع، الفصل السادس،ج٦ص ٣٢٧).

مسئلہ: تعلیقِ دین جائز ہے مثلاً زید نے اپنے مقروض عمر سے کہا کہ اگر آج قرض واپس کردوگے تو آدھے سے بری کردوں گا یا یہ کہا کہ آدھا آج دیدو، باقی کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے یہ بھی صحیح ہے۔(الجامع الصغیر)[2]

مسئلہ: فلوس یا روپے قرض تھے یا دین، بعد میں رواج بند ہوگیا(یعنی لوگوں نے ان پیسوں سے لین دین کرنا چھوڑدیا) قیمت پہلے سے کم ہوگئی، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بعینہ وہ فلوس یا روپیہ دئے جائیں گے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس دن قبضہ کیا تھا اس دن بازار میں جو قیمت تھی وہی دی جائے گی، امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخری دن جس دن بند ہوا ہے اس دن کی قیمت معتبر ہوگی اور اسی پر فتویٰ ہے۔(شامی)[1]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جتنا کھجور لیا تھا اتنا ہی واپس کرے گا کیونکہ قرض میں کسی چیز کی قیمت سے قطع نظر کرکے اس کا مثل صوری واپس کرنا ضروری ہے، اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ قرض دار کو خواہ مخواہ عرب کے موجودہ قیمت میں دینے پر مجبور بھی کیا جاسکتا ہے، کیونکہ کھجور کے بجائے قیمت دینا مستقل معاملہ ہے جو فریقین کی رضامندی سے ہی انجام پاسکتا ہے۔

لو أقرضه طعاما بشرط رده في مكان آخر كان عليه مثل ما قبض. (الدر المختار ،باب المرابحة والتولية، فصل في القرض، ج٥ص ١٦٥).وكذا في الدرر الحكام (خاتمة في أحكام القرض، ج٣ ص ٨٣.

[2] تعلیقِ دین کی پہلی صورت(کچھ قرض سے بری کرنے کی شرط)کا شرعاً اعتبار نہیں کیونکہ براءت تملیکات میں سے ہے جس میں تعلیق درست نہیں، لہٰذا اگر شرط پایا بھی جائے کہ مثلاً اسی دن مقروض آدھا قرض واپس کرے تو بھی باقی ماندہ حصہ معاف ہوگا، البتہ تعلیقِ دین کی جو دوسری مثال حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے یعنی باقی ماندہ قرض کے لئے مہلت دینا، یہ بالکل درست ہے، قرض وصول کرنا مقرض کا حق ہے وہ چاہے تو کچھ مدت کے لئے اس کو موخر بھی کرسکتا ہے۔

رجل له على آخر ألف درهم قال إذا جاء غد فهي لك أو أنت منها بريء أو قال إذا أديت إلى نصفها أو أنت بريء من نصفها فهو باطل. الجامع الصغير ،كتاب الهبة،ص: ٤٣٧.

وإذا كان لرجل على رجل ألف درهم حالة فقال له: متى ما أديت إلي منها خمسمائة فأنت بريء مما بقي، فأدى إليه خمسمائة وأبى أن يبرئه الطالب فإن أبا حنيفة قال فى ذلك: لا يكون هذا براءة، لأن هذا مخاطرة. وكذلك إذا قال: إن دفعت إلي خمسمائة درهم فأنت بريء مما بقى، فأدى خمسمائة وأبى الطالب أن يفي بذلك فإن أبا حنيفة قال: له ذلك، ولا يبرأ مما بقي. الأصل للشيباني ،باب الصلح في الرهون، ج١١ص ١٤٠.

ومن له على آخر ألف درهم، فقال إذا جاء غد فهي لك أو أنت بريء منها وإذا أديت إلي النصف فأنت بريء من النصف الباقي فهذا كله باطل؛ لأن الإبراء تمليك والتعليق بالشرط يختص بالإسقاطات المحضة كالطلاق والعتاق فلا يتعداها. الجوهرة النيرة ،كتاب الهبة، ج١ص ٣٣٢.

مسئلہ : میت کے ترکہ میں تجہیز و تکفین کے بعد دین کی ادائیگی تمام حقوق پر مقدم ہے، البتہ دین صحیح دین غیر صحیح پر مقدم ہے۔[2]

مسئلہ : ایسا دین جو عین کے ساتھ متعلق ہو، وہ تجہیز و تکفین پر بھی مقدم ہے جیسے زر رہن، یا پیشگی کرایہ وغیرہ۔[3]

مسئلہ : اگر قرضہ ترکہ سے زیادہ ہے، اب جو مال میت کی ملک ہے اس کو سب قرض خواہوں میں بقدر حصہ تقسیم کیا جائے گا جس کا جتنا فیصد قرضہ ہے اتنا فیصد ترکہ میں اس کو دیدیا جائے گا، اگر مرحوم کے ترکہ میں کچھ نہ ہو تو قرض خواہوں کو کچھ نہیں ملے گا، کل دین یا مابقیہ دین آخرت کے حساب میں ہوگا، دنیا میں مطالبہ کا حق نہیں، اگر ترکہ زیادہ ہے اور قرض کم ہے تو ترکہ میں سے قرض کی ادائیگی کے بعد وصیت نافذ کی جائے گی، اس کے بعد اگر مال بچے تو ورثہ میں شریعت کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔[4]

مسئلہ : اگر میت مفلس مقروض ہونے کی حالت میں مرا، تو اگر ورثہ اس کا قرضہ ادا کردے تو اللہ تعالیٰ کی

---

[1] (استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي فكسدت فعليه مثلها كاسدة) و (لا) يغرم (قيمتها) وكذا كل ما يكال ويوزن لما مر أنه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ..جعله في البزازية وغيرها قول الإمام وعند الثاني عليه قيمتها يوم القبض وعند الثالث قيمتها في آخر يوم رواجها وعليه الفتوى. (الدر المختار ،باب المرابحة والتولية، فصل في القرض،ج٥ص ١٦٢).

وكذا في الهداية (كتاب الصرف، ج٣ص٨٥).

[2] دین صحیح سے بظاہر دین صحت اور دین غیر صحیح سے دین غیر صحت یعنی دین مرض مراد ہے اور دین صحت بھی تبھی دین مرض پر مقدم کیا جائے گا جبکہ دین مرض صرف مریض کے اقرار سے ثابت ہو ورنہ اگر گواہوں کے ذریعے اس کا ثبوت ہو جائے تو پھر دین صحت اور دین مرض دونوں کا حکم یکساں ہے، ایک دوسرے پر مقدم نہیں ہوگا بلکہ سب مساوی ہوں گے۔

دين الصحة مقدم على دين المرض الثابت بإقراره أما إذا ثبت بالبينة أو بمشاهدة القاضي فهما سواء.(تحفة الفقهاء كتاب الاقرار، ج٣ص ٢٠٢)

وإن كان البعض دين الصحة والبعض دين المرض يقدم دين الصحة إذا كان دين المرض ثبت بإقرار المريض، وأما ما ثبت بالبينة أو بالمعاينة فهو ودين الصحة سواء.(الفتاوى الهندية ،كتاب الفرائض، الباب الاول، ج٦ص ٤٤٧)

[3] (يبدأ من تركة الميت) الخالية عن تعلق حق الغير بعينها كالرهن والعبد الجاني والمشتري قبل القبض فإن صاحبه يقدم على التجهيز كما في حال حياته، وإن لم يكن يبدأ (بتجهيزه ودفنه.(مجمع الأنهر ،كتاب الفرائض، ج٢ص٧٤٦).

وكذا في الدر المختار (كتاب الفرائض، ج٦ص ٧٥٩).

[4] . (ثم تقضى ديونه) من جميع ماله الباقي بعد التجهيز والدفن (مجمع الأنهر ،كتاب الفرائض، ج٢ص٧٤٦).

ذات سے امید ہے کہ اس میت کو بری کردے گا۔

مال حرام سے قرض ادا کرنے کا حکم

مسئلہ: کسی قرض یا عوض سے ذمہ کو فارغ کرنے کے لئے مال حلال شرط نہیں، یعنی اگر زید بکر کا قرض دار ہے اور زید نے خبیث مال قرض میں دیدیا تو زید قرض سے بری الذمہ ہو جائے گا مگر ایسا کرنے سے زید گناہگار ہوگا، اور اگر بکر کو معلوم ہو جائے کہ زید نے حرام مال سے قرض ادا کیا ہے تو اس کے لئے لینا جائز نہیں۔[1]

مسئلہ: زید بکر کا حق مال حرام سے ادا کرتا ہے تو معلوم ہونے کی صورت میں بکر کو نہ لینے کا اختیار ہے اگر لے چکا ہے اور بعینہ موجود ہے تو واپس کردے کیونکہ کسی شخص کو معصیت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور حرام مال قبول کرنا معصیت میں داخل ہے۔[2]

کافر سے مال حرام لینے کا حکم

کافر کے پاس جو حرام مال ہو وہ کافر سے کسی معاوضہ میں لینا جائز ہے جیسے کافر کے پاس شراب کی رقم ہے اور ایسا مال حرام جو اس کافر کے دین میں مال حرام ہو یا جس مال میں ملک ہی ثابت نہ ہو، اس کو کافر سے کسی چیز کے عوض میں لینا جائز نہیں، جیسے زنا کی اجرت، چوری اور ڈکیتی کا مال۔[3]

مسئلہ: زید نے عمر سے دس اشرفیاں بطور قرض لیں، اس کے بعد عمر سے کہا کہ دس اشرفیاں دوسو درہم

---

[1] إذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذي عليه الدين خمرا، وأخذ ثمنها، وقضى به الدين لا يحل للدائن أن يأخذ ثمن الخمر بدينه. (تبيين الحقائق ،كتاب الكراهية، فصل في البيع، ج ٦ ص٢٧).

لمسلم دين على مسلم فباع الذي عليه دين خمرا وأخذ ثمنها وقضى به الدين لا يحل للدائن أن يأخذ ثمن الخمر بدينه. (مجمع الأنهر ،كتاب الكراهية، فصل في البيع، ج٢ص ٥٤٨).

[2] انظرْ الحاشية المتقدّمة.

[3] (وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر) لصحة بيعه (بخلاف) دين على (المسلم) لبطلانه.(الدر المختار ،كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، ج٦ص ٣٨٥).

(وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر بخلاف المسلم) يعني إذا كان دين المسلم على كافر فباع المديون خمرا وأخذ ثمنها جاز للمسلم أخذه لدينه، وإن كان البائع المديون مسلما لم يجز أخذه؛ لأن بيعه باطل فالثمن حرام. (درر الحكام ،كتاب الكراهية والاستحسان، ج١ص ٣١٨).

میں میرے ہاتھ فروخت کر، دو سو درہم دئے، اب دس اشرفیاں جو قرض کے تھے انہی کا حساب کر لیا اس طرح یہ معاوضہ صحیح ہو گیا اور زید کا قرض ادا ہو گیا، برابر ہے وہ دس اشرفیاں دو سو کی ہوں، یا کم زیادہ کی ہوں، لیکن اگر یہ کہیں کہ وہ دس اشرفیاں جو میرے ذمہ ہیں دو سو کی خریدیں، یہ جائز نہیں۔(شرح وقایہ)[1]

فائدہ: ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ زید کہے کہ دو سو درہم لے لے اور مجھے قرض سے بری کر دے اور عمر نے قبول کر لیا تو تعلیق براءت کی شرط کے ساتھ جائز ہے اس بارے میں زید پر کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا۔[2]

---

[1] و(اي يجوز)(بيع) من عليه عشرة دراهم ممن هي له دينارا بها مطلقة ان دفع الدينار وتقاصا العشرة بالعشرة...امّا اذا باعه بالعشرة التي له على عمرو صحّ ويقع المقاصّة بنفس العقد.(شرح الوقاية، كتاب الصرف،ص٩٠).

(و) صح (بيع من عليه عشرة دراهم) دين (ممن هي له) أي من دائنه فصح بيعه منه (دينارا بها) اتفاقا، وتقع المقاصة بنفس العقد إذ لا ربا في دين سقط (أو) بيعه (بعشرة مطلقة) عن التقييد بدين عليه (إن دفع) البائع (الدينار) للمشتري (وتقاصا العشرة) الثمن (بالعشرة) الدين أيضا استحسانا. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،باب الصرف،مطلب في حكم بيع فضة بفضة قليلة مع شيء آخر لإسقاط الربا،ج٥ص٢٦٥).

(و) صح بالإجماع (بيع دينار بعشرة هي) أي العشرة (عليه) وتقع المقاصة بنفس العقد لأن الدين لم يجب بعقد بل كان ثابتا قبله وسقط بإضافة العقد إليه ولا ربا في دين سقط (أو بعشرة مطلقة) أي صح استحسانا عندنا إن باع الدينار ممن عليه عشرة دراهم، ولكن لم يضف العقد إلى ما في ذمته بل إلى عشرة مطلقة غير مقيدة بكونها عليه (إن دفع الدينار. (مجمع الأنهر ،كتاب الصرف، ج٢ص ١١٩)

ان عبارت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ دونوں صورتوں جائز ہیں۔

[2] **اگر باہمی رضامندی سے دس اشرفیوں کے بدلے دو سو روپے دیکر صلح کیا تو یہ شرعاً جائز ہے، تاہم براءت کو اگر کسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے کہ مثلاً اگر فلاں کام ہو جائے یا آپ نے ایسا کیا تو بری ہوں گے، تو وہ براءت مفید نہیں ہو گی اور مخاطب اگر متعلقہ کام کرے بھی تو بھی بری نہیں ہو گا، کیونکہ براءت میں تملیک کا پہلو موجود ہوتا ہے اور تملیک کو معلق کرنا درست نہیں۔**

تعليق البراءة بالشرط لا يجوز لأنه تمليك من وجه حتى يرتد بالرد. (تحفة الفقهاء ،كتاب الصلح، باب اخر من الصلح،ج٣ص ٢٥٩)

ولو قال: إن أديت إلي خمسمائة فأنت بريء من الباقي، أو قال: متى أديت فأد إليه خمسمائة لا يبرأ عن الخمسمائة الباقية حتى يبرئه، وكذلك إذا قال لمكاتبه ذلك فأدى خمسمائة لا يبرأ عن الباقي حتى يبرئه؛ لأن هذا تعليق البراءة بالشرط، وأنه باطل بخلاف ما إذا كان بلفظ الصلح أو الحط أو الأمر؛ لأن ذلك ليس تعليق البراءة بالشرط على ما مر. (بدائع الصنائع ،كتاب الصلح، ج٦ص ٤٥)

رہن (گروی رکھنے) کے احکام

رہن چونکہ قرض کے متعلق ہی ہے اس لئے اس کا ذکر مناسب ہے رہن قرض وصول کرنے کا ایک وثیقہ ہے، یعنی وہ چیز ہے جو حق دار کو اطمینان دلانے کے لئے اس کے قبضے میں دیدی جائے۔[1]

اصطلاحات:

راہن: مقروض (رہن رکھوانے والا)۔

مرتہن: دائن (جس کے پاس رہن رکھوائی جائے)

مرہون: یعنی وہ مال جو بطور وثیقہ ودین رکھوادیا جائے۔

رہن کے جواز کی شرائط

ا۔ شئی مرہون مرتہن کے قبضہ میں دینا اگر مرتہن کو مکمل قبضہ نہ دیا جائے یا اس پر قبضہ ممکن نہ ہو تو وہ رہن نہیں ہوسکتی، جیسے پھل درخت کے بغیر، یا درخت کھیتی[2] کے بغیر، عمارت زمین کے بغیر، یا زمین اس زمین وعمارت کے بغیر جو اس پر ہے یا کسی چیز کا آدھا، چوتھائی وغیرہ، اس لئے ان میں قبضہ مشترک ہوتا ہے۔[3]

۲۔ ایسی چیزوں رہن رکھنا جائز نہیں جن کو بیچنا جائز نہیں، جیسے حمل، شراب، خنزیر، وغیرہ۔[1]

---

[1] اصل فقہی تعریف یہ ہے:

(حبس شيء مالي) أي جعله محبوسا لأن الحابس هو المرتهن بحق يمكن استيفاؤه) أي أخذه (منه).(الدر المختار ،كتاب الرهن، ج٦ص ٤٧٧).

الرهن حبس مال محبوس وتوقيفه مقابل حق يمكن استيفاؤه منه.(مجلة الأحكام العدلية ،كتاب الرهن،المقدمة:ص١٣٣).

الرهن..في الشرع: حبس الشيء بحقٍّ يمكن أخذه منه، كالدَّيْن.(التعريفات ،باب الراء،ص ١١٣).

[2] لفظِ "کھیت" مناسب ہے۔

[3] وامّا شرائط جوازه فمنها القبض...ومنها دوام القبض بأن يكون محوزا في يده لأن مقصود الرهن هو الاستيثاق وذلك لا يحصل إلا بهذا، ومنها أن يكون منفصلا عن غيره غير متعلق بما لم يقع عليه عقد الرهن وعلى هذا قلنا إن رهن المشاع لا يصح.(تحفة الفقهاء ،كتاب الرهن، ج٣ص ٣٧).

وكذ في الهداية (كتاب الرهن، ج٤ص ٤١٢).

وكذا في بدائع الصنائع (كتاب الرهن، شرائط ركن الرهن، ج٦ص ١٤٢).

۳۔ایک مرتبہ رہن رکھوانے کے بعد جب تک اس کو چھڑوانہ لے اس کو دوبارہ رہن رکھوانا جائز نہیں، نہ راہن کے لئے نہ مرتہن کے لئے، اگر دونوں راضی ہوجائیں تو رہن اول باطل اور رہن دوم ثابت ہوجائے گا(شامی)۔[2]

۴۔جو حق خود متردد ہو اور مضمون منفرد ہو، اس کے عوض رکھوانا جائز نہیں ہے۔

حق متردد: کا مطلب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اگر ہمارے ذمہ تمہارا کوئی حق ثابت ہو تو یہ اس کے عوض میں رہن ہے۔[3]

مضمون بنفسہ: وہ شیٔ جو بعینہ واجب الاداء ہو اور اگر ضائع ہوجائے تو قیمت دینی پڑے جیسے امانت،(ہاں اگر یوں کہا جائے کہ مبیع نہ ملنے کی صورت میں اس کا ثمن ادا کردوں گا یا امانت کی قیمت ادا کردوں گا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں) یا کچھ دینا نہ دینا پڑے جیسے مبیع ہلاک ہونے کی صورت میں بیع فسخ اور ثمن متردد ہوجاتا ہے۔[4]

---

[1] وأما ما يرجع إلى المرهون فأنواع منها: أن يكون محلا قابلا للبيع..ولا رهن الخمر والخنزير من مسلم سواء كان العاقدان مسلمين أو أحدهما مسلما لانعدام مالية الخمر والخنزير في حق المسلم وهذا؛ لأن الرهن إيفاء الدين والارتهان استيفاؤه.(الفتاوى الهندية ،كتاب الرهن، الفصل الاول،ج٥ص ٤٣٢).

وكذا في بدائع الصنائع (كتاب الرهن، شرائط المرهون،ج٦ص١٣٥).

[2] في الدر المختار: رهن الرهن باطل. وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله رهن الرهن باطل) أي إذا رهنه الراهن أو المرتهن بلا إذن، فلو بإذن صح الثاني وبطل الأول.(كتاب الرهن،فصل في مسائل متفرقة،ج ٦ص ٥٢٦).

وكذا في مجلة الأحكام العدلية (رقم المادة ٧٤٤و٧٤٥،ص:١٤٠).

[3] أن الرهن إنما يصح بدين واجب أو بدين وجد سبب وجوبه كالرهن بالأجر قبل وجوبه أما الرهن بدين لا يجب، ولم يوجد سبب وجوبه كالرهن بالدرك لا يصح. (الفتاوى الهندية ،كتاب الرهن،الفصل الثالث،ج٥ص ٤٣٤).

اشترط الحنفية في صيغة الرهن ألا يكون معلقاً بشرط، ولا مضافاً إلى زمن مستقبل؛ لأن عقد الرهن يشبه عقد البيع من ناحية كونه سبيلاً إلى إيفاء الدين واستيفائه، فلا يقبل التعليق بشرط، والإضافة للمستقبل، وإذا علق الرهن أو أضيف، كان فاسداً كالبيع.(الفقه الإسلامي وأدلته ، كتاب الرهن،المطلب الثاني . شروط الصيغة،ج٦ص ٤٢١٨).

[4] "وكذلك لا يصح بالأعيان المضمونة بغيرها كالمبيع في يد البائع"؛ لأن الضمان ليس بواجب، فإنه إذا هلك العين لم يضمن البائع شيئا لكنه يسقط الثمن وهو حق البائع فلا يصح الرهن فأما الأعيان المضمونة بعينها وهو أن يكون مضمونا بالمثل أو بالقيمة عند هلاكه مثل المغصوب وبدل الخلع والمهر وبدل الصلح عن دم العمد يصح الرهن بها؛ لأن الضمان متقرر.(الهداية ،كتاب الرهن، باب ما يجوز ارتهانه والارتهان به،ج٤ص ٤١٨).

۵۔جب راہن مرتہن کی اجازت سے شئ مرہون پر دوبارہ قبضہ کرے تو رہن باقی نہیں رہے گا مثلاً یوں کہا کہ راہن کے پاس امانت یا بطور عاریت کے دیدیا یا راہن کو ہبہ کرنے یا فروخت کرنے کی اجازت دیدی۔[1]

شئ مرہون سے فائدہ حاصل کرنا

شئ مرہون کا منافع راہن کی مملوک ہے مرتہن کے لئے حرام ہے۔

ا۔اگر مرتہن راہن کی اجازت کے بغیر شئ مرہون سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کرے مثلاً درخت کا پھل کھایا یا مکان میں سکونت اختیار کی یا اس کو کرایہ پر چلایا تو وہ غاصب اور ضامن ہوگا۔[2]

راجع للتّفصيل الاختيار لتعليل المختار، كتاب الرهن، ج٢ص ٦٣.

[1] راہن کے قبضہ کرنے سے ہر حال میں عقد رہن ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر راہن مرتہن کی اجازت سے بطور عاریت قبضہ کرے تو عقد رہن برقرار رہے گا تاہم اگر راہن ہی کے قبضہ میں مرہونہ چیز ہلاک ہوگئی تو مرتہن پر اس کا ضمان لازم نہیں ہوگا کیونکہ ضمان کا تعلق قبض کے ساتھ تھا لیکن ضمان نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقد رہن ہی ختم ہوگیا، عقد رہن اور ضمان رہن دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور اگر راہن مرہونہ چیز پر قبضہ کرکے اس کو فروخت کرے یا اجارہ پر دیدے اور مرتہن کی طرف سے راہن کو اس کی اجازت بھی حاصل ہو تو اس صورت میں عقد رہن بھی ختم ہوجائے گا۔

ولو أعار المرتهن الرهن من الراهن أو آجره أو أودعه كان للمرتهن أن يسترده والإجارة باطلة...فإن أذن المرتهن للراهن أن يزرع الأرض المرهونة بإذن المرتهن لا يبطل الرهن.وله أن يسترد الرهن فيعود رهنا ومادام في يد الراهن لا يكون في ضمان المرتهن.(فتاوى قاضيخان ،كتاب الرهن،فصل في الانتفاع في الرهن ،ج٣ص ٣٧٩).

فإن أعار المرتهن الرهن من الراهن أو الراهن من المرتهن فإنه يجوز ويخرج الرهن من ضمان المرتهن وعقد الرهن على حاله ولكل واحد منهما أن يبطل العارية ويرده إلى الرهن لأن العارية غير لازمة.(تحفة الفقهاء ،كتاب الرهن،ج٣ص ٤٢).

زرعها الراهن أو غرسها بإذن المرتهن ينبغي أن تبقى رهنا ولا يبطل الرهن فتنبه.(الدر المختار ،كتاب الرهن، فصل في مسائل متفرقة، ج٦ص ٥٢٣).

ولو أذن المرتهن للراهن أن يزرع الأرض المرهونة فزرع أو يسكن الدار المرهونة بإذن المرتهن لا يبطل الرهن وله أن يسترد الرهن فيعود رهنا، وما دام في يد الراهن لا يكون في ضمان المرتهن.(مجمع الضمانات ،باب مسائل الرهن، الفصل الثالث،ج١ص ١٠٤).

لاحظ لمزيد من التفصيل "بدائع الصنائع" (كتاب الرهن،شرائط كون المرهون مضمونا عند الهلاك ،ج٦ص ١٥٦).

[2] وليس للمرتهن أن ينتفع بالرهن لا باستخدام، ولا بسكنى ولا لبس، إلا أن يأذن له المالك"؛ لأن له حق الحبس دون الانتفاع.(الهداية ،كتاب الرهن،ج٤ص ٤١٥).

(وليس له أن ينتفع بالرهن) لأنه غير مأذون له في ذلك، وإنما له ولاية الحبس لا غير. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الرهن، ج٢ص٦٦)

۲۔اگر نفع اٹھانے کی راہن کی طرف سے اجازت ہو تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ رہن عقد میں مشروط یا عرفاً داخل ہے تو وہ عین سود ہے یا سود کے مشابہ ہے اور اگر نہ مشروط ہو نہ عرفاً داخل ہو، نفع اٹھانا جائز ہو گا، لیکن اس اجازت سے عقد رہن کا کچھ تعلق نہ ہو گا، مثال کے طور پر زید نے عمر کو اپنا مکان بطور عاریت دیا پھر اسی کے پاس وہ رکھوایا یا رہن رکھنے کے بعد عاریت پر دیا، تو اس کو ہر وقت اختیار ہے، عاریت کے حکم کے مطابق اپنی اجازت واپس لے لے، یعنی وہ منافع جو جائز کر دئے اس کو ناجائز کر دے مگر اس کی وجہ سے عقد رہن پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، بلکہ مرہون بدستور مرتہن کے قبضہ میں رہے گا اور منافع بھی محبوس ہو گا۔ [1]

مسئلہ: مرہون سے فائدہ اٹھانے کی اجازت قرض کی امید پر، یا قرض دینا شیء مرہون سے نفع حاصل کرنے کی امید پر، دونوں سود ہے، اگر اس کے لئے کوئی حیلہ شرعی نکال لیا تو عند اللہ مؤاخذہ ہو گا، اگر کوئی حیلہ نہیں کیا تو قضاءً بھی ایسا عقد باطل ہو جائے گا" واللہ یَعلم ما في انفسِکم "یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ [2]

مسئلہ: بیع بالوفاء صحیح قول کے مطابق رہن ہے (یعنی رہن بیع کی طرح ہے مشتری کے پاس رہے اور مشتری اس سے کوئی نفع حاصل نہ کرے البتہ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ مدت گزرنے کے بعد خود بخود بیع ہو گی، از سرِ نو ایجاب و قبول کی ضرورت نہ ہو گی، اور یہ معاملہ مرتہن کے حق میں مفید ہے، اگر راہن قرض کی

وليس للمرتهن أن ينتفع بالرهن لا بالاستخدام، ولا بسكنى إلا أن يأذن له المالك .. وليس للمرتهن أن يتصرف بشيء في الرهن غير الإمساك لا يبيع ولا يؤاجر، ولا يعير، ولا يلبس، ولا يستخدم فإن فعل كان متعديا، ولا يبطل الرهن اه. (مجمع الضمانات ،باب مسائل الرهن،الفصل السادس،ص:١٠٩)

[1] واولى الأقوال المذكورة واصحها واوفقها بالروايات الحديثية هو القول الرابع ان ما كان مشروطا يكره وما لم يكن مشروطا لايكره..ثم المشروط اعم من ان يكون مشروطا حقيقة او حكما.(الفلك المشحون فيما يتعلق بانتفاع المرتهن بالمرهون،ص١٢، ضمن مجموعه رسائل اللكهنوي ج٣ص٤١٢).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الرهن،ج٦ص ٤٨٢).

وإذا أذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بالمرهون، جاز مطلقاً عند بعض الحنفية. ومنهم من منعه مطلقاً؛ لأنه ربا أو فيه شبهة الربا، والإذن أو الرضا لا يحل الربا ولا يبيح شبهته. ومنهم من فصل فقال: إن شرط الانتفاع على الراهن في العقد، فهو حرام؛ لأنه ربا، وإن لم يشرط في العقد، فجائز؛ لأنه تبرع من الراهن للمرتهن. والاشتراط كما يكون صريحاً، يكون متعارفاً، والمعروف كالمشروط. وهذا التفصيل هو المتفق مع روح الشريعة.(الفقه الإسلامي وأدلته،كتاب الرهن،انتفاع المرتهن بالمرهون، ج٦ص٤٢٩٠).

[2] ايضا.

ادائیگی میں ٹال مٹول کرے تو خود بخود مالک بن جائے گا۔ [1]

شئ مرہون کے مصارف

مرہون کے مصارف دو قسم کے ہیں:

ا۔ مصارف بقاء: یہ راہن کے ذمہ ہے جیسے مکان کی مرمت، جانور کا دانہ، چارہ، گھوڑے کی خدمت گذاری، باغبان وغیرہ کی تنخواہ، مگر فیصلہ یہ ہے کہ جس مرہون کی حفاظت کے لئے مکان وغیرہ کی ضرورت نہیں جیسے زیورات وغیرہ، وہ مرتہن کے ذمہ ہے اور جس کی حفاظت کے لئے مکان کی ضرورت ہے جیسے گھوڑا یا چھکڑا وغیرہ، تو راہن کے ذمہ ہونا چاہئے [2]۔

۲۔ حفاظت کے مصارف: یہ مرتہن کے ذمہ ہے خود اس کی حفاظت کرے یا اپنے وکیل وغیرہ سے حفاظت کروائے۔

سوال ۸ : ایسے مکان کا کرایہ جس میں شئ مرہون رکھی جائے، مرتہن کے ذمہ ہے مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک راہن ادا کرے گا (ہدایہ) [1]

---

[1] البيع الذي تعارف أهل زماننا احتيالاً للربى وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكه وهو ضامن لما أكل من ثمره وأتلف من شجره ويسقط الدين بهلاكه لو بقي ولا يضمن الزيادة وللبائع استرداده إذا قضى دينه لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام. (جامع الفصولين،الفصل الثامن عشر في بيع الوفاء، ج١ص ١٣٩).

(قوله: قيل هو رهن) قدمنا آنفا عن جواهر الفتاوى أنه الصحيح. قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام.(رد المحتار،كتاب البيوع، باب الصرف، ج٥ص٢٧٦).

قال العبد الضعيف: قد عُقد في المجلة فصل مستقل لاحكام بيع الوفاء (انظر: مجلة الاحكام العدلية، كتاب البيوع ، الباب السابع، الفصل السادس في بيع الوفاء، ص٧٧) وقد فرّع جميع تلك الاحكام على انه رهن، ولذا قال الشارح العلامة الاتاسي رحمه الله: "قد مشت المجلة على انّه رهن"(شرح المجلة، ج٢ص٤١٦).

والصّحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا ثم ينظر إن ذكرا شرط الفسخ في البيع فسد البيع وإن لم يذكرا ذلك في البيع وتلفظا بلفظة البيع بشرط الوفاء أو تلفظا بالبيع الجائز وعندهما هذا البيع عبارة عن عقد لا غير لازم فكذلك وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشر ط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد لأنّ المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس.(فتاوى قاضيخان ،كتاب البيوع، فصل في الشروط المفسدة، ج٢ص ٨١).

وراجعْ أيضا فتاوى دار العلوم ديوبند ج١٤ص٣٢٤.و احسن الفتاوى ج٦ص٥٠٧.

[2] بظاہر یہ فرق محل نظر ہے، مرہونہ چیز چونکہ مرتہن کے پاس محبوس رہتی ہے اس لئے حفاظت وغیرہ کا خرچہ بہر حال اس کے ذمہ ہے چاہے اس کے لئے مکان کی ضرورت ہو یا نہیں، اس لئے فقہاء کرام نے ان دونوں قسموں میں کوئی تفریق نہیں فرمائی۔

مسئلہ: جب ایسے منافع راہن مرتہن کو ہبہ کر دے تو مصارف بھی مرتہن کے ذمہ ہو جائیں گے۔[2]

مرہون میں اضافہ ہونے کا حکم

مرہون میں اضافہ کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ جو مرہون کے جزء ہیں یا جز کے بدل، جیسے درخت رہن رکھا اس میں پھل لگ گیا، وہ پھل یا اس کی قیمت یہ اصل راہن کے ساتھ ہی مرتہن کے قبضہ میں محبوس رہیں گے جب تک راہن قرضہ ادا نہ کر دے۔

۲۔ مکاسب و منافع: جیسے مکان مرہون ہے، اس کا کرایہ حاصل ہوا، یہ مکان کے ساتھ محبوس نہیں ہوں گے، البتہ راہن کی اجازت سے دین سے اس کو کٹوایا جا سکتا ہے، یعنی مرتہن کرایہ کو استعمال کر لے اور اتنی مقدار دین سے منہا ہو جائے۔[3]

رہن کے زوائد اگر باقی رہ سکتے ہیں تو مرتہن کے لئے ان میں تصرف کرنا جائز نہیں، اور اگر باقی نہ

---

[1] وكذلك أجرة البيت الذي يحفظ الرهن فيه، وهذا في ظاهر الرواية وعن أبي يوسف أن كراء المأوى على الراهن بمنزلة النفقة؛ لأنه سعى في تبقيته.(الهداية ،كتاب الرهن،ج٤ص ٤١٦).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الرهن، ج٨ص ٢٧٢).

[2] یہ تب ہے جب مرتہن ہی ان منافع کو استعمال کرنے کی پیشکش کرے۔

ونفقة المستعار على المستعير وعلف الدابة المستعارة على المستعير والكسوة على المعير ولو استعار عبدا للخدمة فعليه نفقته، وإن أعاره مولاه فنفقته على المولى.(الجوهرة النيرة ،كتاب العارية،ج١ص ٣٥٢).

ولو استعار رجل من رجل عبدا فطعام العبد يكون على المستعير لأن نفقة المستعار تكون على المستعير.(فتاوى قاضيخان ،كتاب العارية، ج٣ ص ٢٣٦).

وأما ما يحتاج إليه للحفظ كأجرة المسكن وأجرة الحافظ ومأوى البقر والغنم فعلى المرتهن.(تحفة الفقهاء ،كتاب الرهن،ج٣ص ٤٤).

[3] جملة الكلام في زوائد الرهن أنها على ضربين: زيادة غير متولدة من الأصل، ولا في حكم المتولد منه، كالكسب والهبة والصدقة، وزيادة متولدة من الأصل، كالولد والثمر واللبن والصوف، أو في حكم المتولد من الأصل، كالأرش والعقر، ولا خلاف في أن الزيادة الأولى أنها ليست بمرهونة بنفسها، ولا هي بدل المرهونة ولا جزء منه ولا بدل جزء منه، فلا يثبت فيها حكم الرهن، واختلف في الزيادة الثانية قال أصحابنا رحمهم الله: إنها مرهونة. (بدائع الصنائع ،كتاب الرهن، حكم الرهن، ج٦ص ١٥٢)

وزوائد الرهن كولد وثمرة رهن لا غلة دار وأرض وعبد فلا يصير رهنا. (الدر المختار،كتاب الرهن، باب التصرف في الرهن، ج٦ص ٥١٣).

رہ سکیں جیسے بکری کا دودھ، درخت کا پھل، تو اگر راہن نے مرتہن کو فروخت کرنے کی اجازت دی یا فریقین کی رضامندی سے کوئی تیسرا شخص وکیل بن گیا یا قاضی نے مرتہن کو حکم دیا تو مرتہن فروخت کر سکتا ہے، اگر یہ صورتیں نہیں اور مرتہن نے ویسے ہی استعمال کر لیا تو قیمت کا ضامن ہو گا، لیکن راہن کی طرف سے فروخت کرنے کی اجازت کے بارے میں خاموشی ہو اور یہ زوائد ہلاک ہو جائیں تو مرتہن ضامن نہ ہو گا۔[1]

مسئلہ : جلدی خراب ہونے والے چیزوں کو راہن خود فروخت کر سکتا ہے بشرطیکہ مرتہن کی اجازت سے ہو یا رہن میں ایسی اجازت مشروط ہو یا فروخت کر کے ثمن کو مرہون کے ساتھ مرتہن کے قبضہ میں رکھ دیا جائے، اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو خراب ہونے والی چیزیں بھی فریقین کی رضامندی کے بغیر فروخت نہیں ہو سکتیں بلکہ مرہون کے ساتھ محبوس رہیں گی۔[2]

مسئلہ : یہی حکم ہے جب مرہون ہلاک ہو رہا ہو مثلاً مرہون بکری مر رہی ہے، اگر مرتہن نے بدون اجازت ذبح کر لی تو قیمت کا ضامن ہو گا اور ذبح کے بعد اس کا گوشت فروخت کر کے قیمت اور کھال بعینہ رہن رہے گی۔[3]

---

[1] إذا حلب الغنم والإبل لا ضمان عليه استحسانا..إذا رهن من آخر شاة تساوي عشرة بعشرة، وأذن الراهن للمرتهن أن يحلب لبنها، ويشرب منها ففعل المرتهن ذلك لا ضمان عليه.(الفتاوى الهندية ،كتاب الرهن، الباب الثامن،ج٥ص ٤٦٨).

(المادة ٧٥٩) إذا خيف من فساد الرهن فللمرتهن أن يبيعه بإذن الحاكم. ويبقى الثمن رهنا في يده. وإذا باعه بدون إذن الحاكم يكون ضامنا. كذلك إذا أدركت ثمار وخضرة الكرم والبستان المرهون وخيف من هلاكها فليس للمرتهن بيعها إلا بإذن الحاكم وإذا باعها بدون إذن الحاكم كان ضامنا. (المادة ٧٦٠) إذا حل وقت أداء الدين ووكل الراهن المرتهن أو العدل أو أحدا غيرهما لأجل بيع الرهن صح ذلك. (مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة ٧٥٩و٧٦٠،ص: ١٤٣).

ولو أذن الراهن للمرتهن في أكل زوائد الرهن بأن قال مهما زاد فكله فلا ضمان عليه ولا يسقط شيء من الرهن؛ لأنه أتلفه بإذن الراهن. (البحر الرائق ،كتاب الرهن، المتفرقات، ج٨ص٣٢٢).

[2] توقف بيع الراهن الرهن على إجازة المرتهن فإن أجاز جاز، وصار ثمنه رهنا كما في الهداية. (مجمع الضمانات ،باب مسائل الرهن، الفصل السادس، ج١ص١٠٨).

ليس لأحد من الراهن والمرتهن بيع الرهن بدون رضى صاحبه. (مجلة الأحكام العدلية،رقم المادة ٧٥٦، ص:١٤٢).

[3] ولو كانت شاة، أو بقرة فذبحها، وهو يخاف الهلاك يضمن قياسا واستحسانا.(الفتاوى الهندية ،كتاب الرهن، الباب الثامن، ج٥ص ٤٦٨).

مرہون کا انتظام

کوئی ایسی چیز رہن رکھی جائے جو نفع حاصل کرنے کے واسطے بنائی گئی ہو جیسے کرایہ پر چلنے والے مکان، باغ، کھیتی یا دودھ دینے والے جانور۔ان کا انتظام یعنی مکان کو کرایہ پر دینا، زمین میں کھیتی کرنا، باغ کی نگہبانی کرنا، جانوروں سے دودھ نکالنا اوراس کو فروخت کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب کام فریقین کی رضامندی سے ہونا چاہئے یا کوئی نمائندہ پہلے سے مقرر ہو چکا ہو، وہ کرے، ورنہ راہن خود اس طرح تصرف کر سکتا ہے کہ مرتہن کے قبضہ میں کوئی نقصان نہ آئے،اگر راہن کی طرف سے یہ انتظام نہ ہو تو اس کا انتظام مرتہن کے ذمہ ہوگا کیونکہ یہ بھی مرہون کی حفاظت کے متعلق ذمہ داری ہے لیکن اس حفاظت و بندوبست کے مصارف کم ہو یا زیادہ، وہ راہن کے ذمہ ہوں گے،اگر مرتہن نے راہن کی اجازت سے خرچہ کیا یا اس کے وکیل کی اجازت سے، یا قاضی کے حکم سے، تو مصارف کا اندازہ لگایا جائے گا اور اگر خرچہ کرنے کی نہ راہن کی اجازت نہ قاضی کا حکم، بلکہ مرتہن نے از خود خرچہ کیا تو اس کی طرف سے تبرع سمجھا جائے گا، راہن سے طلب کرنے کا حق نہیں،اس کی مرضی ہے دے یا نہ دے۔[1]

مرہون میں تصرف کرنا

مسئلہ: راہن مرہون میں ہر وہ تصرف کر سکتا ہے جس سے مرتہن کی حق تلفی نہ ہو، مثلاً مرہون کو فروخت کرنا، کسی کو ہبہ کرنا بھی مرتہن کی اجازت سے جائز ہے،اسی طرح مرتہن کو بطور عاریت دینا بھی جائز ہے۔[2]

ولو كان الرهن شاة أو بقرة يخاف عليها الهلاك فذبحها المرتهن ضمن قياسا، والحاصل أن كل تصرف يزيل العين عن ملك الراهن كالبيع لا يملكه المرتهن، ولو فعله ضمن، وإن فيه حفظ المال عن الفساد إلا إذا كان بأمر الحاكم وكل تصرف لا يزيل العين للمرتهن أن يفعله، وإن بغير أمر القاضي إذا كان فيه حفظ أو تحصين. (مجمع الضمانات ،باب مسائل الرهن، الفصل السادس، ج١ص١٠٩).

[1] ولو انفق المرتهن على الرهن بغير أمر الراهن والحاكم فهو متبرع في ذلك، وان انفق بأمر الحاكم أو بأمر الراهن فيكون دينا على الراهن. (النتف في الفتاوى ،كتاب الرهن، ج٢ص ٦٠٦).

(وكل ما وجب على أحدهما) من الراهن والمرتهن (فأداء الآخر كان متبرعا) ؛ لأنه قضى دين غيره بغير أمره (إلا أن يأمر به القاضي)لأن له ولاية عامة فكأن صاحبه أمره به. (درر الحكام ،كتاب الرهن، باب ما يصح رهنه والرهن به، ج٢ص ٢٥١).

[2] مرّ تخريجه.

مسئلہ : مرتہن مرہون کی حفاظت سے متعلقہ امور کے علاوہ راہن کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔[1]

مسئلہ : عقدرہن ہر ایسے قبضے سے باطل ہو جاتا ہے جو قبضہ ضمان کا موجب ہو جیسے مرتہن نے راہن کو واپس اجارہ پر دیدیا یا اس کے پاس رہن رکھوایا۔

مسئلہ : عقدرہن کو وہ قبضہ باطل نہیں کرتا جو موجب ضمان نہ ہو جیسے مرہون کو عاریت پر دینا، تو راہن مرتہن کو بطور عاریت دے سکتا ہے جب تک مرتہن شئ مرہون کو بطور عاریت استعمال کرتا رہے گا مرتہن امین ہے اس دوران کچھ نقصان ہو جائے تو وہ راہن کے ذمہ ہے مرتہن اس کا ذمہ دار نہ ہو گا، اور جو نقصان حالت استعمال کے علاوہ میں ہو اس کا مرتہن ذمہ دار ہو گا اور دین میں اس کا حساب کیا جائے گا جس کی تفصیل آئندہ آئیگی۔[2] اور اگر مرتہن شئ مرہون کو راہن سے کرایہ پر لے تو رہن باطل ہو جائے گا اور اجارہ ثابت ہو گا، راہن یا مرتہن شئ مرہون کو فروخت کریں یا کسی کے پاس رہن رکھیں یا کرایہ پر دیں، یہ فریقین کی رضامندی سے جائز ہے اور رہن فسخ ہو جائے گا، اس کا معاوضہ راہن کی مملوک ہے اور قرضہ بھی راہن کے ذمہ ہو گا۔[3]

---

[1] ايضا. وفي النتف في الفتاوى "وليس للمرتهن في الرهن الا الحفظ"(كتاب الرهن،ج٢ص ٦٠٦).

[2] ولو أعار المرتهن الرهن من الراهن أو آجره أو أودعه كان للمرتهن أن يسترده والإجارة باطلة...فإن أذن المرتهن للراهن أن يزرع الأرض المرهونة بإذن المرتهن لا يبطل الرهن.وله أن يسترد الرهن فيعود رهنا ومادام في يد الراهن لا يكون في ضمان المرتهن.(فتاوى قاضيخان ،كتاب الرهن،فصل في الانتفاع في الرهن ،ج٣ص ٣٧٩).

فإن أعار المرتهن الرهن من الراهن أو الراهن من المرتهن فإنه يجوز ويخرج الرهن من ضمان المرتهن وعقد الرهن على حاله ولكل واحد منهما أن يبطل العارية ويرده إلى الرهن لأن العارية غير لازمة.(تحفة الفقهاء ،كتاب الرهن،ج٣ص ٤٢).

زرعها الراهن أو غرسها بإذن المرتهن ينبغي أن تبقى رهنا ولا يبطل الرهن فتنبه.(الدر المختار ،كتاب الرهن، فصل في مسائل متفرقة،ج٦ص ٥٢٣).

ولو أذن المرتهن للراهن أن يزرع الأرض المرهونة فزرع أو يسكن الدار المرهونة بإذن المرتهن لا يبطل الرهن وله أن يسترد الرهن فيعود رهنا، وما دام في يد الراهن لا يكون في ضمان المرتهن.(مجمع الضمانات ،باب مسائل الرهن، الفصل الثالث،ج١ص ١٠٤).

لاحِظْ لمزيد من التفصيل "بدائع الصنائع" (كتاب الرهن،شرائط كون المرهون مضمونا عند الهلاك ،ج٦ص ١٥٦).

[3] أما إذا آجره الراهن من المرتهن فيخرج من الرهن ولا يعود أبدا لأن الإجارة عقد لازم فالإقدام عليه يكون فسخا للرهن.(تحفة الفقهاء ،كتاب الرهن،ج٣ص ٤٢).

سوال ۸: اگر راہن خود مرہون کو مرتہن سے بطور عاریت کے لے یا بطور اجارہ، دونوں صورتوں میں رہن باطل اور مرہون پر راہن کا قبضہ ہو گیا[1]، رہن کے زوائد جو کرایہ، پھل، درخت یا بچے وغیرہ کوئی چیز اضافہ ہو جائے وہ راہن کا حق ہے، مرتہن اصل مرہون کی طرح زوائد کی بھی حفاظت کرے گا اور یہ سب اصل رہن سے متعلق ہیں۔[2]

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مرتہن اپنے حق کی حفاظت کے لئے بوقت ضرورت ایسا تصرف کر سکتا ہے جس کی اجازت راہن یا قاضی کی طرف سے نہ ملی ہو جبکہ اس کو اپنا حق ضائع یا ناقص ہونے کا خطرہ ہو مثلاً بکری کا دودھ یا درخت کا پھل، جو باقی نہیں رہ سکتے اس کو فروخت کر دے یا درختوں اور کھیتوں کو پانی پہنچائے، پس ایسا عام تصرف جائز ہے اس پر جو خرچہ آئے، وہ ان کو ملیں گے اجازت ہو یا نہ ہو، فقہاء نے جو فرمایا کہ بدون اجازت راہن یا قاضی کا تصرف ناجائز ہے اور خرچہ تبرع واحسان ہو گا اس کا مطلب یہ ہے کہ بلا اجازت تصرف کی ضرورت نہیں تھی، راہن یا قاضی سے اجازت حاصل کرتے تو شئی مرہون ضائع نہ ہوتی۔[3]

(ولو أعاره) أو أودعه (أحدهما أجنبيا بإذن الآخر سقط ضمانه ولكل منهما أن يعيده رهنا) كما كان (بخلاف الإجارة والبيع والهبة) والرهن (من المرتهن أو من أجنبي إذا باشرها أحدهما بإذن الآخر) حيث يخرج عن الرهن ثم لا يعود إلا بعقد مبتدأ لأنها عقود لازمة، بخلاف العارية. (الدر المختار، كتاب الرهن، باب التصرف في الرهن، ج٦ص ٥١١).

[1] عاریت چونکہ عقد لازم نہیں، اس لئے اس سے عقد رہن باطل نہیں ہو گا البتہ اجارہ سے رہن باطل ہو جائے گا کیونکہ وہ عقد لازم ہے، حوالہ جات کے لئے سابقہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] مرّ حكمُ زوائد الرهن وتخريجُه، فليراجعْ.

[3] فقہاء کرام نے عام حالات میں قاضی یا راہن کی اجازت کے بغیر ان جیسے تصرفات کی اجازت نہیں دی، چنانچہ ذیل کی عبارت میں راہن کو ان جیسے تصرفات کی وجہ سے ضامن ٹھہرایا گیا ہے:

ولو كانتْ شاة، أو بقرة فذبحها، وهو يخاف الهلاك يضمن قياسا واستحسانا.(الفتاوى الهندية ،كتاب الرهن، الباب الثامن، ج٥ص ٤٦٨).

ولو كان الرهن شاة أو بقرة يخاف عليها الهلاك فذبحها المرتهن ضمن قياسا، والحاصل أن كل تصرف يزيل العين عن ملك الراهن كالبيع لا يملكه المرتهن، ولو فعله ضمن، وإن فيه حفظ المال عن الفساد إلا إذا كان بأمر الحاكم وكل تصرف لا يزيل العين للمرتهن أن يفعله، وإن بغير أمر القاضي إذا كان فيه حفظ أو تحصين. (مجمع الضمانات ،باب مسائل الرهن، الفصل السادس، ج١ص١٠٩).

مسئلہ : محاصل رہن اگر دین کی جنس سے ہوں تو دین میں وضع کئے جائیں گے ورنہ اصل مرہون کے ساتھ مرتہن کے قبضہ میں محبوس ہوگا، مثلاً کرایہ کا روپیہ آیا اور اصل قرض بھی روپیہ کی شکل میں تھا تو یہ کرایہ کا روپیہ قرض میں وصول کرے۔[1]

مسئلہ : زید نے عمر سے دس ہزار روپے قرض لے کر مکان بطور رہن رکھا، اس کا سالانہ کرایہ چار ہزار ہے، مرمت میں دو ہزار خرچہ ہوا اس میں قرض تین سال میں اتر جائے گا۔

وکیلِ رہن

یعنی عقد رہن کے وقت کسی تیسرے شخص کو فریقین کی رضامندی سے وکیل بنادیا جائے، اس سے مقصد رہن کے تمام تصرفات انجام دینا ہو جیسے مرہون پر خرچہ کرنا یا مرہون میں جو اضافہ ہو اس کو آگے فروخت کرنا وغیرہ، یا مقصد یہ ہو کہ مدت ختم ہوتے ہی مرہون کو فروخت کر کے دائن کا قرض ادا کرے، دونوں صورتوں میں رہن کا معاملہ ختم ہونے تک عاقدین کی رضامندی کے بغیر یہ وکیل معزول نہ ہوگا۔[2]

وضاحت: ہر وہ رہن جس سے فائدہ حاصل ہوتے ہوں، یا جس مرہون کے پیداوار کو فروخت کرنے کی ضرورت ہو جیسے پھل وغیرہ، اس کو فروخت کر کے قرض خواہ کو قرض ادا کرے تو اس کے لئے کوئی معتبر وکیل بنادینا چاہیئے اور اگر اس کے وکیل کے لئے کوئی اجرت مقرر کردے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔[3]

البتہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے زوائدِ رہن کے درج بالا مسئلہ سے نتیجۃً یہ مسئلہ اخذ فرمایا اور بظاہر ضیاعِ حق کے اندیشہ کے وقت مسئلہ "ظفر بالحق" کے تحت بھی اس کی کسی قدر گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اہلِ علم غور فرمائیں۔

[1] مرّ تخريجُه في مَبحث زوائد الرّهن أيضا.

[2] إذا ارتهن الرجل رهناً فوضعه على يدي عدل وقبضه العدل وقيمته والدين سواء فهو رهن جائز..ولو لم يمت وكان على حاله فدفعه العدل إلى الراهن أو إلى المرتهن كان ضامناً. الأصل ،كتاب الرهن،باب الرهن يوضع على يدي العدل،ج٣ ص١٣٨.

رجل رهن عند إنسان وشرط الراهن والمرتهن في عقد الرهن أن يكون الرهن في يد عدل صح الرهن وقبض العدل يكون بمنزلة قبض المرتهن ولا يكون للمرتهن أن يأخذه من العدل إلا برضا الراهن.(فتاوى قاضيخان،كتاب الرهن،فصل في العدل في باب الرهن،ج٣ص ٣٨٢).

(ولو اتفقا) أي الراهن والمرتهن (على وضع الرهن عند عدل صح) وضعهما (ويتم) الرهن (بقبض العدل)..(وليس لأحدهما) أي للراهن والمرتهن (أخذه) أي أخذ الرهن (منه) من العدل (بلا رضى الآخر). (مجمع الأنهر،كتاب الرهن،باب الرهن يوضع عند عدل،ج٢ص ٦٠٠).

[3] لانّ وظيفةَ العدل حفاظةُ الرهن وهو ممّا يجوز إيرادُ عقد الإجارة عليه.

قسم چہارم اوقاف کے بیان میں

یعنی اصل مملوک ہو اور نفع کا کسی کو مالک بنادیا جائے، اسے وقف کہتے ہیں۔

وقف: یعنی کسی مال کا نفع نفس کو خوش کرنے کے لئے یا رضاء الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے دائمی طور پر کسی شخص یا کام کے لئے مخصوص کر دینا۔[1]

وقف کے احکام

۱۔امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک مال وقف واقف کی ملک میں محبوس ہوتا ہے اور صاحبین کے نزدیک واقف کی ملک سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔[2]

۲۔اصل وقف بالاتفاق محفوظ اور منافع وقف مستحقین کے لئے ہے۔[3]

۳۔وقف تام ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وقف کی نیت کے ساتھ [4] زبان سے ایسے کلمات ادا کئے جائیں جو وقف پر دلالت کرتے ہوں،[5] اگر وقف کرنے والا خود وقف کا متولی ہے تو ضروری ہے کہ بعض منافع مستحقین کے حوالہ کئے جائیں اور اگر متولی وقف کوئی اور ہے تو اسے مال وقف پر قابض بنادے۔

مسئلہ: ہمارے زمانے میں وقف لازم ہونے کے لئے حکام سے تصدیق کروانے کی کوئی ضرورت نہیں۔[1]

---

[1](هو) لغة الحبس. وشرعا (حبس العين على) حكم (ملك الواقف والتصدق بالمنفعة).(الدر المختار ،كتاب الوقف،ج٤ص ٣٣٧). وكذا في التعريفات (باب الواو،ص: ٢٥٣).

[2](قوله حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة) يعني عند أبي حنيفة رضي الله عنه وعندهما هو حبس العين على حكم ملك الله تعالى.(البحر الرائق ،كتاب الوقف،ج٥ ص ٢٠٢).

وكذا في الدر المختار (كتاب الوقف،ج٤ص ٣٣٧).

[3]أما حكمه فما ذكره في تعريفه من أنه حبس العين عن التمليك والتصدق بالمنفعة.البحر الرائق،كتاب الوقف،ج٥ ص٢٠٦

[4] البتہ اگر وقف کا لفظ صریح ہو تو اس میں نیت کی ضرورت نہیں ہے۔

[5](فركنه) لفظ الوقف وما فى معناه كقوله صدقة محرمة أو صدقة محبسه أو صدقة مؤبدة. .(الإسعاف فى أحكام الأوقاف، باب فى ألفاظ الوقف وأهله ومحله وحكم،ص ١٠).

وأما ركنه فالألفاظ الخاصة الدالة عليه وهي ستة وعشرون لفظا.(البحر الرائق ،كتاب الوقف،ج٥ ص ٢٠٥).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الوقف، الباب الاول،ج٢ص ٣٥٢).

وقف کو باطل کروانے والی باتیں

۱۔ایسے کلمات جو وقف کے خلاف معنی پر دلالت کریں، مثلاً کہے کہ یہ گاؤں یا اتنی زمین درویشوں کو دیدیا، یہ مکان مدرسہ کے لئے ہے، یہ وقف نہیں ہے ہبہ اور صدقہ ہے۔[2]

مسئلہ نمبر: وہ تمام جائیدادیں جن کے وقف ناموں میں اسی قسم کی عبارتیں ہوں، ہبہ ہے وقف نہیں۔

۲۔ حرام مصارف کے لئے وقف کرنا، مثلاً بت خانہ کے مصارف کے لئے وقف کرنا، یا تعزیہ داری یا مجالس رقص وغناء کے لئے وقف کرنا، یہ وقف باطل ہے۔(عالمگیری)[3]

مسئلہ نمبر: یہی حکم ہے سانڈ کا کہ نہ وہ وقف کی تعریف میں داخل ہے نہ ہی مالک کی ملک سے خارج ہے(سانڈ یعنی وہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا ہے)

۳۔مال وقف کا غیر متقوم یا ممنوع الاستعمال ہونا، جیسے نکمی بے کار چیزیں، شراب، خنزیر یا تصاویر وغیرہ۔[4]

۴۔ غیر مملوک یا غیر کے حق کو وقف کرنا جیسے غصب شدہ زمین یا وہ زمین جس میں حق شفعہ یا حق مرتہن وغیرہ باقی ہو۔[5]

---

[1] لانّ المفتي به هو قول الصاحبين مِن انّه لايحتاج في لزوم الوقف الى القضاء.

يقول الشّيخ العلاّمة قاسم رحمه الله: إنّ الفتوى في جواز الوقف على قول أبي يوسف ومحمّد. وقال في الحقائق : قال في "التتمّة" و"العون" الفتوى على قولهما.(التصحح والتّرجيح على مختصر القدوري، كتاب الوقف،ص٢٨٨.

[2] لانّ ركن الوقف وهو اللفظ الدالّ عليه لم يوجد.

[3] (ومنها) أن يكون قربة في ذاته وعند التصرف لا يصح وقف المسلم أو الذمي على البيعة والكنيسة أو على فقراء أهل الحرب كذا في النهر الفائق ولو وقف الذمي داره على بيعة أو كنيسة أو بيت نار فهو باطل.(الفتاوى الهندية ،كتاب الوقف، الباب الاول،ك٢ص ٣٥٣)

ولو وقف الذمي داره على بيعة أو كنيسة أو بيت نار فهو باطل. (المحيط البرهاني كتاب الوقف، الفصل الخامس والعشرون، ج٦ ص ٢٢٨).

[4] (ومحله) المال المتقوم.(الإسعاف فى أحكام الأوقاف، باب فى ألفاظ الوقف وأهله ومحله وحكم،ص ١٠).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الوقف،ج١ ص ٧٣٠).

[5] مِن شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب أرضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن إليه أو صالح على مال دفعه إليه لا تكون وقفا.(البحر الرائق،كتاب الوقف،ج٥ ص ٢٠٣.

ومن شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب أرضا فوقفها ثم ملكها لا يكون وقفا. (مجمع الأنهر،كتاب الوقف،ج١ ص ٧٣٠.

۵۔وقف مؤبد نہ ہو تب بھی باطل ہے جیسے یہ کہے کہ یہ زمین دس سال کے لئے وقف ہے۔[1] یا وقف میں اختیار رکھے تب بھی باطل ہے جیسے چاہے وقف کروں چاہے باقی رکھوں۔

وقف مال کا حکم

وقف کا حکم یہ ہے کہ وقف کا اصل محفوظ رہے اور منافع تقسیم ہوا کریں، لہٰذا روپیہ، اشرفی، کھانے پینے کی چیزیں اور ہر وہ چیز جس کو ہلاک کئے بغیر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے، وقف نہیں ہو سکتیں۔[2]

مسئلہ: عالمگیریہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ روپیہ قرض حسنہ کی غرض سے یا مضاربت کی غرض سے بھی وقف ہو سکتا ہے۔[3]

مسئلہ: مستحقین کی جماعت پر اصل وقف تقسیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ صرف منافع تقسیم ہوں گے۔[1]

---

[1] امام خصاف وغیرہ فقہاء کرام کے نزدیک اس طرح موقّت وقف مطلقاً منعقد نہیں ہوتا، البتہ علامہ ہلال رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک اس کی دو صورتیں ہیں: اگر وقت مقررہ کے بعد وقف کے باطل کرنے کی کوئی قید لگائی جائے تو وقف نافذ نہیں ہوگا اور اگر ایسی کوئی شرط نہ لگائی جائے ،صرف مدت بیان کی جائے جیسا کہ مندرجہ بالا مثال میں ہے تو اس صورت میں وقف لازم ہو جائے گا، علامہ قاضی خان رحمہ اللہ وغیرہ کا رجحان اسی آخری قول کی طرف ہے۔

قلت: أرأيت إنْ قال جعلتُ أرضي هذه صدقة موقوفة لله عزّ وجل سنة أو شهرا أو يوما؟ قال: هذا الوقف باطل.(أحكام الأوقاف للخصّاف،ص١٢٧.

وكذا في بدائع الصنائع.كتاب الوقف،ج٦ص ٢٢٠.

رجل وقف داره يوما أو شهرا أو وقتا معلوما و لم يزد على ذلك جاز الوقف و يكون الوقف أبدا، و لو قال أرضي هذه صدقة موقوفة شهرا فإذا مضى شهر فالوقف باطل كان الوقف باطلا في الحال في قول هلال رحمه الله تعالى. فتاوى قاضيخان،كتاب الوقف، فصل في مسائل الشرط في الوقف ،ج٣ص١٧٢.

وكذا في الإسعاف فى أحكام الأوقاف،باب فى الوقف الباطل وفيما يبطله،ص٢٩. والتفصيل في الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الوقف،ص٣٥١.

[2] (منها) أن يكون مما لا ينقل ولا يحول كالعقار ونحوه، فلا يجوز وقف المنقول مقصودا لما ذكرنا أن التأبيد شرط جوازه، ووقف المنقول لا يتأبد لكونه على شرف الهلاك، فلا يجوز وقفه مقصودا. (بدائع الصنائع ،كتاب الوقف، شرائط الموقوف،ج٦ ص ٢٢٠)

(ومنها) أن يكون المحل عقارا أو دارا فلا يصح وقف المنقول إلا في الكراع والسلاح كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية ،كتاب الوقف،الباب الاول،ج٢ ص ٣٥٧).

[3] وعن الأنصاري وكان من أصحاب زفر فيمن وقف الدراهم، أو ما يكال أو ما يوزن أيجوز ذلك قال: نعم قيل وكيف قال يدفع الدراهم مضاربة، ثم يتصدق بها في الوجه الذي وقف عليه وما يكال أو يوزن يباع ويدفع ثمنه لمضاربة أو بضاعة قال فعلى هذا القياس.(رد المحتار،كتاب الوقف،ج٤ص٣٦٤).

وكذا في فتح القدير (كتاب الوقف،ج٦ص٢١٩).

مسئلہ : مال وقف کو فروخت کرنا، ہبہ کرنا یا رہن رکھنا جائز نہیں۔[2]

مسئلہ : وقف کی آمدنی پہلے مرمت وغیرہ میں خرچ کی جائے گی اس کے بعد جو باقی بچے اس کو مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا۔[3]

مسئلہ : اگر اصل وقف مرمت اور درستگی کے بغیر باقی نہ رہ سکے اور مرمت کے لئے اور کوئی آمدنی نہ ہو تو ایک جزء فروخت کر کے باقی کو محفوظ رکھنا چاہئے۔[4]

---

[1] لا يقسم الموقوف بين مستحقيه ولو كانوا أولاد الواقف لأنه لا حق لهم في العين وإنما حقهم في الغلة. (البحر الرائق كتاب الوقف، ج٥ ص ٢٢٤).

"ولا يجوز أن يقسمه" يعني النقض "بين مستحقي الوقف" لأنه جزء من العين ولا حق للموقوف عليهم فيه: وإنما حقهم في المنافع، والعين حق الله تعالى فلا يصرف إليهم غير حقهم. (الهداية ،كتاب الوقف، ج٣ ص ١٩).

[2] قال أبو يوسف ومحمد وعامة العلماء رضي الله تعالى عنهم يجوز، حتى لا يباع ولا يوهب ولا يورث. (بدائع الصنائع، كتاب الوقف، ج٦ ص ٢١٨).

وقال أبو يوسف ومحمد هو عبارة عن حبس العين على حكم ملك الله تعالى على وجه تصل المنفعة إلى العباد فيزول ملك الواقف عنه إلى الله تعالى فيلزم ولا يباع ولا يرهن ولا يورث. (الجوهرة النيرة، كتاب الوقف، ج١ ص ٣٣٣).

[3] ويبدأ من ارتفاع الوقف بعمارته وإن لم يشرطها الواقف، فإن كان الوقف على غني عمره من ماله، وإن كان على فقراء فلا تقدر عليهم، فإن أبى أو كان فقيرا آجرها القاضي وعمرها بأجرتها ثم ردها إلى من له السكنى. (الاختيار لتعليل المختار، كتاب الوقف، ج٣ص٤٣.

وكذا في الإسعاف فى أحكام الأوقاف، فصل في بيان ما يجوز للقيم من التصرف وما لا يجوز ،ص:٥٦).

[4] *یہ مسئلہ محلِ اشکال ہے، فقہاء کرام نے یہ بحث ذکر فرمائی ہے کہ ایسی ضرورت کے وقت مسجد (بظاہر دیگر اوقاف کا بھی یہی حکم ہے) کے کسی حصہ کو کرایہ پر دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ در مختار وغیرہ کتابوں میں اس کی ممانعت مذکور ہے جبکہ علامہ رافعی رحمہ اللہ نے علامہ سندی کے حوالہ سے علامہ رملی سے اس کی گنجائش کا قول نقل کیا ہے، لیکن فروخت کرنے کی اجازت کسی نے نہیں دی۔*

في الدر المختار: ولا يجوز أخذ الأجرة منه ولا أن يجعل شيئا منه مستغلا ولا سكنى. وفي حاشية ابن عابدين تحته: والمراد بالمستغل أن يؤجر منه شيء لأجل عمارته وبالسكنى محلها وعبارة البزازية على ما في البحر، ولا مسكنا وقد رد في الفتح ما بحثه في الخلاصة من أنه لو احتاج المسجد إلى نفقة تؤجر قطعة منه بقدر ما ينفق عليه، بأنه غير صحيح. (كتاب الوقف، مطلب فيما لو خرب المسجد أو غيره، ج٤ص ٣٥٨).

اوقاف کے مصارف

مسئلہ : وقف کا مصرف واقف کی رائے پر ہے چاہے اپنے نفس کے لئے، یا اپنی اولاد کے لئے یا بعض رشتہ داروں کے لئے وقف کرے یا کسی شخص یا جماعت یا کسی خاص مد کے لئے وقف کرے، بشرطیکہ وہ خاص مد گناہ کے کام نہ ہوں۔[1]

مسئلہ : یہ بھی جائز ہے کہ وقف کے مصارف کو ترتیب وار رکھے جائیں یعنی یہ شرط کردی جائے کہ فلان فلان پر آمدنی وقف خرچ کی جائے ان سے باقی بچے تو فلان مستحق کو یا میری اولاد کو اس سے منافع ملیں، اگر وہ ختم ہو جائیں تو فلاں جماعت کو، مگر ہر حال میں جب وقف کے مصارف متعین نہ رہیں، اس کے مستحق فقراء ہیں۔[2]

مسئلہ : مجنون یا نابالغ کا وقف کے متولی بننا جائز نہیں، اسی طرح فاسق اور غیر متدین شخص کا بھی وقف کے متولی بننا مناسب نہیں، اگر متولی بننے کے بعد خیانت یا واقف کی شرط کی مخالف کا خطرہ ہو تو قاضی اسلام اس کو معزول کر سکتا ہے۔[3]

---

[1] (وصرف منفعتها على من أحب) ولو غنيا فيلزم، فلا يجوز له إبطاله. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ، كتاب الوقف،ج٤ ص ٣٣٩).

وكذا في تبيين الحقائق (كتاب الوقف،ج٣ ص ٣٢٤).

[2] ولو منهم ولو شرط الولاية بعد موت وصيه لزيد ثم لعمرو ثم لبكر وهكذا وجب الترتيب. (الإسعاف فى أحكام الأوقاف ،باب الولاية على الوقف،ص: ٥٢).

لو قال أرضي صدقة موقوفة تجري علي غلتها ما عشت ثم بعدي على ولدي و ولد ولدي و نسلهم أبد ما تناسلوا فإذا انقرضوا فهي على المساكين جاز ذلك عن ما روي عن أبي يوسف رحمه الله تعالى.(فتاوى قاضيخان ،كتاب الوقف،قبيل فصل في الوقف على الأولاد،ج٣ ص ١٨٣).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الوقف، الباب الرابع،ج٢ص ٣٩٨).

[3] لا يولى إلا أمين قادر بنفسه أو بنائبه لأن الولاية مقيدة بشرط النظر وليس من النظر تولية الخائن لأنه يخل بالمقصود وكذا تولية العاجز لأن المقصود لا يحصل به... ولو أوصى الواقف إلى جماعة وكان بعضهم غير مأمون بدله القاضي بمأمون..ولو جعلها لأولاده وفيهم صغير أدخل القاضي مكانه رجلا أجنبيا أو واحدا منهم كبيرا ولو أوصى إلى صبي تبطل في القياس مطلقا وفي الاستحسان هي باطلة ما دام صغيرا فإذا كبر تكون الولاية له.(الإسعاف فى أحكام الأوقاف ،باب الولاية على الوقف،ص: ٤٩).

خاتمة: في المتولي وغيره: اعلم أنه إما أن يكون بالشرط أو بغيره ويشترط في الكل العقل والبلوغ. (النهر الفائق،كتاب الوقف، خاتمة،ج٣ ص ٣٣٢).

مسئلہ : متولی پر واجب ہے کہ شرائط اور احکام وقف کی پابندی کرے، کمال دیانت اور کفایت شعاری سے وقف کی حفاظت کرتا رہے۔ [1]

مسئلہ : وقف قبرستان یا وقف مہمان خانہ کی اجرت لینا جائز نہیں ہے ہاں بطور احسان کچھ حق الخدمت لینا جائز ہے۔ [2]

مساجد کے احکام

یہ بھی اوقاف میں سے ہیں، وقف کی شرائط کی رعایت کرنے کے علاوہ اس کے کچھ مخصوص احکام بھی ہیں:

۱۔ مسجد کا وقف لازم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بانی کی طرف سے نماز کی عام اجازت ہو اور کم از کم ایک مرتبہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی گئی ہو اور اس کا کوئی راستہ دوسرے کی ملک میں نہ ہو۔ [3]

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين عليه (كتاب الوقف،"مطلب يأثم بتولية الخائن" و"مطلب في شروط المتولي" و"مطلب في تولية الصبي"،ج٤ص٣٨٠ و٣٨١).

[1] ويتحرى في تصرفاته النظر للوقف والغبطة لأن الولاية مقيدة به. (الإسعاف،فصل في بيان ما يجوز للقيم من التصرف وما لا يجوز،ص ٥٦).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الوقف، الكلام في الناظر، ج٥ص٢٤٤).

[2] لانّه يكون اجارة ح ولا تنعقد الاجارة الاّ ان يكون المؤجر مالكا والموقوف قد خرج عن ملكه على القول المختار كما مرّ.

[3] یہ حضرات طرفین کے قول پر مبنی ہے جس کے مطابق وقف کے تام ولازم ہونے کے لئے "تسلیم" شرط ہے، حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک وقف کرنے سے بھی وقف لازم ہو جاتا ہے اس کے "تسلیم" کوئی ضروری نہیں، متاخرین فقہاء ومفتیان کرام نے حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیا ہیں۔

ثم التسليم في الوقف عندهما أن يجعل له قيما ويسلمه إليه، وفي المسجد أن يصلى فيه جماعة بأذان وإقامة بإذنه كذا ذكر القاضي في شرح الطحاوي وذكر القدوري رحمه الله في شرحه أنه إذا أذن للناس بالصلاة فيه فصلى واحد كان تسليما، ويزول ملكه عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله. (بدائع الصنائع ،كتاب الوقف،ج٦ ص ٢٢٠).

أما الصلاة فيه فلأنه لا بد من التسليم عند أبي حنيفة ومحمد فيشترط تسليم نوعه وذلك في المسجد بالصلاة فيه.. وعن محمد تشترط الصلاة بالجماعة لأن المسجد مبني لذلك في الغالب وصححها الزيلعي..وقال أبو يوسف يزول ملكه بقوله جعلته مسجدا لأن التسليم عنده ليس بشرط. (البحر الرائق ،كتاب الوقف،ج٥ ص ٢٦٨).

(وإذا بنى مسجداً لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه) الواقف: أي يميزه (عن ملكه بطريقه) ، لأنه لا يخلص لله تعالى إلا به (ويأذن للناس بالصلاة فيه) ، لأنه من التسليم عند أبي حنيفة ومحمد، وتسليم كل شيء بحسبه، وذلك في المسجد بالصلاة فيه،(اللباب في شرح الكتاب ،كتاب الوقف،ج٢ص ١٨٦).

وفي الدر المنتقى وقدم في التنوير والدرر والوقاية وغيرها قول أبي يوسف وعلمت أرجحيته في الوقف والقضاء.(رد المحتار،كتاب الوقف،ج٤ ص ٣٥٦).

۲۔ مسجد کا متولی غیر مسلم نہیں ہو سکتا (گو یہ جزئیہ کتابوں میں نظر سے نہیں گذرا، تاہم میرے نزدیک ایسے شخص کو بھی مسجد کا متولی بنانا جائز نہیں جو اعتقاداً بانی مسجد کے خلاف ہو، مثلاً اہل سنت اپنی مسجدوں میں خلفاء راشدین کی فضیلت بیان کرتے ہیں، شیعہ بانی اس نیت سے کبھی مسجد نہیں بنا سکتے تو اہل سنت کی مسجد کا متولی شیعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر بانی اپنے اعتقاد اور دیانت سے مسجد کی بناء انہی اصولوں پر کرتا ہے جو ان کے نزدیک عبارت ہے، اس لئے متولی کی اجازت وسکوت کے بغیر دوسرے اعتقاد والوں کا جبراً قبضہ بھی جائز نہیں ہو سکتا۔)[1]

مسئلہ : مسجد کا متولی اصل بانی ہے وہ نہ ہو تو اس کے ورثہ متولی ہوں گے یا ورثہ جس کو متولی بنادیں وہ متولی ہوگا، اگر ایسا نہ ہو تو محلہ کے مسلمان متولی ہوں گے۔[2]

مسئلہ : متولی کو حق ہے (کہ) جس طرح چاہے مسجد کی تعمیر کا انتظام کرے مگر یہ کہ نہ مال وقف ضائع کرے نہ کوئی ناجائز کام کرے۔

---

[1] أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (رد المحتار، كتاب الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة،ج٤ ص ٤٤٥).

ومنها إذا تعارض الأمر بين إعطاء بعض الذرية وحرمانهم تعارضا لا ترجيح فيه فالإعطاء أولى. لأنه لا شك أنه أقرب إلى غرض الواقفين. (الأشباه والنظائر لابن نجيم,الفن الاول،" اعمال الكلام اولى من اهماله،ص: ١١٩)

(ولو) أوصى (إلى صبي وعبد غيره وكافر وفاسق بدل) أي بدلهم القاضي (بغيرهم) إتماما للنظر، ولفظ بدل يفيد صحة الوصية، فلو تصرفوا قبل الاخراج جاز..(فلو بلغ الصبي وعتق العبد وأسلم الكافر) أو المرتد وتاب الفاسق. (الدر المختار ،باب الوصي،٦ص٧٠١).

[2] وإن لم يشرطها لأحد فالولاية له عند أبي يوسف وعند محمد لا تكون له الولاية. (تبيين الحقائق ،كتاب الوقف،ج٣ ص ٣٢٩).

ذكر هلال رحمه الله: إذا وقف الرجل أرضه، ولم يشترط الولاية لنفسه ولا لغيره إن الوقف جائز والولاية للواقف. (المحيط البرهاني،كتاب الوقف،الفصل السادس في الولاية في الوقف، ج٦ص١٣٤).

فإن مات ولم يجعل ولايته إلى أحد جعل القاضي له قيما ولا يجعله من الأجانب ما دام يجد من أهل بيت الواقف من يصلح لذلك أما لأنه أشفق أو لأن من قصد الواقف نسبة الوقف إليه وذلك فيما ذكرنا. (الإسعاف فى أحكام الأوقاف،باب الولاية على الوقف،ص: ٥٠).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الوقف، قبيل مطلب التولية خارجة عن حكم سائر الشرائط،ج٤ص٤٢٥)

مسئلہ: دوسرے مسلمانوں کو مسجد کی خدمت کرنے کی اجازت ہے مگر نظم ونسق متولی کی رائے اور مشورہ سے ہو۔[1]

مسئلہ: مسجد کا احترام سب پر واجب ہے، لہٰذا کسی مسلمان یا کافر کو اجازت نہیں کہ کوئی ایسا کام مسجد میں آکر کرے جو مسجد کے احترام کے خلاف ہو۔[2]

مسئلہ: مسجد کی پرانی چٹائی، بے کار چونا، اینٹ لکڑی وغیرہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسی میں صرف کیا جائے،اور اگر مسجد میں ضرورت نہ ہو تو فروخت کر کے قیمت مسجد ہی میں لگائی جائے گی (عقود الدریہ)[3]

مسئلہ: شکستہ ٹوٹی ہوئی مسجد جس کا کوئی کفالت کرنے والا نہ ہو یعنی متولی نہ ہو اور مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہ رہی ہو تو پہلے مسجد کے متعلقات جیسے پتھر وغیرہ اس میں لگادیئے جائیں اور آخر میں بعض حصے اس کی ایسی سخت ضرورت میں، جو اس کی بقاء وحفاظت کے لئے کافی ہو، صرف کئے وہی بعینہ یا اس کی قیمت۔[4]

مسئلہ: ٹوٹی ہوئی مسجد کی چیزیں دوسری مسجد میں لگانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نہ اس مسجد میں ضرورت ہو نہ اس کی حفاظت ممکن ہو، نہ آبادی کا گمان۔

---

[1] المحيط البرهاني في الفقه النعماني - (٦ / ٢١٥)
متول عليه مشرف ليس للمشرف أن يتصرف في الوقف؛ لأن المفوض إلى المشرف الحفظ لا غير.

[2] قالوا ولا يتخذ في المسجد بئر ماء لأنه يخل حرمة المسجد فإنه يدخله الجنب والحائض. البحر الرائق كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة ،ج٢ص ٣٧.
قيم المسجد إذا أراد أن يبني حوانيت في المسجد وفي فنائه لا يجوز، أما المسجد: فلأنه إذا جعل مسكناً يسقط حرمة المسجد.
المحيط البرهاني في الفقه النعماني ،كتاب الوقف، الفصل الحادي والعشرون: في المساجد،ج٦ص ٢١٥.
وكذا في فتح القدير للكمال ابن الهمام،كتاب الوقف، فصل إذا بنى مسجدا،ج٦ ص ٢٣٦.

[3] رجل بسط من ماله حصيرا في المسجد فخرب المسجد ووقع الاستغناء عنه فإن ذلك يكون له إن كان حيا ولوارثه إن كان ميتا. وعند أبي يوسف رحمه الله تعالى يباع ويصرف ثمنه إلى حوائج المسجد. الفتاوى الهندية،كتاب الوقف، الفصل الاول، ج٢ص٤٥٨.
لو اشترى قنديلا ونحوه للمسجد واستغنى عنه وعند أبي يوسف يباع ويصرف ثمنه في حوائج المسجد وإن استغنى عنه هذا المسجد يحوّل إلى مسجد آخر.الإسعاف فى أحكام الأوقاف، باب بناء المساجد والربط،ص: ٧٧)
وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الوقف،ج٤ ص ٣٥٩.
"عقود الدریۃ" سے بظاہر "العقود الدریہ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ" مراد ہے،اس میں سرسری تلاش کرنے سے یہ حوالہ نہیں مل سکا۔

[4] أنظر عبارات الإسعاف والهندية في الحاشية المتقدّمة.

مسئلہ : مسجد پر جو چیزیں وقف ہوں وہ مسجد کی ملک ہیں جیسے دکانیں وغیرہ، چونکہ ان تمام عطیات کی بناء اقرار کی صحت پر ہے اس لئے اقرار کا حکم حالت صحت اور حالت مرض کے اعتبار سے مختلف ہے اس میں مرض الموت کا کچھ ذکر اس مقام پر مناسب ہے۔

مرض الموت کے احکام

تعریف: وہ شدید بیماری جس سے صحت یاب ہوئے بغیر موت آجائے، ایسے مریض کے تصرف اور اقرار وصیت کے حکم میں ہے۔[1]

مسئلہ : مرض الموت کا اقرار حالت صحت کے دین کی ادائیگی سے موخر ہوں گے، مثلاً سو روپے کا مقروض تھا پھر بیمار ہوا اور بکر کے حق میں سو روپے امانت کا اقرار کر کے وفات پاگیا جب تک قرض کے روپے اس کے ترکہ سے ادا نہ ہو یہ امانت ادا نہ کی جائے گی۔[2]

اگر اسی بیماری کی حالت میں کوئی چیز فروخت کی یا خریدی پھر وفات پایا، اس خرید وفروخت میں اگر بازار کی قیمت سے کچھ نقصان ہے تو وہ نقصان وصیت کے حکم میں ہو کر وصیت کی طرح پورا کیا جائے گا، مثلاً ایک مکان ایک لاکھ کا تھا اس نے پچاس ہزار میں فروخت کر دیا اور وفات پاگیا، اب ترکہ کل ایک لاکھ کا ہے اب اس کو ڈیڑھ لاکھ شمار کریں گے، پچاس ہزار نقصان کے اور ایک لاکھ یہ، اب یہ نقصان تہائی مال

---

[1] مرض الموت هو المرض الذي يعجز المريض فيه عن رؤية مصالحه الخارجة عن داره إن كان من الذكور ويعجز عن رؤية المصالح الداخلة في داره إن كان من الإناث , والذي يكون فيه خوف الموت في الأكثر ويموت , وهو على ذلك الحال قبل مرور سنة سواء كان ملازما للفراش , أو لم يكن. مجلة الأحكام العدلية ،رقم المادة١٥٩٥.ص: ٣١٤.

(والمرض الذي لا يخاف فيه الموت، مثل الفالج، والسل الذي قد تطاول، بمنزلة الصحة).. وتصرف المريض إذا اتصل به الموت: بمنزلة الوصية فيما يعتبر فيه الثلث. شرح مختصر الطحاوي للجصاص ،كتاب الوصايا،ج٤ ص ١٧٤.

تصرف المريض مرض الموت في الحكم بمنزلة المضاف إلى ما بعد الموت حتى يعتبر من الثلث. فتاوى قاضيخان ،كتاب الوقف، فصل في وقف المريض،ج٣ ص ١٨١.

[2] (ويقدمان) أي دين الصحة وما لزمه في مرضه بسبب معروف (على ما أقر به في مرضه) ولو كان المقر به وديعة. مجمع الأنهر ،كتاب الاقرار،باب إقرار المريض،ج٢ ص ٣٠٢.

وكذا في الاختيار لتعليل المختار، كتاب الاقرار،ج٢ ص ١٣٧.

إذا كان مريضا كان حق الورثة متعلقا بماله، فلا يجوز إلا في قدر الثلث، وكذا الإعتاق في مرض الموت، والبيع، والمحاباة قدر ما لا يتغابن الناس فيه، وإبراء الغريم، والعفو عن دم الخطأ يعتبر ذلك كله من الثلث كالهبة، والصدقة لتعلق حق الورثة بمال المريض مرض الموت فيما وراء الثلث.بدائع الصنائع ،كتاب الوصايا، شرائط الموصى به،ج٧ ص ٣٧٠.

"ومن أعتق في مرضه عبدا أو باع وحابى أو وهب فذلك كله جائز وهو معتبر من الثلث.الهداية في شرح بداية المبتدي كتاب الوصايا،باب العتق في مرض الموت،ج٤ص ٥٢٦.

سے پورا ہو گیا اور مکان پچاس ہزار میں فروخت ہو گیا، اگر ترکہ پچاس ہزار بچتا ہے تو کل ترکہ ایک لاکھ سمجھا جائے گا نقصان والے پچاس ہزار اور بچے ہوئے پچاس، اب ۳۳ ہزار تو وصیت کی مد میں ختم ہو گیا اور سترہ ہزار کا خریدار سے مطالبہ کیا جائے گا، اگر خریدار ثمن مقررہ پچاس پر سترہ اور دے کر مکان خرید سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بیع فسخ ہوئی، ایسا اگر سو کا مال تین سو مین خرید لیا اور اس کا کل ترکہ چار سو بچا یا اس سے زیادہ تو خیر ہے تین سو روپے قیمت ادا کی جائے گی، اگر متروکہ مال کم ہے مثلاً صرف سو روپے ہے تو اب ترکہ کل تین سو سمجھا جائے گا نقد ایک سو اور نقصان والے دو سو، پس بائع کو سو زیادہ دئے جائیں گے، بائع چاہے تو اتنے میں مال فروخت کرے چاہے واپس لے لے۔

مسئلہ: اگر کوئی وارث نہ ہو یا وارث راضی ہو جائیں تو یہ اقرار بھی وصیت کی طرح بعینہ نافذ ہوگا۔ [1]

****

[1] (وتجوز بالثلث للأجنبي) عند عدم المانع (وإن لم يجز الوارث ذلك لا الزيادة عليه إلا أن تجيز ورثته بعد موته) .الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الوصايا، ج٦ص ٦٥٠.

وكذا في الفتاوى الهندية، كتاب الفرائض، الباب الاول، ج٦ ص ٤٤٧.

باب سوم مال میں اضافہ ہونے کا بیان

زوائد وہ زیادتی جو مال مملوک سے حاصل ہو، اور یہ بھی دو حال سے خالی نہیں: اعیان میں زیادتی ہو جیسے جانوروں کے انڈے بچے، زمین کی پیداوار، اس کے پھل پھول لکڑی وغیرہ، یا وہ زیادتی جو منافع کی ہو جیسے مکان کرایہ پر لیا اس میں درخت اگا، اس کے سائے سے نفع حاصل کرنا (جو کہ اصل عقد میں داخل نہ تھا) کرائے کی زمین چھتری گاڑے یا کوئی ایسی جگہ بنائے جہاں جنگلی جانور آ کر پھنسیں، وہ سب زائد فائدے ہیں، یا زمین پست ہے اس میں پانی جمع ہوا یہ بھی زائد فائدہ ہے۔

زوائد کا حکم

یہ زوائد اصل کے تابع ہیں، اگر اصل مملوک حلال ہے تو زیادتی مملوک بھی حلال ہے پس کرایہ کے ذریعے جو زیادتی حاصل ہو گی یا مال مستعار سے جو زیادتی حاصل ہو گی وہ مالک کی ملک ہے اور اس کا منافع حلال ہے۔[1]

البتہ اگر کرایہ یا عاریت پر لینے والے نے اپنی کوشش سے وہ زیادتی پیدا کی ہو جیسے درخت لگایا تو پھر انہی کی ملک ہو گی، اگر اس سے مالک کا نقصان ہو تو کرایہ دار نقصان کا ضامن ہو گا یعنی ایسا درخت لگایا جس سے کھیت کا نقصان ہو گیا تو کرایہ درخت خود لے لے اور مالک کو نقصان ادا کر دے۔[2]

---

[1] ما يتولد من شيء مملوك يكون مملوكاً لصاحب الأصل؛ لأن مالك الأصل هو مالك الفرع، سواء أكان ذلك بفعل مالك الأصل، أم بالطبيعة والخلقة. الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي ، نظرية الحق، اسباب الملك،ج٤ ص ٢٩١٤.

[2] (ومن بنى أو غرس في أرض غيره بغير إذنه أمر بالقلع والرد).. (وللمالك أن يضمن له قيمة بناء أو شجر أمر بقلعه) أي مستحق القلع فتقوم بدونهما ومع أحدهما مستحق القلع فيضمن الفضل. الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الغصب،ج٦ ص ١٩٤).

(ومن بنى في أرض غيره) أو غرس فيها شجرا (أمر) الباني والغارس (بالقلع) في ظاهر الرواية (والرد) أي رد الأرض إلى المالك لقوله عليه الصلاة والسلام ليس لعرق ظالم حق أي لذي عرق ظالم وصف العرق بصفة صاحبه وهو الظلم مجازا كما يقال

باب چہارم: مباحات کا بیان

مباح وہ چیز ہے جس میں نہ کسی کو مالک بنایا جاتا ہے اور نہ ہی کسی کو استعمال سے روکا جاتا ہے بلکہ محض فائدہ حاصل کرنے کے لئے مہیا کی جاتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: اباحت عامہ اور اباحت خاصہ، پھر اباحت عامہ کی دو قسمیں ہیں:

ا۔اصلی: یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ اور رحمت تامہ نے عام مخلوق کے فائدے کے لئے پید افرمایا ہے تاکہ ہر کمزور و قوی، فقیر ومالدار، بلکہ درندے اور پرندے بھی ان سے فائدہ حاصل کر سکیں، پس مباح چیزیں عقل مندوں کے لئے کافی ہیں کمانے اور مصائب سے بچنے کے لئے، جیسے دریا، جنگلات، پہاڑ، ان تینوں کی چیزیں، جنگلی حلال جانوروں کا گوشت، کھالیں، بارش کا پانی، سب کے لئے مباح ہیں کھانے لباس اور سکونت کے لئے کافی ہیں۔

مباح کا حکم: مباح کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوتا نہ اس میں تصرف جائز ہے (یعنی اس کو بیچنا، ہبہ کرنا وغیرہ جائز نہیں اور استعمال جائز ہے۔)

مسئلہ: تمام مخلوق کو اس میں مساوی کا حق حاصل ہے۔

مسئلہ: ان پر قبضہ سے حق اور ملک ثابت ہو جاتی ہے۔ [1]

صام نهاره وقام ليله إذا كانت الأرض لا تنقص بالقلع. (وإن كانت تنقص بالقلع فللمالك أن يضمن له) أي للغاصب (قيمتهما) أي قيمة البناء والغرس (مأمورا بقلعهما)(مجمع الأنهر كتاب الغصب،ج ٢ ص ٤٦٢).

[1] تفسير هذه الشركة في المياه التي تجري في الأودية، والأنهار العظام كجيحون وسيحون، وفرات، ودجلة، ونيل فإن الانتفاع بها بمنزلة الانتفاع بالشمس، والهواء ويستوي في ذلك المسلمون، وغيرهم، وليس لأحد أن يمنع أحدا من ذلك، وهو بمنزلة الانتفاع بالطرق العامة من حيث التطرق فيها.ومرادهم من لفظة الشركة بين الناس بيان أصل الإباحة، والمساواة بين الناس في الانتفاع لا أنه مملوك لهم فالماء في هذه الأودية ليس بملك لأحد. المبسوط للسرخسي ،كتاب الشرب،ج٢٣ ص ١٦٤.الشركة العامة تقتضي الإباحة إلا أنه إذا جعل في إناء وأحرزه به فقد استولى عليه وهو غير مملوك لأحد فيصير مملوكا للمستولي كما في سائر

مسئلہ: مال مباح کو بلاضرورت نقصان پہنچانا یا ناقابل انتفاع بنادینا جائز نہیں۔ [1]

مسئلہ: دریا کا پانی، جنگل کی گھاس، پہاڑ کے پتھر، جنگلی جانور، قبضہ میں لانے سے پہلے اگر فروخت کئے جائیں تو بیع باطل ہوگی اور تمام تصرفات جیسے ہبہ، وصیت وشراکت وغیرہ لغو ہیں۔ [2]

مسئلہ: ایسی چیزوں پر قبضہ کرنے میں کسی کو کسی سے زیادہ حق نہیں کہ فلاں قبضہ کرسکتا ہے فلاں نہیں کرسکتا بلکہ سب کو برابر حق ہے۔ [3]

مباح چیزوں سے عام لوگوں کے حقوق منقطع کرنے کی تدبیر

بعض تدابیر سے عام لوگوں کے حقوق منقطع ہوجاتے ہیں جیسے چھت پر چھتری باندھی تاکہ جنگلی کبوتر بیٹھے، یا جال لگایا تاکہ چڑیا پھنسے، یا سمندر کے کنارے گڑھا کھودا تاکہ مچھلی اس میں داخل ہو یا درخت لگایا تاکہ جانور اس میں بسے، اب ان تدابیر سے جو مباح چیزیں قابو میں آئیں ان پر دوسروں کو دست اندازی کا حق نہیں رہا لیکن ایسی تدبیروں میں شرط یہ ہے کہ یہ تدابیر انہی کاموں کے لئے موضوع ہوں اور اسی ارادے سے وہ تدابیر اختیار کی گئی ہوں، لیکن ان تدابیر سے محبوس کرنے کے بعد اس وقت تک ملک ثابت نہ ہوگی جب تک کہ ایسا قبضہ نہ ہوجائے کہ اب قابو کرنے کے لئے مزید حیلہ اور تدبیر کی ضرورت نہ رہے جیسے جانور جال میں پھنس گیا، کبوتر کابک میں چلا آیا، مچھلی چھوٹے حوض میں گرگئی، تو اب مملوک بھی ہوگئی۔ [1]

المباحات الغير المملوكة، وإذا لم يوجد ذلك بقي على أصل الإباحة الثابتة بالشرع فلا يجوز بيعه؛ لأن محل البيع هو المال المملوك. بدائع الصنائع ، كتاب الشرب، ج٦ص ١٨٩.

[1] كل أحد منهي عن إفساد الطعام وفي الافساد الإسراف ولهذا لما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن القيل والقال وعن كثرة السؤال وعن إضاعة المال. (الكسب للامام الشيباني رحمه الله:ص ٧٨).

وكذا في المحيط البرهاني، كتاب الاستحسان والكراهية الفصل الثاني عشر في الكراهية في الأكل، ج٥ ص ٣٥١.

[2] الشركة العامة تقتضي الإباحة إلا أنه إذا جعل في إناء وأحرزه به فقد استولى عليه وهو غير مملوك لأحد فيصير مملوكا للمستولي كما في سائر المباحات الغير المملوكة، وإذا لم يوجد ذلك بقي على أصل الإباحة الثابتة بالشرع فلا يجوز بيعه؛ لأن محل البيع هو المال المملوك. بدائع الصنائع ، كتاب الشرب، ج٦ص ١٨٩.

ومنها أن المبيع إذا كان لا يقدر على تسليمه وقت العقد مثل الطير الذي طار عن يده أو العبد الآبق واللقطة والمغصوب يكون البيع فاسدا. (تحفة الفقهاء ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٢ص ٤٧).

[3] مرّ تخريجه قبل هذا.

مسئلہ: اگرایسی مباح چیزیں حرام چیزوں سے حاصل کی جائیں توذرائع تو حرام ہوں گے لیکن خود وہ چیزیں حرام نہ ہوں گی، جیسے سودی رقم سے کنواں کھودا، یارشوت سے خرید کردہ ڈول میں پانی بھرا، غصب شدہ زمین میں کنواں کھودوایا، حرام مال سے جال خریدا، تووہ پانی یا شکار حرام نہ ہوگا کیونکہ ان مباح چیزوں میں ملک معاوضۃً نہیں آئی اور قبضہ میں خبث بھی نہیں۔[2]

مباح اشیاء قبضہ سے ملک میں داخل ہوتی ہیں

مسئلہ: ہر مباح چیز قبضہ سے ملک میں داخل ہوجاتی ہے اور جب تک باقاعدہ ملک سے نہ نکالی جائے، ملک سے باہر نہیں ہوتی، لہٰذا موتی مونگا، جواہر، لکڑی، پھل، پھول، گھاس، پانی، جانور، مچھلیاں، پتھر، کنکر، اور جملہ معدنیات قبضہ کے بعد مملوک ہوجاتی ہیں اور کسی کے قبضہ میں آنے سے پہلے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس پر قبضہ کرلے۔[3]

مسئلہ: قبضہ سے پہلے بھی مباح چیزوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے لہٰذا دریاؤں کے سیر، درختوں کے سایے اور ہوائیں، ان سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔[4]

مسئلہ: زید نے کسی درخت کے نیچے بستر بچھایا، اب دوسرا اسے زبردستی نہیں اٹھاسکتا اگرچہ کہیں اور سایہ نہ ہو۔[5]

---

[1] (نصب شبكة للصيد ملك ما تعقل بها، بخلاف ما إذا نصبها للجفاف) فإنه لا يملك ما تعقل بها. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب الصيد، ج٦ ص ٤٦٢).

الثالث(من اسباب الملك): إحراز شيء مباح لا مالك له، وهذا إما حقيقي وهو وضع اليد حقيقة على ذلك الشيء وإما حكمي وذلك بتهيئة سببه كوضع إناء لجمع المطر ونصب شبكة لأجل الصيد. (مجلة الأحكام العدلية، رقم المادة:١٢٤٨،ص:٢٤٠).

[2] سئل محمد بن مقاتل رحمه الله تعالى عن رجل سرق ماء وأساله إلى أرضه وكرمه فأجاب أنه يطيب له ما خرج، بمنزلة رجل غصب شعيرا أو تبنا وسمن به دابة فإنه يجب عليه قيمة ما غصب وما زاد في الدابة طيب له. (الفتاوى الهندية،كتاب الكراهية، الباب الثلاثون، ج٥ص ٣٧٤).وكذا في لسان الحكام، قبيل فصل في مسائل الماء،ص: ٤٠٤).

[3] مر تخريجه.

[4] ايضا.

[5] ومن سبق إلى مقاعد الأسواق والطرقات، أو مشارع المياه والمعادن الظاهرة والباطنة، وكل مباح مثل الحشيش والحطب والثمار المأخوذة من الجبال، وما ينبذه الناس رغبة عنه..وما يسقط من الثلج وسائر المباحات، من سبق إلى شيء من هذا، فهو أحق

مسئلہ: زید اور عمر دونوں نے ایک شکار کا پیچھا کیا یا کسی درخت مباح کو کاٹنا چاہا جو پہلے پہنچ جائے وہی مالک ہے۔[1]

مسئلہ: دو آدمیوں نے شکار پر برابر تیر چلایا جس کا تیر پہلے لگا وہی مالک ہوگا، اگر پہلے لگنے کا علم نہ ہو سکے تو جس نے پہلے چلایا وہی مستحق ہوگا ورنہ دونوں شریک ہوں گے۔[2]

عارضی مباح چیزیں:

یعنی کسی آدمی نے اس کو عارضی طور پر مباح کر دیا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **مباح الذات:** یعنی وہ مال جس کے متعلق اعلان ہو جائے جو چاہے لے لے۔

۲۔ مباح الانتفاع: یہ مال وقف کے حکم میں ہے جیسے مساجد، بعض کنویں، پل، راستے وغیرہ، ان میں بعض ضروری چیزوں کے لحاظ کے ساتھ عام لوگوں کا حق ہوتا ہے، مثلاً مسجد میں ہر شخص کو صف اول میں نماز پڑھنے کا حق ہے مگر امام، خطیب، مکبر یا مؤذن کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، راستہ میں ہر شخص کو چلنے کا حق ہے اس طرح کی دوسروں کے حقوق کو نقصان نہ پہنچے، لہٰذا تنگ راستہ میں ایک طرف دے گھوڑا آرہا ہو دوسری طرف سے چھکڑا (یعنی مال لانے کی بڑی گاڑی) تو گھوڑے کو روک واپس لایا جائے گا کیونکہ اس کو واپس لانا آسان ہے، یا ایک گاڑی کم رفتار کی ہے اس کی وجہ سے پیچھے تیز رفتار والوں کا نقصان ہوتا ہو تو اس کو ایک طرف کر دی جائے گی، ایسا ہی ہر وہ کام جس سے عام لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو اس سے

به، ولا يحتاج إلى إذن الإمام، ولا إذن غيره؛ لقول النبي صلى الله عليه وسلم :من سبق إلى ما لم يسبق إليه مسلم، فهو أحق به. المغني لابن قدامة ،كتاب إحياء الموات، ج٥ص ٤٤١.

(ومن سبق إلى مباح كصيد، وعنبر، وسمك، ولؤلؤ، ومرجان، وحطب، وثمر، وما ينتبذه الناس) رغبة عنه (فهو أحق به) وكذا لو سبق إلى ما ضاع من الناس مما لا تتبعه الهمة، وكذا اللقيط، وما يسقط من الثلج والمن، وسائر المباحات، فهو أحق به. وهذا بلا نزاع. الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف،باب إحياء الموات، ج٦ص ٣٨٢.

[1] لانّه مباح يملكه السّابق كما في الحاشية السّابقة.

[2] وإن رمى رجلان صيدا فأصابه سهم أحدهما قبل صاحبه، وأثخنه وأخرجه من أن يكون صيدا ثم أصابه سهم الآخر فهو للذي أصابه سهمه أولا، وإن رمياه معا، ولو أصابه السهمان معا فهو لهما. والعبرة في حق الملك بحالة الإصابة لا بحالة الرمي، وفي حق الحل تعتبر حالة الرمي كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية ،كتاب الصيد،الباب الثاني، ج٥ ص ٤٢٠).

وكذلك في درر الحكام في شرح مجلة الأحكام (رقم المادة ١٢٩٨، ج٣ص ٣٠٥).

روکا جائے گا۔[1]

اباحت خاصہ: جیسے دعوت کا کھانا، سبیل کا پانی جو ایک شخص یا ایک گروہ یا کام کے لئے خاص کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: دعوت کے کھانے میں بغیر اجازت اپنے ساتھ دوسرے کو لیجانا جائز نہیں۔[2]

مسئلہ: دعوت کا بچا ہوا کھانا مہمان ساتھ لے جائے کسی کو دیدے یہ بھی جائز نہیں۔ (عالمگیری)[3]

مسئلہ: صاحب دعوت کو اختیار ہے جسے چاہے کھلائے۔

مسئلہ: یہ بھی جائز نہیں کہ وضوء کا پانی غسل میں یا کسی اور کام میں استعمال کرے، الّا یہ کہ اجازت ہو۔[4]

---

[1] إن السير في ملك نفسه مباح مطلق والسير في طريق المسلمين مأذون بشرط السلامة فما تولد من سير تلف مما يمكن الاحتراز عنه فهو مضمون. (تحفة الفقهاء، كتاب الديات، باب ضمان الراكب، ج٣ص ١٢٣).

الأصل أن المرور في طريق المسلمين مباح بشرط السلامة فيما يمكن الاحتراز عنه. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الجنايات، باب جناية البهيمة والجناية عليها، ج٦ص٦٠٢).

[2] ومن دخل على غير دعوة دخل سارقا وخرج مغيرا. (سنن أبي داود، كتاب الاطعمة، باب ما جاء في إجابة الدعوة).

لا يجوز أن يدخل إلى الولائم وغيرها من الدعوات من لم يدع إليها، فإن في هذا دناءة ومذلة، ولا يليق ذلك بالمؤمن، وفي الحديث من رواية ابن عمر مرفوعا من دخل على غير دعوة دخل سارقا وخرج مغيرا الحديث.. وعلى هذا فالتطفل حرام عند جمهور الفقهاء. (الموسوعة الفقهية الكويتية، المادة "دعوة" ج٢٠ص ٣٣٥).

[3] **یہ عام حالات کا حکم ہے اگر میزبان و مہمان میں اس نوعیت کا تعلق ہو کہ میزبان کی طرف سے مہمان کو ان جیسی چیزیں لے جانے کی عملاً اجازت ہو تو اس صورت میں ایسا کرنا جائز ہے۔**

والصحيح في هذا أنه ينظر إلى العرف والعادة دون التردد، كذا في الينابيع...رفع الزلة حرام بلا خلاف إلا إذا وجد الإذن والإطلاق من المضيف. (الفتاوى الهندية ،كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر، ج٥ ص ٣٤٤).

و لا يباح رفع الزلة بل هو حرام ما لم يقل صاحب الدار ارفعوا. (فتاوى قاضيخان ،كتاب الحظر والاباحة، ج٣ص ٢٤٧).

إذا ناول لقمة من الطعام لغيره يعتبر في ذلك تعامل الناس فإن علم أن رب الطعام يرضى بذلك حل وإن علم أنه لا يرضى بذلك حرم وفي الخلاصة لو ناول الخادم الذي على رأس المائدة جاز، وأما رفع الطعام من بيته لمكان آخر فلا يحل إلا أن يأذن له صاحب الطعام في ذلك. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، ج٨ص ٢٣٤).

[4] **شامی اور محیط وغیرہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ پینے کے لئے رکھے ہوئے پانی سے وضوء جائز نہیں جبکہ وضوء کے لئے رکھے ہوئے پانی کو پینا جائز ہے، امام ابو علی نسفی اور ان کے استاد امام ابن الفضل رحمہما اللہ کا موقف اس کا برعکس نقل کیا گیا ہے، لیکن اصولی اور راجح بات وہی ہے جو مؤلف رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے کہ اس کا دار مدار پانی رکھنے والے کے صراحۃً یا دلالۃً اجازت دینے پر ہے، فتاویٰ قاضی خان میں کیا خوب فرمایا**

:" والمباح في نوع لا يجوز استعماله في نوع آخر". فتاوى قاضيخان، باب التيمم، ج١ص٢٨.

حکومت کے اختیارات

حکومت کے لئے جائز نہیں کہ مباح چیزوں پر قبضہ کر کے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کو مٹانے کے درپے ہو، اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کو بے زاد سرمایہ بنالے کہ جنگل کی گھاس، دریا کا پانی، پہاڑ کے پتھر اور جو کچھ ان میں سے نکلے، نہ حکومت ان پر قبضہ کرے نہ کرایہ پر دے، نہ ہی معادن پر اتنا ٹیکس عائد کرے جو معین حقوق سے آگے بڑھ جائیں۔[1]

مسئلہ: البتہ انتظامی طور پر کسی راستہ کو بند کرنا، یا کسی جنگل کو کاٹ دینا، یا جنگل کی گھاس کی پرورش کرنا اور کسی کو دخل نہ دینے کا اختیار نہ دینا جائز ہے۔[2]

مسئلہ: راستہ کی حفاظت، ڈاکو وغیرہ، اسی طرح ایذاء پہنچانے والے جانوروں سے راستہ کی حفاظت درستگی وانتظام، امن وآسائش کے لئے اسباب فراہم کر کے تجارت کی توسیع میں مصارف منظور کرنا، اسی طرح لوگوں کے آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنا، اور ناجائز وعدوں سے روکنا، یہ سب کام حکومت کی ذمہ داری میں داخل ہے، مگر ان تمام امور کا ایسا نتیجہ پیدا کرنا جس سے مباح چیز اور خرید کردہ چیز میں فرق باقی نہ رہے، حکومت کی آمدنی مصارف متوسطہ سے بڑھ جائیں اور عام لوگوں کو تکلیف پہنچے، یہ جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: ملکی ضرورت کی خاطر کسی جنگل کی لکڑی، یا کسی معادن کی چیزوں کو حکومت کے لئے مخصوص کرلینا، اوروں کے لئے ممنوع کردینا، یا کسی جانور کو خاص کرلینا، تاکہ ملک کو قوت حاصل ہو، مجاہدین کو تقویت ملے، یا عام لوگ نقصان سے بچ جائیں یا دشمن کے حملوں سے محفوظ رہیں، ایسی ضرورتوں کے لئے حکومت سب کچھ کرسکتی ہے[1]۔إنّما الأعمالُ بالنيّاتِ.

---

[1] تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة.(الأشباه والنظائر لابن نجيم، الفن الاول،ص: ١٠٤).

(تنبيه) إذا كان فعل الإمام مبنيا على مصلحة فيما يتعلق بالأمور العامة لم ينفذ أمره شرعا إلا إذا وافقها، فإن خالفها لا ينفذ ولهذا قال الإمام أبو يوسف في كتاب الخراج من باب إحياء الموات وليس للإمام أن يخرج شيئا من يد أحد إلا بحق ثابت معروف. اهـ. (تنقيح الفتاوى الحامدية ،كتاب الشرب، ج٢ ص ٢١٤).

[2] [تنبيه] إذا أمر الإمام بالصيام غير الأيام المنهية وجب لما قدمناه في باب العيد من أن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة.(الدر المختار مع حاشية ابن عابدين (كتاب الصلاة،باب الاستسقاء، ج٢ص١٨٥).

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض فكيف فيما هو طاعة. (البحر الرائق ،باب البغاة، ج٥ ص ١٥٢).

باب پنجم

کفار سے جبراً لئے ہوئے مال کا حکم

جو مال کفار سے جبراً و قہراً چھینا جائے یا حاکم کے ذریعے یا ان کی مدد سے حاصل ہو، اس کی دو قسمیں ہیں: ملک عین، ملک منافع۔

ملک عین کی دو قسمیں ہیں:

مال غنیمت کے احکام:

مال غنیمت وہ مال (ہے) جو کفار سے لڑائی یا لڑائی کے بغیر قہر و غلبہ سے ہاتھ آئے، اس کی کئی شرطیں ہیں:

۱۔ کافر حربی سے حاصل ہو۔[2]

۲۔ قہر و غلبہ سے چھینا جائے، خوشامد، چوری، دھوکہ فریب یا کسی چیز کا عوض، ہبہ، صدقہ وغیرہ نہ ہو۔[3]

۳۔ وہ مال دار الحرب سے دار الاسلام لایا جائے۔[4]

---

[1] أنظر الحاشية المتقدّمة.

[2] الغنيمة اسم لمال مأخوذ من الكفرة بالقهر والغلبة والحرب قائمة قبل الإحراز بدار الإسلام، فأما ما أخذ لا على القهر والغلبة بل بالمهاداة والهبة منهم أو بالسرقة أو الخلسة منهم لا يكون غنيمة، ويكون للأخذ خاصة..وما يؤخذ منهم هدية أو سرقة أو خلسة أو هبة فليس بغنيمة وهو للآخذ خاصة.(الفتاوى الهندية ،الباب الرابع في الغنائم، الفصل الاول، ج٢ ص ٢٠٤).وكذا في تحفة الفقهاء (كتاب السير،ج٣ ص ٣٠٣).

[3] ايضا.

[4] یہ مال غنیمت میں غازی کے ملکیت متاکد ہونے کے لئے شرط ہے، کافر کے ہاتھ سے چھیننے کے ساتھ غازی کا حق ملک ثابت ہو جاتا ہے پھر دار الاسلام میں لانے کے ساتھ اس حق میں مزید پختگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ہنوز کسی غازی کی ملکیت خاصہ ثابت نہیں ہوتی جبکہ دار الاسلام میں جا کر مال کو شرعی طریقہ کے مطابق تقسیم نہ کریں۔(تفصیل کے لئے دیکھئے: تحفۃ الفقہاء، کتاب السیر، الغنائم، ص ۵۵۲۔ البحر الرائق، کتاب السیر، باب الغنائم و قسمتہا ج ۵ ص ۹۱۔ فتح القدیر، کتاب السیر، باب الغنائم و قسمتہا ج ۵ ص ۴۷۹)

۴۔امام مسلمین اس مال کو مسلمانوں میں تقسیم کردے، دار الاسلام میں محفوظ کرنے اور تقسیم کرنے سے پہلے ملک تصرف تو حاصل نہیں ہے مگر حسب ضرورت استعمال جائز ہے مگر مالک بننے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے نہیں، مثلاً کھانا، پانی، گھاس، دوائی۔ حربی آلات کا بوقت حاجت استعمال کرنا جائز ہے جو باقی بچے پھر اسی مال میں واپس ملادے۔ [1]

مال غنیمت کا حکم

مال غنیمت مملوک ہے اور انتہائی حلال مال ہے، اس میں پہلے پانچواں حصہ نکال کر فقراء و مساکین، بنوہاشم، یتامیٰ، اور مسافرین کو دیا جائے اور چار حصے باقی مجاہدین میں تقسیم کردئے جائیں۔ [2]

مسئلہ نمبر: کافر بھی اگر مسلمانوں کے مال پر قابو پاجائیں تو مالک ہو جائیں گے اور ہم ان سے خرید سکتے ہیں، مگر ہم کفار کی جانوں کے مالک ہو سکتے ہیں، ان کو غلام باندی بنا کر رکھ سکتے ہیں، فروخت کر سکتے ہیں، وہ مسلمانوں کے مالک نہیں بن سکتے اور مسلمانوں کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ [3]

دار الاسلام اور دار الکفر کا بیان

حکومت اور دار الاسلام کا بھی مالی احکام میں بہت دخل ہے اس لئے ان کو بیان کر ضروری ہے۔

---

[1] ويجوز للعسكر أن يعلفوا في دار الحرب، ويأكلوا الطعام، ويدهنوا بالدهن، ويقاتلوا بالسلاح، ويركبوا الدواب، ويلبسوا الثياب إذا احتاجوا إلى ذلك.(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب السير، الغنائم،ج٤ ص١٢٧).

يجوز له الانتفاع بالغنيمة قبل الإحراز بدار الإسلام بغير إذن الإمام منها تناول الطعام عند الحاجة بقدر حاجته. (فتاوى قاضيخان ،كتاب السير، فصل في الامان،ج٣ ص ٣٥٤).

[2] ينبغي للإمام أن يرفع من الغنية خمسها ويقسم هذا الخمس على ثلاثة أسهم لليتامى والمساكين وأبناء السبيل. وإن صرف الخمس إلى صنف واحد من الأصناف الثلاثة جاز عندنا.. ثم يقسم الأربعة الأخماس بين الجند. (فتاوى قاضيخان ،كتاب السير، فصل في قسمة الغنائم ،ج٣ ص ٣٥٥).

يجب على الإمام أن يقسم الغنيمة ويخرج خمسها لقوله تعالى {فأن لله خمسه}ويقسم الأربعة الأخماس على الغانمين للنصوص الواردة فيه وعليه إجماع المسلمين.(تبيين الحقائق ،كتاب السير،باب الغنائم وقسمتها،فصل في كيفية القسمة،ج٣ ص ٢٥٤).

[3] ولا خلاف في أنهم أيضا إذا استولوا على رقاب المسلمين، ومدبريهم، وأمهات أولادهم، ومكاتبيهم، أنهم لا يملكونهم، وإن أحرزوهم بالدار واختلف فيما إذا دخلوا دار الإسلام فاستولوا على أموال المسلمين، وأحرزوها بدار الحرب قال علماؤنا: يملكونها.(بدائع الصنائع ،كتاب السير، حكم الاستيلاء من الكفرة على اموال المسلمين،ج٧ ص ١٢٧).

وكذا في فتاوى قاضيخان (كتاب السير، فصل في استيلاء أهل الحرب على أموال المسلمين)،ج٣ص ٣٥٥).

واضح رہے کہ شرعاً دنیا کے دو حصے ہیں: دار الاسلام۔ دار الکفر۔

دار الاسلام کی تعریف: وہ علاقہ جہاں کفار کی طرف سے مزاحمت کے بغیر شرعی احکام نافذ و شائع ہو سکیں، وہاں کوئی مستقل حاکم موجود ہو یا کفار کے ماتحت باج گزار۔ [1]

دار الکفر کی تعریف: وہ علاقہ جہاں نہ مسلمان حاکم موجود ہو نہ شرعی احکام کے اجراء کی تاکید۔

دار الکفر کے احکام

۱۔ وہاں بلاضرورت اقامت و سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں الّا یہ کہ ضروریات نماز، روزہ، حج وغیرہ کی ادائیگی کی اجازت ہو اور عقائد اسلام کا اظہار ممکن ہو اور امن حاصل ہو۔ [2]

۲۔ قضائے شرعی نافذ نہ ہو جیسے حدود اور قصاص وغیرہ، اگرچہ ایسے افعال کا مرتکب گناہ گار ہوگا۔ [3]

۳۔ دار الحرب میں جہالت عذر سمجھا جائے گا یعنی احکام شرعی نہ جاننے والا عند اللہ معذور ہوگا، البتہ دار الکفر میں علماء اسلام کی بڑی تعداد موجود ہو اور اسلامی احکام کی تعلیم بلا روک وٹوک شائع ہو تو جہل عذر نہیں۔ [1]

---

[1] (وجه) قولهما أن قولنا دار الإسلام ودار الكفر إضافة دار إلى الإسلام وإلى الكفر، وإنما تضاف الدار إلى الإسلام أو إلى الكفر لظهور الإسلام أو الكفر فيها، كما تسمى الجنة دار السلام، والنار دار البوار؛ لوجود السلامة في الجنة، والبوار في النار وظهور الإسلام والكفر بظهور أحكامهما. بدائع الصنائع، كتاب السير، معنى الدارين دار الإسلام ودار الكفر، ج٧ ص ١٣٠. دار الإسلام: هو ما يجري فيه حكم إمام المسلمين ودار الحرب: ما يجري فيه أمر رئيس الكافرين. وفي " الزاهدي ": دار الإسلام ما غلب فيه المسلمون وكانوا فيه آمنين، ودار الحرب: ما خافوا فيه من الكافرين. الكليات، فصل "الدال" ص: ٤٥١.

[2] وقال بعضهم معناه أن الله قد فرق بين داري الإسلام والكفر فلا يجوز لمسلم أن يساكن الكفار في بلادهم حتى إذا أوقدوا ناراً كان منهم بحيث يراها. وفيه دلالة على كراهة دخول المسلم دار الحرب للتجارة والمقام فيها أكثر من مدة أربعة أيام. (معالم السنن، كتاب الجهاد، من باب على ما يقاتل المشركون، ج٢ ص٢٧٢).

اني أكره أن يكون ولده بأرض الحرب، وأكره الإقامة بها. (الأصل للشيباني، باب فيمن دخل أرض الحرب مستأمناً للتجارة، ج٧ ص٤٨٧).

يجوز للمسلم أن يتزوج كتابية في دار الحرب، ولكنه يكره؛ لأنه إذا تزوجها ثمة ربما يختار المقام فيهم وقال: صلى الله عليه وسلم أنا بريء من كل مسلم مع مشرك لا تراءى ناراهما. (المبسوط للسرخسي، كتاب النكاح، باب نكاح أهل الحرب، ج٥ ص ٥٠).

[3] أن المسلم إذا ارتكب شيئا من الأسباب الموجبة للعقوبة في دار الحرب فإنه لا يكون به مستوجبا للعقوبة. (شرح السير الكبير، باب الحدود في دار الحرب، ج١ ص ١٨٥١).

لا يجب الحد بالزنا في دار الحرب أو في دار البغي لقوله عليه السلام لا تقام الحدود في دار الحرب. (البحر الرائق، كتاب الحدود، باب الوطئ الذي يوجب الحد، ج٥ ص ١٨).

عدمِ توارث

۴۔ایک ملک میں رہنے والا کافر دوسرے ملک میں رہنے والے کافر کا وارث نہ ہوگا،اگرچہ آپس میں قریبی رشتہ داری ہو، بخلاف مسلمانوں کے وہ مشرق و مغرب میں جہاں بھی آباد ہوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، کیونکہ مسلمانوں کا قانون ایک ہی ہے میراث نظم مملکت میں داخل ہے یہ نظم اسلام میں متحد ہے اگرچہ شامت اعمال سے نہ کیا جائے اور دین کفر میں ہر شخص اپنے قانون کا مختار ہے اگرچہ کسی مصلحت سے متحد نظر آئیں۔[2]

عدمِ عصمت

۵۔یعنی دار الحرب میں نہ جان محفوظ ہے کہ ان کا قتل حرام ہو بلکہ حربی کافروں کو غلام بنالینا اور ان کا مال زبردستی چھین لیناسب جائز ہے، مگر یہ کہ دار الحرب کے باشندے مسلمان ہوں تو مسلمان جہاں کہیں ہوں ان کی جان اور مال شرعاً محفوظ ہیں، اسی طرح اگر کفار اور مسلمانوں کے آپس میں امن کا صلح ہو تب بھی کسی قسم کی دست درازی جائز نہیں ہے۔[3]

---

[1] لا يعذر بالجهل في دار الإسلام، بخلاف من أسلم في دار الحرب ولم يعلم به فإنه لا يجب عليه ما لم يعلم. (رد المحتار، كتاب الصوم، ج٢ ص ٣٧١).

الثالث: الجهل في دار الحرب من مسلم لم يهاجر وإنه يكون عذرا ويلحق به.(الأشباه والنظائر لابن نجيم).وفي شرح الحموي تحته: قوله: وإنه يكون عذرا. حتى لو مكث فيها ولم يعلم أن عليه الصلاة والزكاة وغيرهما ولم يؤدها لا يلزم عليه قضاؤها خلافا لزفر لخفاء الدليل في حقه، وهو الخطاب لعدم بلوغه إليه حقيقة بالسماع وتقديرا بالشهرة فيصير جهله عذرا بخلاف الذمي إذا أسلم في دار الإسلام لشيوع الأحكام والتمكن من السؤال. (،الفن الثالث،الجهل، ج٣ ص ٣٠٠).

[2] ان اختلاف الدارين فيما بين أهل الحرب يمنع التوريث، بمنزلة اختلاف الدينين. (شرح السير الكبير۔باب المرتد في دار الحرب ومعه ولده، ج١ص ١٩٢١).المانع من الإرث: الرق والقتل واختلاف الملتين، واختلاف الدارين حكما. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الفرائض، ج٥ص ٨٦).

[3] واحترز به (أي بمحقون الدم) عن مباح الدم كالزاني المحصن والحربي والمرتد، والمراد الحقن الكامل، فمن أسلم في دار الحرب فقد صار محقون الدم على التأبيد، ولا يقتص من قاتله هناك؛ لأن كمال الحقن بالعصمة المقومة والمؤثمة وبالإسلام حصلت المؤثمة دون المقومة؛ لأنها تحصل بدار الإسلام.حاشية ابن عابدين على الدر المختار،فصل فيما يوجب القود وما لايوجبه، ج٦ص ٥٣٢.

(والقصاص واجب بقتل كل محقون الدم على التأبيد) وهو المسلم والذمي بخلاف الحربي والمستأمن، لأن الأول غير محقون الدم، والثاني، وإن كان محقون الدم في دارنا لكن لا على التأبيد، لأنه إذا رجع صار مباح الدم. اللباب في شرح الكتاب،كتاب الجنايات، ج٣ص ١٤٣.

مسئلہ: جو مال ایسے دار الحرب سے لایا جائے جن سے کوئی امن معاہدہ نہیں ہے یا کفار سے جو مال زبردستی لیا جائے یا حیلہ کرکے لایا جائے، سب حلال ہیں [1]، لیکن اگر مال کفار ایسی رضامندی سے ملے جو شرعاً رضا نہ ہو تو وہ حلال نہیں ہے جیسے سود، جوا، زنا کی اجرت وغیرہ، تو ان میں ملک تو آئے گی کیونکہ ان کا مال غیر محفوظ ہے لیکن استعمال حلال نہ ہو گا کیونکہ شرعی طریقہ سے وصول نہیں ہوا۔ [2]

مسئلہ: اور جو مال کفار کے ایسے ممالک سے لیا جائے جن سے مصلحت اور معاہدہ ہے، زبردستی لیا جائے یا حیلہ سے، دونوں صورتوں میں ملک بھی ثابت نہ ہو گی اور استعمال بھی حرام ہو گا [3]، اور اگر حربی سے مال ایسی رضاء سے لیا جائے جو شرعاً ممنوع ہے جیسے آزاد کی بیع، سود، جوا وغیرہ، تو ملک حاصل ہو جائے گی صورت رضاء کی رعایت سے لیکن حلت حاصل نہ ہو گی شریعت کی مخالفت کی وجہ سے، اگر وہ رضاء شرعاً معتبر ہے یا مسکوت عنہ ہے تو ملک بھی آئے گی اور حلال بھی ہو گا۔ [4]

اس سے ظاہر ہوا جو لوگ دار الحرب میں امن (ویزا) لے کر رہتے ہوں یا داخل ہوتے ہوں، یا آپس میں مصلحت اور عہد و پیمان ہو، انہیں ایسا کوئی معاملہ کرکے مال حاصل کرنا جائز نہیں جو کہ شرعاً حرام ہو جیسے بیع فاسد یا اجارہ فاسدہ و باطلہ، یا شرط فاسد یا رشوت وغیرہ، ہرگز جائز نہیں۔

"لا ربوا بین المسلم والحربی" کا مطلب

اس حدیث مشہور کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان دار الحرب میں کافر سے سود لے تو اس کو سود خور اور اس پر سود خوری کا وبال تو نہ ہو گا اگرچہ ملک حرام حاصل کرنے کا وبال ضرور ہو گا، مگر کفار کو مال دینا کسی طور پر جائز نہ ہو گا مگر اس وقت جب کہ اس سود لینے والے کا وہاں کے لوگوں عہد و معاہدہ ہو یا مستقل وہاں کا

---

[1] لأن مال الحربي مباح، ولكن المسلم بالاستئمان ضمن لهم أن لا يخونهم، وأن لا يأخذ منهم شيئا إلا بطيبة أنفسهم، فهو يتحرز عن الغدر بهذه الأسباب. (المبسوط للسرخسي ،كتاب الصرف، باب الصرف في دار الحرب، ج١٤ص ٥٧).

أن مال الحربي ليس بمعصوم بل هو مباح في نفسه، إلا أن المسلم المستأمن منع من تملكه من غير رضاه لما فيه من الغدر والخيانة. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط جريان الربا، ج٥ ص ١٩٢).

[2] یہ بظاہر حضرت امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے، ان کے نزدیک اس جیسی رضاء کا کوئی اعتبار نہیں ہے لہذا دار الحرب میں بھی سودی معاملات کرنا ناجائز ہے اور حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے نزدیک یہی قول راجح بھی ہے۔

[3] لانة غدر وخيانة كمامرّ.

[4] ايضا.

باشندہ ہو تو اس کے لئے سود لینا بھی جائز نہیں ہے۔[1]

مسئلہ: اگر مسلمانوں کی کسی جماعت نے کفار سے صلح کرلی تو صلح کا اثر اسی جماعت پر مرتب ہوگا جن کے سربراہ نے صلح کی دوسری جماعت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ان پر صلح کا اثر نہیں ہوگا، دلیل اس کی صلح حدیبیہ ہے جس سے ابو نصیر مستثنی سمجھے گئے، یہ حکم سورۃ انفال کی آخری آیات سے مستفاد ہے۔[2]

رکاز کا حکم بیان

رکاز یعنی وہ گاڑا ہوا یا چھپا یا ہوا مال جو دریا، پہاڑ، یا زمین کے اندر سے نکالا جائے، پس اگر وہ خلقی ہے جیسے سیسا، لوہا، تو معدن ہے اور اگر وضعی ہے جیسے زیورات، درہم و دینار وغیرہ، اس کو کنز کہتے ہیں۔[3]

پھر کنز کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کنز الاسلام: جو اسلامی عہد حکومت میں دفن کیا گیا ہو یا دریا میں غرق کیا گیا ہو جس کی شناخت گواہی سے ہوسکتی ہے یا علامت یا قرائن سے جیسے سکہ اسلامی یا طرز اسلامی وغیرہ۔

۲۔ کنز الکفر: یعنی جس دفینہ کے متعلق خیال ہو کہ کفر کے زمانے کا ہے یعنی کوئی شہادت یا علامت کفر کی پائی جائے اور اگر اسلامی کا کفر کے ہونے کی علامت نہ پائی جائے اور نہ کوئی قوی قرینہ پایا جائے تو کنز مشتبہ ہے،

---

[1] ملکیت میں حرمت اسباب وذرائع کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اگر ذریعہ ملک حرام و غیر مشروع ہو تو اس سے حاصل ہونے والا ملک بھی ملک خبیث اور ملک حرام ہے، اس تشریح کے بنیاد پر عبارت کا معنی یہ ہوا کہ مال معصوم نہ ہونے کی وجہ سے سود کا گناہ تو نہیں ہوگا البتہ اس کا عقد حرام ہے لہذا اس کا گناہ ہوگا، حضرات طرفین کے قول کے توجیہ کے ضمن میں تقریباً یہی مطلب حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور حکیم الامت حضرت تھانوی صاحب رحمہما اللہ نے بھی بیان فرمایا ہیں، ملاحظہ فرمائیں: (رسالہ "رافع الضنک عن منافع البنک" امداد الفتاوی، ج۳ص ۱۵۶)

[2] {وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ} [الأنفال : ۷۲]
أي إن وقع بينهم وبين الكفار قتال وطلبوا معونة فواجب عليكم أن تنصروهم على الكافرين {إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق} فإنه لا يجوز لكم نصرهم عليهم لأنهم لا يبتدئون بالقتال إذ الميثاق مانع من ذلك. تفسير النسفي، ج١ص ٦٥٩.
وإن استنصروكم يعنى المؤمنين الذين لم يهاجروا استنصروكم في الدين على أعدائهم من اهل الحرب فعليكم النصر فواجب عليكم ان تبصروهم عليهم إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق فانه لا يجوز نقض العهد. التفسير المظهري، ج٤ص ١٢٢.

[3] الركاز: المعدن، وهو أعم من المعدن. والكنز والمعدن: ما خلق الله تعالى في الأرض. والكنز اسم لما دفنه بنو آدم. وفي الصحاح الركاز المعدن أو الكنز لأن كلا منهما مركوز في الأرض. (انيس الفقهاء ،ص: ٤٦).
المدفون يسمى كنزا على الخصوص والمال المخلوق في الأرض يسمى معدنا على الخصوص والركاز اسم يحتملهما جميعا.(تحفة الفقهاء، باب المعدن والركاز، ج١ص٣٢٧)

بعض حضرات اسے اسلامی دفینہ میں داخل کرتے ہیں اور بعض دفینہ کفر میں، پھر جہاں یہ دفینہ پایا جائے اس کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ارض مباح یعنی سرکاری اراضی۔

۲۔ عشری یا خراجی۔

۳۔ارض مملوک، یعنی کسی کی مملوکہ زمین پائی جائے۔

۴۔ محفوظ یعنی کسی کے گھر میں ملے۔

دفینہ میں خمس کا حکم

۱۔ جو معدنیات دھات قسم کی ہو جیسے لوہا، سیسا، تانبا، رانگا، پارہ، سونا، چاندی، پیتل، اسے منطبع یعنی پگھلانے سے پگھل جائے، ان کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے۔[1]

۲۔ دوسری قسم کی معدنیات جو پگھلنے والی نہیں ہیں جیسے نمک، کوئلہ، جواہرات، وغیرہ، ان میں کچھ بھی لازم نہیں، جو ملے ان کا استعمال حلال ہے[2]، ہاں اگر حکومت کسی مصلحت سے کچھ حق حفاظت وغیرہ متعین کرے بشرطیکہ اس کی مقدار خمس سے کم ہو تاکہ شرعی معافی کا اثر بالکل ختم نہ ہو جائے۔[3]

۳۔ ملازم کو ملازمت کے دوران جو کچھ دفینہ ملے وہ مالک کا حق ہو گا۔[1]

---

[1] أما المنطبع كالذهب والفضة والحديد والرصاص والنحاس والصفر ففيه الخمس. (الفتاوى الهندية ،كتاب الزكاة،الباب الخامس في المعادن والركاز،ج۱ص ۱۸٤).

وكذا في مجمع الأنهر: (كتاب الزكاة،باب الركاز،ج۱ ص ۲۱۲).

[2] اعلم أن المستخرج من المعدن ثلاثة أنواع جامد يذوب وينطبع كالنقدين والحديد وجامد لا ينطبع كالجص والتورة والكحل والزرنيخ وسائر الأحجار كالياقوت والملح، والثالث: ما ليس بجامد كالماء والقير والنفط ولا يجب الخمس إلا في النوع الأول. (الدرر والغرر،كتاب الزكاة،باب الركاز،ج۱ص ۱۸٤).

وأما المائع كالقير والنفط والملح، وما ليس بمنطبع، ولا مائع كالنورة والجص والجواهر واليواقيت فلا شيء فيها. (الفتاوى الهندية ،كتاب الزكاة،الباب الخامس في المعادن والركاز،ج۱ص ۱۸۵).

[3] اس کا کوئی صریح حوالہ نہیں مل سکا، اور حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے شاید یہ مقدارِ خمس سے کم ہونے کی قید اس ضابطہ کی بنیاد پر بڑھایا ہو جو فقہاء کرام نے نذر کی بحث میں ذکر فرمایا ہے کہ "إيجاب العبد يعتبر بإيجاب الله تعالى".

۴۔ کرایہ کی زمین میں کرایہ دار کو جو کچھ ملا وہ مالک کا ہوگا۔ [2]

۵۔ دفینہ میں شرکت باطل ہے مثلاً دو آدمی شریک ہو کر معدن کھودیں تو جس کو جتنا ملے وہ اسی کا ہے دوسرے کو صرف اجرت دلائی جائے البتہ دونوں خوشی سے آپس میں تقسیم کریں تو جائز ہے [3](یعنی قاضی تقسیم کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے، ہاں وعدہ کے لحاظ سے دونوں پابند ہیں)

۶۔ دفینہ کے خمس کا مصرف نہ ملے اور بیت المال بھی شرعی اصول کے مطابق نہ ہو تو مناسب یہ ہے کہ دفینہ کا مالک خود فقراء، مساکین، بنو ہاشم اور مسافرین میں تقسیم کردے۔ [4]

۷۔ جو حربی کافر دار الاسلام میں ویزا لے کر آئے اور کان کھودے، اگر اس سے کل یا بعض حصہ دینے کا وعدہ ہو تو وعدہ کے مطابق اس کو حصہ ملے گا، اگر کوئی شرط نہیں تھی تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ [1]

---

[1] قلت: أرأيت الرجل يتقبّل المكان من المعدن من السلطان فيستأجر فيه أجراء، فيخرجون منه أموالاً، لمن تكون تلك الأموال؟ قال: للمستأجر الذي استأجرهم، ويخمس كله، وما بقي فهو له. (الأصل للشيباني ،كتاب الزكاة، باب الذهب والفضة والركاز والمعدن، ج٢ص ١١٨).

إذا استأجر أجراء للعمل في المعدن فالمصاب للمستأجر؛ لأنهم يعملون له.(البحر الرائق ،كتاب الزكاة، باب الركاز، ج٢ص ٢٥٢).

[2] لا خمس في معدن وجده في داره أو أرضه فاتفقوا على أن الأربعة الأخماس للمالك سواء، وجده هو أو غيره؛ لأنه من توابع الأرض بدليل دخوله في البيع بغير تسمية فيكون من أجزائها.(البحر الرائق ،كتاب الزكاة، باب الركاز، ج٢ص ٢٥٣).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الزكاة، باب الركاز، ج١ص ٢١٣).

[3](ولا تصح فيما لا تصح الوكالة به كالاحتطاب والاحتشاش) ; لأن الوكالة في ذلك باطلة ; لأنها مباحة ; لأن الآخذ يملكه بدون التوكيل فيكون فاعلا لنفسه، ومن ذلك اجتناء الثمار من الجبال والاصطياد وحفر المعادن وأخذ الملح والجص والكحل وغيرها من المباحات (وما جمعه كل واحد منهما فهو له) دون صاحبه ; لأنه مباح سبقت يده عليه (فإن أعانه الآخر فله أجر مثله) بالغا ما بلغ. (الاختيار لتعليل المختار، كتاب الشركة، ج٣ص ١٦).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، ج٤ص ٣٢٥).

[4] كما ذكروا في نصب المتولي، ففي البحر :

ومشايخنا المتقدمون يجيبون عن هذه المسألة ويقولون نعم والأفضل أن يكون ذلك بإذن القاضي ثم اتفق المشايخ المتأخرون وأستاذونا أن الأفضل أن ينصبوا متوليا ولا يعلموا القاضي في زماننا لما عرف من طمع القضاة في أموال الأوقاف.(البحر الرائق ،كتاب الوقف، ج٥ص ٢٥١).

وكذا في حاشية ابن عابدين على الدر المختار(كتاب الوقف، مطلب الأفضل في زماننا نصب المتولي بلا إعلام القاضي وكذا وصي اليتيم، ج ٤ص٤٢٢).

۸۔ مسلمان دار الحرب میں ویزہ لے کر داخل ہو اوہاں کوئی دفینہ ملے تو ایسا مال انہی کو واپس کر دے، اگر چوری کر کے یا دھو کہ دے کر یا بطور جو اوہاں سے لائے گا تو مالک تو ہو جائے مگر مال خبیث ہے اور اس میں خمس نہیں ہے البتہ مسلمان کا کفار سے یہ معاہدہ ہو جائے کہ دفینہ کا کل یا بعض حصہ لے گا تو لینے کا حق ہو گا اس میں خمس واجب نہ ہو گا، خمس صرف ان دفینوں میں ہے جو اسلامی ملک میں دستیاب ہو یا دار الحرب سے قہر و غلبہ کے ساتھ لایا جائے۔[2]

دفینہ کا حکم

ا۔ مذکورہ بالا تقریر سے معلوم ہوا کہ جو مالِ رکاز ملے خواہ معدنی پگھلنے والا ہو یا مسلمانوں کا یا کفار کا دفینہ ہو، اور جہاں ملے وہ مقام خواہ سرکاری زمین ہو جو کسی کی ملک نہیں، خواہ عشری یا خراجی ہو یا مملوک و محفوظ، یہ بارہ مسئلے ہوئے، مسلمانوں کا دفینہ عشری یا خراجی زمین میں ملے وہ لقطہ کے حکم میں ہو گا۔[3]

۲۔اور مملوکہ زمین یا محفوظ مقام میں ملے تو خزانہ دفینہ اسی کو دیا جائے گا جس کو یہ زمین امام مسلمین نے مال غنیمت کے طور پر پہلے مرتبہ دیا تھا، اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے ورثا کو، اگر ان کا بھی پتہ نہ چلے تو اس مسلمان مالک کو دیا جائے گا جس سے پہلے کا مالک معلوم نہ ہو ورنہ بیت المال کا حق ہے۔[1]

---

[1] (خلا حربي مستأمن) فإنه يسترد منه ما أخذ (إلا إذا عمل) في المفاوز (بإذن الإمام على شرط فله المشروط). (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، كتاب الزكاة، باب الركاز، ج٢ص ٣٢٣).

(وما) أي المعدن الذي (وجده الحربي) في دارنا (فكله فيء) كما قررناه آنفا. (مجمع الأنهر، كتاب الزكاة، باب الركاز، ج١ص ٢١٣).

[2] أما إذا كان في أرض مملوكة فإن دخل بأمان فعليه أن يرده إلى صاحب الأرض حتى لا يؤدي إلى الغدر والخيانة في الأمان، ولو لم يرده وأخرجه إلى دار الإسلام يكون ملكا له ولا يطيب له كالمملوك بشراء فاسد ولو باعه يصير ملكا للمشتري وأما إذا دخل بغير أمان حل له ذلك ولا خمس فيه. (تحفة الفقهاء، كتاب الزكاة، باب المعدن والركاز، ج١ص ٣٢٩). وكذا في البحر الرائق: (كتاب الزكاة، باب الركاز، ج٢ص ٢٥٤).

[3] إن كان فيه علامات الإسلام كالمصحف والدراهم المكتوبة فيها الشهادة، وما أشبه ذلك، فهو بمنزلة اللقطة... هذا لأنه إذا كان فيه علامات الإسلام، فالظاهر أنه من وضع المسلمين، ومال المسلم لا يصير غنيمة، والمالك ليس بمعلوم، فيكون له حكم اللقطة. (المحيط البرهاني، كتاب الخراج، الفصل الثامن في المتفرقات، ج٢ص٣٦٦). وكذا في بدائع الصنائع (كتاب الزكاة، حكم المستخرج من الارض، ج٢ص ٦٥).

۳۔ وہ معدنیات جو سیال ہوں، وہ اسی کا حق ہے جس کو ملا، مگر مباح اور عشری زمین میں بالاتفاق خمس لازم ہو گا، اگر گھر میں ملا ہو تو کچھ واجب نہیں، مملوکہ زمین میں اکثر کے نزدیک خمس واجب نہیں ہے۔[2]

۴۔ کفار کا دفینہ جہاں بھی ملے اسی کا حق ہے جس کو یہ دفینہ ملا ہے، البتہ مباح، عشری اور خراجی زمین میں خمس واجب ہے، مملوکہ زمین میں اختلاف ہے، گھر میں ملے تو خمس معاف ہے۔[3]

لقطہ کا حکم

یعنی وہ چیز جو پڑی ہوئی ملے اس میں خمس واجب نہیں ہے، البتہ اس کا علان کیا جائے، اگر کوئی دلیل شرعی سے اس پر اپنی ملک ثابت کر دے تو اس کو دیدیا جائے گا، اگر کسی وجہ سے مالک کے آنے تک انتظار نہ کیا جاسکے یا وہ چیز انتظار کے قابل نہ ہو یا اعلان کرنے میں کوئی خوف وخطرہ لاحق ہو تو اس لقطہ

---

[1] وإن وجد في أرض مملوكة اتفقوا جميعا على وجوب الخمس فيه واختلفوا في أربعة أخماسه قال أبو حنيفة رحمه الله تعالى هي لصاحب الخطة .. وفي الفتاوى العتابية إذا كان صاحب الخطة ذميا فلا شيء له فإن لم يعرف المختط له، ولا ورثته يصرف إلى أقصى مالك في الإسلام يعرف له .. وإلا يكون لبيت المال.(الفتاوى الهندية ،كتاب الزكاة، قبيل الباب السادس في زكاة الزرع والثمار ،ج١ ص ١٨٥).وكذا في النهر الفائق (كتاب الزكاة، باب الركاز،ج١ ص ٤٥١).

[2] یہ بظاہر حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی تسامح ہے، سیّال معدنیات میں خمس لازم نہیں ہوتا۔
وأما المائع كالقير والنفط فلا شيء فيه ويكون للواجد؛ لأنه ماء وأنه مما لا يقصد بالاستيلاء فلم يكن في يد الكفار حتى يكون من الغنائم فلا يجب فيه الخمس. (بدائع الصنائع ،كتاب الزكاة، حكم المستخرج من الارض،ج٢ ص ٦٧).
وأما المائع كالقير والنفط والملح، وما ليس بمنطبع، ولا مائع كالنورة والجص والجواهر واليواقيت فلا شيء فيها كذا في التهذيب. (الفتاوى الهندية ،كتاب الزكاة، قبيل الباب السادس في زكاة الزرع والثمار ،ج١ ص ١٨٥).
وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الزكاة، باب الركاز،ج٢ ص ٣٢٢).

[3] مباح یا عشری زمین وغیرہ کی صورت میں بھی علی الاطلاق عشر لازم نہیں بلکہ تب لازم ہو گا جب کہ قوت وشوکت کے ساتھ مسلمان ان چیزوں کے مالک بن جائیں۔
ولو وجد مسلم ركازا أو معدنا في دار الحرب في أرض غير مملوكة لأحد فهو للواجد، ولا خمس فيه. (الفتاوى الهندية ،كتاب الزكاة، قبيل الباب السادس في زكاة الزرع والثمار ،ج١ ص ١٨٥).
(وإن وجد).. (ركاز متاعهم) أي دخل رجل ذو منعة دار الحرب ووجد ركاز متاعهم أي ما يتمتع وينتفع به قيل الأواني وقيل الثياب (في أرض منها) أي من دار الحرب (غير مملوكة) قيده ليفيد الحكم بالأولوية في المملوكة لكون المأخوذ غنيمة (خمس وباقيه له) (مجمع الأنهر ،كتاب الزكاة، باب الركاز،ج١ص ٢١٤).
(ولا يخمس ركاز) معدنا كان أو كنزا (وجد في) صحراء (دار الحرب) بل كله للواجد ولو مستأمنا لأنه كالمتلصص(و) لذا (لو دخله جماعة ذو منعة وظفروا بشيء من كنوزهم) ومعدنهم (خمس) لكونه غنيمة (الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الزكاة، باب الركاز،ج٢ ص ٣٢٢).

کو صدقہ کردے، مگر جب اس کا ملک نکل آئے تو مالک کو دو باتوں کا اختیار ہو گا یا تو مال اٹھانے والے سے اپنا مال واپس لے یا صدقہ پر خوش ہو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے۔[1]

مسئلہ نمبر: اگر لقطہ پانے والا فقیر ہے تو اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ لقطہ کو اپنے استعمال میں لائے۔[2]

سرکاری خزانہ کا حکم

وہ حقوق اور اموال جو حکومت کے ذریعے لوگوں سے حاصل کئے جائیں، ان کے مراتب چار ہیں:

اول: وہ مال جو اسلامی حکومت کے ساتھ مختص ہیں، جیسے عشر، زکوۃ، خمس، جزیہ اور لاوارث مال۔

جعل (ٹیکس) کا حکم

یعنی فوجی یا ملکی ضرورت کے لئے عام لوگوں پر مال کی مناسب مقدار متعین کرنا کہ وہ حکومت کو دیا کریں، ٹیکس نافذ کرنا جائز ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں کہ:

۱۔ بیت المال سے انتظام متعذر ہو۔

۲۔ واقعی ضرورت ہو۔[3]

۳۔ حاجت عام ہو۔[4]

---

[1] يعرّفها مدة يغلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها بعد ذلك فإن جاء صاحبها وإلا تصدق بها إن شاء، وإن شاء أمسكها، فإن جاء وأمضى الصدقة فله ثوابه، وإلا له أن يضمنه، أو يضمن المسكين، أو يأخذها إن كانت باقية. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب اللقطة،ج٣ ص ٣٢).

والتفصيل في المبسوط للسرخسي (كتاب اللقطة،ج١١ص ٣).

[2] وإن كان فقيرا فإن شاء تصدق بها على الفقراء وإن شاء أنفقها على نفسه.(بدائع الصنائع ،كتاب اللقطة،ج٦ ص ٢٠٢). (وينتفع بها إن كان فقيرا) كغيره من الفقراء، ويعطيها أهله إن كانوا فقراء لما مر. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب اللقطة،ج٣ ص ٣٣).

[3] یعنی حکومتی مصارف سے اسراف وغیرہ ختم کرنے کے بعد بھی ضرورت باقی رہے اور حکومتی خزانہ سے اس کو پورا نہ کیا جاسکے۔

[4] یعنی غیر ضروری اخراجات کے لئے ٹیکس نہ لگائے، اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ٹیکس بقدر ضرورت ہی مقرر کرے اور لوگوں سے وصول کرنے کا طریقہ کار بھی صاف وشفاف اور معقول ہو۔

(وإن ضمن عن رجل خراجه وقسمته ونوائبه جاز إن كانت النوائب بحق، ككري النهر، وأجرة الحارس، وتجهيز الجيش، وفداء الأسارى) أما الخراج فلأنه دين مطالب به يمكن استيفاؤه فيصح؛ وأما ما ذكر من النوائب فقد صارت كالدين. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الكفالة، ج٢ ص ١٧٢).

دوم: عوام سے حکومت کے حقوق حاصل کرنا ہر حاکم کے لئے جائز ہے جیسے خراج یا ٹیکس۔[1]

سوم: ناجائز اور ظلم کے ذریعہ مال حاصل کرنا جیسے مالی جرمانہ یا کسی اور قسم کا ٹیکس، چنگی جبکہ اصول تجارت کے بنیاد پر نہ ہو یا اور کچھ جبراً لیا جائے۔[2]

چہارم: قضاء اور فیصلہ کے ذریعے جو مال حاصل کیا جاتا ہے، اس میں پانچ باتیں ہیں:

۱۔ دعویٰ۔ ۲۔ دلیلِ دعویٰ۔ ۳۔ دعویٰ کا انکار۔ ۴۔ باہمی فیصلہ۔ ۵۔ حکم

۱۔ مدعی کا دعویٰ جائز وجوہ پر مبنی ہو جیسے ثمن مبیع، اجرت، قرض، امانت، ضمان غصب، وغیرہ یہ دعویٰ ہے اور اس سے ملنے والا مال حلال ہے اگر واقعی ثابت ہو جائے۔

۲۔ جو دعویٰ ناجائز وجوہ پر مبنی ہو جیسے سود، رشوت، جوا، ناجائز معاملات، یہ ابتداءً وانتہاءً ظلم پر مبنی ہیں۔

دعویٰ کی دلیل: کبھی یقینی ہوتی ہے جیسے مدعی کو اپنی حقیقت کا خوب علم ہے، اب فائدہ اٹھانے کے لئے کسی

(والنوائب) قيل هي ما يكون بحق كأجرة الحارس وكري النهر المشترك والمال الموظف لتجهيز الجيش وفداء الأسرى وقيل هي ما ليس بحق كالجبايات التي في زماننا يأخذ الظلمة بغير حق فإن أريد الأول جاز الكفالة بها اتفاقا لأنه واجب مضمون.(الدرر والغرر، كتاب الكفالة، ج٢ ص ٣٠١).

فعلى هذا ما يؤخذ في خوارزم من العامة لإصلاح مسناة الجيحون أو الربض ونحوه من مصالح العامة دين واجب لا يجوز الامتناع عنه، وليس بظلم .. اهـ. قلت: وينبغي تقييد ذلك بما إذا لم يوجد في بيت المال ما يكفي لذلك لما سيأتي في الجهاد من أنه يكره الجعل إن وجد فيء (رد المحتار، كتاب الزكوة، باب العشر، ج٢ص ٣٣٧).

ثم وجب أن يؤمر العامل بالتيسير، وينهى عن الغلول والرشوة، وأن يؤمر القوم بالانقياد له لتتم المصلحة المقصودة، وهذا قوله صلى الله عليه وسلم: إن رجالا يتخوضون في مال الله بغير حق فلهم النار يوم القيامة وقال صلى الله عليه وسلم " من استعملناه على عمل فرزقناه رزقا فما أخذ بعد ذلك فهو غلول " ولعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي، والسر في ذلك أنه ينافي المصلحة المقصودة ويفتح باب المفاسد. (حجة الله البالغة ،ابواب سياسية المدن، الخلافة، ج٢ص ٢٣٣).

[1] لاحِظ الحاشيةَ المتقدّمة.

[2] عن عقبة بن عامر، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «لا يدخل الجنة صاحب مكس.(سنن أبي داود ،كتاب الخراج، باب في السعاية على الصدقة، رقم الحديث:٢٩٣٧).

وفي التبيين أن هذا العمل مشروع، وما ورد من ذم العشار محمول على من يأخذ أموال الناس ظلما كما تفعله الظلمة اليوم.(البحر الرائق ،كتاب الزكاة،باب العاشر، ج٢ ص ٢٤٩).

قال شمس الأئمة هذا كان في ذلك الزمان لأنه إعانة على الحاجة والجهاد، وأما في زماننا فأكثر النوائب تؤخذ ظلما ومن تمكن دفع المظلمة عن نفسه فهو خير له إذا أراد الإعطاء فليعط من هو عاجز عن دفع الظلم عن نفسه لفقر ليستعين به الفقير على الظلم وينال المعطي الثواب. البحر الرائق، كتاب الكفالة، ج٦ص ٢٦١.

امر کی حاجت نہیں، صرف قطعِ حجت اور رفعِ نزاع کے ثبوت اور فیصلے کی ضرورت ہو گی۔ [1]

۳۔ کبھی حق ہونا ظنی ہوتا ہے جیسے کسی معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ اس کا زید پر حق ہے یا کارندہ نے حساب کے ذریعے زید پر زائد حق نکالا، اس میں جب تک مدعیٰ علیہ خود اقرار نہ کرے یا شرعی فیصلہ اس کے لئے مفید نہ ہو جائے کوئی فائدہ حاصل کرنا اس کے لئے حلال نہ ہو گا مگر دعویٰ کرنا جائز ہے۔ [2]

۴۔ کبھی حق ہونا وہمی ہوتا ہے جیسے کسی معتبر شخص نے خبر دی کہ اس کا زید پر حق ہے یا مشکوک حساب سے کسی رقم کا شبہ ہو گیا، اب مدعیٰ علیہ اقرار کرے تو ٹھیک ہے ورنہ نہ دعویٰ جائز ہے نہ اس کے لئے حاصل کردہ مال سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ [3]

۵۔ کبھی خود دلیل میں تردد ہوتا ہے مثلاً مدعی کہتا ہے میں نے تمہارے سے جو گھوڑا خریدا اس میں عیب ہے، مدعیٰ علیہ نے کہا جس بات کو تم عیب کہتے ہو وہ عیب ہی نہیں، یا وہ عیب تو ہے میرے پاس نہیں تھا بلکہ تیرے پاس جانے کے بعد پیدا ہوا ہے یا میں نے اس عیب سے براءت کا اظہار کیا تھا، غرض یہ کہ ہر فریق اپنے استحقاق یا بری ہونے کا کوئی معقول وجہ پیش کرتا ہے، اب دعویٰ کرنا تو جائز ہے مگر جب تک آپس میں صلح کے ذریعے طے نہ پایا جائے یا حکم حکم نہ کر دے اس وقت تک نہ نفع حلال ہے نہ ملک صحیح۔ [4]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو دعویٰ شرعی بنیاد پر یقین کی حد تک پہنچ جائے اور مدعیٰ علیہ کے پاس سوائے سرکشی اور شرارت کے اپنی براءت پر کوئی دلیل نہ ہو وہاں نفع اٹھانے کے لئے گواہ یا فیصلہ کی ضرورت صرف قطع منازعت اور آداب نظم کے لئے ہے، ورنہ اس کے حلال ہونے کے لئے فیصلہ کی

---

[1] واستيفاء الحق لا يتوقف على قضاء القاضي.(بدائع الصنائع ،كتاب الهبة،ج٦ ص ١٣٤)
وولاية استيفاء الحق تثبت على سبيل العموم ولذا لا يتوقف على القضاء. (فتح القدير ، كتاب البيوع، باب خيار العيب، ج٦ص ٣٧٨).

[2] ولو لم يعاين القتل ولا أقر به عنده ولكن شهد عنده شاهدان عدلان على معاينة القتل أو على الإقرار به لم يسعه قتله حتى يقضي القاضي بشهادتهما.(بدائع الصنائع ،كتاب الاستحسان،ج٥ص ١٣٠).وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الكراهية، الباب الثالث في الرجل رأى رجلا يقتل أباه،،ج٥ ص ٣١٤).

[3] (والأصل براءة الذمم) لأنها خلقت بريئة عرية عن الحقوق فلا يجوز شغلها إلا بحجة قوية.(فتح القدير ،كتاب الاقرار،ج٨ ص٣٤٣). لأن الأصل براءة الذمم فلا يثبت بالشك.(الاختيار ،كتاب الاقرار، فصل الاستثناء،ج٢ ص ١٣٣).

[4] لأنّ دعوى كلّ منهما لم يثبت بدون القضاء فلا يثبت الحق.

ضرورت نہیں، اور جو دعویٰ فاسد بنیاد پر ہو اور ظن غالب کی حد تک بھی مدعی کے علم میں اس کا ثبوت نہ ہو تو اس دعویٰ کو پیش کرنا ہی ظلم ہے، اس بنیاد پر فائدہ حاصل کرنا حرام ہے مگر مدعیٰ علیہ خوشی کے ساتھ اس کی حقیقت کا اقرار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر بات درمیانی ہو یعنی ثبوت و عدم دونوں کا احتمال ہو اس میں دعویٰ کرنا جائز ہے، ملک و نفع حلال ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں:

ا۔ حاکم کو اس بارے میں کسی ناجائز ثبوت سے مغالطہ میں نہ ڈالا جائے۔[1]

۲۔ اس کا فیصلہ اصول شریعت کے خلاف نہ ہو۔[2]

مسئلہ: جو حقوق حساب کے ذریعے ثابت ہو جائے، وہ یقینی ہے جبکہ حساب صحیح اصول سے مرتب کیا جائے اور مدعی خود بھی جانچ پڑتال کرے یا کام کی زیادتی کی وجہ سے خود تو جانچ نہیں کر سکتا کارندوں پر البتہ اعتماد قوی ہے۔

دعویٰ سے انکار کا حکم

دعویٰ سے انکار کی دو صورتیں ہیں:

ا۔ مدعیٰ علیہ قطعی طور پر کہہ دے کہ میرے اوپر کوئی حق نہیں یا یہ دعویٰ غلط ہے، اگر اپنی براءت کا یقین کامل ہو تو ایسا انکار جائز ہے۔

۲۔ انکار کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہ کہدے کہ مجھے اس کا علم نہیں، یہ بھی اس صورت میں جائز ہے کہ اسے مدعی کے حق دار ہونے کا علم نہ ہو۔

---

[1] ان جیسی حقوق کے اثبات کے لئے حاکم کو مغالطہ میں ڈالنا تو جائز نہیں البتہ اگر کہیں ایسا کیا جائے اور جھوٹی گواہی وغیرہ ناجائز ذرائع کے ذریعے قاضی سے فیصلہ کروایا جائے تو کیا اس کے بعد مدعی کے لئے اس چیز سے نفع اٹھانا جائز ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ "نفاذ قضاء القاضی ظاہرا و باطنا" کے عنوان سے مشہور ہے جس میں کچھ تفصیل ہے، ملاحظہ فرمائیں: (المحیط البرہانی، کتاب القضاء، الفصل الخامس عشر، ج۸ ص ۵۳، و فتاویٰ شامی، کتاب القضاء، فصل فی الحبس، مطلب في القضاء بشهادة الزور، ج۵ ص ۴۰۵)۔

[2] (قوله وإذا رفع إليه حكم قاض أمضاه إن لم يخالف الكتاب والسنة المشهورة والإجماع). (البحر الرائق ،كتاب القضاء، باب كتاب القاضى، ج٧ص ٨).

وكذا في الدر المختار مع حاشية ابن عابدين(كتاب القضاء،مطلب في الحكم بما خالف الكتاب أو السنة أو الإجماع، ج٥ص ٤٠٠).

موافق کا حکم

کسی کے دعویٰ کے مطابق فیصلہ ہو جانا یہ حرام کو حلال نہیں بنا سکتا، صرف مخالفت یا شبہ دور کر دیتا ہے یعنی جس کے متعلق کسی فائدہ کا حکم ہوا ہے اگر وہ فائدہ حاصل کرنا ہو تو اس فیصلہ کی وجہ سے حلال نہیں ہو جائے گا، ہاں اگر مدعیٰ علیہ اس کے ثابت شدہ حق کو روکتا تھا یا اسے اپنے حق دار ہونے میں شبہ تھا تو قاضی کے حکم سے وہ مخالفت اور شبہ دور ہو جائے گا اور ایسے ہی اس فیصلہ کی وجہ سے مدعیٰ علیہ بری الذمہ ہو جائے گا یا مدعیٰ علیہ کو اپنی براءت میں کچھ تردد تھا تو دور ہو جائے گا اور شبہ اور مخالفت بھی ایسے فیصلہ سے ختم ہو سکتی ہے جو حاکم نے اصول دیانت کی بنیاد پر فیصلہ دیا ہو۔[1]

دعویٰ کے مخالف فیصلہ

اگر دعویٰ کے مخالف فیصلہ ہو تو اس کی تعمیل بھی واجب ہے لہٰذا فیصلہ اگر اصول شرع کے مطابق نہیں تو یہ وجوب عقلی ہے یعنی اپنی حفاظت کے لئے جیسا کہ مکرَہ و مضطر ہیں[2]، اگر حاکم مسلم نے اسلام کے اصول صحیحہ کی بنیاد پر فیصلہ دیا ہے جس کے خلاف فیصلہ ہوا ہے اس کو یقین نہیں ہے کہ نفس الامر میں قاضی کو دھوکہ دیا گیا ہے نہ اس کی تعمیل کرنے کو شرعاً ممنوع جانتا ہے تو اس کی تعمیل دیانۃً واجب ہے، ظاہری طور پر تو اتباع کرنا لازم، ظاہر کی مخالفت کے بغیر اپنے آپ کو بچا سکتا ہو تو بچانا جائز ہے، اگر فیصلہ حاکم غیر مسلم کا ہے یا یہ فیصلہ اصول شریعت کے خلاف ہو تو دیانۃً تکمیل واجب نہیں۔

---

[1] عن أم سلمة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: إنما أنا بشر، وإنكم تختصمون إلي، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض، وأقضي له على نحو ما أسمع، فمن قضيت له من حق أخيه شيئا فلا يأخذ، فإنما أقطع له قطعة من النار.(صحيح البخاري ،كتاب الحيل، باب إذا غصب جارية فزعم أنها ماتت،رقم الحديث:٦٩٦٧).

نعم من علم أنه على باطل حرم عليه أخذ ذلك المال. (حاشية الفروق للقرافي ، قبيل الفرق الثالث والمائتان،ج٤ ص ٣).

وانظر الحاشية المتقدّمة المتعلّقة بمسئلة نفاذ قضاء القاضي ظاهرا وباطنا.

[2] فأما إذا كان بالمسلمين قوة عليهم فإنه لا يجوز الموادعة بهذه الصفة. لأن فيها التزام الريبة، والتزام الذل، وليس للمؤمن أن يذل نفسه وقد أعزه الله تعالى. (شرح السير الكبير ، باب الموادعة،ج١ص ١٦٩٢).

وكذا في فتح القدير (كتاب السير، باب الموادعة ومن يجوز أمانه،ج٥ص ٤٥٩).

مسئلہ: باطل اور موہوم ومشتبہ دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کوشش کرنا ظلم ہے اور ذمہ میں جو دوسرے کا حق ثابت ہے اس سے براءت ظاہر کرنے کے لئے کوشش کرنا سخت گناہ ہے۔[1]

مسئلہ: ایسی تدبیریں جو بظاہر کچھ کچھ بناوٹ ہوں، حق بات یا سچائی کو ثابت کرنے کے لئے جائز ہے۔[2]

مسئلہ: مروجہ قانون یا حاکم وقت کے غالب حالات سے یہ یقین ہو جائے کہ صاف گوئی سے ایسا فیصلہ ہو گا جو قانون شریعت کے خلاف اور باطل ہے تو اس طرح توریہ سے کام لینا جو نہ صریح جھوٹ ہو اور نہ ہی امر باطل کو ثابت کرنے والا ہو، حق کی حفاظت کی خاطر جائز ہے۔[3]

مسئلہ نمبر: شہادت دینا اس وقت ضروری ہوتی ہے جبکہ گواہ کو یہ یقین نہ ہو کہ گواہی سے فیصلہ دیانت و شریعت کے خلاف ہو گا، اگر یہ یقین ہو تو گواہی واجب نہیں۔[4]

تنبیہ: یہ جو ہم نے لکھا کہ حفاظت کے لئے جھوٹ و سچ کے درمیانی راستہ کو اختیار کرنا جائز ہے تو اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو دیندار ہو اور دینی سمجھ رکھتا ہو، اس کو مقدمہ بازی کا حیلہ نہ بنایا جائے۔

---

[1] { إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا} [النساء : ٥٨]

[2] قال أبو عبيد: " المعاريض أن يريد الرجل أن يتكلم بالكلام الذي إن صرح به كان كذبا , فيعارضه بكلام آخر يوافق ذلك الكلام في اللفظ , ويخالفه في المعنى , فيتوهم السامع أنه أراد ذلك , وقوله: " مندوحة " , يعني: سعة وفسحة " قال الشيخ: " وهذا إنما يجوز فيما يرد به ضررا , ولا يرجع بالضرر على غيره , وأما فيما يضر غيره فلا.(السنن الكبرى للبيهقي ،باب المعاريض فيها مندوحة عن الكذب،ج١٠ص ٣٣٦).

وإن دعا إلى هذا الصلح، وعلم المسلمون أنه لا يخرج إليهم إلا بالإجابة إلى ذلك، فينبغي لهم أن يعاملوه على أمر لا يكذبون فيه، وهو يرى أنهم قد أعطوه ما أراد. يعني ينبغي أن يستعملوا معاريض الكلام، فإن في المعاريض مندوحة عن الكذب، وذلك جائز في حق المحاربين. قال صلى الله عليه وآله وسلم: الحرب خدعة. وقد بينا أن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم استعمل ذلك يوم الخندق بقوله، فلعلنا أمرناهم بذلك، وهذا لأن الكذب لا رخصة فيه، فلا ينبغي للمسلم أن يتعمد الكذب بحال من الأحوال.(شرح السير الكبير ،باب المرتد يصيب الحد وغيره،ج١ص ٢٠١٥).

[3] ايضا.

[4] ثم إنما يلزم أداؤها بشروط..الثاني أن يعلم أن القاضي يقبل شهادته فإن علم أنه لا يقبلها لا يلزمه. (البحر الرائق،كتاب الشهادات، ج٧ ص ٥٨).

وكذ افي الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الشهادات،ج٥ص ٤٦٣.

خرچہ عدالت کا بیان

عدالت کا خرچہ جو ایک امر جدید اور احکام میں عام اور شائع ہے، اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ اسٹامپ کا خرچہ

۲۔ حلبانہ (یعنی وہ خرچہ جو گواہ کو عدالت طلب کرنے کے واسطے لیا جائے)

۳۔ وکالت کا خرچہ۔

اور حق تو یہ ہے کہ ایسے مصارف کو نہ عدالت رعایا سے لے سکتی ہے اور نہ ہی جیتنے والا ہارنے والے سے لے سکتا ہے کیونکہ دینے والا مظلوم ہے مظلوم دوسرے پر ظلم نہیں کر سکتا۔

"الاختیار" کا متن "المختار" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صرف حلبانہ لینا جائز ہے یعنی اگر مدعیٰ علیہ سرکشی اور شرارت سے عدالت میں حاضر نہ ہوتا ہو تو قاضی اپنی فوج کے ذریعے اس کو طلب کرے اور یہ خرچہ مدعیٰ علیہ سے وصول کرے، لیکن ہر مدعی کو خرچہ کی ایک مقدار برداشت کرنا پڑتا ہے اس خرچہ کرنے پر وہ مجبور ہوتا ہے مگر مدعیٰ علیہ اس پر مجبور نہیں اس کو مدعیٰ علیہ خوب جانتا ہے اگر میں مدعی کا حق روکوں گا تو اسے عدالت سے رجوع کرنے میں یقیناً اتنا خرچہ اٹھانا پڑے گا، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ہارنے والے کے ذمہ لازم ہے کہ جتنے[1] والے یہ خرچہ دے اور جتنے والے کے لئے یہ خرچہ لینا جائز ہے بطور دفع ضرر یا ضمان غرور، تو یہ کوئی امر بعید نہیں۔

لیکن ایسا خرچہ جس درجہ میں لینا جائز ہوا نہی لوگوں سے لینا جائز ہوگا جن کی شرارت اور حق تلفی نہایت واضح طور پر متعین ہو جائے اور اسے اطلاع ہو چکی ہو اگر اب بھی حق کی ادائیگی سے باز رہا تو حق دار کو بے فائدہ اتنا خرچہ برداشت کرنا ہوگا، ورنہ صرف گمان وشبہ کی بنیاد پر خرچہ عدالت وصول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے مدعیٰ علیہ نے سکوت وانکار سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہو، مدعی کی حق تلفی کا قصد

---

[1] کتابت کی غلطی ہے، اصل لفظ "جیتنے والے" ہونا چاہئے، یوں ہی اس کے کچھ لفظ بعد بھی "جتنے" کی بجائے "جیتنے" کا لفظ ہی درست ہے۔

وارادہ نہ ہو کوئی شخص ایسے حق کو روکنے سے مجرم نہیں ہو سکتا جس حق کو وہ خود واجب اور لازم نہ سمجھتا ہو۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب [1]

****

[1] مدعیٰ علیہ متسبب ہے اور اس کا علم کے باوجود ایسا کرنا تعنت ہے جو کہ موجب ضمان ہے جیسا کہ رجوع عن الشہادۃ کی صورت میں شاہد ضامن ہوتا ہے اس لئے بہت سے فقہاء کرام نے ایسی صورت میں مدعیٰ علیہ کو ضامن قرار دیا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب کسی کو اپنے حق کی حفاظت کے لئے بمجبوری نالش کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کاروائیوں کی وجہ سے بہت سے مصارف برداشت کرنا پڑیں تو ایسی صورت میں خرچہ کا روپیہ بہت سے علماء کے نزدیک (ومنہم مولانا رشید احمد گنگوہی) جائز ہے"۔(امداد الفتاویٰ، خرچہ عدالت وصول کرنا، ج۳ص۱۲۳) وکذا فی فتاویٰ محمودیہ ایضا(ج۱۶ص۴۶۱)۔

إذا مات إنسان بسقوط ما ذكره من كنيف أو ميزاب أو جرصن فديته على عاقلة من أخرجه إلى الطريق؛ لأنه متسبب لهلاكه متعد في إحداث ما يتضرر به المارة بإشغال هواء الطريق به أو بإحداث ما يحول بينهم وبين الطريق.(تبيين الحقائق ،كتاب الديات،فصل في الجنين، ج٦ص ١٤٣).

المباشر ضامن وإن لم يتعمد، والمتسبب لا إلا إذا كان متعمدا ..ولو أرضعت الكبيرة الصغيرة لم تضمن نصف مهر الصغيرة إلا بتعمد الإفساد بأن تعلم بالنكاح، وأن يكون الإرضاع مفسدا له وأن يكون لغير حاجة. (الأشباه والنظائر لابن نجيم،كتاب الغصب، ج١ص ٢٤٣).

بابِ ششم: حقوق کا بیان

حقوق کی دو قسمیں ہیں: حق ملک۔ حق حصول ملک۔

حق ملک: یہ زیادہ تر بیع واجارات کے متعلق ہیں اور یہ حقوق اپنے اپنے موقعوں پر مذکور ہیں۔

حصول ملک: جیسے شفعہ، اس کے ذریعے دوسرے کے زمین کے مالک بننے کا حق ہوتا ہے، یا نسب جو میراث ملنے کا سبب ہوتا ہے، پھر یہ حقوق ثابت ہونے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شریعت کی طرف سے اجازت ہو جیسے حق شفعہ۔

۲۔ عرف ورواج سے یہ حق ثابت ہو جیسے کسی خاص گلی میں دروازہ کھولنے کا حق، پہلا حق تو شکل اول یہ تو بدون شرط قابل قبول ہے مگر شکل ثانی تین شرطوں سے قابل تسلیم ہوگی:

۱۔ جبر واکراہ کے ساتھ جاری نہ کرائی گئی ہو جیسے وہ سرکاری ٹیکس یا زمینداروں کی وہ نذریں اور حقوق جو کسی معاوضے کی بناء پر ہوں، ہرگز لازم نہ ہوں گے۔

۲۔ کسی شرعی حق کو متغیر نہ کردیں جیسے عشر کی جگہ خراج یا نقد لینا، یا آٹھواں یا بارہواں حصہ مقرر کرنا، یہ بھی ہرگز جائز نہیں۔

۳۔ یہ کہ شرعی مخالفت پر مبنی نہ ہو جیسے عرف ورواج کی بنیاد پر نقصان برداشت کرنا بدون فیصلہ اور رضاء کے، ڈھوم ڈھاریوں مراسم، یا کفار کے مذہبی تہواروں کے حقوق جو شرعاً جائز نہیں۔

ملک حاصل کرنے کی صورتیں

پھر ملک حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ وہی دعویٰ عین مقصود ہو مثلاً کسی دوسرے کی ملک سے گزرنے کا حق، کیونکہ گزرنا خود مقصود ہے۔

۲۔ دعویٰ دوسری چیز کے متعلق ہو جیسے ارث، اس دعویٰ کا مقصود صرف وارث بن جانا نہیں ہے بلکہ

میراث کا حصہ حاصل کرنا ہے، انہی صورتوں کو فقہاء حقوق مجردہ کہتے ہیں۔

حقوقِ مجردہ کے احکام

حقوق مجردہ کا عوض لینے کو فقہاء نے ناجائز کہا ہے[1]، اس باب میں فقہاء کے اقوال منتشر ہیں جو کسی ایک ضابطے کے تحت نہیں آتے، بندہ فقہاء کے ان اقوال کو ان کی افادات متفرقہ سے جمع کر کے ایسے کلیے کے تحت عرض کرتا ہے جس میں تمام اقسام کا ذکر ہو جائے۔

(حقوق کی اقسام)

۱۔ وہ مخصوص حقوق جو صاحب حق سے نہ دوسرے کی طرف منتقل ہو اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہو جیسے حق شفعہ، یہ حق مخصوص ہے اس کے لئے جو مکان کا وارث، خریدار یا موہوب لہم ہو یا کسی اور طرح سے زمین و مکان میں شریک ہو (جیسے خلیط فی حق المبیع) یعنی جن کی عین مکان زمین و باغ میں شرکت نہ ہو بلکہ ان کے حقوق میں شرکت ہو جیسے حق مرور (یعنی دوسرے کی زمین سے گزرنے کا حق) یا حق سیل (یعنی دوسرے کی زمین سے پانی گزارنے کا حق) یا حق شرب وغیرہ۔ یا جار کے لئے یعنی وہ پڑوسی جس کا گھر متصل ہو یا دونوں کے دروازے کا راستہ متحد ہو، ان تین کے علاوہ کوئی اور شفیع نہیں ہو سکتا۔[2]

---

[1] بخلاف البيع لأن البيع تمليك العين والعين تحتمل الملك بدونه، ولا تجوز هبته والتصدق به؛ لأن كل واحد منهما تمليك والحقوق المفردة لا تحتمل التمليك، ولا يجوز الصلح عليه بأن صالح من دعوى على شرب سواء كان دعوى المال أو الحق من القصاص في النفس وما دونه؛ لأن الصلح في معنى البيع.(بدائع الصنائع ،كتاب الشرب،ج٦ص ١٩٠).

لأن بيع الحقوق المجردة لا يجوز كالتسييل وحق المرور. (فتح القدير ،كتاب البيوع، باب البيع الفاسد،ج٦ ص ٤٣٠).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع، مطلب: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة ،ج٤ ص ٥١٨).

[2] (وبالصلح عن الشفعة على عوض وعليه رده) أي تبطل الشفعة إذا صالح المشتري الشفيع على عوض وعلى الشفيع رد العوض؛ لأن حق الشفعة ليس بمتقرر في المحل، وإنما هو مجرد حق التملك فلا يجوز أخذ العوض عنه. (تبيين الحقائق ،كتاب الشفعة، باب ماتبطل به الشفعة،ج٥ص ٢٥٧).

أما الصلح عنها لأن الشفعة حق التملك وليس حقا متقررا، فلا يصح الاعتياض عنه. (الاختيار لتعليل المختار ،كتاب الشفعة،فصل ما يبطل الشفعة،ج٢ص ٤٧).

(بخلاف الصلح عن حق الشفعة على مال فإنه لا يصح لأن حق الشفعة حق أن يمتلك، وذلك ليس بحق في المحل قبل التملك) فأخذ البدل أخذ مال في مقابلة ما ليس بشيء ثابت في المحل وذلك رشوة حرام. (العناية شرح الهداية ،كتاب الصلح، الصلح عن دعوى الاموال،ج٨ص ٤١٦).

مسئلہ: حق شفعہ میں نہ میرث جاری ہوتا ہے نہ تملیک، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ خود نہ لے کسی اور کو اس کا مالک بنادے اور نہ صلح کرنے سے مال لازم ہو گا یعنی اگر شفیع صلح کرے کہ اتنا مال دیدو تو میں حق شفعہ چھوڑدوں گا تو دعویٰ ساقط ہو جائے گا مال لازم نہ ہو گا۔ [1]

مسئلہ نمبر: شفعہ کے دعویٰ میں جلدی کرنا شرط ہے یعنی سنتے ہی دعویٰ کرے کہ میں حق شفعہ کا دعوی دار ہوں، اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو طلب حق شفعہ پر دو گواہ پیش کر دے ورنہ حق ساقط ہو جائے گا (ہدایہ) [2]

نفقہ کے احکام

حق صلہ: یہ حق بطور صلہ ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس کے علاوہ دوسرا کوئی نہ صلہ کا مستحق ہو سکتا ہے نہ یہ حق دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ [3]

حقِ نفقہ کی پانچ قسمیں:

نفقہ زوجات: بیویوں کا نفقہ، ان کا نفقہ بقدر استطاعت واجب ہے [4] بیوی مسلمان، کتابیہ، مالدار ہو یا فقیر، ہر صورت میں نفقہ شوہر پر واجب ہے البتہ شوہر کا فرمانبردار ہونا شرط ہے ناشزہ (نافرمان) ہو تو اس کو نفقہ نہیں ملے گا، اسی طرح شوہر موجود ہو یا مفقود، صحیح ہو یا معذور، فقیر ہو یا صاحب استطاعت، نفقہ برابر واجب

---

[1] ایضا.

[2] "وإذا ترك الشفيع الإشهاد حين علم بالبيع وهو يقدر على ذلك بطلت شفعته" لإعراضه عن الطلب.(الهداية، كتاب الشفعة،باب ما يبطل به الشفعة ،ج٤ص ٣٢١). (يبطلها) أي الشفعة (ترك طلب المواثبة أو) ترك (الإشهاد عليه) أي على طلب المواثبة (قادرا عليهما).(الدرر شرح الغرر،كتاب الشفعة،ج٢ص ٢١٥).

[3] لأن النفقة صلة وليست بعوض عندنا.(الهداية ،باب النفقة،ج٢ص ٢٨٧).

(قوله ولا تجب نفقة مضت إلا بالقضاء أو الرضا) ؛ لأن النفقة صلة وليست بعوض عندنا فلم يستحكم الوجوب فيها إلا بالقضاء كالهبة لا توجب الملك فيها إلا بمؤكد وهو القبض. (البحر الرائق ،باب النفقة،ج٤ص ٢٠٣) وفيه:"قالوا ونفقة الغير تجب على الغير بأسباب ثلاثة بالزوجية والقرابة والملك." (البحر الرائق ،باب النفقة،ج٤ص ١٨٨).إعلم بأن نفقة الغير تجب بأسباب منها الزوجية، ومنها الملك، ومنها النسب.(المبسوط للسرخسي ،باب النفقة،ج٥ص ١٨٠).

[4] اگر میاں بیوی دونوں مالدار یا دونوں تنگدست ہوں تب تو شوہر پر مالداری اور تنگدستی کے مطابق نفقہ لازم ہو گا، اگر ایک مالدار ہو اور دوسرا فقیر، تو اس میں امام خصاف وغیرہ کے نزدیک دونوں کے حال کا اعتبار ہو گا اور اسی کے مطابق نفقہ لازم ہو گا جبکہ امام کرخی اور ظاہر الروایہ کے مطابق اس صورت میں خاص بیوی کے حال کے مطابق نفقہ لازم ہو گا، اکثر فقہاء کرام نے امام خصاف کے قول کو ترجیح دی ہیں اور صاحب ہدایہ وغیرہ حضرات نے اس کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہیں جبکہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ بظاہر دوسرے قول کو راجح قرار دے رہے ہیں چنانچہ لفظ "بقدر استطاعت" سے یہ متبادر ہوتا ہے۔

رہے گا۔[1]

مسئلہ: نفقہ پیشگی دیدیا ہو یا ذمہ میں باقی ہو موت کے بعد نہ میراث بنے گا، نہ اس کا حساب ہوگا، نہ اس کا مطالبہ ہوسکتا ہے، مثلاً عورت کے سو روپے نفقہ کے سلسلہ میں شوہر کے ذمہ باقی ہے، عورت مر گئی اس کی ماں یا دوسرے ورثاء اب شوہر سے طلب نہیں کر سکتے، اسی طرح شوہر مر گیا تو عورت اس کے ترکہ سے نہیں لے سکتی، اسی طرح اگر عورت کو نفقہ پیشگی ایک سال کے لئے دیدیا تھا چھ ماہ کے بعد شوہر کا انتقال ہو گیا یا عورت کا انتقال ہوا، دونوں صورتوں میں شوہر یا عورت کے ورثاء مطالبہ نہیں کر سکتے۔[2]

تنبیہ: جس عورت کو بلا نکاح داشتہ[3] بنالیا جائے۔ اگر رسم کی وجہ سے ان کا نفقہ لازم ہو گیا ہو لیکن حرام میں ملوث ہونے کی وجہ سے نفقہ بھی حرام ہے کیونکہ یہ فعل حرام کے عوض ہے، اگر بعد میں ناجائز تعلق باقی بھی نہ رہے تب بھی اس کا عوض ادا کرنا واجب نہیں۔[4]

اولاد کا نفقہ: اگر اولاد محتاج اور نابالغ ہو تو ان کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، اگر بالغ ہوں تو دو تہائی باپ کے ذمہ اور ایک تہائی ماں کے ذمہ ہے[5]، دونوں کے دین متحد ہوں یا نہ ہوں، اسی طرح باپ مالدار ہو یا فقیر، نفقہ

---

[1] أطلق في الزوجة فشمل المسلمة والكافرة الغنية والفقيرة.وأطلق في الزوج فشمل الغني والفقير والصغير والكبير بشرط أن يكون للصغير مال.(البحر الرائق،باب النفقة،ج٤ص ١٨٨).وكذا في مجمع الأنهر(باب النفقة،ج١ص٤٨٥).

[2] (قوله وإذا مات الزوج بعدما قضى عليه بالنفقة أو مضت شهور سقطت) وكذا إذا ماتت الزوجة؛ لأن النفقة صلة والصلة تبطل بالموت.. (قوله وإن أسلفها نفقة سنة) أي عجلها (ثم ماتت قبل مضيها لم يسترجع منها شيء) عند أبي حنيفة وأبي يوسف وكذا إذا أعطاها نفقة شهر وتكون النفقة ملكا لها.(الجوهرة النيرة ،كتاب النفقات، ج٢ص ٨٧).

وكذا في الهداية (باب النفقة، ج٢ ص ٢٨٨).

[3] داشتہ: رکھا ہوا۔ رکھی ہوئی شئی۔ خانگی۔ مدخولہ۔ بے نکاحی عورت۔ (فیروز اللغات، ص:٦٠٨)

[4] ولا تجوز إجارة الإماء للزنا؛ لأنها إجارة على المعصية وقيل: فيه نزل قوله تعالى {ولا تكرهوا فتياتكم على البغاء إن أردن تحصنا لتبتغوا عرض الحياة الدنيا} وروي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه نهى عن مهر البغي وهو أجر الزانية على الزنا.(بدائع الصنائع ،كتاب الإجارة،شرائط ركن الإجارة،ج٤ص١٩٠).

وكذا في المبسوط للسرخسي (كتاب الإجارات، ج١٥ص ٨٤).

[5] امام خصاف اور حسن بن زیادہ رحمہما اللہ کی یہی روایت ہے لیکن ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے ماں پر اولاد کا نفقہ لازم نہیں، بلکہ پورا ہی نفقہ اصلاً والد پر واجب ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے۔" وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن على أبويه أثلاثا على الأب الثلثان وعلى الأم الثلث " لأن الميراث لهما على هذا المقدار قال العبد الضعيف هذا الذي ذكره رواية الخصاف والحسن رحمه الله وفي ظاهر الرواية كل النفقة على الأب لقوله تعالى: {وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ}وصار كالولد الصغير. (الهداية ،باب النفقة، ج٢ص ٢٩٣). (وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن) والأعمى، إذا كانوا فقراء (على أبويه أثلاثاً) على قدر ميراثهما

واجب ہو گا۔[1]

مسئلہ: بالغ کے نفقہ لازم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ محتاج یا اپاہج ہو اور عورت کا نفقہ واجب ہونے کے لئے صرف محتاج ہونا کافی ہے۔[2]

مسئلہ: ولد الزنا نہ نفقہ کا مستحق ہے نہ میراث کا، نہ ہی اس کا نسب باپ سے ثابت ہو گا۔[3]

۳۔ نفقہ آباء: اولاد مالدار ہوں اور ماں باپ محتاج تو ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہے چاہے مسلمان ہو یا کافر۔[4]

مسئلہ: ماں کا شوہر (یعنی سوتیلا باپ) باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) منہ بولا رشتہ، ناجائز رشتہ یعنی زنا نفقہ کے مستحق نہیں ہیں[5]۔

(على الأب الثلثان، وعلى الأم الثلث) ، لأن الميراث لهما على هذا، قال في الهداية: وهذا الذي ذكره رواية الخصاف والحسن، وفي ظاهر الرواية كل النفقة على الأب، قال المحبوبي: وبه يفتي، ومشى عليه صدر الشريعة والنسفي. تصحيح. (اللباب في شرح الكتاب ،باب النفقة،ج٣ص ١٠٦).

[1] ولا تجب النفقة مع اختلاف الدين إلا للزوجة وقرابة الولاد أعلى وأسفل. (الاختيار لتعليل المختار ،باب النفقة،ج٤ص ١١).ونفقة الصغير واجبة على أبيه وإن خالفه في دينه "(الهداية ،باب النفقة،ج٢ص ٢٩٢).

رجلٌ له أولاد صغار لا مال له ولا مال للصغار هل أيضاً يفرض عليه؟ فيكتسب وينفق عليهم؛ لأن نفقة الأولاد الصغار لا تسقط بعسرة الأب. (المحيط البرهاني ،كتاب النفقات، الفصل الثالث،ج٣ ص٥٦٩).

[2] لأن شرط وجوب نفقة الكبير العجز عن الكسب حقيقة كالزمن والأعمى ونحوهما، أو معنى كمن به خرق ونحوه. (الاختيار لتعليل المختار ،باب النفقة،ج٤ص ١١).

(ولو) كانت الأنثى (بالغة) صحيحة (أو) كان الذكر (بالغا) لكن (عاجزا) عن الكسب (بنحو زمانة) كعمى وعته وفلج. (الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،باب النفقة،مطلب في نفقة قرابة غير الولاد ،ج٣ص ٦٢٧).

[3] وإذا أقر الرجل أنه زنى بامرأة حرة، وأن هذا الولد منه من هذا الزنى بها، وصدقته المرأة، فإن نسب الولد لا يثبت بهذه الدعوة من المرأة، ولا من الرجل؛ لأنه من زنى، وليس يثبت نسب ولد الزنى. (الأصل للشيباني، كتاب الدعوى والبيّنات،باب الإقرار بولد من الزنى، ج٨ص١٠٧).

وفي التتارخانية ولا ينتفي من أحكام النسب من جهة الزوج سوى التوارث وإيجاب النفقة وما عداهما من أحكام النسب من جهة الزوج قائمة.(البحر الرائق ،باب اللعان، ج٤ ص ١٢٩).

[4] واختلاف الدينين يمنع الوراثة فيمنع القضاء بالنفقة إلا الزوجة والوالدين والوالد. (المحيط البرهاني، الفصل الرابع في نفقات أهل الكفر، ج٣ ص ٥٨٦).على الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجدته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه.(الهداية، باب النفقة،فصل، ج٢ص٢٩٢).

[5] پہلے اور آخری دو مسائل میں تو وجوبِ نفقہ کی کوئی بنیاد موجود نہیں، البتہ دوسری مسئلہ (سوتیلی ماں کا نفقہ) میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی ایک روایت کے مطابق مطلقاً نفقہ واجب ہے جبکہ ظاہر الروایت کے مطابق سوتیلی ماں کا نفقہ تبھی واجب ہو گا جبکہ باپ فقیر ہو اور اس کو خدمت وغیرہ کے لئے بیوی کی ضرورت ہو، اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے تو بچے پر اس کا نفقہ واجب نہیں رہے گا۔ تفصیل

۴۔ نفقہ اقارب ذور حم: بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں، بھتیجا بھتیجی، بھانجا، بھانجی، اگر محتاج ہوں اور دین متحد ہو تو مالداروں پر ان کا نفقہ واجب ہے۔

مسئلہ: اقارب کے نفقہ میں میراث کا حساب ہوگا مثلاً دو بھائی مالدار ہیں اور بہن محتاج ہے، تو بہن کا نفقہ دونوں پر آدھا آدھا لازم ہوگا، اگر ایک بھائی اور ایک بہن مالدار ہو دونوں کی ایک بہن محتاج ہو، تو اس بہن کا دو تہائی نفقہ بھائی کے ذمہ ہوگا اور ایک تہائی مالدار بہن کے ذمہ۔ [1]

مسئلہ: دودھ کے رشتوں اور ان رشتوں میں جو اپنے یا کسی رشتہ دار کی نکاح سے پیدا ہوتے ہوں، جیسے سالہ، سالی، ساس، بھاوج، ممانی، خالو وغیرہ، ان میں بیوی کے علاوہ اور کوئی نفقہ کا مستحق نہیں [2]، احسان کرنا ان کے ساتھ خیر خواہی کا برتاؤ کرنا ہر حال میں بہتر ہے اس کے لئے کوئی قانون و دستور نہیں۔

۵۔ نفقہ مملوک: مملوک کا نفقہ واجب ہے یا تو اس کا نفقہ ادا کرے یا فروخت کردے یا کسی کو ہبہ کردے یا آزاد کرے تاکہ خود ہی کما کر کھائے۔ [3]

مسئلہ: کسی کو ناجائز طور پر غلام یا لونڈی بنا لینے سے ان پر ملک رقبہ تو حاصل نہ ہوگا البتہ ان کو محبوس کرنے سے ان کا نفقہ واجب ہوگا۔

مسئلہ: پالتو جانور کو چارہ کھلانا واجب ہے اور اس پر رحم کرنا لازم ہے۔ [4]

کے لئے ملاحظہ فرمائیں: الدر المختار مع رد المحتار، باب النفقة، مطلب في وجوب نفقة زوجة الأب، ج٣ص٦١٦. والاختيار لتعليل المختار ،باب النفقة، ج٤ص١٢.

[1] النفقة في قرابة الولادة تجب بحق الولادة لا بحق الوراثة.وفي غيرها من الرحم المحرم تجب بحق الوراثة لقوله عز وجل {وعلى الوارث مثل ذلك} علق سبحانه وتعالى الاستحقاق بالإرث فتجب بقدر الميراث..ولو كان له ابنان فنفقته عليهما على السواء وكذا إذا كان له ابن وبنت ولا يفضل الذكر على الأنثى في النفقة .بدائع الصنائع،كتاب النفقة، نفقة الأقارب، ج٤ص ٣٢.وكذا في الهداية في شرح بداية المبتدي، باب النفقة، ج٢ص ٢٩٣.

[2] قالوا ونفقة الغير تجب على الغير بأسباب ثلاثة بالزوجية والقرابة والملك. البحر الرائق، باب النفقة، ج٤ص ١٨٨. وكذا في الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب النفقة، ج٣ص ٥٧٢.

[3] لأنّ الملكَ مِنْ أسباب وجوب النّفقة كما مرّ عنِ البحر والدر.

[4] (وسائر الحيوانات يجبر فيما بينه وبين الله تعالى) لما فيه من إضاعة المال وتعذيب الحيوان، وقد ورد النهي عنهما. الاختيار لتعليل المختار، قبيل الحضانة، ج٤ص ١٤.

بیویوں کی باری کا بیان

اگر کوئی بیوی اپنی باری کسی سوکن کو ہبہ کرنا چاہے تو ان کو اس کا اختیار ہے جیسے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیدی تھی۔[1]

مسئلہ: مرد کو بھی اختیار ہے اس ہبہ کو قبول کرے یا نہ کرے، کیونکہ یہ میاں بیوی کے درمیان مشترکہ حق ہے۔[2]

مسئلہ: اپنا حق ساقط کرنے والے کو اختیار ہے جب چاہے اپنا حق واپس لے لے کیونکہ یہ حق وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا رہتا ہے تو ہر نئے حق پر استحقاق پیدا ہوگا۔[3]

مسئلہ: باری دینے والی اپنے شوہر یا سوکن سے اس ہبہ کا بدلہ نہیں لے سکتی (اگر کچھ دیدیا جائے تو وہ عطیہ ہے معاوضہ نہیں) کیونکہ مقصود تو قرب و نشاط ہے اور وہ شوہر کے اختیار میں ہے۔[4]

اختیارات:

ا۔ آزاد لڑکی کو بالغ ہوتے ہی اختیار مل جاتا ہے کہ باپ دادا کے علاوہ کسی غیر کیا ہوا نکاح کو قائم رکھے یا توڑدے، اس کو خیارِ بلوغ کہا جاتا ہے۔[5]

(قوله وملك) شامل لنفقة المملوك من بني آدم والحيوانات والعقار كما في الدر المنتقى، لكن في الأخير لا يجبر قضاء. الدر المختار مع حاشية ابن عابدين،باب النفقة،ج٣ص ٥٧٢.

[1] (ولو) (تركت قسمها) بالكسر: أي نوبتها (لضرتها) (صح، ولها الرجوع في ذلك) في المستقبل.(الدر المختار ،كتاب النكاح، باب القسم،ج٣ ص ٢٠٦) (وإن وهبت قسمها لضرتها صح) والهبة هنا مجاز عن العطية (ولها) أي للواهبة (أن ترجع) عن هبتها.(مجمع الأنهر،،كتاب النكاح، باب القسم،ج ١ص ٣٧٤).

[2] وقيل يهجرها بأن لا يكلمها في حال مضاجعته إياها لا أن يترك جماعها ومضاجعتها؛ لأن ذلك حق مشترك بينهما، فيكون في ذلك عليه من الضرر ما عليها، فلا يؤدبها بما يضر بنفسه.(بدائع الصنائع ،كتاب النكاح، احكام النكاح،ج٢ص ٣٣٤).

[3] مر تخريجه تحت المسئلة الاولى من هذا الموضوع.

[4] ولو حطت لزوجها جعلا على أن يزيدها في القسم فهو حرام وهو رشوة وترجع بمالها وكذا لو جعلت من مهرها شيئا ليزيدها في القسم أو زادها في مهرها أو جعل لها شيئا لتجعل يومها لصاحبتها فالكل باطل. (البحر الرائق ،كتاب النكاح، باب القسم،ج٣ص ٢٣٧). لو بذل الزوج للواحدة مالا على أن تبذل نوبتها لصاحبتها أو بذلت هي المال لصاحبتها لتترك نوبتها لا يجوز والمال يسترد كذا في التتارخانية. (الفتاوى الهندية ،كتاب النكاح، الباب الحادي عشر،ج١ص ٣٤١).

[5] (لهما) أي لصغير وصغيرة وملحق بهما (خيار الفسخ) ولو بعد الدخول (بالبلوغ أو العلم بالنكاح بعده) لقصور الشفقة ويغني عنه خيار العتق.(الدر المختار ،كتاب النكاح، باب الولي،ج٣ ص ٦٩).

ثم خيار البلوغ يثبت للذكر والأنثى، وخيار العتق لا يثبت إلا للمعتقة.(بدائع الصنائع ،كتاب النكاح،ج٢ص ٣١٦).

۲۔ باندی کو آزاد ہوتے وقت یہ اختیار مل جاتا ہے کہ آقا کا کیا ہوا نکاح برقرار رکھے یا توڑ دے۔[1]

۳۔ جس عورت کو شوہر نے طلاق لینے کا اختیار دیا ہو کہ اگر تیرا جی چاہے تو طلاق اختیا کر لے، اگر اسی مجلس میں ورنہ خیار باطل ہو جائے گا اختیار کر لیا تو ٹھیک ہے۔[2]

یہ تمام حقوق واختیار سکوت ورضاء سے ساقط ہو جاتے ہیں کیونکہ دفع ضرر وعار کے لئے یہ اختیار دیئے ہیں تو سکوت ورضاء کے بعد نہ عار ہے نہ ضرر کا حق، اس میں نہ عوض لینا جائز ہے نہ صلح ہو سکتی ہے اور نہ یہ حق کسی اور کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔[3]

مسئلہ نمبر: نکاح اگرچہ نقل کرنے کے قابل نہیں تاہم اس کو بالعوض یا بلا عوض زائل کر دینا جائز ہے جیسے بدل خلع، طلاق علی المال وغیرہ۔[4]

حق نکاح

منگنی کے بعد زوجین کو حق ہے کہ نکاح کریں، مگر یہ حق قابل انتقال نہ ہونے کی وجہ سے اس پر عوض لینا جائز نہیں یعنی عورت یا مرد کو حق نہیں کہ معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام بنا لے، ہاں آپس میں یہ صلح کر لینا کہ منگنی ختم کرتے ہیں اور آئندہ نکاح کا مطالبہ نہیں کریں گے یہ جائز ہے۔[5]

---

[1] ایضا.

[2] عبارت میں کچھ تقدیم وتاخیر معلوم ہوتا ہے، اصل عبارت یہ ہونی چاہئے "اگر اسی مجلس میں اختیار کر لیا تو ٹھیک ہے، ورنہ خیار باطل ہو جائے گا۔ إذا قال أنت طالق إن شئت فالجواب فيه مثل الجواب في أمرك بيدك في جميع الأحكام إن كان مطلقا فعلى المجلس وإن كان مؤقتا فثابت في جميع الوقت. (تحفة الفقهاء ،باب تفويض الطلاق، ج٢ص ١٩١).

وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الطلاق، الباب الثالث، الفصل الثالث في المشيئة، ج١ص ٤٠٢).

[3] كما هو حكم الحقوق المجردة حيث لا يجوز الإعتياض عنها لا بالبيع ولا بالصّلح، وقد مرّت العبارات في مبدأ البحث وفي حكم الإعتياض عن حقّ الشفعة، فليراجع.

[4] إن طلقها على مال فقبلت وقع الطلاق ولزمها المال وكان الطلاق بائنا كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية ،كتاب الطلاق،الفصل الثالث في الطلاق على المال، ج١ص ٤٩٥).

والتفصيل في فتح القدير(باب الخلع، ج٤ص٢١٣).

[5] لأنّه وعد من الجانبين يجوز نقضه وهو من الحقوق المجرّدة فلا يجوز الإعتياض عنه.

خلافت بیعت:

کسی پیر، عالم، حاکم یا صاحب فن کا جانشین ہونا، یہ حق بھی تقسیم کرنے، عوض لینے یا منتقل کرنے کے قابل نہیں کیونکہ اس میں اصل صلاحیت ولیاقت ہے، پھر یہ صلاحیت دو سبب سے تسلیم کرلی جاتی ہے:

۱۔استخلاف: جیسے خلیفہ بنائیں یا خلیفہ بنانے کی وصیت کریں۔

۲۔قبول عام: یعنی جن سے اس خلافت کا تعلق ہو ان میں کے معتبر اشخاص قبول کرلیں، ایسا آدمی صالح اور خلافت کی[1] مستحق مان لیا جاتا ہے۔

مگر یہ رسم وعادت کہ باپ کا جانشین بیٹا ہی ہو، اگر دائمی ہو اور یونہی ہوتا ہوا چلا آیا ہے تو یہ صراحت واستخلاف کی طرح ہے کیونکہ قاعدہ "المعروف کالمشروط"۔ اگر دائمی نہیں ہے تو اس کی پابندی لازم نہیں۔

مسئلہ: خلافت صراحۃً ملی ہو یا سکوت کے ذریعے حاصل ہو، میراث کے مسائل میں معارض نہیں ہوسکتی، لہٰذا کسی خلیفہ کو شیخ کی مالی میراث نہیں مل سکتی،[2] صرف وہ اختیارات واسباب جو اس خلافت کے لئے مخصوص مان لئے گئے تھے، وہ اس کے لئے ہیں، اور جس قدر مال جیسے مکان وآلات کھیت وغیرہ، اس خانقاہ سے متعلق ہوں، ان پر خلیفہ کو متولی کی حیثیت حاصل ہے نہ ذاتی مال کی طرح تصرف کرے نہ مملوک قرار دے، اور یہی حکم شامل ہے دینی مدرسوں، خانقاہوں اور ان کے متعلقہ اشیاء کو، کہ متولی ان کو اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کرسکتا۔[3]

مسئلہ: سلطنت بھی خلافت ہے، سلطان نہ سرکاری خزانہ کا مالک ہے نہ ذاتی کاموں میں خرچ کرسکتا ہے، نہ اس مال میں میراث جاری ہوگا، نہ اس کو اس بات کا اختیار ہے کہ ناظم ہونے کی حیثیت سے جو چاہے کرے، جسے چاہے دیدے اور خود بھی خرچ کرے۔[4]

---

[1] "کا" ہونا چاہئے۔

[2] لأنّه ليس من أسباب الإرث، وفي الفقه الإسلامي وأدلته :أما أسباب الإرث المتفق عليها فهي ثلاثة: وهي القرابة، والزوجية، والوَلاء.(الاحوال الشخصية، الفصل الثالث،ج۱۰ ص ۷۷۰٤).

[3] وليس لمتولي المسجد أن يحمل سراج المسجد إلى بيته.(الإسعاف فى أحكام الأوقاف،باب بناء المساجد والربط والسقايات،ص: ۷۸).وكذا في الفتاوى الهندية (كتاب الوقف، الباب الحادي عشر،الفصل الثاني،ج۲ ص ٤٦۲).

[4] ايضا.

وصیت کے احکام

مسئلہ: وصیت میراث کی طرح ہے، مسلمان کافر حربی کے حق میں وصیت کرے تو یہ وصیت لغو ہوگی۔[1]

مسئلہ: تہائی مال سے زیادہ کی وصیت نافذ نہیں ہوگی مگر یہ کہ کوئی وارث ہی نہ ہو یا دوسرے ورثاء اس پر راضی ہوں۔

مسئلہ: ایسے وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں جو میراث کے حصہ دار ہوں۔[2]

مسئلہ: مرنے سے پہلے وصیت پر عمل لازم نہیں[3]، اسی طرح وصیت کا عوض لینا یا صلح کرنا بھی جائز نہیں۔[4]

مسئلہ: زید نے عمر کے حق میں ہزار روپے کی وصیت کی، اور زید ابھی زندہ ہے تو زید کو اختیار ہے کہ جب چاہے وصیت کو منسوخ کردے اور عمر اگر زید کے ورثاء سے صلح کرکے کچھ لے لے تو اس کو واپس کروادیا جائے گا۔[5]

---

[1] منها أن لا يكون حربيا عند مستأمن، فإن كان لا تصح الوصية له من مسلم أو ذمي؛ لأن التبرع بتمليك المال إياه يكون إعانة له على الخراب، وإنه لا يجوز. (بدائع الصنائع ،كتاب الوصية، شرائط الموصى له، ج٧ص ٣٤١).

وكذا في النتف في الفتاوى (كتاب الوصايا، ج٢ص ٨٢٠).والتفصيل في الدرر والغرر، كتاب الوصايا، ج٢ص٤٢٦).

[2] (وشرطها كون الموصي أهلا للتمليك) .. (و) كونه (غير وارث ولا قاتل). (الدرر والغرر، كتاب الوصايا، ج٢ص٤٢٧). (ومنها) أن لا يكون وارث الموصي وقت موت الموصي، فإن كان لا تصح الوصية. (بدائع الصنائع ،كتاب الوصايا، ج٧ص ٣٣٧).

[3] قلنا إن القبول من الموصى له والرد يعتبر بعد الموت لأن الإيجاب ينزل بعد الموت والقبول يشترط عند الإيجاب كما في البيع وغيره وهذا عندنا.(تحفة الفقهاء ،كتاب الوصايا، ج٣ص ٢٠٦).

[4] یعنی وصیت کرنے والا شخص اپنی وصیت کرنے کے عوض موصی لہ (جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے) سے نہ کوئی عوض وصول کر سکتا ہے نہ ہی اس کے بدلے صلح کرنے کا حق ہے کیونکہ محض وصیت کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا عوض لیا جاسکے بلکہ جب تک خود وصیت کرنے والا زندہ ہے تو اس کی حیثیت ایک وعدہ یا ایجاب کی ہے جو کہ ایک غیر متقوم چیز ہے اور اس کا عوض لینا جائز ہے یہی وجہ ہے کہ وصیت کرنے والے کو اپنی زندگی میں وصیت سے رجوع کرنے کا برابر اختیار حاصل ہوتا ہے۔

"ويجوز للموصي الرجوع عن الوصية" لأنه تبرع لم يتم فجاز الرجوع عنه كالهبة.(الهداية ،كتاب الوصايا،باب في صفة الوصية، ج٤ ص ٥١٦).أصل الباب أن الرجوع في الوصية صحيح لأنه تبرع لم يتم لأن القبول فيه بعد الموت فيملك الرجوع كالرجوع عن الإيجاب في البيع قبيل القبول.(تحفة الفقهاء، كتاب الوصايا، باب الرجوع عن الوصية، ج٣ ص ٢٢٣).

[5] أنظر الحاشية المتقدّمة.

مسئلہ: وصیت کرنے والے کی موت کے بعد وصیت میراث کی طرح لازم ہو جاتی ہے مگر وصی کسی اور کو نہیں دلا سکتا[1]، ورثاء سے صلح کرنے اور معاوضہ لینے کا بھی اختیار ہے۔[2]

حقِ بزرگانہ: جیسے معلم، استاد، پیر، باپ وغیرہ کے حقوق، یہ نہ منتقل کرنے کے قابل ہیں نہ ان کا عوض لینا جائز ہے اور نہ صلح کرنا،، کیونکہ یہ حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے بندہ نہ انہیں ساقط کر سکتا ہے نہ اس میں تغیر کر سکتا ہے۔[3]

میراث کے احکام: میراث وہ حق ہے جو کسی شخص کو دوسرے شخص کے مرتے ہی اپنی ذات کے لئے پیدا ہو، میراث دو قسم پر ہے:

ا۔ **مال کا میراث:** جو تجہیز و تکفین کے بعد، اس طرح وصیت نافذ کرنے کے اور قرض ادا کرنے کے بعد باقی

---

[1] یہ دونوں باتیں محلِ نظر ہیں، وصیت میراث کی طرح حقِ جبری نہیں ہے کہ موصی کے مرنے کے بعد خود بخود لازم ہو جائے بلکہ موصیٰ لہ تبھی اس کا مالک بنے گا جبکہ وصیت کرنے والے کے مرنے کے بعد یہ وصیت کو قبول کرے (ملاحظہ فرمائیں مندرجہ ذیل میں سے پہلے چار عبارات)، اسی موصیٰ لہ مالِ وصیت کو قبض کرنے سے پہلے بھی اس میں تصرف کر سکتا ہے کیونکہ وصیت ان عقود میں سے نہیں ہے جس میں فسخ ہو جانے کا اندیشہ ہو (ملاحظہ فرمائیں مندرجہ ذیل میں سے آخری دو عبارات)

"والموصى به يملك بالقبول" خلافا لزفر، وهو أحد قولي الشافعي.. ولنا أن الوصية إثبات ملك جديد.. ولا يملك أحد إثبات الملك لغيره إلا بقبوله. الهداية، كتاب الوصايا، باب في صفة الوصية، ج٤ص٥١٥.

لا يدخل في ملك الإنسان شيء بغير اختياره إلا الإرث اتفاقا، وكذا الوصية في مسألة؛ وهي أن يموت الموصى له بعد موت الموصي قبل قبوله. .الأشباه والنظائر، الفن الثالث، ج٣ص٤٦٢.

(وبه) أي بالقبول (يملك) أي الموصى به ولا يملك قبله لأن الوصية إثبات ملك جديد..ولا يملك أحد إثبات الملك لغيره بلا اختياره بخلاف الميراث. الدرر والغرر ، كتاب الوصايا، الباب الأول، ج٢ص٤٣٠.

وكذا في المبسوط للسرخسي ،كتاب نوادر الزكاة، ج٣ص ٤١.

وكذلك الموصى به بأن أوصى إلى إنسان بشيء، ثم مات الموصي فللموصى له أن يتصرف قبل القبض؛ لأن الوصية أخت الميراث، ويجوز التصرف في الميراث قبل القبض فكذا في الموصى به. بدائع الصنائع، كتاب البيوع، ج٥ص١٨١.

وفي التجريد يجوز التصرف في الأثمان والديون قبل القبض سوى الصرف والسلم وكذا في الديون والنقولات الموروثة والموصي به عيناً أو ديناً يجوز التصرف والبيع قبل القبض. الفتاوى البزازية، كتاب البيوع، ج١ص٣٢٧.

[2] إنّ الورثة لو صالحوا الموصى له بالخدمة على مال أومنفعة جاز.(تبيين الحقائق ،كتاب الصلح، فصل الصلح جائز، ج٥ص ٣٤).الورثة إذا صالحوا الموصى له بالخدمة على مال مطلقا أو المنافع إن اختلف جنسها فإنه يجوز لا إن اتحد.(البحر الرائق ،كتاب الصلح، فصل الصلح جائز، ج٧ ص ٢٥٧).

[3] لأنّها من الحقوق المجرّدة فلا يجوز بيعهما ولا الإعتياض عنها كما مرّ مرارا.

بچے۔[1]

۲۔میراث حقوق: جیسے خیار تعین اور خیار عیب وغیرہ[2]، میراث مال ہی میں انتقال اور صلح جائز ہے، وارث اگر چاہے تو دوسرے ورثاء سے صلح کرے[3] یا اپنا حصہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کردے۔[4]

مسئلہ: جو اولاد زنا سے پیدا ہوں، ان کو ماں سے میراث ملتا ہے، باپ سے نہیں ملے گا۔[5]

مسئلہ: جو مال میراث میں ملے اس میں زکوۃ نہیں، مگر وہ مال سونا چاندی کی شکل میں ہو یا مفت جنگل میں چرنے والے جانور ہوں، تو سال پورا ہونے کے بعد زکوۃ واجب ہوگی۔[6]

مسئلہ: ولاء: یعنی کوئی آزاد شدہ غلام مال چھوڑ کر مر جائے اس کا کوئی اور وارث نہ ہو تو اس کا مال آزاد کرنے والے آقا کو بطور ولاء ملے گا، اس ولاء کو ہبہ کرنا، فروخت کرنا، منتقل کرنا جائز نہیں۔[7]

---

[1] والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب الفرائض، ج٦ص ٧٥٩).

[2] وأما الحقوق فمنها ما يجري فيه الإرث حق الشفعة وخيار الشرط وحد القذف عندنا والنكاح لا يورث بلا خلاف وحبس المبيع وحبس الرهن يورث والوكالات والعواري والودائع لا تورث، واختلف المشايخ في خيار العيب فمنهم من قال يورث ومنهم من قال لا يورث ولكن لا يثبت للورثة ابتداء والدية تورث بلا خلاف.(البحر الرائق ،كتاب الفرائض، ج٨ ص ٥٥٧).

وكذا في الأشباه والنظائر لابن نجيم، كتاب الفرائض، ص: ٢٥٦).

[3] ويُقال له التخارج في اصطلاح الفقهاء واحكامه تذكر في باب التخارج من كتاب الصلح.

[4] والتفصيل في كتاب البيوع من تنقيح الفتاوى الحامدية.

[5] (ويرث ولد الزنا واللعان بجهة الأم فقط) لما قدمناه في العصبات أنه لا أب لهما.(الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الفرائض، فصل في الغرقى والحرقى وغيرهم، ج٦ ص ٨٠٠).

وكذا في البحر الرائق (كتاب الفرائض، ج٨ص ٥٧٤).

[6] وأما الدين الضعيف فهو ما وجب وملك لا بدلا عن شيء وهو دين إما بغير فعله كالميراث أو بفعله كالوصية أو وجب بدلا عما ليس بمال دينا كالدية على العاقلة والمهر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد وبدل الكتابة والحكم فيه أنه لا يجب فيه الزكاة حتى يقبض المائتين ويحول عليها الحول عنده.(تحفة الفقهاء ،كتاب الزكاة، ج١ص٢٩٤).

وكذا في مجمع الأنهر (كتاب الزكاة، ج١ص ١٩٥).

وتفصيل الروايات في المبسوط للامام السرخسي رحمه الله (كتاب الزكاة، نوادر الزكاة، ج٣ص٤١).

[7] محمد عن أبي يوسف عن عبيد الله بن عمر عن عبد الله بن دينار عن عبد الله بن عمر قال رسول الله – صلى الله عليه وسلم "الولاء لُحْمَةٌ كلُحْمَةِ النسب، لا يباع ولا يوهب". وهذا قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد. (الأصل للشيباني، كتاب الولاء، باب بيع الولاء، ج٦ص ٣٧٧).

وكذا في المبسوط للسرخسي (كتاب الولاء، باب بيع الولاء، ج ٨ص٩٧).

حقِ علو

زید و بکر دونوں ایک مکان کے مالک تھے پھر دونوں نے مکان کو اس طرح تقسیم کیا کہ زید کو نیچے کا حصہ ملا اور بکر کو اوپر کا حصہ، اب بکر کو حق علو ہے چھت بکر کی ہو یا زید کی، بکر ہی اس میں تصرف کر سکتا ہے اس کو اختیار ہے کہ اپنا حق استعمال کرے یا کسی اور ہبہ کر دے، اس پر مزید تعمیرات کرے اس طرح کہ زید کی تعمیر پر زائد بوجھ نہ پڑے، لیکن جب اوپر کی منزل گر پڑی اور کچھ باقی نہ رہا، اوپر کا حق محض (یعنی صرف علو کا حق) فروخت نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ ہوائے محض ہے ہاں از سر نو تعمیر کا حق ہے۔[1]

مسئلہ: چونکہ اس حق میں انتقال جائز ہے اس لئے دونوں آپس میں صلح کر سکتے ہیں کہ گرنے کے بعد بکر دوبارہ تعمیر نہیں کرے گا۔[2]

حق نکاح خوانی

مسئلہ: حق نکاح خوانی: اگر حکومت کی طرف سے ہے تو حکومت کی اجازت سے، اگر عوام کی طرف سے ہو تو ان کی رضامندی سے قابل انتقال ہو سکتا ہے اور عوض لینا بھی جائز ہے۔[3]

حق امامت

مسئلہ: حق امامت و خطبہ خوانی وغیرہ، بھی حکومت یا عوام کی اجازت سے منتقل کرنے کے قابل ہے ورنہ نہیں۔[4]

---

[1] سفل وعلو بين رجلين انهدما فباع صاحب العلو علوه لم يجز؛ لأن الهواء ليس بمال. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط المعقود عليه، ج٥ص ١٤٥).

"وإذا كان السفل لرجل وعلوه لآخر فسقطا أو سقط العلو وحده فباع صاحب العلو علوه لم يجز" لأن حق التعلي ليس بمال لأن المال ما يمكن إحرازه والمال هو المحل للبيع.(الهداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ج٣ص ٤٧).

[2] ايضا.

[3] بظاہر یہ حکم تب ہے جبکہ یہ امور باقاعدہ ملازمت کی شکل اختیار کریں۔

أقول على اعتبار العرف الخاص، قد تعارف الفقهاء بالقاهرة النزول عن الوظائف بمال يعطى لصاحبها وتعارفوا ذلك فينبغي الجواز.(الأشباه والنظائر لابن نجيم ،الفن الاول،ص: ٨٩).

والتفصيل في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب البيوع،مطلب في النزول عن الوظائف بمال، ج٤ص ٥١٩).

[4] ايضا.

مسئلہ: ایسے معاوضے آپس کی رضامندی سے مل سکتے ہیں قضاءً نہیں۔

مسئلہ: امام، خطیب، مؤذن اگر کسی کو اپنا قائم مقام بنانا چاہیں تو سلطان یا قوم یا متولی کی رضاء سے جائز ہے، چاہے یہ قائم مقام بنانا وقتی عارضی ہو یا دائمی۔ [1]

شاہی وظائف

مسئلہ: اس کی مختلف صورتیں ہیں:

۱۔ وہ وظیفہ جو کسی موجود مال سے متعلق کردئے گئے ہوں، جیسے فلاں زمین یا فلاں مکان کے منافع سے یا کسی خاص آمدنی سے زید کو اتنی مقدار دیا جائے گا، یہ بقدرِ وجوب مملوک وموجود متصور ہوں گے اور قبضہ سے پہلے متولی یا منیجر کے پاس امانت سمجھے جائیں گے، ان کا عوض لینا، منتقل کرنا جائز ہے۔ [2]

۲۔ وہ جو ذمہ میں ثابت ہوں، یعنی یہ کہے کہ میرے ذمہ یا حکومت کے ذمہ میں ہے کہ آپ کو ماہانہ اتنا ملے کرے گا، یہ صرف تبرع واحسان ہے نہ موجود نہ مملوک، نہ انتقال کے قابل ہے نہ تصرف کے، اب دینے والا مر گیا تو دیکھا جائے گا اگر اس نے ہمیشہ دینے کا وعدہ کیا تھا یا کسی مدت تک، تو وصیت کی طرح ایک

---

[1] لأنّ هذه المناصبَ إجارة إمّا مِن جهة السلطان أو مِن جِهة القوم فتعمتدُ التراضي كما هو حكمُ الإجارة.
شروط الصحة ستة أنواع: النوع الأول: رضاء العاقدين.(درر الحكام في شرح مجلة الأحكام،الإجارة، الفصل الثاني، ج١ص ٤٩٥)

[2] یہ مسئلہ قابل غور ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ نے اپنی ذاتی مال سے کسی کو بلا عوض کچھ دینا چاہے تو یہ ہبہ یا صدقہ ہے جو قبض کرنے سے پہلے ملکیت میں داخل نہیں ہوتا، اگر کسی چیز کے عوض میں دینا چاہے تو اس کی مکمل مقدار متعین ہونی ضروری ہے ورنہ معاملہ فاسد ہو جائے گا، سرکاری املاک میں سے کچھ دیدینے کے لئے اس کے ساتھ مزید یہ بھی شرط ہے کہ قوم وملک کی مصلحت کے لئے دیا جائے، متن میں جو حکم ذکر کیا گیا ہے اس کو بظاہر وقف پر حمل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر سرکار کی جانب سے کوئی زمین کسی پر وقف کی جائے تو موقوف علیہ اس زمین کے غلہ اور منافع پر قبضہ کرنے سے پہلے بھی اس کا مالک قرار پائے گا البتہ اس صورت میں بھی "بقدرِ وجوب مملوک وموجود متصور ہوں گے" کا لفظ قابل اشکال ہے۔
وغلة الوقف يملكها الموقوف عليه وإن لم يقبل. الأشباه والنظائر، فن الجمع والفرق، القول في الملك، ج٣ ص ٤٦٣.
وكذا في تنقيح الفتاوى الحامدية ، كتاب الوقف،الباب الثالث في أحكام النظار، ج١ص١٩٣.

تہائی مال سے شرط کے مطابق ملتا رہے گا۔ اگر یہ وظیفہ بیت المال سے متعلق ہے تو وہاں سے ملا کرے گا اور قبضہ سے پہلے دین ہی کی طرح مدیون ہی کے ہاتھ فروخت ہو سکتا ہے۔

مسئلہ: مدیون کے علاوہ کسی غیر کی طرف منتقل کرنا حوالہ دین کی طرح صحیح ہے اگر انتقال کا معاوضہ لیا تو مقررہ وظیفہ وصول نہ ہونے کی صورت میں معاوضہ واپس لیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ: اگر یہ وظیفہ کسی شرط کی جزاء ہو یا کسی خدمت کا صلہ یا کسی مال کا عوض، تو شرط کے مطابق دین کی طرح واجب الاداء ہے اور فروخت کرنے کے قابل ہے، صرف مدیون کو مالک بنانا صحیح ہے۔

مسئلہ: جو حقوق وظائف سے متعلق ہیں، ان کو اصل وظیفہ دینے والے کیلئے خرید لیں تو جائز ہے (یعنی وہ دین والا جو اپنی ملک اور حکم سے دے، صرف متولی اور مختار کار مراد نہیں)

مسئلہ: ایسے وظائف متولی اور دینے والے کی اجازت سے غیر کی طرف منتقل کئے جا سکتے ہیں۔

حقِ امتناع

جس نے کوئی نئی چیز بنوائی اب اس کو حق ہے کہ دوسروں کو اس کی نقل کرنے سے روک دے تاکہ اس کے تجارتی فائدے ایجاد والے ہی کو ملیں، دوسرے آدمی ایجاد کرنے والے کو نقصان نہ پہنچا سکیں نہ خود نفع حاصل کر سکیں، ایسے حق روکنے یا پھر کسی کو اجازت دیکر معاوضہ حاصل کرنے پر جو اعتراضات سنے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ کہ اس سے کتب دینیہ کی اشاعت کم ہو گی اور یہ روکنے والا مناع للخیر یعنی خیر سے روکنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو گا۔

۲۔ یہ حق تصنیف وغیرہ ایک وہمی اور فرضی حق ہے حق شفعہ اور ولاء کی طرح، اس کے معاوضہ لینے کا اعتبار نہیں۔

۳۔ جب چیز بنائی اور بیچی گئی تو خریدار کو ملک مطلق حاصل ہو گئی، اس کو کچھ فائدہ اٹھائے کی اجازت دینا اور کچھ سے روکنا کس طرح جائز ہو گا۔

۴۔ اس حق کو روکنے کے جائز ہونے پر کوئی شرعی دلیل قائم نہیں۔

حقِ تصنیف وغیرہ محفوظ کرنا جائز ہے [1]،اس کے جواز پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ :

۱۔اشاعتِ دین واجب ہے تجارت کی عام اجازت واجب نہیں، یہاں ممنوع تجارت کا جزء ہے علم کا جزء نہیں بلکہ اس طرح دین کی اشاعت زیادہ ہوگی، کیونکہ ہر شخص مال خرچ کرکے ایجاد واختراع پر ضرر کے خوف سے جرأت نہیں کرسکتا، لہٰذا شائقین طلبہ اس موجود سے دوسری نقلیں کریں یا اسی کو خرید لیں۔

۲۔ہم حقِ تصنیف کو حق مجرد تسلیم نہیں کرتے (کیونکہ مقصود صرف روکنا ہے دوسری چیز کا حصول نہیں) بلکہ ایک چیز کا بنانا، چھاپنا اور شائع کرنا کوئی فرضی چیز نہیں ہے، یوں تو تمام فوائد فرضی ہوسکتے ہیں، اگر فرضی ہو بھی تو جس طرح دوسرے حقوق معتبر ہیں تو اس کا بھی اعتبار ہونا چاہیئے۔

جہاں تک حقِ شفعہ کا تعلق ہے وہ تو صرف ضررِ جار پر مبنی تھا اور حقِ ولاء نسب کی طرح ہے، یہ نقل اور عوض کے قابل نہیں۔یہ حق تو مالی فوائد اور تجارتی اغراض پر مبنی ہے یہ کسی طرح حق مجرد نہیں ہوسکتا۔

۳۔خریدار خریدنے کے بعد مبیع کا ضرور مالک ہوجاتا ہے مگر آگے تجارت کی اجازت دینا نہ مبیع کا جزء ہے نہ ہی عقدِ بیع کے اندر داخل ہے۔

۴۔یہ صورتیں پہلے زمانہ میں موجود نہیں تھیں نہ مفید، ان کے احکام بھی کتب میں مذکور نہیں بلکہ جدید دور کے جدید ایجاد وضرورت ہے، اس کے قیاس دوسرے عنوان سے ہونا چاہیئے۔

---

[1] حقوق تصنیف وغیرہ کو محفوظ کرنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور محفوظ کرنے کے بعد دوسرے کے لئے ان کتابوں کی نشرواشاعت کا گناہ ہوگا یا نہیں؟ اس کے متعلق بنیادی طور پر تین اہلِ علم کے تین مواقف ہیں۔۱: یہ حقوقِ مجردہ میں سے ہے جس کا معاوضہ لینا بھی ناجائز ہے اور محفوظ کرنے کا بھی اعتبار نہیں۔۲: دوسرا موقف اس کے برعکس ہے کہ لوگوں کے تعامل کی وجہ سے یہ حقوقِ مجردہ نہیں رہے لہٰذا محفوظ کرنے کا اعتبار بھی ہے اور معاوضہ لینا بھی جائز ہے۔۳: دنیوی مقاصد کے تحت لکھی ہوئی کتابوں میں اس کی اجازت ہے اور دینی کتابوں میں ایسا کرنا درست نہیں۔ پہلا موقف فقہاءِ ہند میں سے حضرت گنگوہی صاحب، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی، مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب، اور حضرت مفتی عبد الواحد صاحب وغیرہ کا ہے، دوسرا موقف مولانا عبد الغنی، مفتی عبد الرحیم لاجپوری، دکتور سنہوری، دکتور فتحی درینی، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، اور اکثر معاصر فقہاء کرام کا ہے، اکثر فقہی اکیڈمیوں نے بھی یہی قرارداد منظور کی ہے، جبکہ تیسرا موقف مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے "نظام الفتاویٰ" میں ذکر کیا ہے اور فتاویٰ بینات ج۴ میں بھی (شاید) یہ موقف اختیار کیا گیا ہے، حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ دوسرا قول راجح تھا، اس لئے اس کی تفصیل ذکر فرمائی اور غالباً برصغیر میں اس پر مستقلاً بحث کا آغاز آپ ہی نے فرمایا تھا۔

حقِ تصنیف محفوظ کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں نہ ٹیلیفون تھا نہ ڈاک کا نظام، نہ ریل ،نہ جہاز، نہ اس قدر عام تجارت، اور نہ ہی آن واحد میں پوری دنیا کی سیر اور ہر مقام کی خبر، اب اگر کسی نے کوئی دوا بنالی، یا کتاب لکھی یا فن ایجاد کر لیا، تو اسی کو ہی نفع اٹھانے کا حق ہونا چاہئے کیونکہ ان کی ایجاد سے پہلے کون جانتا تھا؟ کون بناتا؟ اور کون کارخانوں اور تجارت گاہوں میں خبر بھیجتا تھا؟ نہ تاجرانہ خیالوں کو اس قدر وسعت تھی کہ جو دیکھا اس کے سر ہو گئے اور آج کل ادھر خیال آیا اور ادھر ہر مقام پر اس کی صورت پیش نظر ہے، بے چارے ایجاد کرنے والے نے مر مر کر بہت مال خرچ کر کے درد سری کر کے ایک چیز تیار کی، وہ بھی پہلی مرتبہ کچھ اس کی خوبی ہے کچھ نقصان، کچھ محنت میں زیادتی، یاروں کو مفت نمونہ مل گیا اور لوگوں کا رجحان دیکھ کر ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر سستا فروخت کرنے لگے۔

اب جس نے ابتدائی مصارف برداشت کئے، مشقتیں اٹھائیں، نقل کرنے والوں کا مقابلہ اس کے لئے ممکن نہ تھا، اب پہلے کی مصیبت ٹلی نہ تھی کہ بعد میں خسارہ ونقصان سر پر آ کھڑا ہو گیا، اب عمر بھر کے لئے کان پکڑے رہ گئے، اسی طرح رفاہ عام کا طریقہ، علوم وفنون کی اشاعت کا راستہ مسدود ہو گیا اگر حق محفوظ کرنے کی ڈھال سامنے نہ ہو تو کوئی بھی مرد میدان میں نہیں آئے گا اور ایجاد میں قدم نہیں رکھے گا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکمت شرعی اور مصلحت الٰہی ایسے خسارہ ونقصان کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں انتہائی درجہ کی ناکامی اٹھانا پڑے اور کچھ ہو تو کوئی شرعی الزام بھی تو عائد نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا عام مصلحت اور حکمت فقہ اسلامی پر نظر کرتے ہوئے حق امتناع کو جائز سمجھا جائے گا اور اس بارے میں زیادہ گفتگو اور اس کو ناجائز کہنا زمانہ کے حالات اور حکمت شرعیہ سے ناواقفی اور بے پرواہی کے سوا اور کیا ہے؟

مسئلہ: زید کو اختیار ہے کہ کوئی کتاب تصنیف کر کے اس کی اشاعت سے دوسرے لوگوں کو روک دے، نہ کوئی اس کو بنائیں نہ شائع کریں، نہ اسے دوسری صورت میں تبدیل کریں تاکہ اس کا فائدہ زید ہی کے لئے مخصوص رہے۔

مسئلہ: زید کے بعد زید کے ورثاء کو بھی مندرجہ ذیل شرائط کے تحت منع کرنے کا حق ہو گا:

ا۔ زید نے اپنی حیات میں منع کر دیا ہو۔

۲۔ نہ ممانعت کر دی ہو نہ شائع کیا ہو بلکہ صرف ایجاد و تصنیف کرے مر گیا ہو پھر وارثوں نے اس کو شائع کیا ہوں تو زید کی طرح ان کو منع کرنے کا حق ہو گا، اگر یہ دو باتیں نہ ہوں تو حق تصنیف کرنے کا حق نہ ہو گا کیونکہ ہو سکتا ہو زید کا مقصد اجازت عام ہو۔

مسئلہ: زید نے عمر کو معاوضہ لے کر اشاعت کی اجازت دی، یہ حق کی بیع ہے زید اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔

مسئلہ: زید نے عمر کو بلا عوض طباعت کی اجازت دی، تو زید کو اختیار ہو گا آئندہ کے لئے جب چاہے روک دے یا کسی اور کو اجازت دیدے کیونکہ یہ اجازت ہبہ اور عاریت کی طرح ہے۔[1]

مسئلہ: زید کا بلا عوض و تخصیص یہ کہنا کہ تم فلاں کتاب چھاپ سکتے ہو، عام اجازت کی حد میں بھی آسکتا ہے یعنی دوسروں کی حق میں بھی اجازت ہو سکتی ہے اور اگر خاص کر کے یا عوض لے کر اجازت دے تو دوسروں کے لئے اشاعت کی اجازت نہ ہو گی۔

مسئلہ: اگر زید کی طرف سے ممانعت کے باوجود کسی اور نے شائع کر دی تو زید کو حق ہو گا کہ اس سے اپنے نقصان کا معاوضہ لے لے یا اس مال کو اس طرح ضائع کر دے کہ زید کے حق میں نقصان دہ نہ رہ سکے، ان کے نظائر فقہ کے ان جزئیات سے نکل سکتے ہیں جن جزئیات میں مالک اپنی ملک میں ایسے تصرف سے روکا گیا ہو جو دوسروں کے حق میں نقصان دہ ہو،[2] جیسے اپنی دیوار میں سراخ کرنا یا اپنی کھیت کو اس قدر سیراب کرنا کہ دوسروں کی زمین تک پانی پہنچے یا گرتے ہوئے مکان کو منہدم یا مستحکم نہ کرنا یا لوہار کا اپنی دکان میں گرم لوہا اس طرح پیٹنا کہ قریب والوں کو جلنے کا خوف ہو یا اس کی مثل دوسری وجہ "لاضرار فی الاسلام"۔

---

[1] (ولها أن ترجع إن تركت قسمها لأخرى) ؛ لأنها أسقطت حقا لم يجب بعد فلا يسقط؛ لأن الإسقاط إنما يكون في القائم، فيكون الرجوع امتناعا بمنزلة العارية حيث يرجع المعير فيها متى شاء لما قلنا.(الدرر والغرر ،كتاب النكاح، باب القسم،ج١ص ٣٥٥).وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب النكاح،باب القسم بين الزوجات،ج ٣ص ٢٠١).

[2] (لا يتد ذو سفل فيه، ولا ينقب كوة بلا رضا ذي العلو) معناه إذا كان لرجل سفل ولآخر علو فليس لصاحب السفل أن يتد فيه وتدا، ولا ينقب فيه كوة وهذا عند أبي حنيفة وقالا يصنع فيه ما لا يضر بالعلو.(تبيين الحقائق، كتاب القضاء، باب مسائل شتّى،ج٤ص ١٩٤).وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب القضاء، باب مسائل شتّى،ج ٥ص ٤٤٣).

يجوز لأحد الشريكين أن يتصرف مستقلا في الملك المشترك بإذن الآخر لكن لا يجوز له أن يتصرف تصرفا مضرا بالشريك. (مجلة الأحكام العدلية، الشركات، رقم المادة: ١٠٧١،ص٢٠٦).

صلح کے احکام

مسئلہ: صلح: اس کے ذریعے سے مدعی کو فریق مقابل کی رضاء سے کوئی عوض یا حق ملتا ہے، اس کی چار صورتیں ہیں اور تین حکم۔

۱۔ اگر مدعی حق کا اقرار کر کے صلح کرے تو یہ بیع واجارہ کی طرح ہو جبکہ منافع پر صلح ہو۔ [1]

۲۔ سکوت: یعنی مدعیٰ علیہ نہ حق کا اقرار کرتا ہے نہ انکار، بلکہ سکوت اختیار کر کے صلح کرتا ہے۔

۳۔ حق کا انکار کر کے پھر صلح کرتا ہے، تو یہ سمجھا جائے گا کہ مدعیٰ علیہ نے جھگڑا ختم کرنے کے لئے صلح مال خرچ کیا، اس صلح میں نہ خیار عیب ہے نہ حق شفعہ۔

۴۔ حق کا اقرار تو ہے مگر مقدار واجب یا تعیین یا تخصیص یا قیمت وغیرہ میں گفتگو ہے، تو جتنی مقدار حق کا اقرار ہے اس میں بیع اور قدر اختلاف میں قطع منازعت کے لئے مال خرچ کرنا۔

مسئلہ: صلح ایسے حقوق اور عوض کے مقابلے میں جائز ہے جس پر **ملک جواز ثابت** ہو لہٰذا حدود سے صلح نہیں ہو سکتی کیونکہ مدعی کو معاف کرنے کا اختیار نہیں، یا حق عامہ سے ایک آدمی صلح نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی خاص **ملک** نہیں، اسی طرح شراب، خنزیر، سود، جوا وغیرہ سے صلح نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ سارے حرام ہیں۔ [2]

---

[1] فإن وقع الصلح عن إقرار اعتبر فيه ما يعتبر في البياعات إن وقع عن مال بمال فتجرى فيه الشفعة.. وإن وقع عن مال بمنافع يعتبر بالإجارات فيشترط التوقيت فيها.. والصلح عن السكوت والإنكار في حق المدعى عليه لافتداء اليمين وقطع الخصومة وفي حق المدعي بمعنى المعارضة.(الفتاوى الهندية ،كتاب الصلح، الباب الاول،ج٤ص ٢٣٠).

وكذا في الدرر والغرر (كتاب الصلح،ج٢ص ٣٩٦).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين(كتاب الصلح،ج٥ص ٦٢٩و٦٣٠).

[2] (ومنها) أن يكون المال المصالح عليه متقوما فلا يصح الصلح على الخمر والخنزير من المسلم.. (ومنها) أن يكون المصالح عنه مما يجوز الاعتياض عنه مالا أو غير مال نحو القصاص مجهولا كان أو معلوما.. (ومنها) أن يكون المصالح عنه حق العبد لا حق الله سواء كان مالا عينا أو دينا أو حقا ليس بمال عين ولا دين حتى لا يصح الصلح من حد الزنا والسرقة وشرب الخمر.(الفتاوى الهندية ،كتاب الصلح، الباب الاول،ج٤ص٢٣٠).

(و) شرطه أيضا (كون المصالح عليه معلوما إن كان يحتاج إلى قبضه و)كون (المصالح عنه حقا يجوز الاعتياض عنه، ولو) كان (غير مال كالقصاص والتعزير معلوما كان) المصالح عنه (أو مجهولا لا) يصح (لو) المصالح عنه (مما لا يجوز الاعتياض عنه) وبينه بقوله (كحق شفعة وحد قذف وكفالة بنفس).(الدر المختار وحاشية ابن عابدين،كتاب الصلح،ج٥ص ٦٢٩).

وكذا في الدرر والغرر (كتاب الصلح،ج٢ص ٣٩٥).

مسئلہ: مال اور منافع دونوں سے صلح جائز ہے۔[1]

مسئلہ: جن حقوق پر صلح کرنے سے منع کیا گیا ہے جیسے حق شفعہ وغیرہ، ان پر جو کچھ معاوضہ دیا جائے وہ عطیہ ہے اور جو کچھ کہا جائے وہ محض وعدہ ہے۔[2]

مسئلہ: جن حقوق سے صلح میں سکوت یا اشتباہ ہو وہ وعدہ مشروط کی طرح ہے۔[3]

حق مہر کے احکام

۱۔ یہ حق عورتوں کے لئے خاص ہے۔[4]

۲۔ نفس نکاح سے حق مہر ثابت ہو جاتا ہے۔[5]

---

[1] (الصلح جائز عن دعوى المال).. (والمنفعة) يعني الصلح عن دعوى المنفعة أيضا جائز ويكون بمعنى الإجارة إن وقع عنه بمال أو بمنافع.(تبيين الحقائق ،كتاب الصلح، ج٥ص ٣٤).

(وصح) الصلح (عن دعوى المال مطلقا) ولو بإقرار أو بمنفعة (و) عن دعوى (المنفعة)).(الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الصلح، ج٥ص ٦٣٣).

[2] لیکن شرط یہ ہے کہ اس کو وعدہ ہی کے درجہ میں رکھا جائے، اگر دونوں طرف سے ایسا کرنے کی شرط لگائی جائے یا صراحت کے ساتھ شرط تو نہ ہو لیکن یہی معہود و متعارف ہو تو پھر اس کو وعدہ یا عطیہ کہنا مشکل ہے بلکہ تب اس کا حکم معاوضہ ہو گا اور چونکہ ان جیسے حقوق کا عوض لینا جائز نہیں اس لئے معاوضہ لینا جائز نہ ہو گا، جیسا کہ فقہاء کرام نے ان جیسے مسائل میں اس کی تصریح فرمائی ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وفي الفتاوى الخيرية سئل فيما يرسله الشخص إلى غيره في الأعراس ونحوها هل يكون حكمه حكم القرض فيلزمه الوفاء به أم لا؟ أجاب: إن كان العرف بأنهم يدفعونه على وجه البدل يلزم الوفاء به مثليا فبمثله، وإن قيميا فبقيمته وإن كان العرف خلاف ذلك بأن كانوا يدفعونه على وجه الهبة، ولا ينظرون في ذلك إلى إعطاء البدل فحكمه حكم الهبة في سائر أحكامه فلا رجوع فيه بعد الهلاك أو الاستهلاك، والأصل فيه أن المعروف عرفا كالمشروط شرطا اهـ. قلت: والعرف في بلادنا مشترك نعم في بعض القرى يعدونه فرضا حتى إنهم في كل وليمة يحضرون الخطيب يكتب لهم ما يهدى فإذا جعل المهدي وليمة يراجع المهدى الدفتر فيهدي الأول إلى الثاني مثل ما أهدى إليه. (حاشية ابن عابدين على الدر المختار ،كتاب الهبة، ج٥ص٦٩٦).

(المعروف عرفا كالمشروط شرطا. (المادة ٤٤) : المعروف بين التجار كالمشروط بينهم. (المادة ٤٥) : التعيين بالعرف كالتعيين بالنص. (مجلة الأحكام العدلية،المقالة الثانية في القواعد الفقهية،ص:٢١).

[3] ايضا.

[4] لأنه تجب لقاء منافع البضع وهي مختصة بالنّساء.

[5] المهر في النكاح الصحيح يجب بالعقد؛ لأنه إحداث الملك، والمهر يجب بمقابلة إحداث الملك.(بدائع الصنائع ،كتاب النكاح، ما يجب به المهر، ج٢ص ٢٨٧).إن المهر يجب بالعقد أو بالتسمية فكان حكما له فيعقبه. (مجمع الأنهر ،كتاب النكاح، باب المهر، ج١ص ٣٤٥).

۳۔ مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم چاندی ہے۔[1]

۴۔ یہ مہر دین کی طرح ذمہ میں واجب ہے۔

۵۔ اس میں معاف کرنا، وارث بننا، اس کی نسبت وصیت کرنا سب جائز ہے۔

۶۔ نکاح ہوتے ہی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے مگر کوئی مدت مقرر ہو جائے تو اس مدت کے پوری ہونے کے بعد مطالبہ کرے گی۔[2]

حق مہر ساقط ہونے کی صورتیں:

مہر ساقط نہیں ہوتا مگر چند صورتوں میں:

۱۔ عورت خود معاف کردے۔[3]

۲۔ خلع سے۔

۳۔ خلوت سے پہلے عورت کے مرتد ہونے سے۔[4]

۴۔ اور خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دینے سے آدھا مہر ساقط ہو جاتا ہے۔

۵۔ نکاح کے وقت کہدیا جائے کہ مہر کچھ نہیں ہوگا، یا مہر کا ذکر نہ ہو یا ذکر تو ہو مگر مقدار مذکور نہ ہو یا مقدار یاد نہ رہے تو ان سب صورتوں میں مہر مثل لازم ہوگا۔[5]

---

[1] المهر أقله عشرة دراهم أو ما قيمته عشرة دراهم.(الاختيار لتعليل المختار ،كتاب النكاح،ج٣ ص١٠١).

وأقله عشرة دراهم.(مجمع الأنهر ،كتاب النكاح، باب المهر،ج١ص ٣٤٥).

دس درہم موجودہ اوزان کے مطابق دو(۲) تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی کے برابر ہے(اوزانِ شرعیہ،ص۲۲)

[2] " ولو كان المهر كله مؤجلا ليس لها أن تمنع نفسها " لإسقاطها حقها بالتأجيل.(الهداية ،كتاب النكاح، باب المهر،ج١ص ٢٠٦).وكذا في البحر الرائق (كتاب النكاح، باب المهر،ج٣ص١٩٠).

[3] لأنّه حقّها فلها إسقاطه.

[4] الفرقة بغير طلاق قبل الدخول بالمرأة وقبل الخلوة بها: كل فرقة حصلت بغير طلاق قبل الدخول وقبل الخلوة: تسقط جميع المهر، سواء أكان من قبل المرأة أم من قبل الزوج، كأن ارتدت المرأة عن الإسلام، أو أبت الإسلام وأسلم زوجها.(الفقه الإسلامي وأدلته،الاحوال الشخصية، الزواج، المهر،ج٩ ص ٦٨٠٦).

وكذا في بدائع الصنائع (كتاب النكاح، بيان ما يتأكد به المهر،ج٢ص ٢٩٤).

[5] وإن لم يسم لها مهرا، أو شرط أن لا مهر لها – فلها مهر المثل بالدخول والموت، والمتعة بالطلاق قبل الدخول. ولا تجب إلا لهذه. الاختيار لتعليل المختار،كتاب النكاح،ج٣ص ١٠٢.ويجوز النكاح بدون المهر حتى إن من تزوج امرأة، ولم يسم لها مهرا

مہر مثل کی تعریف

مہر مثل کا مطلب یہ ہے کہ کسی عورت کے لئے اس کے آبائی رشتہ دار عورتوں کی مثل مہر مقرر کرنا، شرط یہ ہے کہ یہ عورت ان کے مثل ہو، عمر میں، حسن میں، عقل میں، مال وغیرہ میں۔

متعہ کا حکم: متعہ سے مراد: کسی عورت سے مہر کے بغیر نکاح ہو پھر خلوت سے پہلے طلاق واقع ہو جائے تو اس کو ایک جوڑا کپڑا حسب حیثیت دینا واجب ہے جو پانچ درہم سے کم اور آدھے مہر سے زیادہ کا نہ ہو، یہ اس صورت میں ہے جبکہ عورت کو مہر دینا نہ پڑے اور دوسری صورتوں میں متعہ مستحب ہے یعنی جبکہ شوہر کے ذمہ مہر لازم ہو مگر جس صورت میں آدھا مہر دینا پڑے تو جوڑا نہیں دیا جائے گا[1]۔

عقر کا حکم: عقر وہ مال ہے جو ایسی عورت کو دلایا جائے جس سے مرد نے حلال کے شبہ میں وطی کی ہو اور حد اس پر لازم نہ آئے۔[2]

حقوق مشترکہ

جس میں محدود افراد شریک ہوں منع و حبس جاری اور جائز ہو جیسے کسی خاص گلی میں چلنے کا حق، کسی زمین یا نہر میں پانی بہانے کا حق، کسی ممنوع اور محفوظ چراگاہ میں جانور چرانے کا حق[3]، لکڑی اور گھاس

بأن سكت عن ذكر المهر أو تزوجها على أن لا مهر لها ورضيت المرأة بذلك يجب مهر المثل بنفس العقد عندنا.بدائع الصنائع، كتاب النكاح، ج٢ص٢٧٢.

[1] (المتعة عندنا على ثلاثة أوجه) متعة (واجبة) وهي للمطلقة قبل الدخول ولم يسم لها مهرا (ومستحبة) وهي للمطلقة بعد الدخول (ولا واجبة ولا مستحبة) وهي للمطلقة قبل الدخول وقد سمى لها مهرا كذا في السراج الوهاج. الفتاوى الهندية ،كتاب النكاح، الباب السابع،ج١ص ٣٠٤. (وإذا طلقها قبل الدخول، ولم يسم لها مهرا: فلها المتعة واجبة). قال أحمد: لا متعة واجبة عند أصحابنا غير هذه، وهي مستحبة لكل مطلقة غيرها. ولا خلاف بين الفقهاء أن المطلقة قبل الدخول إذا كان قد سمي لها في العقد: أنه لا متعة لها. شرح مختصر الطحاوي للجصاص ،كتاب النكاح، باب الأصدقة،ج٤ص ٤٠٥.

راجعْ للتفصيل مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر ،كتاب النكاح، باب المهر،ج١ص ٣٥١.

[2] (والعقر) صداق المرأة إذا وطئت بشبهة.(المغرب في ترتيب المعرب،مادة " عقر"ص: ٣٢٣).ولو أسقط الجلد للشبهة يجب العقر إذ الزنا في دار الإسلام لا يخلو عن عقوبة أو غرامة. (تحفة الفقهاء، كتاب الحدود،ج٣ص ١٣٧).

وكذا في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (كتاب النكاح، باب المهر،مطلب في بيان مهر المثل،ج٣ص ١٣٧).

[3] **بشرطیکہ یہ زمین متعین ہو ورنہ معاملہ فاسد ہوجائے گا۔** وبيع رقبة الطريق وهبته منفردا جائز وبيع مسيل الماء وهبته منفردا فاسد.(ووجه) الفرق أن الطريق معلوم الطول والعرض؛ فكان المبيع معلوما فجاز بيعه بخلاف المسيل فإنه مجهول القدر؛ لأن

وغیرہ کاٹنے کا حق۔ یہ تمام حقوق مسلم ہیں، اصل کے ساتھ تبعاًان کو فروخت کرنا بھی جائز ہے مثلاًزید نے ایک مکان خریداتواسے یہ حقوق بھی خود بخود حاصل ہو گئے اوران حقوق کو مستقل فروخت کرنا بھی جائز ہے اگر بیع ذات نہ ہو۔[1]

لیکن جب نہ ہر شخص کے لئے الگ الگ راستہ بنایا جاسکتا ہے نہ ہی اس کے بغیر گذرنا ممکن ہے نہ مفت میں ملنا لازم ہے بلکہ بخل منع کرنا اسمیں جاری ہے، جب اس کی سخت ضرورت ہے اور ایسے حقوق فروخت کرنے سے نہی بھی منقول نہیں ہے اب خریداری کے سوا کوئی اور راستہ تو ہے نہیں اور ممانعت پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے، لہٰذا ان حقوق کو بیچنا جائز ہو گا۔

حقوقِ عامہ

وہ حقوق جن میں تمام لوگ شریک ہوں اور شرعاًان حقوق کو استعمال کرنے کی عام اجازت ہو، جیسے شارع عام نہ اس میں خاص کسی کا حق ہے نہ ہر شخص کو تصرف کا اختیار ہے، ہاں حکومت انتظامی مصلحتوں سے اس میں تصرف، تغیر و تبدل کرسکتی ہے اور کسی عام آدمی کے لئے ایسا تصرف کرنا جائز ہے جس سے عام لوگوں کو نقصان پہنچ جائے۔[2]

واللہ تعالی اعلم بالصواب

****

القدر الذي يشغل الماء من النهر غير معلوم؛ فكان المبيع مجهولا فلم يجز. (بدائع الصنائع ،كتاب البيوع، شرائط الصحة، ج٥ص ١٦٣).

[1] الدر المختار: (وصح بيع حق المرور تبعا) للأرض (بلا خلاف و) مقصودا (وحده في رواية) وبه أخذ عامة المشايخ شمني وفي أخرى لا، وصححه أبو الليث.وفي حاشية ابن عابدين تحته: (قوله وبه أخذ عامة المشايخ) قال السائحاني وهو الصحيح، وعليه الفتوى مضمرات اهـ. (كتاب البيوع،مطلب في بيع الشرب، ج٥ص٨٠).

[2] يجوز لأحد الشريكين أن يتصرف مستقلا في الملك المشترك بإذن الآخر لكن لا يجوز له أن يتصرف تصرفا مضرا بالشريك. (مجلة الأحكام العدلية، الشركات، رقم المادة:١٠٧١، ص٢٠٦). رجل يبيع على الطريق إن كان لا يضر بالمارة لسعة الطريق يحل الشراء منه وإن أضر بالمارة لا يحل الشراء منه وإن كان الطريق واسعاً وقيل يكره. (الفتاوى البزازية ،كتاب البيوع، السادس عشر في الحظر والإباحة، ج٥ص ٥٠).

فہرستِ مضامین

مراجع ومصادر

❖ البحر الرائق شرح كنز الدقائق مع منحة الخالق ، مكتبة رشيدية
❖ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع مكتبه رشيديه، كوئته
❖ البناية شرح الهداية ، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان
❖ الجامع الصغير،عالم الكتب، بيروت
❖ جامع الفصولين إسلامي كتب خانه، بنوري تاؤن، كراچي
❖ حاشية ابن عابدين على الدر المختار، ايچ ايم سعيد
❖ درر الحكام في شرح مجلة الأحكام للعلّامة علي حيدر. المكتبة العربية كوئته
❖ شرح المجلة للعلامة محمد خالد الأتاسي، مكتبه رشيديه، كوئته
❖ تكملة عمدة الرّعاية على شرح الوقاية للعلاّمة فتح محمد اللكهنوي رحمه الله.
❖ العناية شرح الهداية علي هامش فتح القدير، مكتبه حقانيه، بشاور.
❖ فتاوى قاضيخان، قديمي كتب خانه، كراچي.
❖ فتح القدير للعاجز الفقير، مكتبه حقانيه، بشاور.
❖ كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، مكتبة لبنان.
❖ مجلة الأحكام العدلية، مير محمد كتب خانه ، كراچی.
❖ مجمع الأنهر في شرح ملتقي الأبحر،مكتبه عمريه بلوچستان.
❖ المجموع شرح المهذب، دار الفكر، بيروت، لبنان.
❖ المحيط البرهاني في الفقه النعماني،إدارة القران والعلوم الإسلامية، كراچي.
❖ مختصر القدوري، دار الكتب العلمية.
❖ المغني لابن قدامة، وزارة شئون المطبوعات والبحث العلمي. السعودية.
❖ ملتقى الأبحر مع شرحه مجمع الأنهر، مكتبه عمريه بلوچستان.
❖ أحكام الأوقاف للإمام الخصّاف، الطبعة القديمة بِهند.
❖ الهداية في شرح بداية المبتدي، مكتبة البشرى، كراچي.
❖ كتاب الأصل للإمام محمد بن الحسن الشيباني، مكتبة الأحرار، مردان.
❖ تحفة الفقهاء للإمام أبي بكر علاء الدين السمرقندي، دار الكتب العلمية بيروت.

❖ الإختيار لتعليل المختار للعلاّمة عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي الحنفي، دار الكتب العلمية بيروت.
❖ الجوهرة النيرة شرح مختصر القدوري للعّلامة أبي بكر بن علي الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ الحنفي. قديمي كتب خانه كراچي.
❖ النتف في الفتاوى لشيخ الإسلام أبي الحسن علي بن الحسين السُّغْدي. دار الفرقان،بيروت.
❖ درر الحكام شرح غرر الأحكام للعلاّمة محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا خسرو. دار إحياء الكتب العربية.
❖ اللباب في شرح الكتاب للعلاّمة عبد الغني الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي، دار الكتب العلمية، بيروت.
❖ الفِقْهُ الإسلاميُّ وأدلَّتُهُ للعلاّمة د. وَهْبَة بن مصطفى الزُّحَيْلِيّ، دار الفكر، سورية دمشق.
❖ الإسعاف فى أحكام الأوقاف. للعلاّمة إبراهيم بن موسى الطرابلسي الحنفي،مطبعة هندية بشارع المهدى بالأزبكية بمصر المحمية.
❖ شرح مختصر الطحاوي للإمام أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي المحقق: د. عصمت الله عنايت الله محمد. أ. د. سائد بكداش. المكتبة الكريمية، كوئتة باكستان.
❖ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشِّلْبِيِّ. للعلاّمة عثمان بن علي فخر الدين الزيلعي الحنفي. المطبعة الكبرى الأميرية بولاق، القاهرة.
❖ التجريد للقدوري للإمام أحمد بن محمد بن أحمد أبو الحسين القدوري، مكتبه محموديه، قندهار افغانستان.
❖ كنز الدقائق للعلاّمة أبي البركات عبد الله بن أحمد بن محمود النسفي. المحقق: أ. د. سائد بكداش. الناشر: دار البشائر الإسلامية.
❖ مختصر القدوري في الفقه الحنفي للإمام أحمد بن محمد بن أحمد أبو الحسين القدوري.دار الكتب العلمية.
❖ المجموع شرح المهذب(مع تكملة السبكي والمطيعي) للإمام أبي زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي.الناشر: دار الفكر.
❖ صحيح البخاري للإمام محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي. الناشر: دار طوق النجاة.
❖ صحيح مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري. الناشر: دار إحياء التراث العربي بيروت.

- ❖ سنن أبي داود،للإمام أبي داود سليمان بن الأشعث السِّجِسْتاني. الناشر: المكتبة العصرية، صيدا بيروت.
- ❖ سنن ابن ماجه للإمام ابن ماجة أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني. الناشر: دار إحياء الكتب العربية.
- ❖ سنن الترمذي للإمام محمد بن عيسى بن سَوْرة الترمذي، أبو عيسى. المحقق: بشار عواد معروف. الناشر: دار الغرب الإسلامي – بيروت.
- ❖ نشر العرف في بناء بعض الأحكام على العرف. مركز البحوث الإسلامية مردان.
- ❖ كتاب الكسب للإمام أبي عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني.مكتب المطبوعات الإسلامية.
- ❖ تنقيح الفتاوى الحامدية للعلامة محمد أمين بن عمر عابدين الدمشقي الحنفي. الناشر: دار المعرفة.
- ❖ مجمع الضمانات للعلامة أبي محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي. الناشر: دار الكتاب الإسلامي.
- ❖ الجامع الصغير وشرحه النافع الكبير لمن يطالع الجامع الصغير للعلامة عبد الحي اللكهنوي. عالم الكتب بيروت.
- ❖ تكملة فتح الملهم للعلامة المفتي تقي العثماني، مكتبة دار العلوم كراتشي.
- ❖ فتاوى قاضي خان للإمام فخر الدّين حسن بن منصور قاضي خان، قديمي كتب خانه.
- ❖ الفتاوي البزازية،
- ❖ فيض الباري شرح صحيح البخاري لإمام العصر العلامة أنور شاه الكشميري. مكتبه رشيديه كوئته.
- ❖ شرح النووي علي صحيح مسلم بن الحجاج (المطبوع على هامش الكتاب).
- ❖ عمدة القاري شرح صحيح البخاري للإمام أبي محمد محمود بن أحمد بدر الدين العينى.دار إحياء التراث العربي بيروت.
- ❖ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال للإمام علاء الدين علي بن حسام الدين الشهير بالمتقي الهندي. المحقق: بكري حياني – صفوة السقا. الناشر: مؤسسة الرسالة.
- ❖ الترغيب والترهيب من الحديث الشريف. للإمام عبد العظيم بن عبد القوي المنذري. المحقق: إبراهيم شمس الدين. الناشر: دار الكتب العلمية — بيروت.

❖ مسند الإمام أحمد بن حنبل للإمام أبي عبد الله أحمد بن حنبل. المحقق: شعيب الأرنؤوط – عادل مرشد، وآخرون.إشراف: د عبد الله بن عبد المحسن التركي. الناشر: مؤسسة الرسالة.
❖ تاليفات رشيديه، مفتي رشيد احمد گنگوهي رحمه الله. اداره اسلاميات لاهور.
❖ أحسن الفتاوى، مفتي رشيد احمد لدهيانوي صاحب، ايچ ايم سعيد كمبني كراچي.
❖ إمداد الفتاوى، حضرت مولانا أشرف علي تهانوي صاحب، مكتبه دار العلوم كراتشي.
❖ المبسوط للإمام محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي. دار المعرفة — بيروت.
❖ فتح القدير للعاجز الفقير للعلامة كمال الدين محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الهمام. الناشر: دار الفكر.
❖ غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر للعلامة أحمد بن محمد الحموي الناشر: دار الكتب العلمية.
❖ شرح القواعد الفقهية للعلاّمة أحمد بن الشيخ محمد الزرقا. الناشر: دار القلم – دمشق / سوريا.
❖ مؤسُوعَة القَواعِدُ الفِقْهِيَّة للعلاّمة محمد صدقي بن أحمد آل بورنو.الناشر: مؤسسة الرسالة، بيروت لبنان.
❖ شرح مشكل الآثار للإمام أبي جعفر أحمد بن محمد المصري المعروف بالطحاوي.تحقيق: شعيب الأرنؤوط. الناشر: مؤسسة الرسالة.
❖ الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار. للإمام أبو بكر بن أبي شيبة. المحقق: كمال يوسف الحوت. الناشر: مكتبة الرشد – الرياض
❖ المقالات والمضامين الفقهية – الغير المطبوعة– لمخرّج هذا الكتاب.